

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226410

UNIVERSAL
LIBRARY

TIGHT BINDING BOOK

226410

وَمَا وَدَّعْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

مذکرہ مدرسہ سائنس

بینی

ڈاکٹر جان ولیم ڈیوڈ پیریچیم ایس ایل ایل ڈی

کی شہرہ آفاق تصنیف

کانفلکٹ بیٹوین لیجن اینڈ سائنس

کا اردو ترجمہ

مترجم

ظفر علی خاں بی۔ اے (طبیگ)

حسب ایامیئے انجمن اردو حیدر آباد دکن

مطبوعہ فہ عام اسٹیم پریس لاہور

ایک ہزار

۱۹۱۰ء

طبع اول

انتساب

عالی جناب نواب محسن الملک مولوی سید
ہمدی علی خاں صاحب مرحوم و معذور جن کا نام
مسلمانان ہند کی علمی تاریخ میں آب زر سے لکھا
جا چکا ہے سب سے پہلے شخص تھے جن کی تحریک
میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ
اُردو میں کیا تھا۔ اس لئے میں اس کتاب کو جو اب
نظر ثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہو کر شائع ہوئی
عالی جناب ممدوح کی پاک یاد کے ساتھ نسبت دینے
کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ ظفر علی خاں

معرکہ مذہب و سائنس

فہرست مضامین

از صفحہ ۱ تا ۱۰	فہرست مضامین
صفحہ ۱	اغلاط نامہ
از صفحہ ۱ تا ۸۰	مقدمہ کتاب از مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے
از صفحہ ۸۱ تا ۹۲	حیات ڈاکٹر ڈریسپر از مترجم
از صفحہ ۹۲ تا ۱۰۴	دیباچہ مصنف

پہلا باب

سائنس کی ابتدا

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب و اقیقت حاصل کرتے ہیں۔
مقدونوی فوج کشی سے فن حرب فن انجینیئری اور سائنس کو جو تحریک پہنچی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوئی ہے یہی دارالعلم جس میں تجربہ شاہدہ اور ہند سائنس تفتید کے ذریعہ سے علوم و فنون کی ترقی کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں سائنس یعنی علوم و فنون کا سرچشمہ قرار پاتا ہے + صفحہ ۱

دوسرا باب عیسائیت کی ابتدا

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلب ماہیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ۔
روما کی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے بعد بہ حکومت شخصی ہونے سے لوگوں
کا میلان قوس کی طرف ہو جاتا ہے سلطنت روم میں مذہب عیسوی کی اشاعت عیسائیت کو حکومت
جس طریقہ سے لڑا آتی ہے اُس کے سیاسی مقضیات عیسائیت اور بت پرستی کے باہمی اتحاد کو لازم
قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے عقاید اور رسوم کے متعلق ٹرینین کا بیان قبطی طین کی حکومت علی کا مغرب
اثر عیسائیت کا اتحاد حکمران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور سائنس کا تناقض باہمی کتب خانہ
اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی ممانعت۔ انگلستان کے فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت
کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے + صفحہ ۴۴

تیسرا باب

نزاع مذہب سائنس دربار مسئلہ توحید پہلی یعنی جنوبی اصلاح
اہل مصر اصرار کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے قسطنطنیہ کا بطریق
نسطور ان کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ اُس سوچ کے جو مصریوں کو دربار قیصر میں حاصل ہے
نسطور کو جلا وطن کر دیتے ہیں۔ اور نسطور کے پیروں منتشر ہو جاتے ہیں +
اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج +
اصلاح ۶ ب۔ حضرت محمدؐ نسطوری فرقے کے راہبوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے اصول
اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش مسئلہ تثلیث
اور اُس فیکہ سے جو توحید باری سے توافقی نہیں رکھتا انکار کرتے ہیں۔ عوب کی بت پرستی کو

جبر مٹا دیتے ہیں اور دولت روم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے نشین شام مصر ایشیائے کوچک شامی افریقہ اور ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں +
اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روم کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سر نو زن ہوتا ہے اور سچی دنیا کے بہت سے مشہور مرکز حکومت مثلاً اسکندریہ کا تہج یہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں + صفحہ ۹۱

چوتھا باب

جنوب میں سائنس کا ایجا

نسطوریوں اور یوودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب اکتساب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قضا و قدر اور سرفروشت اذلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جہامت اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں ان کے خلفاء عظیم الشان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رصد گاہیں قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں الجبر ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و مثلثات پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں ان کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں ارسطو کے طریقہ استقرائے تام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سائنس سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسطوریوں کی مدد سے موجود وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سائنس و اعداد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں موجود فنون ہیئت و کیمیا و طبیعیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاح و صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں + صفحہ ۹۲

پانچواں باب

تعارض مذہب و سائنس و زبارة ماہیت روح بمسئلہ انفصال و التجاذب
روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات یعنی روح جسم کے مشابہ ہے۔

اہل مشرق کے فلسفیانہ خیالات۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصالِ انجذاب کی تلقین کرتے ہیں یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروان فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں مسمیٰ اور عرب کرتے ہیں یہی مسئلہ ایچینا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے +

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و تناسب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مماثلت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر +

فلسفہ ابن رشد جو الہیس واقعات پر مبنی ہے اسپین اور سسلی ہوتا ہوا مسیحی دنیا میں پہنچا ہے فلسفہ ابن رشد کے استیصال کی تاریخ۔ اسلام کا اس سے ابا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائے روم کا اس فلسفہ کے مشاوینے پر کمر باندھنا "انکویریشن" (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے وحشیانہ مظالم اور ان کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پامالی۔ ڈیٹیکن کونسل کا فیصلہ + صفحہ ۱۷۲

چھٹا باب

نزاع مذہب و سائنس در بارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین چٹنی ہے۔ بہشت اور دوزخ +

اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام شمسی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کوپرنیکس ٹیوگا اور گیلیلین کے قین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور رقاص ساعت کے ذریعہ سے کر دیت زمین کی یقین +

کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دور بین کی ایجاد۔ گیلیلیو "انکویریشن" کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اس کی سزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر +

جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے سرور منظر منظر البروج کی بنا پر آقا

کے زاویہ اختلاف منظر کی تعین۔ کرہ زمین اور انسان کی پہچ میرزی +
 جنالات و بارہ جہاست کائنات۔ زوایائے اختلاف مناظر کو اکب۔ بروذیہ دعویٰ
 کرتا ہے کہ اس دنیا کے طوط اور بھی آباد و نیائیں موجود ہیں۔ محکمہ انکویزیشن "اُسے گرفتار کر کے
 قتل کر دیتا ہے +
 صفحہ ۲۱۳

ساتواں باب

تنوع در بان عمر زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہونا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا
 جانا۔ پادریوں کے علم التایخ کا انبیاء سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں
 مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض +

قصہ طوفان فوج۔ روئے زمین کا از سر نو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اختلاف
 السنہ انسان کی قدیمی زبان +

کیسینی کا یہ اکتشاف کہ سیارہ مشتری سطح الطرفین ہے۔ نیوٹن کا یہ اکتشاف کہ کرہ
 ارض سطح الطرفین ہے۔ اس اکتشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات
 و خیل کے سانچے میں ڈھل کر موجود شکل اختیار کی ہے۔ احجار آبی کی طبقات الارضی
 تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق آتار اجسام فومی الاعضا سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔
 زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہانے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش
 کی جگہ مسئلہ ارتقاء لیتا ہے۔ اکتشافات و بارہ قدامت انسان +

کائنات کے پیانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و

تفریط سے احتراز +

آکھواں باب

تراج دربارہ معیار حق

فلسفہ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں +
 قدیم سیموں میں عقاید کے اختلافات - کلیسائی کونسلیں ان اختلافات کے مٹانے کی
 بے سود کوششیں کرتی ہیں - حجت معجزہ و حجت ابتلا کی ترویج +
 پاپائے روم طریقہ اعتراف ستری کو جاری کرتا ہے - محکمہ احتساب عقاید کو اپنا
 آلہ اقتدار بناتا ہے - اور اختلافات عقاید کے رفع کرنے کے لئے وحشیانہ مظالم پر
 اتر آتا ہے +

قیصر جینین کج مجلہ قوانین کی دریافت اور قانون دینیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت
 و ماہیت شہادت پر - قانون شہادت میں درایت کی شان نمودار ہونے لگتی
 ہے +

اصلاح کینسہ کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے
 کا حق حاصل ہو جاتا ہے - کلیسائے رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار
 خود کلیسا ہے - فہرست کتب محررہ کے اجراء سے دن کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا
 ہے اور حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ برتھالومیو کے قتل
 عام کے سے ذرائع سے کرتا ہے +

پرنسٹن مذہب تواریک کو معیار حق تسلیم کرتا ہے - تواریک کی موثوقیت پر نظر انتقاد
 ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرف ہے +

سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں - پرنسٹن کے نزدیک یہ معیار کتب
 مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپائے معصوم اس کا مورد وہی ہے + صفحہ ۶۷۹

نواں باب

نزاع و ربارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ اتوفیق ربانی دوم بذریعہ قانون بشر
اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ ثانی کی ترویج کا مختصر بیان +

کہلوی قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر مبنی ہیں۔ پاپائے روم اس کی تعریف
کی تکفیر کرتا ہے۔ ذادنی فذخہ حرکات وحیل کی بنا ڈالتا ہے +

گللیلیہ علم تحریک الاجرام کے اصولی قوانین دریافت کرتا ہے۔ نیوٹن اجرام سماوی کی حرکات
کو ان قوانین کے حیز اطلاق میں لاکر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہند سائز جبر
کے ہاتھ میں ہے۔ ہرشل ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع فرمان ہے مسئلہ
ضبابیہ انجوم۔ اس پر متاہین کے اعتراضات +

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشو و نما سے سلسلہ بنائی و حیوانی تابع قانون ہے -
نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ ارتقاء ہوا ہے -

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے
بہم پہنچتا ہے +

اصلاح یافتہ کلیساؤں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کر لیتے
ہیں + صفحہ (۳۱۴)

دسواں باب

لاطینی مسیحیت اور نژدہ جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل و ادراک پر قبضہ
کئے رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے +

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینسہ کے وقت شہرِ روم کی حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوامِ یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جوار کھا ہوا تھا یعنی ایک طرف انہیں حکامِ دنیوی کی متابعت کرنی پڑتی تھی دوسری طرف حکامِ دینی کی۔ اہلِ یورپ جمالتِ اودام پرستی اور تکالیفِ دینیہ میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی و روحانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کردنیالوں کی انجمن اور کیوریا کی کارروائی۔ پاپائی خزانہ کے لئے بیشِ قرار محال کی ضرورت بد اخلاقی کی محرک ہوتی ہے جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہدِ حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے نشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ محض اتفاقی یا ضمنی تھے۔

۳۵۰

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجود زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا صاف

گیارہواں باب

سائنس کا تعلق تمدنِ جدید کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخِ امریکہ سے +
سائنس کا یورپ میں دخل ہونا۔ اسلامی سپین سے چل کر سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقر یونان میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ نشوونما پائی۔ چھاپہ بھری اسفار اور اصلاح کینسہ کا اثر۔ اطالوی مجالسِ علمی کا قیام +
سائنس کا عقلی اثر اس نے یورپ میں اور اک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی اسل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توضیح +
سائنس کا اقتصادی اثر ان بیشمار ایجادات متعلقہ فنِ جبرئیل و فنِ طبیعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز سے کی گئی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحتِ بدنی اور خانگی

زندگی اور نیز فنون رزم و بزم پر

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے + صفحہ ۳۹۱

بارہواں باب

خطرہ کی آمد آمد

مذہب کے بتلائے خطرہ ہونے کی قریب الوقوع علامات - کلیسا نے روماجو نصرانیت کا رکن رکین ہے ان علامات کو پہچان کر آنے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرنا ہے۔ پاپائے پائس تاسع مجلس عمومیہ مسیحیہ منعقد کرتا ہے مختلف دول یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ - کلیسا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصحیح مندرجہ مکتوب عمومی وٹیکن پاپائیت وٹیکن کونسل کے فتوے عصمت پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس - کونسل کے جملہ کا خلاصہ - حکومت پروشیا اور پاپائیت کی مٹ بھیڑ - یہ مقابلہ تفوق اور غلبہ کے حصول کے لئے دراصل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے - یورپ میں دو علی حکومت کا اثر - وٹیکن کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے - رومن کیتھولک مذہب کی تحکمانہ ساخت - خدا - الہام ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفات - اس کا سبب شرم تمدن جدید پر اس کی لے دے -

جماعت اتحاد انجیلیہ فرقہ پرستوں اور اس کے فیصلہ جات +

سابق الذکر فیصلہ جات و فتاویٰ پر ایک عام نظر - مسئلہ زیر بحث کی موجودہ و آئندہ صورت صفحہ ۴۳۸

ضمیمہ

اعلاط نامہ کتاب معرکہ مذہب و سائنس

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۵	مج	صحیح	۳۴۱	۱۶	قابل	قابل
۱۲۷	۱۵	کا	کی	۳۴۹	۵	کشتیں	کشتیں
۱۳۱	۱۰	ے	کے	۳۵۱	۱۸	جھنکار	جھنکار
۱۳۳	۱۹	چھو	چھو	۳۶۱	۱۹	اب	اب ہم
۱۴۶	۲۱	مقبولہ	مقبولہ	۳۶۴	۱	غلاظمان	غلاظتوں
۱۷۱	۱۳	واز	دراز	۱۶	۱۶	چھین	چھین لی
۱۷۸	۱۶	مراعت	مراعن	۳۶۸	۱۳	القدس	القدسی
۲۴۴	۲۰	دولاکہ جھین	دولاکہ جھین	۱۴	۱۴	لنٹن	لنٹیں
۲۵۴	۱۳	مناظر	مناظرہ	۱۴	۱۴	مضا	فضا
۲۷۷	۹	روایت	درایت	۳۷۱	۹	جاری	عاری
۲۸۰	۱۶	کے	سے	۳۷۶	۱۸	کلیسائی	کلیسا کی
۳۲۲	۲۰	بچانچہ	چنانچہ	۳۷۸	۱	اکتار	اکتار
۳۲۳	۳	زمین	زمین	۱۹	۱۹	کردیالوں	کردیالان
۳۲۹	۱۸	پرسے	پرسنے	۳۸۲	۹	چالیں	چالیں سال
۳۳۶	۶	صفائر	صفائر	۲۰	۲۰	زایم	زایم
۳۳۷	۴	ضابطہ الخوم	ضابطہ الخوم	۳۸۳	۱۵	سات	ساتھ
۳۴۰	۱۳	نودار	نودار نہیں	۳۸۴	۵	آرزو	آڑ
۳۴۱	۵	ہوتا ہو	ہوتا ہوا	۳۸۵	۱۶	ابرانی	عبرانی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸۵	۱۹	ابرانی	عبرانی	۴۲۴	۱۱	آتی	چلی آتی
۳۸۷	۲	چھاینوں	چھاوینوں	۴۲۵	۲	ڈبروں	ڈابروں
۳۸۸	۱۱	نشوونا	نشوونائے	۴۲۶	۶	ر	کر
۳۸۹	۱	مواخذہ	مواخذہ	۴۲۷	۲۰	کانیس	کارنیں
۳۹۰	۱۸	رین	کہ رومین	۴۲۸	۳	شریبہ	اشربہ
۳۹۱	۹	پورپین	یورپین	۴۲۹	۲	ذرایعہ	ذرائع
۳۹۲	۱	انتباع	انتباہ	۴۳۰	۱۵	مروج	مزج
۳۹۳	۶	برفیٹر	بہ فیٹر	۴۳۱	۱۵	سابقہ	سابقہ
۳۹۴	۲۰	جنسی	جنس	۴۳۲	۱	۶۱۶۶	۶۱۶۶
۴۰۱	۱۵	طرف	طرح	۴۳۳	۱۲	اتحاد	الحاد
۴۰۲	۳	خوزیر	خوزیز	۴۳۴	۱۱	کھربائی	کھربائی
۴۰۸	۱۴	مصر	عصر	۴۳۵	۱۲	ایوان	الوان
۴۱۰	۱۹	تاریخی	یہ تاریخی	۴۳۶	۱۳	کیبہا	کیبیا
۴۱۱	۱۱	تحکم	تحکیم	۴۳۷	۱۴	تثلثہ	ثلثہ
۴۱۲	۱۷	تغییرات	تغییرات	۴۳۸	۱۵	کے	کئے
۴۱۳	۷	جو	کہ جو	۴۳۹	۱۶	جواجو	جوا
۴۱۴	۱۴	کئی	گئی	۴۴۰	۱۸	مے	نئے
۴۱۷	۸	ارض کے	ارض کی کیفیت	۴۴۱	۱۶	انسداد	انسان
۴۲۲	۴	سیح اسیرل	سیح اسیرل	۴۴۲	۴	جو چھاڑ	بوچھاڑ
۴۲۳	۱۵	نہایت	ہی	۴۴۳	۸	ناموری	نامور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴۴	۱۶	جھکے	جھکے	۴۵۴	۱۰	تغزیری	تغزیری
۴۵۰	۳	غ	غیر	۴۵۶	۴	پر فلج	پر اس فلج
۴۵۱	۱۱	جزیات	جزیات	۱۳	۱۳	رعم	رغم
۴۵۲	۱۰	خاج ار	خاج از	۱۱	۱۱	جس	روس جس
۴۵۳	۲۱	دیکھ کر	دیکھ کر کہ	۰	۰	۰	۰

مکرر

۴	۱۲	کرنے	کرنے کے	۲۱۵	۵	پنچتی	پنچی
۷۳	۱۷	تثیت	تثیث	۲۲۰	۲۰	بتانی	البتانی
۷۲	۱۸	بت برستی	بت پرستی	۲۲۳	۱۷	بلکہ	ملکہ
۸۱	۳	کامل	کاحل	۲۲۴	۱	اٹھایا	اٹھایا
۱۰۸	۱۸	آزینی	آفرینی	۲۲۷	۱۹	۲۲۸	۲۲۶
۱۰۸	۱۹	عرب کا	عرب	۲۵۱	۱۷	دہریہ	دہریہ
۱۱۳	۴	آپ کی	اپنی	۲۵۴	۲۱	خیالی	خیالی
۱۲۸	۲۰	کچی	کھچی	۲۶۵	۶	بے ریڑھ	بے ریڑھ
۱۵۷	۱۰	الحاج	الحاج	۲۷۲	۱	تقی	تقی
۱۶۲	۱۷	دارتھا	دارتھی	۲۹۵	۱۵	اور امرا	امرا
۱۶۸	۱۰	جیب ستوی	اوتار	۳۱۲	۴	اُن	اُس
۱۶۸	۱۰	اوتار	جیب ستوی	۳۳۶	۱۴	معلوم	معلوم ہو
۱۸۵	۴	کیا جا	کیا جاتا	۳۳۷	۱۳	زبانوں	زمانوں

مقدمہ

کتاب معرکہ مذہب و سائنس

رقمزن جناب مولوی عبدالحق صاحب - بی۔ اے۔ - (علیگ)

سکرٹری انجمن اُردو و حیدرآباد دکن

۱

جن لوگوں نے فردوسی کی زنب کتاب شاپنا مہ کو پڑھا ہے انہیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آماں جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پُرالم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی +

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے ناسور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے مصنف کا زور قلم اور تجسس شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا

دیر یا کوڑے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یوں نہیں ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ پکڑ اور دنگ میں رہے گا؟ کیا وہ یوں نہیں اندھیرے میں ٹامک ٹٹیاں مارتا رہے گا۔ اور فوراً کبھی نہ پوچھے گا؟ رستم و شہر اب کے حال سے تین شخص واقف تھے ایک شہر اب کا ماموں ژنن، رزم جسے اُس کی ماں نے اسی غرض سے اُس کے ساتھ کر دیا تھا۔ دوسرا ہجیر تیسرا کیا تو اُس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا حقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا طح طح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اُس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قوتیں ہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت مخالفت حق اور نفسانیت لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی حق کا بول بالا ہو گا۔ دونوں مخالف ایک دوسرے کو جانیں اور پہچانیں گے ظلمت کا پرچہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی سے۔ رنج راحت سے۔ اور رٹہ بکڑی کا ڈی سے مبدل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشمکش اور ابھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اسے ہم آگے بیان کرینگے۔

اس میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یاد رکھئے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی شکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو میں بے بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو حقیقت قابل مبارکبادیں اس شکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اُسی سے ہو سکتا ہے جس نے قلم میں اس قدر زور و ادب سے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل ترجمہ کا

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں اس کا ہاتھ پاؤں مارنا غوں
 غاں کرنا۔ ڈر سے سم جانا۔ پیار کرنے سے ہلک کر آنا۔ ماں کی محبت۔ خیروں سے وحشت۔
 غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوی کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قوی اونے حالت میں
 ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے۔
 اور اعلیٰ دماغی قوی کے نشو و نما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوت
 بڑھ جاتی ہے اور حسی غدود اعصابی کی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ یہ
 حالت جوانی دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی۔ احساس اور
 خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔
 لہذا انسان کی نشو و نما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی۔ احساسی اور عقلی۔

قوة الحيوانية کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر
 اُسے اپنے افعال۔ جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی
 ورزش (یعنی اعصابی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کی
 وجہ سے آدمی فصال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے
 لئے ہمیں غذائی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے انجن کو ایندھن کی۔ یہی ایندھن یا غذا اعضا
 یا اعصابی ایشیہ میں بدل جاتی ہے جب ہماری قوت صرف ہوتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن
 حساب پورا کرنے کے لئے ایندھن طلب کرتا ہے۔ اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق جائیگا
 اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوة الحيوانية قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی حسی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی
 ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو و نما اور اس کے انتقال
 سے اپنی نسل کے نمونے میں صرف کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا

کی تلاش گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل صرف کر سکتا ہے اور چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جاذبوں سے ملتی جلتی ہے۔ بہت جیسی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اسے وہ عضلات، گوشت اور خون کے بنائے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی شکل کو بڑھائے تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے۔ اور وہ خون کی نہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکسا پیدا ہوتا ہے اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تغلیف گہری ہو جاتی ہے۔ اور اکساؤں کے لئے زیادہ گنجائش مل آتی ہے جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلہ کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پسینہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغی و رزش سے خیالات پیدا ہوئے ہیں۔ اور وہ دماغ میں رہتے ہیں۔ اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لئے بہت سا حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح منتشر ہوتی ہے +

صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر جس کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں جس طرح برف آس پاس کی اشیاء سے ایک مقدار حرارت کی جذبہ کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے۔ اور جب برف پانی کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد۔ سیلان

اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی لپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں۔ اور پیچھے کی طرف پھٹنا و تشکبہ پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت و مافی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو دماغ سے دُور (جوف طبل) میں توجہ پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا کو بخیتی ہیں۔ اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے تبدیل ہو جاتی ہیں +

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اس صدمے کی قوت کو جو مریخی کی شعاعوں سے تشکبہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر ہوتی ہے جس طرح کہ سوچ کی قوت کو تلے کی تھون میں مستتر ہوتی ہے۔ اور اُس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سُرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں جا کر خیال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منفعلاً میں رہتی ہے +

جہاں اور اک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ ماورِ زاد اندھے کے دماغ میں سُرخ کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سُرخ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عالم خیال اور عالم مادی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے +

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا سنا سو گھمایا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے +

عالم خیال یا دو اشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یا دو اشتین اور اکا کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے۔ جب ایک عصور کوئی تصویر بنارہا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستقر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل فطری ہوتا ہے۔ جسے تیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے بعض سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شامل سل رہتا ہے۔ اور اک عقل کا دروازہ ہے۔ احساس علم ہے۔ بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے چل ہوتا ہے۔ اور اک میں یہ اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توفیق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جو نہیں کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اس کا واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچتے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے مثلاً میں نے ایک شے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دار الخلافہ ہے۔ اور اسی کی وجہ سے انسان و حیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ

اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بنسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے پھیل یا گوند کی زندگی کا انحصار اُس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لئے اُس کی قوت حیوانیہ بنسبت دماغ کے جسم پر زیادہ صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقلی پر ہے اور اس لئے اس کی قوت حیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوت حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے یعنی قوت حیوانیہ دماغی مادہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابلِ وقت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیزیں ہیں۔ لہذا اب ہم اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے سنج و راحت کا حسا نہیں کے ماتحت میں ہے بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں کہ ایسا ڈھنگ نکال کہ اُن خوشگوار اثرات کا پھر اعانہ ہو سکے لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ اُن کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر کُلف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ بال بچوں

عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطف محبت ہو۔ شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو قنن لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشوونما انسان کی ہمدردی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقلی کی نشوونما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے مثلاً خواہش کا رنجان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔ جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آجاتا ہے۔ ایک خبیث بد باطن کے ہرے کو دیکھتے کیسی پھٹکا رہی ہے بخلاف اس کے ایک نیک نفس زلف دل کے ہرے کو ملاحظہ کیجئے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنا نہ ہے دوسری مردانہ اگر صرف عقل ہی کی نشوونما اور ترقی زیادہ ہوگی تو جذبات محدود اور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی احمس اور ہرولعزیز اور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لئے۔

عقل انسان میں شخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات مدینیت اور انس۔ بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے۔ اور بحیثیت جذبات کے وہ منعقد اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے۔ اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لئے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدگی ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیاء قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے دماغی قویٰ اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیرِ حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن۔ پالیٹکس اور اتحاد و مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت جبوری کو دماغی اور احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔

حیات کے دو مقصد ہیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل +
 قوت کے انجذاب کے لئے ضرور ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے۔ اور اس غرض
 سے کہ وہ مانع اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لئے ضرور ہے کہ اس
 میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضا اونے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے۔ اور
 جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی ہے وہاں زیادہ ہوتی ہے +
 بقول لب نثر کے حیات حجرات میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور
 انسان میں جاگتی ہے +

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زخم رہنے بڑھنے اور نسل کے بڑھانے
 کا۔ نیز طبعی تیز ہونی چاہئے جس کے ذریعہ سے وہ سمجھے کہ کیونکہ زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی
 چاہئے۔ بغیر اس تیز کے ترقی حیات کے لئے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا
 ممکن ہے۔ اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں
 ہو سکتا +

تیز طبعی افزائش اور نشوونما کا ہیما نہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور
 پر ہے کہ حیات کے ان دو مقاصد کے لئے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن
 ہے کہ اس کی قوت ایسی شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی
 اور قوت کی تولید ضایع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشوونما کے لئے روشنی کی ضرورت
 ہے۔ اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے
 حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں
 مل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھا نا شروع ہو گا۔
 اور مر جائے گا +

پودے کی نشوونما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ میں۔ وہ اُسے کچھ تو اُس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے *
 حیوانی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں۔ بلکہ دو پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے کے لئے اُسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہذا وہ اُسے دی گئی ہے +

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوئی ہے جو پودوں میں نہیں یعنی خوشی کا احساس۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کمال نشوونما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے مگر اُسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کرے گا اور اس طرح اُس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا +

جو اس ارادہ کو اُسکاتے اور تیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنے والا ہے چھوٹا پنڈ اندھے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہے بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نکلنے کے لئے غل توڑتا ہے۔ اور باہر نکلنے ہی دانہ چننے کے لئے چونچ کھولتا ہے۔ قید کی جس نے اُس کے ارادہ کو ابھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئی اور غل ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تیز طبعی کا کام تھا۔ تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ کون سے ایسے محسوس توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی امتیاز نے اس کی چونچ کھلوائی۔ یہ تھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے تیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لئے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب

اس کی پہلی کوشش ہے کہ تجربہ نے اُسے یہ بتایا ہے کہ مُنہ اور گلے کے ذریعہ سے دودھ کا پینا اُس کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہ تمیز طبعی ہے جس نے اُسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اُس کی بھوک احساسِ رفعِ ہولہ

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اس کے حیوانی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے ارد گرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشوونما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اُسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔ نظامِ اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تمام جسم پر حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک باریک اعصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب ملی ہوتی ہیں۔ سب سے بیرونی عصبہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں۔ اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات پر سے کام نہیں کرتے ہیں۔ سو اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائشِ نسل۔ انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے۔ دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں۔ فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً آج کے بال یا پر یا غل ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے اس قدر بہت تیز ہے۔ اور تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے نگہانکا آتا ہے لہذا اسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لئے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی ہے جو دیگر حیوانات کی تمیز طبعی سے اعلیٰ ہے۔

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لئے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اُس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اور یہ قوت اس

ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے +

بھیر مادہ اور قوت کو غذا کے ذریعہ سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اُفنی کی شکل میں مادہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں یہی مادہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے۔ جو اُسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے +

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصے کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہمیں رنگوں کے تناسب حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اُس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں۔ احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جانا ہے۔ انسان ایسی اشیاء سے بچہ دسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنہیں اُس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دُنہنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اُس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں لوری یا گانا سننے سے انہیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں +

انسان کی ساخت میں حصہ سفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلیٰ میں روحانی

آلات حصہ اسفل کو باضمہ اور توالد سے تعلق ہے اور حصہ اعلا قوت حاصل کرنے کا آرد ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے حصہ اعلا میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی بھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیاں تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ محنت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذرات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بننے بند ہو جاتے ہیں۔ لہذا جس قدر دماغی محنت کی جاتگی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہوگی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر ان ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب تو فطرت حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی اس وقت وہ مسرت جو حصول علم۔ ورزش عقل۔ احساس حسن وغیرہ سے ہو سکتی ہے۔ زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر بیحد زور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو ان چیزوں سے حاصل ہوتا ہے جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے۔ اور فطرت حیوانی کمزور ہو جاتی ہے۔

رنج و راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ حقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے۔ چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے اُسے نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اُسے کچھ لطف نہ آئے گا۔ کیونکہ اُس کے

دیباغ میں کوئی شے اُسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اُس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور ٹل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت ہے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی قوت والد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اُس کے خیالات ننھے ننھے جتھے جو ڈال دیتے گئے میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ اُن بچوں نے میرے دیباغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی تحلیل نسلاً بعد نسل پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے انہیں تغیر تبدیل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب اُن اصلی خیالات کی زنجیرِ اولاد ہیں جو اُس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوتِ مہی کے تغیر و تبدل سے روشنی حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دیباغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوتِ افعالِ مادہ اور اک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے۔ اور ہم اُس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اُس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی روحانی زندگی میں بھی رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کو جذب ہوئی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشو و نما پاتی ہے۔

مقصود حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی فروتنی

روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشوونما ہے جسم میں قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشوونما ہوتی ہے۔ حیات کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشوونما پاسکتی ہے۔ ہر دخت اور جوان کی نشوونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں جاری ہے۔ وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولیٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہئے۔ اس خیال کی بنا پر بنی نفع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربہ اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اور آئندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئندہ ترقی پر ہونا چاہئے۔ اور نیکی اور بڑائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نفع انسان کی بہبودی یا مضرت متصور ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے ہر قوارہ ضعیف اور بعض افراد بہتر ہیں۔ مہذب ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ کیونکہ سامنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انہیں پھیلاتا اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں از روئے انتخاب فطری ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مہذب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا۔ اور اس لئے قوم میں انحطاط

پیدا ہو جاتا ہے +

سب سے اونے جان داروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغت تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے غریب لوگ جنہیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے ان کے کثر سے بال بچے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے +

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کاریں ہے۔ غیر تمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا۔ وہ اب میں شخص کرتے ہیں۔ پہلے ایک ہی شخص کو بڑھئی۔ دزدی۔ موچی۔ معمار۔ ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھئی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں۔ اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو لے گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو ایک ہی پیشہ کی کئی شاخیں ہوئیں اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگے۔ اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے۔ چوتھا اُسے صیغہ کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا حقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے انسان یہاں کچھ ایسے بکھیڑوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اُس کی خوشی کا دار و مدار زیادہ تر اُس کی فائست پر ہے۔ اُسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ اُسے دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا دردیں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلیٰ درجہ کی تمدن

نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مذہب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ مثلاً لندن پیرس۔ چکاگو۔ نیویارک میں جو شہم و چراغ عالم کھلائے ہیں۔ وہاں امر خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ فقر و قلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہذا محض تمدنی و پولیٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔ اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے۔ اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک لیگا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہوگا۔ اُن قومی اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے میسر کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی ذاتی نشوونما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی نشوونما کے لئے ضروری نہیں ہے پس وہ چیزیں جن کے لئے انسان کی حیوانی فطرت خواہشمند ہے ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت موڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے + انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔

جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے تہنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً ہر طریقہ کو رشتہ معصوم پر قائم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پامال کر دیتا ہے تو اس طریقہ کو رشتہ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعہ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور اُسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

۴

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی چونچ ہے۔ دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیاء کا اثر جو اس کے ذریعہ سے یعنی جس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگر کسی میں کوئی جس نہیں تو اس جس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم حاصل کرتا ہے۔ یہ سرت۔ غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آسکتے گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم

ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدائیں انہیں چل کرتا ہے +

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اُسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم اخلاق کا مطالعہ بیکار ہوگا +

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اولیٰ کہلاتی ہے۔ اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے اُسے علت ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علت ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً علل ثانیہ کے سلسلہ میں اُس مصدر حرکت کو ٹھولتا ہے۔ جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولیٰ کہتا ہے +

علت کا خیال مفروض نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اُس تعلق کا جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگر ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اُسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم اُن تمام اشیاء کو جو نہیں الگ کر دیں۔ نیز ہم یہ فرض کر لیں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے جو اس کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اُس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے بالکل ناقابل

تصور ہوگی ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔
 جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اسے اس حالت کے پیدا کرنے کے
 لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ
 ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلہ علت و معلول سے انکار کرتے
 ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں بہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں +
 کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اُس واقعہ سے متعلق کرتا ہے
 جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے۔ چاند کی تبدیلی اور بوج کی
 ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو بوج کی مدد کا باعث قرار دیا لیکن
 یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کسی میٹھی بوج کی مدد جو ز کی تعلق ہے +

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل
 نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا
 خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا۔ دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا
 کہ رات دن کی علت یا سبب ہے +

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور بچہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح
 احساس تیر طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ
 وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے
 لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے۔ اس طرح قوت کا خیال تو ہم
 میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے +

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلا ہستی کی ترقی کے لئے
 بھی ضروری ہے۔ جو ان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کو آ

تجربہ سے بندوق دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلے تو مجھے چوٹ لگے گی یا مہ جاؤں گا۔ لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لئے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربہ نے اسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا اسی قدر اُسے ترقی ہوگی۔ حیوان جو حل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اُسی حالت میں ہے +

اُدئے سے اُدئے دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس میں قوت ہے اور اس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گونا گونا گوارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رککا ہم چلنے سے رک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اُس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں۔ اُس کا یہ خیال کہ اُس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے +

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اُس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے جس پر اُسے کوئی قدرت نہیں۔ جو اُس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اُس سے زیادہ قوی ہے +

انسان میں خواستے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت

میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اُسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھنا ہے جو اُس سے باہر ہے اور اسی قسم کی جیسی اُس میں ہے۔ ایک اونے عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنسنے کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے سمجھ قوی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خود راہِ حتمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے +

بصرہ ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے۔ لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا غریبی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہی حالت چشم بصیرت کی ہے بعض معلومات کے ذریعہ سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں لیکن اونے اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت اونے کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے +

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اُس نے جو اُس قوت کو جو نہ چہر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کی مثل سمجھا تو اُس کا ایسا سمجھنا جائز ہے۔ جب اُس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت مختار سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں۔ اور درختوں دریاؤں پہاڑوں بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علت اعلیٰ ہر جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے + اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانہ کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغریٰ کبریٰ سے ایک ہی نتیجہ پہنچی ہیں الہام انسان کی ذات اور اصول علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر فاعلی عقل پہ ہوتا ہے +

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے +

حجریات و نباتات و حیوانات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیاء میں سے اُسی سے ملتی یا اُسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ارد گرد کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور ان کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیاوی ترکیب کو دیکھئے بہرہ دہ دوسری سے گھل ل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزا اور اسی قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیر مادی کبھی تو وہ اُن چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور مادی نشوونما کے لئے مفید ہیں۔ اور کبھی وہ اشیاء جو خواہ حصہ غیر مادی کی نشوونما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اُس میں یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اُس کی قوت انتخاب دونوں ڈول رہتی ہے کبھی قوی اُن چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں۔ اور کبھی اُن اشیاء کی طرف جو اُس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع ہے۔ جدھر زیادہ زور ہوتا ہے اُدھر ہی کھچ جاتا ہے۔ ایک طعہ پھلیاں دو کشش آپس میں ہے۔ انسان میں یہ تخالف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تمیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔ لیکن اُس میں جو دوسری قوت ہے وہ اُسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں اُس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے +

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح ادراک

غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیاء یا احاسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیاء انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تیز طبعی اعلیٰ خیال کرتی تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرف متوجہ کر کے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت اونے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کر کے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ جس شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج ٹھک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اور چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ اپنی سماعت اور اجازت کو بلا قید مکان و زمان اُن غیر مادی صورت تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اثری ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے شمل پہنچ جاتا ہے جس سے رستے پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ لیکن چونکہ وہ کسی منہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے +

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے۔ اور اُس کمال کا ایک رخ دیکھتا ہے جو ان تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس و قزح کی حسن سے کم نہ ہو +

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا جن کا نیکی کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے جینال علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ بھٹکا ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علت انتہائی میں وہ اپنے تمام اور اکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادرِ علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے + کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بڑی ہوتی۔ اُسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک رُوح ہے جو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربہ سے اُسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصور ہوتے نہ منفی +

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے

ہے۔ اور محبت کا جذبات سے عقل چاہتی ہے کہ سب میری تابع ہوں اور میرے اشار پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب و حقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علتِ علیٰ کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوت انتخاب کی مدد سے وہ ایک منہتائے خیال کا تصور کرتا ہے۔ اور یہ منہتائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔ جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں۔ وہ فلسفہ ہے۔ اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک نا واجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں۔ ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہیے اور عقلی پرداز کی اصلاح جذبات سے۔ علتِ العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش۔ دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام مخلوق کی علت ہے۔ اور آریا اقوام نے اُن قوتوں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اس جھگڑے کو مار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی کھیسڑوں میں پڑ گئے۔

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اُس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہونگے نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی۔ اس کے محدود حالات اُس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہے گا ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے کہ سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پُرانے خیال کو بدل دے۔ لیکن وہ عقیدہ جو امٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت قفس کی سی ہے۔ پیر فرقت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پُرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے پہرہ کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کرے گا اور اعلیٰ کرے گا اور آئینہ نسلوں کے حوالہ کر جائے گا۔ قرن در قرن اور صدی در صدی یہ کام پونہیں جاری رہے گا حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تحائف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدا

آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں +

ایک انگریز لڑکے کے ایک جاہل مسلمان ایک معمولی ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھنے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے جوابات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تین ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو مثلاً میکڈانڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریکینائیں" لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ "کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں۔ اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے" اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ ہر برٹا سپنر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے۔ اگرچہ اُس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اُسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں، وحشوں، جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکا یا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اُس سے بادل کی گج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کر لیا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور بہتے دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے جھکا یا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو جھاگ جاتے تھپ جاتے۔ لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازیلی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے۔ لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال اُن بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے تھیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں بھی بلکہ امداد وغیرہ صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ سے یہاں تک رسائی کی ہے۔ اور اُن میں خدا کا خیال اور روح و جسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آ رہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پرست سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مختلف مرحلوں کے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اہل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول تمام ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سُرِ باغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارثاً ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

۶

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفہ حال و قدیم کا دعوئے ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں ہی واقع ہوگا۔ یہ ماننا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربہ سے؟ تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی

پائی جاتی ہے !

یہ ہم کس لئے مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے ؟

بوجہ تجربہ کے !

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے ؟

اس لئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے !

اسی طرح استدلال کرتے جانیے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دار و مدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اس شے سے جو تجربہ میں نہیں آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اسے ثابت نہیں کیا تھا +

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا کیونکہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے +

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوت ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں +

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دار و مدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں +

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کرتا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں " اس منطق سے باہر ہے۔ کیونکہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں۔ اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کرتا ہوں یا نہیں یا ارادہ کرتا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لئے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے ہوش پا کر لے لے اور یہی شکوک ہیں جو رُوح کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شے غیر مادی نہیں۔ ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو اس کی رپورٹ مستقبل ہے اور جو اس کے تابع نہیں۔ لیکن جب جو اس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ جو اس او عقل منکر اور ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں +

ممکن ہے کہ مادیوں کہیں کہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے ؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا ؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور ان سے پہلے اور اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام

نفع انسان یہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں میں خیال کرتا ہوں میں کرتا ہوں۔ میں اپنے گرد اوروں میں بھی انہیں تین چیزوں کو پاتا ہوں۔ لیکن ان میں سے کوئی یا سب مل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سبب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں مل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کہ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے۔ آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادی سے! ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں۔ اور یہ تمام قوتیں ظور میں اُس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

۷

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالہ (جزو میفرطیسی) میں سلسل غور و فکر ہے۔ اُس میں

جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اُس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن یا ہیڈروجن کا لٹا
 جزو دیمقراطیسی (معرفت طبعی) کا نشس (نس) چل کرتے ہی چل دیتا ہے؟ اور کیا آنے والا
 جزو دیمقراطیسی آنے ہی معرفت طبعی چل کر لیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے
 جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے۔ اور جس کا ان سالمات کی سلسلہ کو فوٹ
 پر عمل ہے۔ اور ادراک جس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے۔ اور جو روح کہلاتی
 ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے چل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہوتی
 ہے۔ لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر
 مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر ان اعصاب اور ریشوں
 سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی
 کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام
 ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت
 پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اعصاب اور دماغی اعضا اور اسکے تابع اور کارکن
 ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علم فریالوجی (علم کا سر جس کی
 نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور ہریت کی طرف مائل کرتا ہے اس پر اگر اس پہلو
 سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مشرک ٹراپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر
 کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اُس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ بیہوش
 میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ
 اُس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک
 آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زہادہ زور سے لگے تو وہ مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اُس
 میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کانشس نس)

حاصل کرتا ہے؟ حوٹری سی ضربے۔ وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آ جاتا ہے۔ زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام گڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر کوشش ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے مستراح علمائے سائنس کہتا ہے اور جو عین اسی زمانہ میں جیک ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (ایجن آف ہیمنز) لکھ رہا تھا۔ اپنی اپنی تحقیقات سے انہیں نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ ڈارون کے پاس رائل سوسائٹی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون دنگ ہو گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ہیں یقین دلاتا ہے کہ کبھی اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام علمین نے ایسے واقعات جو بہت سے اوسط درجہ کے ایماندار اور توہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔

چنانچہ اس فاضل جھرنے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کی اور بعد کمال غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اُس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر فوئل سر جان فوربس اور ڈاکٹر کارنبر اور دیگر علمائے بعد تحقیق کے اس کی اصلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے۔ اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور مٹھی اڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اُس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو اس امر

کی تحقیق کے لئے میٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایسی ہی ترقی جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس دان تھے ۔

۸

انسان جو اپنے شمس اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لئے ہے جس نے اپنی بساط سے زیان قدم مارا ہے اور اسرار عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز نئی اور پر اسرار معلوم ہوگی اور ایک فنے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی پیچیدہ پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت سے۔ جب ہم اس کرپہ نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حامی نہیں ہیں لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگان کے مقابلہ میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشو و نما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے اور بننے میں صرف ہو لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے زمانہ نشو و نما سے کیا جائے تو بہت ہی لمبے ہے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لمحہ کے برابر ہے اور ابد الابد کے مقابلہ میں ہیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے اس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صبح رائے قائم ہو سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرد ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس آتشین مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہونگے۔ جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے سے کرہ کی حالت درست ہونے میں اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہئے

کہ ان کروں کے لئے جو اس سے سینکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عمدہ درکار ہوا ہوگا۔ جب انسان پر سوچتا ہے کہ سبوح سے بھی بڑے بڑے ستارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اور اور ان کے بعد اور اور یہ سلسلہ نامتناہی یونہی چلا جاتا ہے تو خلائے بسیط کا خیال حد و ہم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ زمانہ کا خیال کرتا ہے کہ ایک ادنیٰ اور حقیر کوس کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانے کس ترتیب اور قاعدے سے برابر چل رہے ہیں اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و دہم میں نہیں سماسکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جن کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گاس مچتی ہے جنہیں "ضبابہ" کہیں گے۔ یہ ضبابہ نظام شمسی کے احاطہ کشش کے اندر آکر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور شمس ہیں ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو ہمہ ہو کر بڑے بڑے ثابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں، ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے

عالم سیارگاہ میں منتشر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سبے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی سمت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت ماضی کی تھی؟ یہ مادہ جو ابتدائیں باطل سادہ اور اجزائے لاینفک کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کہے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی جزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہمیں ان قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہو گا جن کے زور سے یہ اجزائے مادہ اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوئے اس سادہ سے سادہ قوتیں کہاں سے انھیں پیدا ہوا؟ یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ پراسرار قوت ثقل کہاں سے آئی؟ جو غیر محدود و غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لاینفک مسائل اینٹریں ہیں۔ ایٹر کیا ہے اور مادہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ایٹر میں کیکیا ہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی۔ الکڑشن کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہشت۔ حرکات سالمات اور مادہ کی ان سبے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشوونما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً نہ کبھی ہو۔

قدیم سے قدیم نظریہ مادہ سے لیکر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں ہی خیال سوالات پیدا ہوتے ہیں اور کوئی اس کائنات کی علت العلل کے قریب نہیں پہنچتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہر برٹ سپنسر تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ناقابل دریافت قوت کے ظہور کا ادراک ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامہ دہرنے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا ”ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہ خیال کے پڑ جلتے ہیں جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر محقق دست سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیق بیچ و بیک حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اور پھر اس خلا سے بیٹھ کا خیال جس کے مقابلہ میں ہمارے

بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کچھ
عرصے سے یہ طبعی اور اک کہ یہ غیر محدود ظاہر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود
ہے گا۔ میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سمجھانا ہوگا

۹

مادین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گنتی سمجھانے کے
لئے کافی ہے۔ روحانی یا آتشی اثر سب فنا ہے۔ دیا قریب سے لے کر اس وقت تک
اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی
قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علوم طبیعیات کو
اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیاء اور مظاہر کی کنہ
اور یافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیا وی
تعمیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کسی ہی تبدیلی اس میں کیوں
نہ واقع ہو جائے نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علم طبیعیات کی
رو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل و صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات
اختیار کر لے وہ نہ قوت ہو سکتی ہے اور نہ پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے
مرکبات ترتیب دیے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور
آخر بڑے بڑے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے ویمقراطیسی قائم ہوا اور سب سے آخر
نظریہ اجزائے لایچر نے۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت
کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا
باعث ہے ؟ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے ؟
اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک
دخل ہوتا ہے۔ اور ان کا باہمی کیا تعلق ہے ؟ دوسرے اگر کوئی منظر ایسا ہے جو مادے

سے باطل آزاد ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم کسی مظہر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہے۔ اس کے ہم چند اسباب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں نہیں؟ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہو۔ جواب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یورنیس دریافت ہوا۔ تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سوج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سوج کی اور بعض اور چھوٹے سیاروں کی کشش جو یورنیس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سوج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہونے ہو غلاں مقام پر کوئی اور ستارہ یورنیس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے چنانچہ بعد میں اس مقام پر دورین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب بچوں کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور شے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خلج ہے؟ پس اگر کوئی ایسی شے ہے تو یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور سے

یہ ہوگی +

۱۔ قوت۔ جو حرکت۔ اتصال اجزائے لایتجزئے اور کشش کی یاد دی سے ظاہر ہوتی ہے *

۲۔ حیات۔ حیوانی یا نباتی +

۳۔ قوت۔ مدرک

۴۔ اوراک طبعی (کانشس نس)

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً محبت رحم وغیرہ

ہماری سب سے اول تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مندرجہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ اُن کا باعث نہ ہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور نبات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں سوائے مادہ کے تعلق کے کسی اور طرح نہیں جانتے اب رہی قوت مدرک اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مان سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے۔ اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرک کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعال اوراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لایتجزئے کی حرکت سے ہے۔ اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہیں کہیں نظر نہیں آتی +

مگر اس میں شک نہیں کہ اوراک طبعی (کانشس نس) یعنی خالص قوت مدرک کا قوت مدرک پر غور کرنے کا فعل مادہ سے باطل ہے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مان سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اوراک طبعی (کانشس نس) کو اُن دیگر اوراکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لایتجزئے سے ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور

دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مان کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ مظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و دافی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شے ہے جو اس کا تکمیل کرتی ہے ؟

شائد یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہر حال یہ باور کرنا چاہئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرک کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مان کا وجود خود قوت مدرک کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہئے اور قوت مدرک کے نتائج کا اعتبار نہ کرنا چاہئے انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوت مدرک سے ہے جو حواس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اس کے فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کا اشارہ پر کفایت کرتا ہوں۔

مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے اب تک تسلیم کی گئی ہیں ٹھوس جیسے برف سیال جیسے پانی اور دھانی جیسے آکسیجن یا ہائیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی اضافہ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے ؟

مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لایتجزئے سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جن میں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لایتجزئے کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دیگر ایسی کسی نہ کسی کیبیادی عنصر کے ایک یا ایک سے زائد اجزائے لایتجزئے سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے

اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیادوی اتصال کے قوانین کی رو سے عمل میں آتا ہے +

یہ اجزائے لایتجزے اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا ہے اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طبع استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے جیسے روح کا ہے جنہ لایتجزے میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں +
اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لایتجزے - یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزو لایتجزے سے بڑی ہے مجتمع رکھتی ہے - یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ - حالت سیال میں کم اور حالت دھانی میں بالکل نہیں ہوتی +

دوئم - یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لایتجزے ایک انتعاشی حرکت سے بچپن رہتا ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس سیال دھانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں +

سوم - ہر جزو لایتجزے میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے - بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لایتجزے کی دوسرے حصہ پر - مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جائے - اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی جاتی ہے +

چہارم ہر شے کے اجزائے لایتجزے ایک ہی جسامت کے خیال کئے گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جسامت کے اجزائے لایتجزے سے بنی ہوں ناممکن ہے +

اس سے مفصل ذیل نتائج نکلے ہیں :-

۱۔ ایک شے کے اجزائے لایتجزئے باطل ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ مگر دوسری
اشیا کے اجزائے مختلف ہوتے ہیں +

۲۔ مختلف اشیاء کے اجزائے لایتجزئے جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور ان
میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی +

۳۔ ایک شے کے اجزائے لایتجزئے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور
اسی لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے +

۴۔ کسی جزو لایتجزئے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی +
ان کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف
کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لایتجزئے کا (جو مان کے متعلق جدید نظریہ ہے)
صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں
سے ایک جزو لایتجزئے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جہز مادہ کا ہے جس میں
تمام صفات و خواص مان کے موجود ہیں۔ یا تو یہ سادہ یعنی مفرد ہے جیسے آکسیجن
کا جزو لایتجزئے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے دیہی و قریبی ہائیڈروجن
کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو دیہی و قریبی ایک مرکب شے
ہے کیونکہ از روئے علم کیسا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیا ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت
میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی (بشرطیکہ وہ ترکیب
پاسکے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہیں
اور بعض کو رو کر دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بوجہ کیما دی کشش و اندفاع
الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لایتجزئے اور اجزائے دیہی و قریبی دونوں کو
دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالہ نہیں پایا جاتا بلکہ ساتھ ستر اشیا
ایسی ہیں جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بیشمار

ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لائیجر کے گدام کے لائق ہے۔ جنہاں جڑنے
 کیماوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبعیات کی روت سے بھی
 مرکب ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنی اس
 کے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصے پر جس سے کہ اس پاس کے ایش میں روشنی پیدا
 ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لائیجر میں مختلف ہوتی ہے۔ لہذا
 اجزائے لائیجر کے اصل مسالانہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی
 گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے +

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لائیجر نے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور
 مفرد عناصر جن سے اجزائے لائیجر بنے ہیں لیکن کہیں اصل مسالاجو تمام اشیاء
 کی اصل ہے نہیں ملا۔ مگر باوجود اس کے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب عقل و حکمت
 کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں +

یہ ہے وہ مادی جسے عالم علوم طبعیات و کیما تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔
 اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبعی اجزائے لائیجر سے وہ صفات منسوب کرتا ہے۔
 جن کا وجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لائیجر نے اس میں نہیں کیونکہ اس نے اسے
 کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لئے اس کا خیال
 ہے کہ یہ صفات اجزائے لائیجر ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم
 کیما اجزائے ذیقرطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اسے معلوم
 ہے لیکن اجزائے ذیقرطیسی میں نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک جزو ذیقرطیسی کا
 تجربہ کا نہیں کیا بلکہ انہیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا وہ مادی ڈروجن کے
 جزو ذیقرطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے
 جسے وہ درحقیقت مادی ڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے۔ طبعیات

وکیما کے واقعات اجزائے لایتجزائے و میقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں اور اجزائے لایتجزائے و میقراطیسی از روئے تعریف کافی سبب ہیں ان تلخ کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کئے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن وہ مہلحات اجزائے لایتجزائے و میقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی ان واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں +

کیا نظریہ اجزائے لایتجزائے اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتہہ الاولیٰ (پروٹوپلزم) سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اور اگرچہ کتہہ الاولیٰ کے کیمیاوی اجزاء بجلی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کتہہ الاولیٰ پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم ان صفات کو لیں جو از روئے جدید سائنس اجزائے لایتجزائے میں پائی جاتی ہیں اور ان کو ہزار ملائیں ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیمیا، اجزائے لایتجزائے کی حرکت دہائی اور ان اجزاء کی یکپاٹی ہوئی حرکت پسبل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اہل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی +

جب حیات صرف اجزائے لایتجزائے یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر

قوت مدرک تو کہاں ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرک مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب قوت مدرک کا یہ حال ہے تو کائنات میں معنی معرفت طبعی تو اس سے بھی کہیں پرے ہے۔ کیونکہ معرفت طبعی کے معنی ہیں قوت مدرک کا اپنے باطن پر غور کرنا۔ اور یہ اجزائے دیمقرطیس کے ترتیب دینے والے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

مکن ہے کہ مادہ میں سے کوئی یہ کہے۔ کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پزیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرک اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہو جائے گی جس قدر اجزائے لایتجزے کی تحقیق میں زیادہ تر کے انہ جاؤ گے اسی قدر اجزائے لایتجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرک کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر نباتات اجزائے لایتجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لایتجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرک کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح چاہو حل کرنے کی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑے گی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پاسکتے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض یک طرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوت مدرک سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے اپنے ساتھ مادہ پر فضیلت ہے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہو کر بھی قائم رہ سکتی ہے۔

اور اس میں شبہ نہیں کہ مان کا جو نظریہ اجزائے لایتجزئے اور اجزائے دیمقراطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسی خالق اور منتظم قوت مدرک کی شہادت دیتا ہے جس کی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے +

۱۰

نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ابھی ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اہل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے پچھلے صدی میں جبکہ سائنس کی ترقی محض کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا۔ اس کی منہی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ نفیض ہو گیا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بڑھئیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بیجا ہے جس کا دور زمانہ طفلی سے بیتھا ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پر زور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا گمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہو گی وہ ان پیچیدہ مسائل اور گنہیں کو سلجھانے کا جواب تک لائیںل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اسی کے زور سے اُسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشر جس سے اہل سائنس منحور تھے اترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا، انگر سال اور برید لایسے اعدائے مذہب بے وقت ہوتے جلتے ہیں اور ان کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایک ناشک (اور یہ) کے بانی تھے۔

ہکسی کے پر زور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی اب دھیمے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے بہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہے جیسی پہلی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مہتمم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتداء سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کیے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے انسان کے بھترے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جاتی تو منظر زیاں وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آتی۔ تو کیا مذہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل تصرف اور قوت ہے محل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ لے نہیں کبھی اس طرف متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھسری رہی۔ اور ابتداء سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے۔ بلکہ بجائے

تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس جلتی آگ میں اوتیل ڈالا +

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زمین سے دوسرے زمین پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھجک کے رہ جاتا ہے سب سے اول اُسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا مگر اس رستہ میں اُسے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں۔ بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ہوا۔ اور اب تک ترقی کے میدان میں اُسے وہی ہفتخاں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اُسے اپنے بنی بنی کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے۔ یہی لڑائی مقابلہ منافصہ اور جدوجہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے۔ ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور اور حیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدوجہد پائی جاتی ہے۔ تمام خال و حرکات میں تمام ارادوں اور فیصلوں میں۔ اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلیٰ اور نازک موقعوں میں ہمارا بڑا مشاہدہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور دشمنندی اسی میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لئے اس کا ارتقاء دوسرے حیوانات کے ارتقاء سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے لیکن عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے

ہمارا سارا فائز اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہئے۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے اعلیٰ کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی عقل کا کلام تفرؤ، انفعال اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائز کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جواب تک وجود میں نہیں آئیں۔ قربانی کرنا ہے۔ یہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی۔ اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالکل الگ ہے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن اور ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جدوجہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالکل مخالف اس کی مخالف ہے۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدوجہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقاء عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربانی کر دینے جاتے ہیں عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانہ میں آئیں گے اور ابھی وجود میں بھی نہیں آئے۔ حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ عرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقلی ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائز نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائز ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے نال اور غدر ہے۔ لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے۔ مگر اس اتباع کے

عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی تمام خیالات بیچ ہیں۔ اُس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتیٰ الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انسان تکلیف سے بچنے کی راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے۔ اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے۔ اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے باطل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور محیر اور نیک چلن ہوتے ہیں لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدمہ نسل کا کام نہیں ہے۔ قرون اور نسلوں کی جدوجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست بات چیت۔ طرز خیال غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوانحی سے اثرات تعلیمات مجھتے ملے ہیں۔ وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحان طبیعت اُس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں

نخل سکتا۔ وہ مجبور ہے۔ اور بات بات میں اُسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس کو وہ انکار کرتا اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے ۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اور بڑے بڑے اہل آرا کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون و ارسطو و فیڈاس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیت و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہیں رہا۔ یہ اس لئے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے۔ اسی بد اخلاقی اور بد مذہبی نے روما کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجود وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں۔ ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں ۔

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوتی ہے کہ وہ ایک حالت پر قانع نہیں رہتا ۔

ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوتی رفتہ رفتہ جب رونی پیٹ بھر کے ملنے لگی تو بھوک تو ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آٹھیرا۔ اور اس چاٹ میں اس نے ذہن ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اُسے اس نے وجہ زیبائش و آرائش بنالیا۔ وہ حقیر چھوٹا بچہ سر چھانے کے لئے بنایا تھا اب ایک شاندار محل بن گیا ہے۔ جس میں تمام سامان آرائش و حسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی۔ اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا

ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں اصل یہ ہے
 کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوتا
 ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی کو اصل ترقی
 سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ درجہ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجہ اعلیٰ کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ
 باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس
 کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی
 ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی
 نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح نہیں دی۔ جس نے اُس ہدایت کے نور
 سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن
 اور روح کو صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اُس کی روح عالم ارواح میں بھی اونٹنے
 حالت میں رہے گی۔ ڈارون کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علاقے تک ہے
 جب جسم کا خاتمہ ہو گیا تو اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس اصول کے ماننے والوں کو اور
 ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ اب الابد تک
 رہنے والا ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اُسی حالت
 میں عالم ارواح میں پہنچتی ہے۔ اگر وہ یہاں اونٹنے حالت میں تھی تو وہ وہاں اونٹنے
 حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تخلیف کا
 باعث ہوں گی اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور
 وہاں سے ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور
 اسی طرح ترقی کر کے اس سے بھی اعلیٰ عالم میں پہنچے گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ
 جاری رہے گا۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لاقدولا تھے ہیں اسی طرح نظامات
 روح بھی عید و بشمار ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ نامتناہی ہے

اور لازوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات کو چھوڑ کر درجہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرے جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے *

۱۱

غرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ وہ مادی اور غیر مادی دونوں ملکوتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے تہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبہ کا انکار کیا کرے کیونکہ وہ کوتاہ نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ہستی نازل نہیں ہو سکتی۔ اہل سائنس اپنے بھروسے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہیں۔ جو ذرا ہوشیار ہیں انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں لیکن یہ جواب خود ان سائنٹفک ہے۔ سائنس جستجو تلاش اور تحقیق سکھاتا ہے تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات کے خلاف ہے لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے۔ جو امور ان کی تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے قوسنکر ہی ہیں لیکن

سائنٹفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر تو جابجا طعن و تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتدا ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس۔ گلیلیو اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جو تاقیاست یا دوکار ہیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت سب سے اول نہایت شد و مد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل سائنس نے کی جب ہنری فریٹکن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برقہ کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقت بنایا اور رسالہ فلاسوفیکل ٹرنیز ایکشن نے اس مضمون کو دہج کر دے سے انکار کیا۔ حالانکہ وہی چیز آجکل کس قدر مفید اور کامیاب ثابت ہوئی اور اس کا استحکام عام ہو گیا ہے۔ جب یلنگ نے روشنی کے نظریہ انتقاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کئے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر ہنری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہو سکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ اسٹینون نے جب یہ تجویز کی کہ لورپول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ ناپاک ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہو سکے۔ جب نامور اور مشہور منجم آرسے گو نے برقی ٹیلیگراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فریچ اکاڈمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظریہ پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی۔

جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیات کے متعلق وہ جس قدر شدت و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہو جائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا۔ اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں۔ ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے تحقیق تجس جس پر انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس غول کو توڑنا باہر نکلنا پڑے گا *

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی لائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذاہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے۔ اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا انتہا سمجھ لے تو کیا ان انسانی متناؤں کے لئے جو اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہو سکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بڑی بھلی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علوم طبعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبعیات دریا ضیات کے قانون اس کے فرماؤ ہیں تو انسان محض ایک چلتی پھرتی گل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک حشیہ قوت ہے جو سب پر غالب آ جائے گی۔ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف یہ نہیں ہے

کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اولیٰ قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو۔ اور خدا، حیات جاوید، نصیحت و عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مان سب زائل ہو جائے گا اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس اُن پچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقت میں جُٹ جاتے تھائیں سستے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش و عشرت کا سامان ہم پہنچائیں۔ افسوس اُن پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرت ہے۔ دولت ملی۔ اُس وقت جب کہ آفتیں سستے سستے اور بلائیں جھیلنے جھیلنے کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو گئی۔ دہلی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش۔ توئے میں ضحکال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں۔ یا اُس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جبکہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا۔ اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہا نے مسرت کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے اصل خوشی اعتدال قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلیٰ کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرت

بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے۔ بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہئے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اُسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرت انسان کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسانی کی نہ میں سرخ و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گمراہا ہے۔ اور زیادہ ترجوہ کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بہلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت اونے درجہ کی ہے۔ اعلیٰ درجہ اس کا اُس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلیٰ طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اُسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے۔ خدا اُس بواہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر بچتا اور حال میں مذہب بے اطمینان

رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اُسے تاریک نظر آتا ہے +

۱۲

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں۔ بلکہ اس منہج پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ آج کل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیر ہو گئی ہے کہ وہ دوسرے منہج پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کارآمد ہونے سے کئے انکار ہو سکتا ہے۔ اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اُسے اس رُتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشا و مہمتا ہے +

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے +

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ سائنس کے اصول اور ان کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کر دیں گے حالانکہ یہ خیال محض جہل ہے۔ سائنس صدائے سال سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسی ہی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ اس لئے کہ جس شے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے و باع نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے۔ حالانکہ عقل بذاتِ محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اولہ و براہین اسی کیلئے مفید ثابت

ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لئے تمام دلائل بیکار ہیں۔ لہذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر زمین گردش کرتی ہے تو اور آسمان پھر تا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے پتھر متحجر نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائیے مذہب کیوں اس سے گھبرائے؟

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذاہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جبکہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لئے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی اخلاقی معاشرتی سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا اور مذہب کا بادی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں داخل کر لئے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے نئے انکشافات شروع ہوئے۔ اہل مذاہب نے جب یہ دیکھا تو انہیں یہ امر ناگوار گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے۔ جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے۔ جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لے لئے۔ اور جو نجوم و

شعور و اقامت کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت میں آ گئے۔ مگر اہل مذاہب ایک وقت تک انہیں باقوں پر جبر سے جو ابتدا میں ضمناً ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اُسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے کہ جس پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے +

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بیجا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس ہند لال عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اترتیں ان کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاقِ حق میں صرف عقل ہی پر دار و مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاقِ حق میں عقل وہیں تک کامی رہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا ہے جب معمولی باقوں کی تحقیق میں عقل حالاً و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جاسکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز و جدائی پر ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافرمانی

سے اس پر حملے کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اُسے ادا
 ہاتھ لگ گئی ہے جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اٹھتا ہے
 کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں
 اور وہ اُن سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کُرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی
 کیا ہے دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں باطل محدود ہیں اور وہ صرف
 مادی حالت سے متعلق ہیں عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے
 اور بھی محدود ہے۔ اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسی ہو سکتی ہے۔ وہ مادی کے
 آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر
 اس محدود علم اور ایک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے بیچ ہیں۔ اور بغیر اس کوچہ میں
 قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل
 ہونے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار ناقابلِ سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا
 مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافرمانی ہے۔ اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی
 زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔
 اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہہ دینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے
 اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انہیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے
 خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرتِ واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں اور اس
 سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تعصب اور اُن کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور غصہ سے
 کہیں بڑھی ہوئی ہے +

جس طرح علمائے طبیعیات و مریدان ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چا
 دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذہب کو
 بھی چاہئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے

جہاں مذہب کو رک جانا چاہئے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہئے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے اپنے قصے قہیئے اور عداوتوں کو بھلا دیں بلکہ دور و ٹھٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح من جایشیں۔ عالم طبیعیات کو ابھی کچھ کرنا باقی ہے قبل اس کے کہ وہ کائنات کا مسئلہ کو حل کرے۔ اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہے یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی۔ لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی ہے اور دوسرے کا مقصد باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقر کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خراج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے بہت اچھا کرتا ہے۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہے تو پھر اسے نکال نہیں سکتی۔ رُوح اُسے ضرور یہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے +

جھگڑے تنازع اور جدوجہد سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اُس سے مدد لینا اور اُسے معاون بنانے کے رکھنا چاہئے۔ اگر اُس کے کہیں دشمن ہیں تو اُن سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گناہی کا احتمال ہے۔ اور گناہی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اُسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کٹافتنوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔

اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اُس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اُس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اُس کی قسمت میں ہار ہے۔ یہ وقت ہے اس کی بہت آزمائی کا تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اُسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشا دیکھے۔ اُسے اب صداقت کے ماننے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور زیادہ عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئے اور ضد اور نفی سے دست بردار ہونا چاہئے +

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیوارٹ جو اس زمانہ میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں اس کائنات میں ایک قانون قوال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ بہت ہی محض بیکار اور ہسٹل ہو جائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادہ ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دار و مدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ قوت اُسی وقت کار آمد ہے جبکہ یہ تبدیل ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اسے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کر لیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت کو کمزور کرے گی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سوچ ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلیٰ ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دار و مدار ہے اُس حرارت سے اخذ کی جاتی ہے جو سوچ سے نکلتی ہے۔ جبکہ سوچ ہمارے لئے قوت مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد

ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہو جائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سبوح کے سرد ہونے کے ہیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایٹری گز کی وجہ سے ہمارے زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کُرے بالتغاف سوچ کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تقصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور عارضی طور پر سبوح بھی ہونی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ بچہ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنہ میمار کے بعد اس کے پھر کبھی ٹوٹی کرے سے مٹ بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ کر دے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانون عالم جسے قانون توال یا عدم انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت وہ بتسل جو برابر جاری رہنا چاہئے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہری سب کچھ ہونا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے گھر ورے ہاتھ سے ٹول ٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت کئے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہو گا۔ کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہئے۔ اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور اس کی کائنات سب ل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ استدلال کرتا ہے کہ موجود نظام کا انجام

یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے
گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دینی زبان سے
کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون میا میٹ ہو جائیں گے اور اپنے ہاتھوں
آپ اپنی قبر بنائیں گے۔ کیونکہ قانون تو ال یا عدم انقطاع کا مقتضی یہ ہے کہ اگر یہ موجود
کائنات برباد و تباہ ہوگی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلہ قوانین
کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشوونما میں پھولے پھلے۔ اور یہی
اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس لئے ہر کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر
فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو موت انسانی
ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی۔ اور یہی آخرت یا حقیقت ہے +

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے
اور جس پر ڈاکٹر ڈیر پر نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کا فور ہو جاتی ہے۔ سائنس
اب تک ایک گنبد بے دریں چکر لگا رہا تھا۔ اب اُدھر کی بھٹوری سی جھلکنا پہنچی
مشرق ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے۔ وہ زمانہ
قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور ہو جائے اور مذہب سے
اکرمیت کرے +

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی
ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا
کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انہی کھے تہا سات اور نظریات
سے جن پر ال سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبر گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے
کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں
ٹکرائے گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اُس حالت میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے

سے ایمان لائے بیٹھتے تھے۔ لیکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اُسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے لہذا مذہب اور الہام کو بھی اُسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی۔ اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اُسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل مذہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اُسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے +

لیکن صرف اہل مذہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہل سائنس اہل مذہب کے اجتہادات اور رائوں کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے اُن رائوں کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا۔ زیان تر خطرہ ”نیم حکیم“ اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی انکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقیناً سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعطی دماغ عطا کیلئے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے +

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب ”کان فلکٹ بنوین سائنس اینڈ ریلیجی“ (معرکہ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے انہوں نے مذہب پر کئے ہیں وہ بلاشبہ رومن ازم

پر ہیں مذہب پر نہیں ہیں بلکہ میں یہاں تک گستاہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حلوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے +

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی تک رک رہے گی۔ اور اسے سہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے۔ اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی نادانی پر پتھرائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہو گا۔ اور یہ تو اہم بھائی ایک جان دو قالب ہو جائیں گے +

۱۳

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے ان امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے پر مبنی ہیں اور استقرا پر مبنی ہیں۔ حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بیحد اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتہ کہاں ملے +

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے

آتے ہیں۔ انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال مذاہب کا ہے۔ ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ رد و بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور اُن اقوام کی وجہ سے ہیں جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانہ کی وجہ سے جبکہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لیکر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جایا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائگا۔ ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر شکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے اور اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں۔ اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لئے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے۔

مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کسی ایک خوبی کو لیا اور اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو باطل نظر انداز کر دیا۔ دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت مذہبی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب بیچ رہ جاتے ہیں۔ غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر

سے دیکھا اور باقی پہلو پر نہیں رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور منزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوتی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی۔ اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ سے کمزور ہو گئیں جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضا کمزور ہو جاتے ہیں اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی ہیں۔ مذاہب کی کامل صداقت اور اہل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عداوت ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات۔ اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈ مذہب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جدوجہد رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عاید ہیں۔ بحیثیت انسان ناطق کے وں کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے۔ اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے تمام خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے۔

اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف بنی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا۔ نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لئے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اُس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک چلے آ رہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی اہم اور اصلاح کے اہلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مدنظر رکھا۔ اور ان اختلافات میں ہمیشہ کے لئے مصالحت پیدا کر دی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے پیغمبر خدا نے اس معنی کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ اسخطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کشمکش میں ہے کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے

محروم رہا جاتا ہے اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے۔ اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور اس دنیا کے امور کی اصلاح کے لئے ضروری ہے بلکہ عام اخلاق و نیکی اور نیک کائنات کا درار و مدار اسی پر ہے۔ یہ زمین یہ سیارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنی حد اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے۔ اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کسی کو پورا کیا اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیتے ہیں، لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹیٹی ہے۔ نماز روزے حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہی معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب بچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب بیٹیوں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ نماز پڑھنا۔ اپنے عہد کو پورا کرنا۔ سختی اور تکلیف میں شائبہ

۱۵ لاس رہبانیت فی الاسلام ۷

۱۶ وما الحیوة الا متاع الفنا و...

قدم رہنا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کا مدار محض ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا و آخرت - مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے۔ اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابن ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں اور وہ آگے قدم رکھتا ہے۔ اور اس کا روحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرتؐ کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ جب اٹنے صحابی آنحضرتؐ صلعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کھلی رکھے ہوئے کعبہ کے سامنے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مشرکوں سے بہت کچھ ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ مسخ ہو گیا اور فرمانے لگے۔ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر ارہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اسے دین سے نہ پھیرتی

لَهُ لَيْسَ إِلَهٌ أَنْ تَوَلَّوْا قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْيَوْمَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالْبَنِينَ وَالنِّسَاءِ وَالْمَالِ عَلَى
حَبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَأَبْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا
عَاهَدُوا وَالصَّادِقِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝

حقّی۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔
 اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق
 میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے۔ بدلاؤ تو اس کے بدلے
 میں اسی قدر تخلیف دو جتنی تمہیں پہنچی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو و درگزر کرو معاف کرو اور بخشن دو
 تو اللہ تمہیں دو ہزار اجر دے گا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کو
 بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا ذکر
 بہت بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم گنہگاروں۔ خطاکاروں اور
 دشمنوں اور مخالفوں سے شیوہ عفو و غفران اختیار کرو گے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں
 سے درگزر کرے گا۔ یعنی بدلائینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور
 مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ بُرائی کے عوض بھلائی
 کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور بُرائیوں کو معاف کرو اور عموماً درگزر کرو۔ پھر یہ بھی
 فرمایا ہے کہ بُری بات کا جواب ایسا کہو جو سب سے بہتر ہو۔ ایک دوسری جگہ
 ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ بُرائی کا دَفِیہ ایسے برتاؤ سے کرو
 کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھ لو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں
 تھی تو اب ایک دم سے گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ اور حسن مدارات کی توفیق

لَهُ وَيَذَرُونَ بِأَلْسِنَتِهِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عَقِبَى الدَّارِ (رعد - ۲۰)

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (شورے - ۳۸)
 وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَبِمَا قَبِلْتُمْ مِمَّا عُوْقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ
 فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (مائدہ)

لَهُ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (نور - ۶۳)

سہ اِدْفِعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (مومنون - ۴۸)

اُنہیں لوگوں کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اُنہیں کو دی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے ؟

اسی طور پر روپیے پیسے کے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی بات ہے۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگدستی کریں۔ اُن کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم کو اپنے پیروکار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے اُن سے

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ (مجادلہ)
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَحِبُّ مِنْكُمْ
شَنَّانٌ قَوْمٌ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا إِنْ عَدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ
كُلُّوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَحِبُّ مِنْكُمْ
شَنَّانٌ قَوْمٌ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا إِنْ عَدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ
كُلُّوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (سورہ انفاسہ رکوع ۱۷)
وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَّامًا (سورہ فرقان
رکوع ۷۶)

منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ماتھ نہ اتنا سیڑھوں کے گردن میں بندھ جاؤ اور نہ باطل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہید دست ہو کر لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح روان ہے۔ فرمایا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ یعنی مسلمان سب

بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک اونٹ غلام اور ایک شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے

اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو کر رہے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا

ہے اور اُس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جاو کا اثر رکھتی ہے اور اس نے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں

ان کی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے۔ لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور اونٹنی اتیاناز سے بالاس ہے۔ مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود۔ آب و ہوا۔ رنگ اور

نسل حائل نہیں۔ وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو۔ ہندوستان کا برہمن۔ یورپ کا فرنگی۔ مصر کا فلاح غرض دائرہ اسلام میں داخل ہوتے

ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں مسلمان کہیں ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے اس کا وطن سارا عالم اور اُس کی برادری سب

مسلمان ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور میں

نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

لَهُ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا

اس سے بھی بڑھ کر اعلیٰ اور افضل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کے لئے صلائے عام ہے۔ یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا ہے "مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ" اس سے بڑھ کر کمال وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے دنیا وسیع ہونا ممکن نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا اور دنیا پر اس کی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور انسان کی ترقی کی مدد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

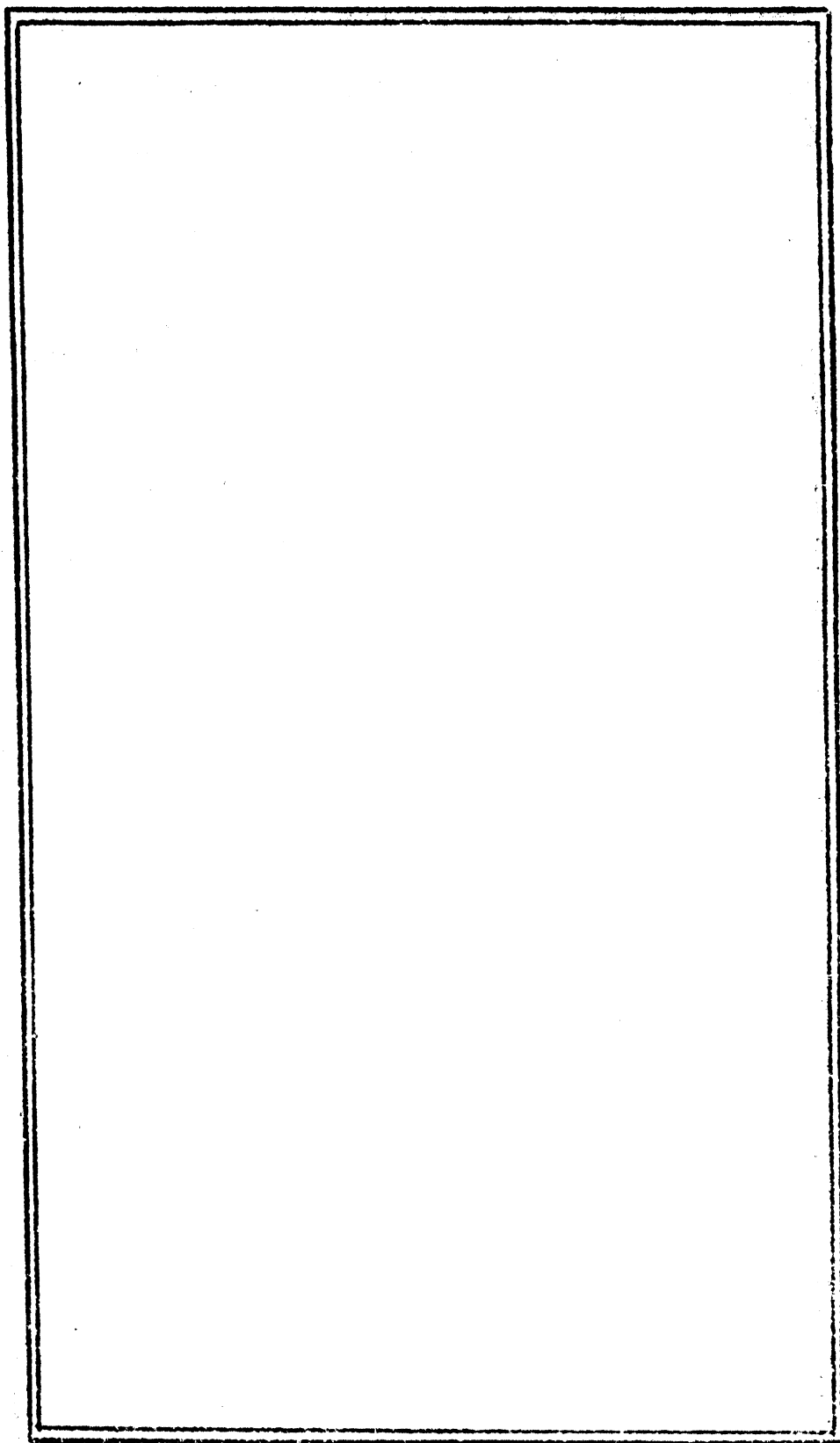
یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبرؐ اور پاک باطن خلفا اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوة اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑتی ہیں +

خود ڈاکٹر ذریر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پوشیدہ حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسی طرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مروجہ علوم کو زعفران کیا بلکہ نئے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے ہمت خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صلح جوئی آزادی بے نقبسی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں روشن شعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ کر رہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی۔ دنیاوی تمدن اور اخروی راحت عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں تواضع اور توازن قائم رکھنے

والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر بھی زور دیا
 تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر۔ مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو
 کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس
 کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ خاتم الذاہب اور اکمل الادیان ہے۔ اور انسان
 کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے +

عبداللہ

حیدر آباد دکن



بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہرگز نہیں دیکھو کہ دلش زنگ شد بسم

ثبت است جبرجین عالم دوام او

ڈاکٹر جان ولیم ڈریسپر ایم ڈی ایل ایل ڈی

ڈاکٹر ڈریسپر مصنف کتاب معرکہ مذہب و سائنس مغربی دنیا کے اُن مشاہیر میں سے ہیں جن کا نام بوجہ اُن کے علمی کارناموں کے لچ روزگار پر سنہرے سرفروں میں ابد الابد تک لکھا رہے گا۔ اُن کی ذات انگلستان کے لئے جو اُن کا جنم بھوم تھا اور امریکہ کے لئے بھی جہاں وہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ سرمایہ افتخار و نازش ہے۔ اور اُن کا نام دنیائے علوم و فنون میں ہر جگہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

جان ولیم ڈریسپر ۱۸۰۷ء میں بمقام سینٹ ہیلن پیدا ہوئے جو لورپول کے فوج میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے لورپول ہی میں پائی۔ اور جب لندن یونیورسٹی کا افتتاح ہوا تو آپ فن کیسیا کی تحصیل کی غرض سے اس یونیورسٹی میں بھیج دیئے گئے۔ ۱۸۳۲ء میں آپ نے امریکہ کا عزم کیا۔ اور پنسلوینیا کی یونیورسٹی میں بغرض اکتساب فن طب داخل ہو کر ۱۸۳۶ء میں ایم ڈی کی ڈگری چھل کی کچھ دنوں کے بعد اپنی غیر معمولی علمی قابلیت کی وجہ سے آپ ورجینا کے ہسپتال سٹڈی کالج میں کیسٹری کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور ۱۸۳۷ء میں نیویارک کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر ڈریسپر کی سب سے پہلی تصانیف کا موضوع یہ مسئلہ تھا کہ روشنی کا مولید ثلاثہ پر

کیمیاء کی اشکریا ہوتا ہے اس موضوع پر آپ کی تقریباً ۴۰ تصنیفات موجود ہیں۔ روشنی کے کیمیاء
 اثرات میں سب سے زیادہ متم بالشان اثر کاربانک ایسڈ (حموضۃ الفحم) کی تحلیل ہے
 جو درختوں کے پتوں پر دھوپ کی شعاعوں کے پڑنے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اسی
 واقعہ پر نباتات کے نشوونما کا انحصار ہے۔ اور اسی کی بدولت حیوانات کو بالواسطہ یا
 بلاواسطہ غذا ملتی ہے۔ اس تحلیل کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بالفاظِ حق
 اُسے نشر اکسا دینی آکسیجن کے اجزا کی علیحدگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ روشنی کا جب
 بذریعہ مقیاس الوان نور منشور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سات رنگ کی شعاعوں
 سے مرکب ہے یعنی (۱) بنفشہ (۲) سرمئی (۳) ارزقی (۴) اخضر (۵) اصفری (۶)
 نارنجی (۷) احمری بنفشہ تک علمائے سائنس کا یہ خیال تھا کہ عمل نشر اکسا دینشی
 شعاع کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا نام شعل نشر اکسا ورکھ دیا گیا
 تھا لیکن یہ محض قیاسی نظریہ تھا۔ جو کسی تجربہ سے قطعی طور پر ثابت نہ کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر
 ڈریسپر کو خیال ہوا کہ اس مسئلہ کے قطعی تصفیہ کی صرف ایک شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ تحلیل خود
 الوان نور منشور کے ذریعہ سے کی جائے یعنی نباتاتی مان کو ہر رنگ کی شعاع کے زیر عمل لاکر دیکھا
 جائے۔ کہ نشر اکسا د کس شعل سے ہوتا ہے۔ اس لطیف و دلکش تجربہ میں ڈاکٹر ڈریسپر کو یہ
 کامیابی ہوئی۔ اور انہوں نے یہ اکتشاف کیا کہ عمل تحلیل میں شعل بنفشہ مطلق حصہ نہیں لیتی بلکہ
 یہ کام شعل اصفری سے متعلق ہے اس نتیجہ کا تمام علمی دنیا میں نہایت دلچسپی کے ساتھ خیر
 مقدم کیا گیا اور علمائے کیمیاء کی معلومات میں اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا
 ہو گیا۔ ڈاکٹر ڈریسپر نے نور کی قوت کیمیائی کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا جس
 سے آگے چل کر علمائے کیمسٹری نے بہت کچھ مدولی۔ چنانچہ مین اور راسکو نے جب ۱۸۵۶ء
 میں اپنے کیمیائی تجربوں کے متعلق ایک مضمون رائل سوسائٹی لندن کے اجلاس میں پڑھا
 تو اس میں اعتراف کیا کہ ڈریسپر کو اس آلہ کی مدد سے نور کے عمل کیمیاء کی بعض نہایت

ہی اہم نجات کے حل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر ڈریپر نے ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ حرارت سے نور کیوں پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ سے الوان نور منشور کا تجربہ زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ یہ دریافت کرنا ممکن ہو گیا کہ آفتاب ستارے اور ضبابیۃ النجوم ٹھوس حالت میں ہیں یا سیال حالت میں۔ اس رسالہ میں ڈاکٹر ڈریپر نے تجربہ ثبات کر دیا کہ تمام ٹھوس اجسام یقیناً اور تمام مایع اجسام غالباً ایک ہی درجہ حرارت پر پہنچ کر منور ہو جاتے ہیں +

ڈاکٹر ڈریپر پہلے دن شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۳۹ء میں انسانی چہرہ کی عکسی تصویر کامیابی کے ساتھ اتاری اور نیز قر کا عکس لیا +

یہ چند مثالیں علمی تحقیقات و اکتشافات کی اس طویل فہرست سے اخذ کی گئی ہیں جس کی ترتیب و تدوین کے لئے ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی نمایاں قابلیتوں کو مرتے دم تک وقف کئے رکھا اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اپنے اپنے اکتشافات علیہ کو جو بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہو سکتے تھے کبھی آلہ جلب منفعت نہ بنایا۔ بلکہ سچا ذوق علمی اور ہمدردی بنی نفع انسان ان کی محرک ہوئی تو آپ کی جلالت قدر کا بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کا نایاب رسالہ پاپولر سائنس منتقلی جس کے جنوری ۱۸۷۷ء کے نمبر سے ان حالات کا اقتباس کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ یہ علمی اکتشافات جو ڈاکٹر ڈریپر کی ساہا سال کی عرق ریزی اور دماغ سوزی کے نتیجہ ہیں اپنے گرانبار مصارف کے تکفل کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی جیب خاص کے ہینر بہت ہیں۔ اگرچہ بعض بعض علمی تجربوں پر انہیں ایک رقم خطیر صرف کرنی پڑی۔ لیکن ان کی اولوالعزمی کبھی کسی خیر کی مالی سرپرستی کی روادار نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی کسی ایجاد کو کبھی پیٹنٹ نہ کرایا۔ بلکہ جو علمی نکتہ دریافت کیا۔ اور جو ایجاد کی اس کا ثمرہ ازراہ غایت ایشافنس خلق اللہ کی نذر کر دیا +

ان تصانیف سے جن میں ادق علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ قطع نظر کر کے اگر

ڈاکٹر ڈریپر کی دوسری تصانیف کو جن کا موضوع تاریخی اور نظری مباحث ہیں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ ایک مسلم الثبوت ادیب اور انشا پرداز بھی ہیں۔ ۱۸۶۶ء سے لیکر ۱۸۸۲ء تک کا زمانہ آپ نے اسی قسم کی دلچسپ و دلادیز کتابوں کے تصنیف کرنے میں گزارا چنانچہ آپ کی دماغی ترقی کی تاریخ ”تاریخ خانہ جنگی امریکہ“ اور ”معرکہ مذہب و سائنس“ اسی دور کی تصانیف ہیں +

ڈاکٹر ڈریپر کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ آپ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات موجود ہیں۔ بیٹے علم و فضل میں اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر ہنری ڈریپر نیویارک کے کالج میں علم خواص الاشیاء کا پروفیسر ہے۔ دوسرا بیٹا ڈاکٹر جان ڈریپر نیویارک کی یونیورسٹی میں علم حیات حیوانی کا پروفیسر ہے۔ تیسرا ڈاکٹر ڈینیئل ڈریپر نیویارک کی رصد گاہ متعلقہ حادثات الجو کا ناظم ہے +

پروفیسر چرچ ڈپر اکثر اپنی تالیف ”لینڈ ریڈنگس“ (مطالعہ بوقت فرصت) میں جو لطیف و دلکش مضامین کا ایک نفیس مجموعہ ہے۔ ”کانفلکٹ بیوین رلیجن اینڈ سائنس“ یعنی کتاب خدا کی نسبت حسب ذیل خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ”یہ کتاب ایک اعتبار سے یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ مذہبی تعصب اور عدم مسامتہ پر اس میں سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور ان وجوہ پر نظر انصاف نہیں ڈالی گئی جو بسا اوقات مذہبی جبر و تشدد کی محرک ہوئیں۔ لیکن باایں ہمہ یہ کتاب ایک صحیح الدلغ اور صائب الرائے شخص کے قلم کا حاصل ہے اور اگر ان چند مقامات سے قطع نظر کیا جائے جن میں بیجا سختی پائی جاتی ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا چکی ہے اور پہنچا سکتی ہے“ +

بحیثیت ایک مسیحی ہونے کے پروفیسر چرچ ڈپر ”معرکہ مذہب و سائنس“ کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اور اگر ہم (خدا نخواستہ) مسیحی ہوتے تو اس تعریف

میں جس کی یہ کتاب دوست دشمن سب کے نزدیک مستحق ہے منقصت کے شایہ اس
 سے بھی زیادہ شاخسانے نکالتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے مقابلہ میں نصرانیت
 پر جو فرو قرار واد جرم ڈریں گے لگایا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ نصرانیت کا بڑے سے
 بڑا وکیل اُس کے چھوٹے سے چھوٹے نکتہ کا تخیلہ کر سکے اور اگر چشم انصاف کھلی سکے
 اُن واقعات پر نظر ڈالی جائے جو سائنس اور نصرانیت کی ہزار سالہ جنگ کے محرک
 ہو کر اُس شکست فاش پرنتی ہوئے جو نصرانیت کو اپنے حریف کے مقابلہ میں ٹھانی
 پڑی اور جنہوں نے نصرانیت کی روحانی و اخلاقی قوتوں کا شیرازہ بکھیر کر اُسے محض
 پولیٹیکل اغراض کی تکمیل کا ایک مادی آلہ بنا دیا ہے تو خواہی سخاوی اعتراف کرنا پڑے گا
 کہ جو فتح سائنس کو بمقابلہ نصرانیت حاصل ہوئی ہے اُس کی وجہ یہ تھی کہ حق اور قوت دونوں
 اس کی جانب تھے اور ڈاکٹر ڈریپر نے کوئی بات ان دونوں حریفوں کے کارناموں
 اور ان کی جدوجہد کے متعلق ایسی نہیں بیان کی جس کی تغلیط و ترویید ہو سکے البتہ ایک
 لغزش ڈاکٹر ڈریپر سے یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے مذہب پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے
 کہ اس کا الہامی حصہ غیر متحرک اور غیر ترقی پذیر ہونے کے لحاظ سے گویا جہلا کے اوہام
 باطلہ کا ایک لایعنی مجموعہ ہے جس کی ظلمت آفتاب سائنس کی درخشاں شعاعوں کے آگے
 ایک پل کے لئے نہیں ٹھہر سکتی۔ انہوں نے مذہب کے فلسفہ پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی اور
 فطرت انسانی کے اُس زبردست اقتضا کا حکیمانہ تجزیہ نہیں کیا جو مذہبی تخیل کی شکل میں مینوس
 صدی عیسوی کے ایمان کو باایں ہمہ دانش و حکمت انسان اولین سے سلا بعد منسل ترکہ
 میں پہنچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مقام پر مصنف نے انسان کی دماغی ساخت
 پر علم حیات حیوانی کے اصول سے بحث کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ
 مذہبی خیالات فکر انسان کے اجزائے لاینفک ہیں اور ان سے کسی انسان کو خواہ وہ
 کیسا ہی تہذیب یافتہ اور روشن دماغ کیوں نہ ہو مضر نہیں لیکن یہ بحث بیچ میں برسبیل

استطراو آجاتی ہے اور اس سے وہ کوئی اہم نکتہ جسے انسان کے معادے تعلق ہوا
نہیں کرتے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے پیش نظر رومن کیتھولک نصرانیت کے
منحرفات لاطائل و شیطانات لایعنی ہیں اور انہوں نے اپنی تمام قوت انہیں کے اہمال
و ابطال میں صرف کر دی ہے +

رومن کیتھولک مذہب کے پیشواؤں نے کچھ تو اس تحریف کی وجہ سے دھوکا کھا
جس نے تورات و انجیل کی سماوی اصلیت کو پایہ اعتبار سے ساقط کر دیا کچھ اس جہالت
کے اقتضائے جو قرنہا قرن تک پادریوں کا سرمایہ امتیازی رہی اور کچھ ان سیاسی ضرورتوں
سے مجبور ہو کر جنہوں نے ان کے دین کو مبدل بہ دنیا کر دیا ان باتوں میں بھی دخل دینا
شرع کر دیا تھا جن سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا یعنی وہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھانے سکھاتے
اور نجات اخروی کی راہ دکھانے دکھاتے علم و حکمت کے بھی سبق آموز بن گئے اور
سائنس کے مسائل پر بھی ملہم من اللہ کی حیثیت سے رائے زنی کرنے لگے۔ اس غلط
بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقائق فطرت کے متعلق جب انسان کو صحیح صحیح علم ہوا تو ان کے
و عادی جنہیں الہام سے کوئی لگاؤ نہ تھا باطل ہو گئے اور ان کے پیروان کو جھوٹا سمجھ کر
کفر و الحاد کی طرف جھک پڑے اور مغربی دنیا ایک بڑی حد تک مذہب کی قید سے آزاد
ہو گئی۔ ڈاکٹر ڈریپر کو رومن کیتھولک پادریوں کے اس طرز عمل نے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور
کیا ہے کہ وہ مذہب جو سائنس کے مطابق نہ ہو جھوٹا ہے اور وہ صحائف آسمانی جو حقائق
فطرت کے مخالف ہوں ایمان پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ عام نتیجہ بالکل صحیح ہے اس
کہ بقول سر سید احمد خاں رحمت اللہ علیہ کے سائنس کی ہر حقیقت خدا کا کام ہے اور صحیفہ
آسمانی خدا کا کلام ہے۔ دونوں میں اگر ضد ہو تو ممکن نہیں کہ دونوں سچے ہوں پس جس کی
سچائی عقل سلیم کے نزدیک جو معیار یقین ہے مسلم نہ ہو گی وہ باطل ہو گا۔ لیکن ہم کو ڈاکٹر
ڈریپر کی باغ نظری اور نصفت پروری سے اس امر کی توقع تھی کہ وہ صرف یہی نتیجہ نکال

نہ رہ جائیں گے کہ چونکہ فرقہ رومن کیتھولک کے لوگ مسئلہ عصمتِ پاپا کے قائل ہیں۔
 اور اُس کو نائب خدا سمجھ کر اُس کی ہر بات کو برحق سمجھتے ہیں اس لئے رومن کیتھولک مذہب
 جھوٹا ہے اور سائنس کے ساتھ توافقی نہیں رکھ سکتا اور چونکہ پراٹسٹنٹ مذہب سچائی کی
 تلاش بائبل کے اوراق میں کرتا ہے اور اصل سچائی صحیفہ کی فطرت کے اوراق میں مضمر
 ہے لہذا عقلی بحران جس میں یورپ مبتلا ہوا چاہتا ہے منجرب ہلاکت مذہب ہوگا۔ ہم کو
 امید تھی کہ ڈاکٹر ڈیپر مذہب اور سائنس کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ کر ادایک کو
 معاد اور دوسرے کو معاش کا منظر قرار دے کر اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ اگرچہ ان کا
 جہاد ہے۔ لیکن انسان کو اُس جسمانی و مادی اور روحانی منزل پر پہنچنے کے لئے جس کی
 طرف انگشت ارتقا اشارہ کر رہی ہے دونوں کی یکساں ضرورت ہے اور تا وقتیکہ سائنس
 اور مذہب ایک دوسرے کے مدد و معاون نہ ہوں گے انسان کے قومے ذہنی و
 روحانی منتہائے بلوغ کو نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں خیال تھا کہ ڈاکٹر ڈیپر موجود مذہب کا
 مقابلہ کر کے ایک ثالث کی حیثیت سے یہ فیصلہ کریں گے کہ ان میں سے کون سا مذہب
 سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور اس لحاظ سے سائنس کے دوش بدوش چلنے کے
 قابل ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری یہ تمنائیں اور توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر ڈیپر
 نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ایک طرف اور ایک طرف ہونے کی حیثیت سے بھی بالکل اوجھڑا
 ہے۔ اُنہوں نے اول تو سائنس کے مقابل کی شخصیت کی تعظیم کو تخصیص سے بدل دیا
 ہے یعنی علوم کا حریف نصرانیت کو قرار دیا ہے کسی دوسرے مذہب سے سروکار نہیں
 رکھا اور نصرانیت سے بھی رومانی نصرانیت مراد لی ہے۔ غالباً اس تخصیص کی وجہ یہ
 ہے کہ رومانی نصرانیت ہی نے اپنے آپ کو علوم و فنون کا سب سے بڑا دشمن ثابت کیا
 ہے۔ دنیا میں بجز رومانی نصرانیت کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو قدیم الایام سے
 ہر علمی تحریک کے ساتھ اس درجہ معاون نہ برتاؤ کرتا چلا آیا ہو جس کے ائمہ اہل علم

کو اتنی سخت ایذائیں پہنچی ہوں اور غالباً اسی لئے مذہب کو سائنس کا حریف قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب سے مراد رومن کیتھولک نصرانیت لی ہے اور اپنی کتاب کا نام بجائے نصرانیت اور سائنس کی معرکہ آرائی کے ”معرکہ مذہب و سائنس“ رکھا ہے۔ پرائسٹنٹ نصرانیت کے متعلق اگرچہ انہوں نے ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ اس کا اور سائنس کا میل ممکن ہے لیکن جب انہیں کے قول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ سائنس پر پرائسٹنٹ مذہب کا ذرا سا بھی احسان نہیں ہے اور اس کی ترقی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح نے ذرا بھی حصہ نہیں لیا اور نیز جب یہ امر پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ زمانہ حال کی فلسفیانہ تنقید نے انانجیل مقدسہ کو جو پرائسٹنٹوں کا منہاج ایمان میں تحریف و تدلیس سے مملو ثابت کر دیا ہے اور ان میں ایسے ایسے تاریخی نواقض کا موجود ہونا بدلائل قاطع پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے جن سے ان کی تنزیل ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اور جن کا جواب کسی پادری سے بن نہیں پڑا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر یہ دونوں ایک دوسرے کے دلی دوست ہو سکتے ہیں +

رومانی اور پرائسٹنٹ نصرانیت میں سب سے بڑا ماہہ الافراق یہ ہے کہ رومن کیتھولک فرقہ آیات کتب مقدسہ کی تفسیر اور مذہبی عقائد کی تائید و تقنین کا حق صرف پاپائے روم اور اس کے ماتحت پادریوں سے مخصوص سمجھتا ہے اور پرائسٹنٹ فرقہ کے عقیدہ کے بموجب تورات و انجیل کی تفسیر و تائید کے متعلق ہر لکھے پڑھے شخص کو حق اجتہاد حاصل ہے۔ یہ فرق اگرچہ بجائے خود بہت بڑا فرق ہے اور اس نے پرائسٹنٹوں کے پاؤں سے قسیمیست کی بیڑیاں کاٹ کر انہیں بنوعلم خود معصوم و غیر خاطی پاپا کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے لیکن اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ تورات و انجیل کی آیات بدستور اسی قسست آفریں شان کے ساتھ قائم ہیں جس نے سائنس کے ہاتھ میں منجیق بن کر رومانی نصرانیت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اب پرائسٹنٹ نصرانیت کے حلقہ بگوشوں کو اس حد

ہمک آزاد خیال بنائی جا رہی ہے کہ ان کے نزدیک خدا کی حکمت اور مان کی قوت انقبل
مترادفات ہیں تاویل کا میدان نہایت وسیع ہے لیکن داتا وسیع کہ ان تحریفات کو
سائنس کے ساتھ تطبیق دینے میں عقل سلیم کا خون کتے بغیر کامیابی حاصل ہو سکے جن سے
قورات و انجیل کے اور اقی بھرے پڑے ہیں۔ ایک فرانسیسی باورچی سے جو اپنے فن کا
استاد تھا پیرس کے کسی امیر نے فرمائش کی تھی کہ فن طباطبی میں جو بے مثل کمال اُسے حاصل
ہے اس کا ثبوت سرے ہونے میں کا قلید تیار کرنے سے دے۔ باورچی نے جواب دیا
کہ جناب والا میں سو سال پرانے بوٹ کے تلے کا شور با تیار کر سکتا ہوں۔ لیکن سرے
ہونے میں کو قابل غور بنانا میرے امکان سے خارج ہے۔ یہی حال تحریف شدہ تور
وانجیل کا ہے۔ اگر کوئی آیت حقیقت میں الہامی ہو اگر کوئی صحیفہ حقیقت میں آسمانی ہو
تو اس کی سوتا و طیس ہو سکتی ہیں لیکن ان محلات کی کیا صحیح اور مفید یقین تفسیر ہو سکتی ہو
انسان ظلم و جمل کے ترشہ ہوتے ہوں اور فطرت کے حقائق مسلمہ کی ضد ہوں +

ڈاکٹر ڈیرمیر اگر اس مواد کی بنا پر جو ان کے پاس موجود تھا اور جس نے اس کتاب
کی ترتیب میں بعد ایک سو صفحہ کے حصہ لیا ہے کام لیتے تو بآسانی ثابت کر سکتے کہ
مذہب اپنی ترقی یافتہ شکل میں انسان کو نہ صرف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آزاد
تمام ان حقائق کا اکتشاف کرے جو عقل انسانی کی رسائی کے اندر ہیں اور تمام وہ کوششیں
عمل میں لاتے جن سے اس کی طبیعی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ ان کوششوں
کو اپنے آغوش عاطفت میں لے کر جہاں انسان کو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے کمال
بننا اور ابدی زندگی کے تمتعات سے بہرہ اندوز ہونا سکھاتا ہے وہاں دینیوی حیثیت
بھی اُسے اعلیٰ درجہ کے مابج پر پہنچانا چاہتا ہے +

اسلام کو ڈاکٹر ڈیرمیر نے نصرانیت کی ایک شلخ تصور کیا ہے۔ کوئی مستقل مذہب

ملکہ بکری کا گوشت +

نہیں سمجھا۔ اسی لئے دُشمنوں نے اس کو رومن کیتھولک کلیسا کی اصلاح جنوبی اور پچھلے
 مذہب کو کلیسائے مذکور کی اصلاح شمالی سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر ان کے اس خیال کو جس
 ایک حد تک معقول ہونے میں کلام نہیں پوری طرح سے تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن سے
 اس امر کی بددعا اوسے توقع تھی کہ وہ اسلام کو مذہبی ترقی کی معراج یا منتہا قرار دے کر
 اور سائنس کی اُس حیرت انگیز ترقی کو پیش نظر رکھ کر جو اسلام کی سرپرستی میں سے میسر ہوئی
 اور جس نے یونان و مصر۔ کالدیہ و ایران۔ ہندوستان و چین کی فرسودہ ہڈیوں میں نئی روح
 پھونک کر علوم جدید کی بنیاد قائم کی اس نتیجہ پہ پہنچے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب
 ہے جو فطرت الہی و سنت ریزدی سے تطابق کلی رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب سائنس
 میں اگر وفاق پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ مذہب سے مراد اسلام
 لی جائے۔ اور یہ تعبیر نادرست بھی نہ ہوگی اس لئے کہ اگر کوئی مذہب دنیا کے تمام مذاہب
 کے حسنات کے شیراز بند ہونے کی وجہ سے ہر گیری کا ادا کار سکتا ہے اور احسنیت
 سے تمام مذاہب کا یکشم افضاف قائم مقام بن سکتا ہے تو وہ اسلام ہے ۵

یہ دعویٰ ہم کچھ اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں بلکہ اسلام کے دینی و
 دنیوی کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں جن کا ذکر خود ڈاکٹر فریہر نے اس کتاب میں
 شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے اسلام کے اُس اصولی عقیدہ کا ذکر کرنے کے بعد جس کا ماز
 لا الہ الا اللہ میں چھپا ہوا ہے اور جو ہر قوم کے ترقی یافتہ مذہبی جذبات کا نصب العین
 ہے۔ اور اُن روحانی و اخلاقی حقائق کا بالاجمال اعادہ کرنے کے بعد جن کی تکشیف حضور
 سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ڈاکٹر فریہر نے جان اسلام کی عظیم النظر
 ملکی فتوحات اور قابل رشک تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام نے
 خود اپنے ہاتھوں سے سائنس کے اُس پودے کو سنبھالنا جسے عجائب خانہ اسکندریہ کے
 زلزلہ جاوید بانی بطلیموس سوڑنے لگا یا تھا لیکن جو نصراہنت کی بغیر زمین میں خشک ہو چکا تھا

اور یہ اسی آبیاری کا حقد تھا کہ علوم و فنون حکمت و فلسفہ صنائع و معادن کا وہ لہلہا تاج
 جن محل واداک کی سیر کے لئے تیار ہو گیا جس کے پھول یورپ و امریکہ میں آج نئی شگفتگی
 کے ساتھ جھک رہے ہیں۔ علوم جدیدہ کا دور وسطیوں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ نمود
 اسلام چھٹی صدی میں ہوا یہ ہزار سال کا زمانہ ان مسلسل و متوالی کوششوں سے بھر پڑا
 ہے جو علوم قدیمہ کے احیا اور علوم مروجہ کی بقا کے متعلق دینا نے اسلام کے طول و
 عرض میں ظاہر ہوتی رہیں اور یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سائنس نے جو شرفی گزشتہ
 پچیس سال میں کی ہے اُس کے لحاظ سے وہ اسلام ہی کا شرمندہ احسن ہے۔ گویا اسلام
 نے ایک ڈھلچ قائم کر لیا تھا جس پر یورپ نے گوشت و پوست چڑھالیا۔

تم نے قذیل سخن کو ہنڈ لیا تو کیا ہوا

ڈھلچ میں تو ہیں وہی انگلہ برس کی تسلیں

ایسی حالت میں جبکہ اسلام با بقول مصنف نصرانیت کی جنوبی شاخ نے جس کے نئے
 والے روئے زمین پر بقدتس کر و نفوس کے سوجدہیں سائنس کی ہم آہنگی و ہم صفیری کا یہاں
 دم بھرا ہو۔ ایسی حالت میں جبکہ ہادی عرب کے جانشینوں نے جاہلوں کو عالم۔ عامیوں
 کو فلسفی اور غلاموں کو شہنشاہ بنا دیا ہو۔ ایسی حالت میں جبکہ ہادی بطی سے ایک ابر رحمت
 نے اُٹھ کر مغرب و مشرق میں خیر و برکت کے و موفی برسائے ہوں کہ دنیا ابھی تک
 بزل رہی ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ کل مومنین اخوة کی منادی نے ارذل قرین اقوام کو
 مسند نشینان بزم شرافت کے پہلو میں جگہ دے کر حریت اخوة اور مساوات کے و نہر
 اصول قائم کر دیئے ہوں جن پر عمومیت کے ساتھ عمل کرنا صرف دینا نے اسلام ہی میں ممکن
 ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ لکم و لکم ولیین کا فرمان واجب الاذعان مسالمت اور رواداری
 کے و حقوق ادا کرتا ہو جن کا یہود و نصاریٰ جو سی و ہنود کو یکساں اعتراف ہے ایسی حالت
 میں جب کہ رب زدنی علما کی نصیحہ صریح نے جس میں لاکراہ فی الدین نے شان تاسیس پیدا کر دی

سے الحکمت خاتون المؤمنہ فحیث وجد الفواحق بها کی معنی مخلوق کے ساتھ ملکر علم و حکمت کو خواہ اس کا
 ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کی میراث قرار دیا ہو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اور علم
 کی سائی ایک اقلیم میں نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں جس میں بالآخر
 مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

بہر حال ڈاکٹر ڈبیر نے یہ کتاب لکھ کر ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کہ تلاش
 حق کا دروازہ کھول دیا ہے اس دروازہ کے اندر داخل ہو کر ہر شخص علی قدر توفیق گوہر
 مقصود سے اپنی جیب و دامن بھر سکتا ہے اور اگر اُسے مبداء فیاض سے ذوق سلیم ہے
 دوسرے لغظوں میں ایمان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے عطا ہوا ہے تو وہ اس نتیجہ پہنچ سکتا
 ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف ہیں۔

ظفر علی خاں

کرم آباد - پنجاب
 ۱۹۱۰ء

دیباچہ مصنف

جس شخص کو یورپ اور امریکہ کی روشن خیال جماعتوں کی ذہنی حالت واقف ہونے کا موقع ملا ہے اُس کو معلوم ہوا ہوگا کہ لوگ جانتے نہایت جلد جلد اور بہ نقد اور کثیر خرچ ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ اُس جماعت نے جو راست گفتاری اور صاف گوئی کے ادھٹا سے متصف ہے اس انحراف کو مخفی نہیں رکھا۔ لیکن ایک بہت بڑی جماعت ایسے ٹھٹھاس کی ہے جن کی بد اعتقادی بہت زیان خطرناک ہے اس لئے کہ اخلاقی جرأت کے فقدان کی وجہ سے یہ جماعت اپنے اعتزال کو علانیہ نہیں ظاہر کرتی +

یہ اعتزال اس قدر عمیم الاثر اور اس درجہ زبردست ہے کہ اس کو نہ تحقیر دیا جاسکتا ہے نہ تعزیر مناسبت ہے۔ اس کا سد باب نہ استحقاق و استہزاء ہو سکتا ہے نہ سب و شتم سے نہ جبر و تعدی سے۔ نہ سامت جلد جلد قریب آ رہی ہے جب کہ اس سے نہایت خطرناک سیاسی نتائج پیدا ہو کر رہیں گے +

دنیا کی حکمت عملی کے جسم سے قیسمت کی روح نکل چکی ہے۔ وہ جنگی جوش جو کبھی مذہب کی حمایت میں سرکھٹ نظر آتا تھا جھاگ کی طرح بجھ گیا ہے۔ اور اس کی بجی کچھی یاد گاریں حروب صلیبیہ کے اُن سوراٹوں کے مرمری مجسموں میں باقی رہ گئی ہیں جو گر جاؤں کے زمیں دوز مدفون میں محو آرام ہیں +

دول عظمیٰ نے پاپائیت کے مقابلہ میں جو روش اختیار کی ہے۔ وہ اس خطرہ کی آمد آمد کا پتہ دے رہی ہے جو مل نہیں سکتا۔ ن طاقت جس کا منظر پاپائے روم ہے یورپ کی دو ٹوٹ آبادی کے خیالات اور تئناؤں کی وکیل ہے۔ اس طاقت کو منسوب الی السما اور مامور من اشد ہو سنے کا دعویٰ ہے اور اسی دعوے کی بنا پر وہ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی سیاسی فوقیت بتقابلہ دول یورپ تسلیم کر لی جائے۔ اس کو اس جہالت کی تجدید و احیا پر اصرار ہے جو قرون وسطیٰ میں پائی جاتی تھی۔ اور وہ یہ بانگ مہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اس کی اور تمدن جدید کی ایک تعلیم میں سہائی نہیں ہو سکتی +

یہ منافقت جو ہیں مذہب اور سائنس کے درمیان نظر آ رہی ہے اس کشمکش کا تسلسل ہے جو اس وقت سے چلی آئی ہے جب کہ سیاسی اقتدارات کی باگ نصرائیت کے اٹھ میں اول اول آئی۔ الہام ربانی تردید کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کمال و بے عیب سمجھ کر مستوجب الترمیم ہونے سے سختی کے ساتھ ابراہیم اور اس ترمیم کو جو انسان کے نشوونما عقلی کی تقاضیات میں سے ہو۔ ازراہ حقارت و رد کر دے۔ لیکن انسانی علم کی اہل ترقی معلومات انسانی کے ہر شعبہ کے متعلق ہمارے مسائل میں تبدیلی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی +

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایک ایسی بحث کی اہمیت کے اظہار میں مبالغہ سے کام لے سکیں جس میں ہر ذی شعور انسان حصہ لینے پر خواہی بخواہی مجبور ہے؟ مذہب سے کیا منہ منہ ہالشان حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے پس ظاہر ہے کہ بجز ان اشخاص کے جن کی دنیوی اغراض موجود مذہبی عقاید کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں باقی تمام اشخاص کی صدق دل سے یہی خواہش ہوگی کہ حق کی تلاش کریں۔ وہ مسائل مابہ بحث کے متعلق پوری شخصیت پیدا کرنی چاہیں گے اور اس امر کے خواہش مند ہوں گے کہ مباحثہ کرنے والوں کے طرز اور روش پر روشنی ڈالی جاسکے +

سائنس کی تاریخ کو انفرادی اکتشافات کے ایک بے ربط مجموعہ کی کہانی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ان دو متخالف طاقتوں کی زور آزمائی کی داستان ہے جن میں سے ایک تر عقل و انسانی کی انتہائی قوت ہے اور ایک روایتی ایمان اور انسانی اغراض کی متفقہ انقلابی قوت ہے۔ کسی مصنف نے اب تک اس مسئلہ پر اس پہلو سے نظر نہیں ڈالی لیکن یہی وہ پہلو ہے جو سب سے زیادہ نکتہ آموز سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور سب سے زیادہ اہم مقام پر ہے۔

تج سے کچھ سال پہلے مصلحت اور صوابدید اسی میں سمجھی جاتی تھی کہ اس بحث کی پیشہ اشارہ تک نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس جھگڑے سے الگ ہی رہنے کی کوشش کی جائے۔ جماعت انسانی کا سکون نفس و اطمینان قلب اس کے مذہبی عقائد کے ثبات و مقام پر اس درجہ منحصر ہے کہ کوئی شخص بلا وجہ و موجب و محبت کافی ان عقائد میں خلل انداز ہونے کے کاغذ سے حق بجانب نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن چونکہ ایمان بالطبع غیر متغیر و غیر متحرک اور سائنس بالطبع متبدل اور ترقی پذیر ہے لہذا ان دونوں میں اس افتراق کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جو چھپانے سے چھپ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کا جو عقل کے دونوں طریقوں سے آشنائیں فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی رائے کا اظہار فرد تنی لیکن مضبوطی سے کریں اور نہ وہ سائنس کے حریفانہ دعویٰ پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ بلکہ دور رعایت فلسفیانہ انداز سے نظر استقامت و ادائیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو انسان کو وہ تمدنی و عمرانی تباہیاں آگھوس گی جن کا سلسلہ گونا گون مصیبتوں کے ساتھ مدتوں قائم رہے گا۔ جب یورپ کی قدیم بت پرستی اپنے ہی ذائقے کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تو نہ تو قیصران روم ہی لوگوں کے روحانی پیشوا بن سکے اور نہ اس زمانہ کے فلاسفہ ہی نے عقائد کا کوئی مضبوط مرتبہ کیا۔ بلکہ انہوں نے مذہب کو بحال خود چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جاہل اور غیظ آلود پادریوں۔ مگر گداؤں زخموں اور غلاموں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔

اس فحلت کبر نے کے باعث جو عقلی تاریکی یورپ پر چھا گئی وہ اب زائل ہو رہی ہے اور ہماری آنکھیں فہم و شعور کی صبح صادق کے نور سے منور ہونے لگی ہیں۔ جماعت انسانی طلع آفتاب کا شوق سے انتظار کر رہی ہے تاکہ اس کی روشنی میں اسے نظر آجائے کہ وہ بھٹکتی ہوئی کہ صحرائیں کھلی ہے اس کو صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ تمدن کا شاہ راہ پر اب تک سفر کرتا چلا آیا تھا اسے چھوڑ کر اب وہ ایک نئی ڈگر پر پڑ گیا ہے جو اسے ایک غیر معلوم سرزمین کی طرف لے جا رہی ہے +

اگرچہ ان خیالات نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا لیکن اس کتاب کے لکھنے اور جو خیالات اس میں ظاہر کئے گئے ہیں انہیں ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت مجھے پھر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ اگر میں نے یہ کتاب لکھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے موضوع پر میں نے مدتوں غور کیا ہے اور سالہا سال تک اس کے مباحث کی تنقید میں خلوص نیت اور صدق دل سے کام لیا ہے۔ ایک اور بڑی وجہ جو کہ اس کتاب کی اشاعت کی یہ ہوئی کہ یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ جو میں نے کچھ سال پہلے شائع کی تھی یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ چنانچہ یہ تاریخ نہ صرف امریکہ ہی میں کئی بار چھپ چکی ہے بلکہ انگلستان میں مکرر طبع ہونے کے علاوہ فرانسیسی جرمن روسی پولش سربین وغیرہ متعدد دیوبہین زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ”تاریخ خاندان جنگی امریکہ“ کے نام سے جو کتاب میں نے بہت بڑی محنت شاقہ و محنت شائع کی تھی اس کے مواد کی فراہمی کے دوران میں مجھے متخالف بیانات کے مقابلہ اور متخالف دعویٰ کے تقبیہ کا موقع بار بار ملا تھا۔ اہل امریکہ نے جن کی وقت نظر ڈالنا ضرور بحث کے انتقاد کے متعلق محتاج ایضاح نہیں قبولیت عام کی جو سند اس تاریخ کو ملنے کی وہ میرے لئے مزید حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی ہیں۔ میں نے مظاہر قدرت کی عملی تحریقات پر بھی بہت کچھ توجہ صرف کی تھی اور متعدد مشہور و معروف رسائل ان مضامین پر شائع کئے

تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مشاغل کی نذر کر دے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ سائنس کا درس دینے میں گزارے وہ عدم پاسداری اور حق پرستی کے ان اصولوں سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا جو فلسفہ کی نکتہ آمیزی کا حصہ ہیں۔ فلسفہ ہم میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنا لئے جس کی بھلائی کے لئے وقف کر دیں تاکہ جب ہماری مشغل زندگی کے گل ہونے کی گھڑی قریب آئی تو ہم اس کی مثالی ترقی میں گزشتہ واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور نہ ہوں کہ وہ مشاغل جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے پادروں اور دور از کار محض تھے۔

اگرچہ کوئی ایسی محنت نہیں جو اس کتاب کے لکھنے میں نے برداشت نہ کی ہو لیکن جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا ہے اُس سے عہدہ برانہ ہو سکنے کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ موضوع ہے جس کا حق ادا کرنے کے لئے مصنف کو سائنس، تاریخ، الکیات اور سیاسیات میں دسترس ہونی چاہئے اور اُس کی تصنیف کا ہر ورق معارف کا گنجینہ اور حقائق کا سفینہ ہونا چاہئے۔ لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دے لی ہے کہ یہ کتاب اُن تصانیف کا محض ایک دیباچہ یا مقدمہ ہے جو زمانہ موجود کے واقعات اور ضرورتوں کے اقتضا سے سپرد قلم ہو کر رہیں گی۔ ہم نے ایک بہت بڑے عقلی انقلاب کی دادی میں قدم رکھا ہے۔ آج کل جو لغو اور منفرخت کتابیں پڑھی جاتی ہیں اُن میں سے اکثر کا قائم مقام وہ دماغ آزما اور دانش آموز لٹریچر ہو جائے گا جس میں ہمارے روحانی مقاصد کے خطرات ایک نئی روح بھونک دیں گے اور نہ ہی جذبات ایک نیا جوش پیدا کر دیں گے۔

میں نے اس کتاب میں فریقین کے افعال و آثار کو بصراحت اور بلا راد و تحاییت درج کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے میں نے دونوں کے طرفدار بننے کی کوشش کی ہے۔

تاکہ ان میں سے ہر ایک کی وجہ تحریک کا اندازہ اچھی طرح سے کر سکوں لیکن ایک اعتبار سے جس کا مفہوم بہت کچھ ارفع و اعلا ہے میں نے اپنی مساعی کے دامن کو پاسداری کے دھبہ سے بچایا ہے اور دونوں کے کارنامے ہو ہو بیان کر دئے ہیں +

پس مجھے یقین ہے کہ جو حضرات اس کتاب پر نکتہ چینی کرنا چاہیں گے وہ اس امر کو ضرور پیش نظر رکھیں گے کہ اس کا مقصد فریقین میں سے کسی ایک کے آراء و دعاوی کی حمایت نہیں ہے بلکہ دونوں کے آراء و دعاوی کو بوضاحت و صراحت اور بلا ڈرنے یا جھجکنے کے صاف صاف بیان کر دینا ہے۔ میں نے ہر باب کی ترتیب میں عام طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ اول مذہب کا خیال پیش کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے حریف کا +

مضمون زیر بحث پر اس طور سے نظر ڈالتے وقت میں نے معتدل یا متوسط آراء کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں خیال کیا اس لئے کہ اگرچہ فی نفسہ ان کے قیسی و گرائی ہوئے میں شک نہیں لیکن اس قسم کے مباحث میں غیر طرفدار اور انصاف پسند ناظرین کو اعتدال پسندوں سے نہیں بلکہ انتہا پسندوں سے بحث ہوتی ہے اور انتہا پسندوں کی افراط و تفریط ہی سے نتائج مترتب ہو سکتے ہیں +

یہی وجہ ہے کہ میں نے مسیحیت کی دو بڑی شاخوں یعنی کلیسا نے پراسٹنٹ کلیسا یونان کا بہت کم ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر نے سائنس کے اچھا کے وقت سے ترقی علوم و فنون کی کبھی بھی مخالفت نہیں کی بلکہ انہا اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ سچائی کو خواہ اس کا ماخذ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس نے ہمیشہ بنظر استحسان و احترام دیکھا ہے۔ حقائق الہامی کی جو تعبیرات اس نے کی ہیں ان کو سائنس کے اکتشافات سے بظاہر متعارض پا کر اس نے ہمیشہ یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس مخالفت و مناقضت کی شافی تاویل ہونے کے بعد فریقین میں مصالحت ہو جائے گی اور اس امید میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی۔ تمدن جدید کے

بچے ہوتے اگر کلیسا نے رومانے ہی روش اختیار کی ہوتی +

مسیحیت کا ذکر کرتے ہوئے عام طور سے کلیسائے روم یا ہی کا حال اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ مسیحی دنیا کی آبادی کا جزو غالب اسی کلیسا کا پیرو ہے۔ کچھ اس لئے کہ اس کے مطالبات حد سے زیادہ بالغ فی الادعا ہیں اور کچھ اس لئے کہ ان مطالبات کا نفاذ اس نے عموماً بزور حکومت کرنا چاہا ہے۔ پرنسٹن کلیساؤں میں سے کسی کو ایسا خود مختارانہ درجہ نصیب نہیں ہوا اور کسی کا سیاسی رسوخ اس درجہ عظیم الاثر نہیں ثابت ہوا۔ ان کلیساؤں نے اول تو جبر و مزاحمت کو رد اہی نہیں رکھا اور اگر گنتی کی چند صورتوں میں انہوں نے جابرانہ طرز عمل اختیار کیا بھی ہے تو وہ فتوائے عدت کے صدور کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتا +

سائنس کے طرز عمل پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کبھی بھی زور حکومت کو اپنا طرف دار بنانا نہیں چاہا۔ اُس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ کسی انسان کو بوجہ اُس کے عقائد کے بدعتی قرار دے یا اُس کے تمدنی حقوق کو پامال کرے۔ اپنے مسلمات یا خیالات کی توثیق یا اشاعت کی غرض سے اُس نے کبھی کسی شخص کو عقاب روحانی یا عذاب جسمانی میں مبتلا نہیں کیا اور سزاے موت کا تو ذکر ہی نہیں۔ اُس کے دامن پر قساوت و بے رحمی اور معصیت و جرائم کا وہبہ نہیں کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم محکمہ احتساب عقائد کے کارناموں کو یاد کر کے پاپائے روا کے قصور و بیشک کے اندر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ ہاتھ جو اس وقت دعا کے لئے ارحم الراحمین کی جناب میں اٹھتے ہوئے ہیں بے گناہوں کے غن سے رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں +

تایخ نگاری کے دو طریقے ہیں۔ شاعرانہ و عالمانہ۔ اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ واقعات و حوادث انسان کے تابع ہیں ماسی لئے ان تصانیف میں جو اس طریقہ کے

مطابق لکھی جاتی ہیں کسی سربراہ آوردہ شخص کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور اُس کے حیرت انگیز کارناموں کی تصویر کھینچ کر اُسے کسی قصہ کا سورما بنا دیا جاتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر کی رو سے معاملات انسانی ایک مسلسل زنجیر کے مشابہ ہیں جس میں ہر واقعہ کسی واقعہ سابقہ کا معلول اور کسی واقعہ آئندہ کی علت ہے اور اس اعتبار سے واقعات انسان کے تابع نہیں ہیں بلکہ انسان تابع واقعات ہے۔ طریقہ اول الذکر ان تصانیف کا ذمہ دار ہے جو خواہ کیسی ہی دلچسپ اور دل پسند کیوں نہ ہوں لیکن اُن کا درجہ حقیقت میں انسانوں اور قصوں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے۔ طریقہ ثانی الذکر بالکل ہی روکھا پھیکا ہے بلکہ شاید موجب استکراہ بھی ہو اس لئے کہ وہ ہم پر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قانون کی جستجو اہل اور انسان کی کوشش ناچیز ہے۔ جو مہتمم بالشان مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہے اُس کو خیال آرائی و ابغوجہ آخرینی سے کوئی تعلق نہیں۔ اُس شخص کو جسے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہو مقرر کے اُس تسلسل پر اپنی نگاہ جلائے رکھنی چاہئے جو تاریخ عالم میں پایا جاتا ہے اُسے پاپاؤں اور مدبروں اور شہنشاہوں کی پرچھائیوں کی طرف سے جو مصلحتی پھرتی چھاذل کی طرح ہیں ازراہ تحقیق منہ پھیر لینا چاہئے +

اگر شاعرانہ تاریخوں کے ساقط الاعتبار ہونے کے ثبوت کی ضرورت ہو تو ہمارا ذاتی تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ہمارے ہم نوالہ وہم پیالہ دوست بھی ایسا اوقات ہمارے روزانہ اعمال کی حقیقی نیتوں سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اور اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ارادوں کی غلط تاویل کرتے ہیں پس جب اُن واقعات کی یہ حالت ہے جو روزمرہ ہماری نگاہ کے سامنے گزرتے ہیں تو اُن اشخاص کے کارناموں کی نسبت کوئی قطعی حکم لگانا تو صریحاً ناممکن ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کی ہم نے صورت تک نہیں دیکھی +

مضامین زیرِ غور کے انتخاب و ترتیب میں ایک حد تک قویں نے اُس کونسل کی

رونداوسے مدلی ہے جو بصدارت پاپا بچلی مرتبہ روم میں منعقد ہوتی تھی اور ایک صد تک واقعات تاریخی کی ترتیب سے۔ حضرات ناظرین دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جن مسائل پر ہم اب غور کر رہے ہیں وہ وہی ہیں جن پر قدیم فلاسفہ یونان نے بحث کی ہے یعنی خدا کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ دنیا کا انتظام کس طرح چلتا ہے؟ کیا حق کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود ہے؟ جو ناظرین ان فرامض کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ”آیا ہم نے ان مسائل کو ان سے بہتر حل کیا ہے؟“

القصد اس کتاب کے مقدمات کی ترتیب حسب ذیل ہے:-
میں نے اول جدید سائنس کا علوم قدیمہ سے مقابلہ کر کے اور یہ دکھا کر کہ نظریات پر مبنی ہونے کے بجائے اس کا انحصار مشاہدہ تجربہ اور مہندسانہ مباحثہ پر ہے ثابت کیا ہے کہ اس کی ابتدا مقدونی فتوحات کی وجہ سے ہوئی جنہوں نے ایشیا اور یورپ میں تعلق پیدا کر دیا۔ ان فتوحات پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اور عجائب خانہ اسکندریہ کے مختصر حالات بیان کر کے میں نے جدید سائنس کی فوجیت اور خصوصیات کی توضیح کی ہے پھر میں نے برہیل ایجادِ ظہور مسیحیت کے مشہور واقعات کا اعادہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے ترقی کرنے کے لئے شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے اور بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو جانے کے باعث جو سلطنت روم کا مروجہ مذہب تھی اس کی شکل باطل تبدیل ہو گئی۔ چونکہ اس کو صاف معلوم ہو چکا تھا کہ سائنس کا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس نے اسکندریہ کے فلسفیانہ مدارس جبراً بند کر دیئے اور اس کا زروانی پر اس کی سیاسی ضرورتوں نے اسے مجبور کیا +

نصر اینست اور سائنس کو ایک دوسرے کا حریف ظاہر کرنے کے بعد میں نے ان کی پہلی علائقہ زور آزمائی یعنی اصلاح اولیٰ یا اصلاح جنوبی کی داستانِ قبلہ

کی ہے۔ اس تنازع میں امر باہ النزاع نہایت ذات باری تعالیٰ تھا۔ اس کا نتیجہ طور
اسلام ہوا جس نے ایشیا اور افریقہ کا بہت بڑا حصہ اور بیت المقدس اسکندریہ اور کابج
کے تاریخی شہر مسیحی دنیا سے چھین لئے اور وحدانیت خدا کے اصول کو اُس مملکت
بہت بڑے حصے میں شائع کر دیا جس پر کبھی رومنہ الکبرئے کا پھر براؤن تھا +

اس سیاسی واقعہ کے بعد سائنس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور عربوں کے
مالک محروسہ میں دارالعلم مدارس اور کتب خانے جا بجا قائم ہو گئے۔ کشور کشایان اسلام
نے جو عقل و ادراک میں بسرعت تمام ترقی کر رہے تھے ماہیت ذات باری کے اُن
تجسیمی خیالات کو جو اُن کے عامیانہ عقائد میں لے ہوئے چلے آتے تھے ترک کر دیا
اور ان کے بجائے اُس قسم کے کچھ فلسفیانہ عقائد اختیار کر لئے جن کا طور بد توں پہلے
ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت روح انسانی کے متعلق علم اور مذہب
میں دوسری نزاع پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں فلسفہ ابن رشد کو ترقی ہوئی اور مسائل انفصال
و انجذاب نے رواج عام پایا۔ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام پر محکمہ اعتبار عقائد یورپ سے
ان مسائل کو خارج کرنے میں کامیاب ہوا اور اب وینکیں کونسل نے باضابطہ طور پر مذہبی
رسموں کے ساتھ اُن کی تکفیر کر دی ہے +

اس اثنا میں ہیئت جغرافیہ اور دوسرے علوم کے اکتساب کی بدولت نظام شمسی
میں زمین کے مرتبہ اور دوسرے اجرام سماوی کے ساتھ اُس کے تعلق اور ترکیب کائنات
کے متعلق صحیح خیالات قائم کئے جا چکے تھے۔ اور چونکہ مذہب کو جو کتب مقدسہ کی آیات
کی اُس تاویل پر مبنی تھا جو تفسیر راشدہ و صحیح تصور ہوتی تھی اس امر پر اصرار تھا کہ زمین مرکز
کائنات ہے اور موجودات میں کوئی شے لمحاظ عظمت و شان اس سے لگتا نہیں کھاتی لہذا
تیسری نزاع برپا ہو گئی۔ اس جنگ میں سائنس کا علم بردار گلیلیو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو شکست
فاش ہوئی اُس کے بعد ایک اور ضمنی بحث دنیا کی عمر کے بارہ میں چھڑ گئی۔ کلیسا کو اصرار تھا کہ

دنیا کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے۔ اس بحث میں بھی اُسے نک اٹھانی پڑی +

تاریخ اور سائنس کی روشنی سے یورپ میں بتدریج اُجالا ہو رہا تھا۔ سولہویں صدی میں رومانی نصرانیت کا اقتدار اور اثر بوجہ اُن عقلی زکوں کے جو اُسے اٹھانی پڑی تھیں اور نیز باعث اپنی سیاسی اور اخلاقی حالت کے بہت کچھ گھٹ گیا۔ بہت سے ارباب زہر و اتقا کی نظر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ مذہب خود اُن خرابیوں کا ذمہ دار نہ تھا جو اُس میں پائی جاتی تھیں بلکہ ان مفاسد و ذمائم کا باعث وہ رشتہ اتحاد تھا جو اُس نے زمانہ قدیم میں روم کی بت پرستی کے ساتھ قائم کر لیا تھا۔ پس اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ قرونِ اولیٰ کی پاک اور صاف نصرانیت کی طرف عود کیا جائے۔ اس طور پر وہ چوتھی نزاع باپائی ہوئی جو اصلاح اُخْلے یا اصلاحِ شمالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس نزاع نے جو خاص شکل اختیار کی وہ معیار حق سے تعلق رکھتی تھی یعنی سچائی کا معیار اصلی کلیسا ہے یا بائبل۔ اس بحث کے تصفیہ میں حریت عقل کا شاخسانہ نکل آیا یعنی امور عقلی میں ہر انسان کو شخصی اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ لوہقر نے جو اس دور کا سب سے زیادہ مشہور و سربرآوردہ شخص ہے اپنے مقاصد کی تکمیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور جب جنگ کے بعد دونوں حریف الگ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ شمالی یورپ رومانی نصرانیت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے +

اب ہمارے سامنے یہ بحث ہے کہ انتظامِ عالم کس طرح چل رہا ہے۔ آیا اس انتظام کا تکفل خدا کی متسلل و متوالی مداخلت سے متعلق ہے یا اذلی و غیر متغیر قانون سے سچی دنیا کی عقلی تحریک نشوونما کے اُس نقطہ پر اب پہنچی ہے جس پر عربی و ملغ و سویس اور گیارھویں صدیوں میں پہنچ چکا تھا اور اُن مسائل پر جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کے پیش نظر تھے اب مکرر غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ارتقا۔ مسئلہ پیدائش۔ مسئلہ نشوونما۔ مسئلہ تولید و مباحث ہیں جو انیسویں صدی کی نصرانیت کو دسویں صدی کے اسلام سے ترکہ میں ملے ہیں +

میر خیال ہے کہ ان عام عنوانات کی ذیل میں اس مہتمم بالشان مباحثہ کے تمام

اصولی نکات آجائیں گے۔ اور ان جامع ابواب کی تحت میں واقعات زیر غور کو جمع کرنے اور ہر مجموعہ پر جداگانہ بحث کرنے سے ہمیں ان کے باہمی تعلق اور ان کی تاریخی ترتیب کا صحیح صحیح علم ہو جائے گا۔

سائنس اور مذہب کی ان معرکہ آرائیوں کی داستان میں نے حتی الامکان ہر ترتیب زمانی سپرد قلم کی ہے اور بہ نظر تکمیل و اتمام ذیل کے تین ابواب کا اضافہ اصل بحث پر کر دیا ہے۔

(۱) لاطینی نصرانیت نے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچایا۔

(۲) سائنس سے تمدن جدید نے کیا فیض پایا۔

(۳) مذہب اور سائنس کی عنقریب چھڑنے والی جنگ میں وٹیکن کونسل کے اعلان کے

محاذ سے رومانی نصرانیت کا رویہ۔

حق و راستی کی جستجو میں اکثر اشخاص نے مختلف مذہبی فرقوں کے تنازعات کی جزئیات پر اپنی توجہ کو اس حد تک صرف کر رکھا ہے کہ وہ یوں کا بھگڑا جس کے تاریخی واقعات سے ان ادراک میں بحث ہے لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ میں نے مستقیم الغرم ہو کر کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو بلا رو و رعایت لکھوں اور فریقین کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے حق کو ہرگز نہ چھپاؤں۔ اس امر کا اندازہ کہ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے میں ناظرین اور الاباب کے حق پسندانہ فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔

جان ولیم ڈی بیپر

نیویارک یونیورسٹی

دسمبر ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرکہ مذہب و سائنس

پہلا باب سائنس کی ابتدا

یونانیوں کی مذہبی حالت چوتھی صدی قبل مسیح میں سلطنت ایران پر حملہ آور ہو کر
وہ قدرت کے نئے نئے مناظر دیکھتے ہیں اور نئے نئے مذاہب سے واقفیت
حاصل کرتے ہیں مقدونی فوج کشی سے فن حرب فن انجیری اور سائنس کو
جو تحریک پہنچتی ہے اسکندریہ میں ایک دارالعلم کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔
یہی دارالعلم جس میں تجربہ شادہ اور ہندوستان تنقید کے ذریعہ سے علوم
وفنون کی ترقی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں سائنس یعنی علوم وفنون کا سرچہ
قرار پاتا ہے۔

ارباب فکر و دانش کی نظر میں کوئی سماں اتنا دردناک نہیں ہوتا جتنا کسی پرانی مذہب کا
زوال اور وہ بھی اوس مذہب کا زوال جس نے اپنے زمانہ میں بنی نوع انسان کی کئی نسلوں

کے لیے تسکین روحانی کا سرمایہ ہم پہنچایا ہو۔

سفرِ سیح علیہ السلام کی ولادت سے چار سو سال پہلے یونان علم و حکمت میں اتنی جلد جلد ترقی کر رہا تھا کہ قدیم مذہب کی قبا اوس کے قاست پر تنگ ہو چلی تھی۔ وہاں کے فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانینِ فطرت کی عظمت و جبروت کے مقابلہ میں اولیٰ پس کے دیوتاؤں میں سخت حقیر اور ذلیل نظر آئے۔ مورخوں نے جب معاملاتِ سیاسی کے انضباط و ترتیب اور افعالِ انسانی کی ہمواری و باقاعدہ روش پر نگاہ ڈالی اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ دنیا میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آتا جس کی کوئی صریح علت کسی واقعہ سابقہ کی شکل میں موجود نہ ہو تو انہیں شبہ ہوئے لگا کہ کہیں وہ مجھڑے اور آسمانی نشانات جن سے عہدِ عین کے سفائن معمور ہیں محض من گھڑت قصہ کہانیاں ہی تو نہیں۔ اور جب فوق القدرت واقعات کا ظہور موقوف ہو گیا تو یہ بدیہی سوال پیدا ہوا کہ کیا وجہ ہے کہ کسی دیوتا کے منہ سے اب کوئی پشین گوئی سننے میں نہیں آتی اور کرامات و عجائبات کا دروازہ مطلقاً سدود ہو گیا ہے۔

قدیم روایات نے جو قرنہا قرن سے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں اور جنکی صداقت خوش عقیدہ اشخاص کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی چلی آئی تھی جزا سربجہ روم اور ارضِ مقدس کو فوق العادت عجائبات سے آباد کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان ممالک کی نسبت عام طور سے مشہور تھا کہ وہاں عجیب الخلق ہستیاں مثلاً جادوگر۔ جادوگر نیاں۔ دیو۔ بھوت۔ چرملین۔ پردار سانپ کے بالوں والی بلائیں۔ نصف انسان اور نصف گھوڑے کے دھڑ والی آفتیں اور یہ کچھ غفریت

ملہ یونان کے مروجہ بت پرستی میں ایک پہاڑ ہے جس کا ارتفاع ۹۴۹ فٹ اور حد اشج کی بلندی ۹۰۰۰ فٹ ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو نہایت وسیع و فراخ ہے ہر وقت بادلوں کا ایک گھٹا ٹوپ چھایا رہتا ہے۔ ہومر اور اوس کے بعد کے زمانہ کے یونانی شعرا کا یہ عقیدہ تھا کہ اس چوٹی پر مہادیوتا زیوس جیسا کہ دوسرا نام جو پیٹر تھا دوسرے چھوٹے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ رہتا ہے اور وہاں سے یہ سب جب چاہتے ہیں بادلوں میں پلٹے ہوئے آسمان کو چلے جاتے ہیں۔ مترجم

ہستے ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کو متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے جس میں مہادیوتا زیوس دیوتاؤں اور اودن کی بیویوں اور آشناؤں کے حلقہ میں دربار کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کے مشاغل بھی نوعیت میں انسانی مشاغل پر تفوق نہ رکھتے تھے یعنی آسمان والے بھی زمین والوں کی طرح جذبات بہیمیہ و اعمال سیئہ سے بری نہ تھے۔

یونان کے ساحل کی انسانی ہیئت نے ایک ایسے مجمع الجزائر کے موزوں موقع کو ساتھ مل کر جس کے بعض جزیرے خوشنمائی اور دلگیری کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنی آپ نظر میں یونانیوں میں جہاز رانی جغرافیائی اکتشاف اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قائم کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ اودن کے جہاز بحیرہ اسود اور بحیرہ روم میں چکر لگانے لگے اور قرب و جوار کے سمندر دنگ چپے چپے اونہوں نے چھان مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمہ ا نشان عجائبات جن کی شنا و صفت سے کتاب ”اڈیسی“ کے اوراق مزین تھے فرضی ڈھکوسلے ثابت ہوئے۔ قدرت کی واقعات کے متعلق جب زیادہ تجسس و تفحص سے کام لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آسمان محض فریب نظر کا نام ہے اور اولمپس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اگر ہیں تو تارے ہیں یا فضا بے بیضہ غرض مکان کے ساتھ مکین بھی تشریف لے گئے نہ ”ایونین“ خاندان کے معبود باقی رہے جس کا ذکر ہومر نے کیا ہے اور نہ ”ڈرک“ قبیلہ کے دیوتا جن کے بھیج مہیسا نڈ نے گائے ہیں۔

۱۔ کتاب ”الید“ کے شہرہ آفاق مصنف ہومر یونانی کی دوسری منظوم تصنیف کا نام۔ ہومر کا زمانہ حضرت مسیح کی ولادت سے نو سو چالیس سال قبل بیان کیا جاتا ہے۔ گویا حضرت سلیمان کی ولادت سے کوئی رس بارہ سال بعد۔ ”اڈیسی“ کو ایک لحاظ سے ”الید“ کا جو یونان کی مہا بھارت ہی ضخیم سمجھنا چاہئے۔ مترجم

۲۔ یہاں اولمپس کے یعنی جسی وجود سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مصنف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولمپس جو دیوتاؤں کا مسکن سمجھا جاتا تھا تحقیقات کرنے پر ایک ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ مترجم

۳۔ ایک قدیم یونانی شاعر جس نے آٹھویں صدی قبل مسیح کا وسطی زمانہ پایا ہے۔ اسکی تصانیف جسکی زبان ہومر کی زبان سر ملتی ملتی ہے جو مثنوی میں شایع ہو چکی ہیں۔ مترجم

لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ اتنا بڑا انقلاب بغیر کسی مزاحمت یا مخالفت کے واقع ہو گیا۔
 اولاً عوام الناس خصوصاً اہل مذہب نے متشککین کے اٹھتے شبہات پر لامذہبی کا فتویٰ
 لگایا۔ انہوں نے غلطیوں میں سے بعض کا مال و اسباب ضبط کر لیا بعض کو جلا وطن کر دیا اور
 بعض کو قتل کر ڈالا۔ اون کا دعویٰ یہ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزار ہا برس سے مانتے چلے آئے
 ہیں وہ ضرور سچے ہیں ورنہ اتنی مدت تک قائم کیوں رہتیں لیکن جب شہادت مخالف
 اس قدر بردست ہو گئی کہ اوس کا کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا تو انہیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ یہ
 عجائبات استعسا سے تھے جن کے پردے میں قدما کی دانش و حکمت نے بہت سے مقدس
 و پوشیدہ رموز و نکات کو ظاہر کیا تھا۔ اگرچہ خود ان کے دل میں بھی یہ خدشہ پیدا ہو چکا کہ ممکن
 ہے کہ جن باتوں کی ہم حمایت کر رہے ہیں اون کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہ ہو لیکن چونکہ
 مذہب کا اثر دل پر قوی تھا لہذا اون کی کوششوں نے یہ صورت اختیار کی کہ اپنے معتقدات
 کو اپنے عقلی و ادراکی نشو و نما کے ساتھ تطبیق دینے لگے۔ لیکن ممکن نہ تھا کہ یہ کوششیں بار آور
 ہوں۔ اس لیے کہ یہ امر مقدرات سے ہے کہ انسانی رائے خاص خاص مدارج ارتقا طی کر کے
 بعد ایک خاص نقطہ پر جا کر ٹھہر جائے۔ انسان جس عقیدہ کو حرمت اور توقیر کی نظر سے دیکھتا ہے
 اول اول اوس کے متعلق اوس کے دل میں شبہات و شکوک ناشی ہوتے ہیں۔ تشکک کے
 بعد تاویل کا دوڑ ماتا ہے۔ تاویل مہمل بہ اختلاف ہو جاتی ہے۔ اور اختلاف کل عقیدہ کو ایک
 فرضی افسانہ سمجھ کر انکار کی انتہائی اور قطعی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فلاسفہ اور مورخین کے بعد شعرا کے اعتزال کی باری آئی۔ یورپیڈیز پر فاسد العقیدہ

یونانی ڈراما نویس کی اوس صنف میں جس کا خاتمہ مسرت پر ہوتا ہے یورپیڈیز ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔
 اسے قبل مسیح میں بمقام سلاطین پیدا ہوا۔ فلسفہ۔ بلاغت۔ طبیعیات میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اول اول اس کا
 پیشہ نقاشی تھا۔ اس کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ سقراط سے اس نے تعلیم تو نہیں پائی مگر اوس کے زمرہ
 احباب میں ضرور شریک تھا۔ فلسفیانہ عقاید رکھنے کی وجہ سے اہل ایتھنز اوس کے (بقیہ مضمن بر صفحہ آئین)

ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ارسطو کفر بکنے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوئے بچا۔ لیکن جن لوگوں کی اغراض بے بنیاد باتوں کی حمایت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور ان کی مجنونانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ اس عقلی بل چل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگے یہاں تک کہ عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

قومی مذہب کے اس استیصال میں اہل یونان کے فلسفیانہ اکتشافات کو اور ان کی حکیمانہ تنقید سے بہت کچھ مدد ملی تھی۔ اسی تنقید کا نتیجہ تھا کہ عقاید مردوجہ کے متعلق جو عام شکوک پھیل گئے تھے اور ان کی تائید میں شواہد و دلائل کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ اور مختلف مذاہب کے عقاید کے باہمی مقابلہ سے اور لواقص کی بنا پر جو ان میں پاسے گئے یہ ثابت کیا گیا کہ انسان کے پاس حق اور صدق کا کوئی معیار نہیں۔ نیکی اور ہدی کے خیالات اس عالم کون و نسار میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ مطلقاً تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ ایک ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اچھائی اور بُرائی نیکی اور بدی محض چند اعتبارات کا نام جنہیں بنی نوع انسان نے اپنے فواید کے لحاظ سے قائم کر رکھا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) دشمن جان ہو گئے اور اس زمانہ کے مشہور نثریال ارسٹوفینس نے اس کی جو کوی۔ یہاں سے جان بچا کر وہ مقدونیہ کے دربار میں جا پناہ گزین ہوا لیکن دو شاخوں سے وہاں بھی اس کی جھڑپ ہو گئی اور انہوں نے اس پر کتے چھوڑ دیے جنہوں نے اسے چیر بھاڑ ڈالا۔ اس کا انتقال شکستہ قلب میں ہوا۔

اٹھارہ کتابیں اس کی تصنیف سے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مترجم لے ڈراما نویس کے اسی شعبہ کا جس کا اوپر ذکر ہوا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ۳۵۰ ق م میں یونان کے شہر ایتھنس میں پیدا ہوا اور ۳۰۰ ق م میں بمقام گیلاد واقع ہمزہ نمائے سسلی وفات پائی۔ سول میر تھان کی جنگ اور اس کے دس سال بعد ۳۰۰ ق م میں سلاطین کی مشہور بحری لڑائی میں شریک ہوا۔ شرتھانگ اس کی تصنیف سے ہیں جن میں سے مرن سات ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کا طرز ادب نہایت دلکش ہے اور عبارت نہایت سلیس سمجھی جاتی ہے۔ ڈراما میں مکالمہ کا طریقہ اوس کا رواج دیا ہوا ہے۔ مترجم

ایہ تفسر میں بعض فرستے تو یہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف انہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیکھی اُن بوجھی اور فوق القدر ہستی کا وجود ہو سکتا ہے بلکہ وہ دنیا کو ایک خواب پریشان ایک خیال موہوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔ یونان کی ماہیت ارضی و طبعی کا اثر اس کی پولیٹکل حالت پر بھی پڑا۔ اس نے اہل یونان کو متعدد جماعتوں میں تقسیم کر دیا جن کی اغراض مختلف اور مقاصد جداگانہ تھے۔ اور یہ بات ناممکن ہو گئی کہ اون کی ایک حکومت قائم ہو۔ اون مسلسل خانہ جنگیوں نے جو یونان کی رقیب ریاستوں کو ایک دم چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں اس کی ترقی رفتار کو روک دیا۔ ملک کی مالی حالت سقیم تھی اور ملک کے سربراہ اور وہ لوگ جاہل و نادان تھے۔ وہ جب وطن کی بے بہا جنس کو مالک غیر کے سیم و زر کے بدلے فروخت کرنے میں ذرا پس پیش نہ کرتے تھے اور ایرانی رشوت کی قربانگاہ پر یونانی اغراض کی بھینٹ چڑھانا اون کے لیے سادات ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فنونِ بُت تراشی و تمیہ کے اون محاسن نے جنکی دلاویزی و رعنائی آج تک دنیا میں اپنی مثال آپ بھی گئی ہے یونان کو حسنِ صوری کا اس حد تک شیفتہ و دالہ بنا دیا تھا کہ اس میں حسنِ معنوی یعنی سعادت و صداقت کے عملی امتیاز کی قسا بلیت سلب ہو گئی تھی۔

یونان کا جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو خود مختاری و حریت کے اون خیالات کی بدولت جو وہاں پھیلے ہوئے تھے ایران کے باجگذا رہنے سے انکار کر دیا لیکن ایشیائی یونان بلا تامل اس کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس زمانہ میں سلطنت ایران رقبہ میں موجودہ یورپ کے نصف کے برابر تھی۔ ایک طرف اس کے ساحلون کو بحرِ روم۔ بحیرہ ایجیئن۔ بحیرہ اسود۔ بحیرہ خزر کی موجیں بوسہ دیتی تھیں۔ دوسری طرف اس کی سرحد بحرِ قزقم۔ خلیج فارس اور بحرِ ہند سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے میدانوں اور وادیوں کو دنیا کے سب سے بڑے چھ دریا فرات۔ دجلہ۔ انڈس۔ جیون۔ سیون اور نیل جن میں سے ہر ایک کا طول ہزار میل سے زیادہ تھا۔

سیراب کرتے تھے۔ اس کی سطح سمندر کی سطح سے کہیں تیرہ سو فٹ نیچی اور کہیں بیس ہزار فٹ بلند تھی۔ اور اسی نشیب و فراز کا نتیجہ تھا کہ اس میں ہر قسم کی نباتی پیداوار موجود تھی اور معدنی دولت کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ میڈیا اور بابل کا جاہ و جلال اور اسیر یا اور کا آئینہ کی عظمت و تمکنت اسے متفقہ و مشترکہ طور پر ترکہ میں ملی تھی اور یہ وہ دولتیں تھیں جن کے تاریخی کارنامے بیس صدیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

ایران یورپین یونان کو سیاسی پہلو سے ہمیشہ تعمیر و تہذیب میرزا بھٹارا اس لئے کہ اس کا رقبہ کسی ایرانی صوبہ کے نصف کے مساوی بھی نہ تھا۔ لیکن جو چڑھائی ان اس سرکش علاقہ کو نیچا دکھانے کے لئے ایران نے وقتاً فوقتاً کین اون کے اثنائین او سے یونانیوں کی جنگی قابلیت کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایرانی افواج کے سب سے زیادہ جانبدار اور جری دستے اون یونانی سپاہیوں سے مرکب تھے جنہیں فرمان روایان ایران فیض قرار معاوضے دیکر نوکر رکھ لیا تھا۔ افواج ایران کے سپہ سالار اور ایرانی جہازوں کے بیڑے کے امیر البحر تک بعض دفعہ یونانی ہوتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں کے دوران میں جنہوں نے ایران کو طوایف الملوک کا موقف بنا دیا تھا تخت و تاج کے دعوے داروں کی رقبہ اند کویشن بسا اوقات یونانی سپاہیوں ہی کے مردانہ اوصاف کی شرمندہ احسان ہوئیں۔ ان نبرد آزماؤں سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت اہم تھے۔ بہادر اور جنگجو یونانیوں نے جن کے جوہر سپہگری کو اب تک ایران کے روپیہ بے خرید رکھا تھا ایک نظر میں معلوم کر لیا کہ سلطنت رو بہ انحطاط ہے اور تلوار کے زور سے تخت تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ

۱۔ اس مقام کا ٹھیک موقع تو معلوم نہیں لیکن زونون نے جو حالات اس جنگ کے جوہان سنائے کہ ۶۰۰ میں ہوئی بیان کئے ہیں اون سے نتیجہ نکالا گیا جو کہ بابل سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال و مغرب دریائے فرات کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ یہ جنگ کینخسرو خسرو ایران اور اس کے بھائی اردشیر میں ہوئی تھی۔ سائیرس مارا گیا اور اردشیر فتح یاب ہو کر تخت نشین ہوا۔ مترم

کے میدان جنگ میں سائرس کے کام آنے کے بعد زونون کا اپنے دس ہزار ہمراہیوں کو ایران سے صحیح وسلامت لے نکلنا ایک ایسا زندہ جاوید واقعہ تھا جس نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ بالکل ممکن ہے کہ یونانی فوج قلب ایران پر ترک تاز کرے اور وقت آپڑے تو صحیح وسلامت واپس چلی جائے۔

زرکسیس نے ہیلسپانٹ پر چل باندھ کر اور کوہ ایٹھاس کی خاکناے کو اجناے کی شکل میں بدل کر یونانیوں کے دلوں پر ایشیائی سپہ سالاروں کی جنگی قابلیت کا سکھ بٹھا دیا تھا لیکن سلاسل پلینیا اور مائیکیل کی لڑائیوں نے یہ نقش محو کر دیا۔ ایران کے مالامال صوبوں کو تاخت و تاراج کرنے کی ہوس کا ایک طوفان اون کے دلوں میں اُمنڈ آیا۔ اسپارٹا کا بادشاہ اگیسیلیس اسی خواہش کے اقتضائے ایران پر چڑھ دڑا اور کئی نمایاں فتوحات حاصل کیں لیکن ایرانی گورنمنٹ نے اس موقع پر اپنی قدیم حکمت عملی سے کام لے کر اوس کی پیش قدمی کو روک دیا یعنی اسپارٹا کی ہمایہ ریاستوں کو رشوت دے کر خود اسپارٹا پر حملہ کرا دیا۔ اگیسیلیس کو اب اپنے گھر کی پرگئی اور جب جہاز پر سوار ہو کر وہ اسپارٹا کو واپس جانے لگا تو یہ تلخ اور تعزیریں آمیز جملہ اوس کے منہ سے نکلا کہ ”آہ میں مغلوب بھی ہوا تو فقط تیس ہزار ایرانی تیر اندازوں سے“ اس سے اوس کی مراد ایرانی سکے ”دارک“ سے تھی جس پر تیر انداز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد فیلقوس شاہ مقدونیہ کو ایک زیادہ تر اہم مقصد نے ایک بہت بڑے

بلے مجمع الجزائر یونان کے ایک جزیرہ کا نام ہے جو ایٹھنر کے قریب واقع ہے۔ اس کا رقبہ کوئی دس مربع میل ہو گا۔ جس جنگ کی طرف متن میں اشارہ ہے وہ ایک بحری لڑائی تھی جو سنہ ۴۹۰ ق م میں ایرانیوں اور یونانیوں میں ہوئی اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ مترجم

لے یونان قدیم کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو شہر طبریز سے ساڑھے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ سنہ ۴۹۰ ق م میں یہاں ایرانیوں اور یونانیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ مترجم

جنگی چاہنے پر ان کوششوں کی تجدید و احیا کا خیال دلایا۔ تمام یونانی ریاستوں کو اوس نے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اوسے یونان کی افواج متحدہ کا سپہ سالار اعظم قرار دیں نہ اس غرض سے کہ صوبجات ایران کو تاخت و تاراج کیا جائے بلکہ اس غرض سے کہ دولت ایران کو مسخر کر کے یونان کا حلقہ بگوش بنالیا جائے۔ ابھی اس عظیم الشان مہم کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ وہ قتل کر ڈالا گیا اور اوس کا بیٹا سکندر جو ابھی بالکل نوجو تھا اوس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ فیلقوس کے قتل کے بعد یونانیوں کی ایک عام مجلس شوریٰ بمقام کارتھ منعقد ہوئی تھی اور اوس میں بالاتفاق یہ قرار پایا تھا کہ سکندر اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے۔ اہنی دنون الیر یا میں کچھ فدا اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے اپنی فوج لے کر تھال کی جانب دریائے ڈینیوب تک جانا پڑا۔ اوس کی غیبت میں اہل تھیبز نے دیگر قبائل کے ساتھ مل کر اوس کے برخلاف سازش کی۔ واپس آکر اوس نے تھیبز کو ایک دھاوے میں سر کر لیا اور اہل شہر میں سے چھ ہزار کو قتل کیا تیس ہزار کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالا اور شہر کو مسمار کر دیا۔ یہ جبر و تشدد اوس کی فوجی مال اندیشی کی بہت بڑی دلیل ہے اس لئے کہ جب وہ ایشیا کی تسخیر میں مصروف تھا تو اوس کی غیبت میں کسی کو سر اٹھانے کی جرارت نہ ہوئی۔

۳۳۴ ق م کے موسم بہار میں سکندر ہیپاٹ کو عبور کر کے ایشیا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اوس کی فوج تعداد کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ چونتیس ہزار پیادے تھے اور چار ہزار سوار۔ خزانہ بھی اوس کے ہمراہ واجب ہی تھا یعنی کلہم ستر ٹیلنٹ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایرانی فوج دریائے گرینیٹس کے اوس پار ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سیدھا غنیمت کا رخ کیا اور

۱۵ ابتدا میں ایک یونانی مقدار وزن کا نام تھا جو مختلف ریاستوں میں مختلف تھی۔ یعنی کہیں ۱۶ ۳۸ سیر تھی اور کہیں ۱۶ ۴۷ سیر۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق انڈری سکدر رائج الوقت کی مساوی مقدار پر ہونے لگا۔ اگر ٹیلنٹ کی مقدار ۱۶ ۴۷ سیر بھی فرض کی جائے تاہم سکندر کے خزانہ میں اس مہم پر روانہ ہونے کے وقت آج کل کے ارز نقہ کے حساب سے ایک لاکھ نوے ہزار روپیہ سے زیادہ رقم موجود نہ تھی۔ مترجم

دور یا کو چیرتا ہوا حریف سے جا بھڑا گھسان کی لڑائی ہوئی۔ ایرانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن سکندر کی بہادری اور تعداد ان فوج کے آگے اون کی ایک پیش نہ گئی۔ شکست فاش کھا کر اونہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آگیا۔ سال کا باقی حصہ سکندر نے ممالک مفتوحہ کے فوجی نظم و نسق میں گزارا۔ اس اثنا میں دارا فرزند اسے ایران چھ لاکھ کاٹھی دل لے کر آگے بڑھتا کہ مقدونی فوج کو شام کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکے۔ کوہستان ایس کی گھاٹیوں میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ ایرانیوں کو اس دفعہ بھی شکست ہوئی۔ اس خونریز جنگ میں جانوں کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ اس سے چھ سکتا ہے کہ سکندر اور اس کا ایک جرنیل بلیسوس جب ایک گھاٹی میں سے گزرے تو اسے کشتوں کے ایک عظیم الشان پستے سے اٹا ہوا پایا اور دونوں کو اس گنج قتیلان کے اوپر سے ہو کر گذرنا پڑا۔ سکندر کے ہمراہ جو قایق نوے تھے اونہوں نے حساب لگایا ہے کہ اس جنگ میں ایرانی فوج کا نقصان بقدر نوے ہزار پیادوں اور دس ہزار سواروں کے ہوا۔ شاہی حرمسرا کا خیمہ دارا کی بی بی اور اس کے کئی بچوں سمیت قایق کے قبضہ میں آیا۔ اس طور پر ملک شام بھی یونانی فتوحات کی ملک میں منسلک ہو گیا۔ دمشق میں دارا اور اس کے اعیان دولت کی کثیر التعداد خواصین مع بیشمار خزانہ کے سکندر کے ہاتھ آئیں۔

مسیوٹیمیا کے میدانوں کی جانب اخیر جنگ کے لئے پیش قدمی کرنے سے پہلے سکندر نے اون ممالک کی حفاظت کے خیال سے جنہیں وہ فتح کرتا ہوا پیچھے چھوڑ آیا تھا اور نیز اس غرض سے کہ اس کے اور سمندر کے درمیان غنیم کو حایل ہونے کا موقع نہ ملے بحر روم کے ساحل کو کنارے کنارے سے جنوب کا رخ کیا اور رستہ میں جو جو شہر پڑے انہیں فتح کرتا گیا۔ ایس کی لڑائی کے بعد جو مجلس شوریٰ منعقد ہوئی تھی اس میں سکندر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اپنے افسران فوج سے کہا تھا کہ ایسی حالت میں جبکہ طائر مسخر نہیں ہوا اور مصر و قبرس

نہ قدیم دولت فینیشیا کا ایک بہت بڑا شہر جو اپنی جنگی قوت اور تجارتی عظمت کی وجہ سے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئین)

ایران کے قبضہ میں ہین دارا کا تعاقب کرنا کسی طرح قرن مصلحت نہیں اس لئے کہ اگر ایران بندر گاہوں پر مکرر قابض ہو گیا تو مرکز جنگ یونان میں منتقل ہو جائے گا۔ پس بجز اس کے چارہ نہیں کہ سمندر کے قبضہ میں ہمارا کوئی شریک و ہمیم نہ ہو۔ سمندر اچھی طرح جانتا تھا کہ متصرف اور قبرس پر قبضہ کر لینے کے بعد اوسے یونان کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں ہو سکتا۔ ٹائٹر کے محاصرہ میں اوسے چھ مہینے کی مدت لگی۔ اس تاخیر کی پاداش میں اوس نے اہل ٹائٹر میں سے دو ہزار کو سولی پر لٹکا دیا۔ یورشلم نے بلا فراحت ہتھیار ڈال دئے اور اس لئے اوس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا گیا لیکن غازیہ کے ایرانی گورنر بیطیس نے مقدونوی فوج کو رستہ میں جاننا زائد مقابلہ سے دو مہینے تک روڑا اٹکانا کر رکھا۔ آخر ایک سخت حملہ کے بعد اس شہر کو بھی سمندر کی کشور کشا تلوار نے مسخر کیا۔ شہر کے دس ہزار باشندے تہ تیغ کئے گئے۔ اور باقی اپنے بی بی بچوں سمیت لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔ خود بیطیس کو فاتح کے رحم کے پہیوں کو ساتھ

(بقیہ مضامین صفحہ گذشتہ) مشہور تھا۔ اور بیروت سے ۴۴ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب کی سمت میں واقع تھا۔ اس کا کچھ حصہ ایک جزیرہ پر جو ساحل سے کوئی پون میل ہو گا اور کچھ حصہ ساحل پر آباد تھا۔ مدین صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان کے دوست شاہ ہیرام نے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اور موقع کی موزونی کے لحاظ سے اس کی دولت و قوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ بادجو دیکھ متعدد حملہ آوردن نے اس پر چڑھائی کی اور یہ شہر کئی مرتبہ لٹا اور برباد ہوا لیکن یہ تباہی ہر دفعہ عارضی ثابت ہوئی وہ بگڑ بگڑ کر بنا اور اُجڑ اُجڑ کر بسا۔ اور ہر دفعہ پہلے سے بھی زیادہ رونق کے ساتھ آباد ہوا۔ اوس کی یہ رونق عظمت حروب صلیبیہ کے زمانہ تک قائم رہی۔ ۱۰۹۶ء میں شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ نہر سوئیر کے افتتاح سے اس کی تجارتی اہمیت بالکل کم ہو گئی۔ آج کل اس کا نام متورہو اور اس کی آبادی ۵۰۰۰۰ ہے۔ مترجم

۱۱۷۷ ارض کنعان کا سب سے قدیم شہر اس کی اہمیت اور عظمت کا راز اس کے جغرافیائی موقع میں پوشیدہ تھا۔ یعنی یہ اوس شاہراہ پر واقع تھا جو مسکو شام سے ملائی تھی۔ یہ شہر ۱۰۹۶ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا جنہوں نے اس کا نام غزہ رکھا۔ آج بھی اس کا یہی نام ہے اور اس وقت اس کی آبادی پندرہ بیس ہزار ہے۔ مترجم

باندہ کر شہر کے گرد اگر دھکیٹا گیا۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ اہل مصر نے جنہیں ایرانی حکومت سے نفرت تھی یونانی حملہ آور کا ہشتیاقت تمام خیر مقدم کیا اور سرخون کا ایک قطرہ گرے بغیر اوس کے ہاتھ آگیا۔ مصر کے انتظام میں سکندر نے اپنی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا یعنی بڑے بڑے فوجی عہدے مقدونی افسروں کو دئے اور ملکی نظم و نسق کی باگ اہل مصر کے ہاتھ میں رہنے دی۔

جب ایران پر آخری حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر جو پیٹریا میں دیوتا کے مندر کی جاترا کو روانہ ہوا جو دوسومیل کے فاصلہ پر صحراے لبیا کے ایک خوش سواد مرغزار میں واقع تھا۔ مندر کے غیب دان کا بن لئے اوسے یہ خوش خبری سنائی کہ تم اسی مہیکل کے دیوتا کی اولاد ہو جو سانپ کی شکل اختیار کر کے تمہاری ماں اولمپیاں کو اپنے تصرف میں لایا تھا۔ یہ خیالی کسبے باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور یہ نتیجہ دیوتاؤں اور اون عورتوں کی مصلحت سے مترتب ہوتا ہے جو اون کی منظور نظر ہوں اوس زمانہ میں اس قدر عام تھا کہ جو شخص اپنے اقربان و امثال میں غیر معمولی طور پر نمایاں اور سربرآوردہ ہوتا تھا آسمانی نسل سے سمجھا جاتا تھا اس قسم کے خیالات صد ہا سال تک لوگوں میں پھیلے رہے۔ چنانچہ رومۃ الکبریٰ کی نسبت عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک کنواری لڑکی رومی سلویا نامی گھڑائے ہوئے پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر جا رہی تھی کہ مہمس دیوتا کی اوس پر نظر پڑ گئی۔ دیوتا اس دوشیزہ پر عاشق ہو گیا اور اس عشق کا نتیجہ رومیو کس ہوا جس نے شہر روم کی بنا ڈالی۔ اگر کوئی شخص اس دایت کے معجم ہونے میں شک لاتا تو خدا جانے اوس کی کیا گت بنتی۔ خود فلاطون کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اوس کی ماں پیریکیٹونی کنواری تھی جسے آباؤ دیوتا سے حمل رہ گیا تھا اور دیوتا نے ارشاد کیا کہ جس کے ساتھ پیریکیٹونی کی نسبت ٹھہری تھی فلاطون۔ کسے آسمانی نسب کا حال بتا دیا تھا۔

بانی فلسفہ اشراقیہ کے مصری تلامذہ کے سامنے اگر کوئی شخص اوس کی اہوت کی سادولی لاصل ہونے کے متعلق شبہ ظاہر کرتا تو اودن کی ناراضی کی کوئی انتہا نہ رہتی شاہ اسکندر ابن

جو پیڑ ایمن کے القاب کے ساتھ جب سکندر کے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے تو شام اور مصر کے باشندے اونہیں اوس انتہائے تعظیم و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا آج کل صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے۔ لیکن آزاد خیال یونانی اس آسمانی نسبت کی اصلی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اولیٰ پیا س جس سے زیادہ روشنی اس معاملہ پر اور کوئی نہ ڈال سکتا تھا ازراہ مزاج کہا کرتی تھی کہ ”بہتر ہو اگر سکندر مجھے اس فضیلت سے محاف رکھے تاکہ جو پیشہ کی بی بی کے ہر وقت کے رقیب از حدیث و غضب سے تو بچی رہوں“ مقدونیوں کے وقایع نویس ایرین کا بیان ہے کہ سکندر کی یہ کوشش کہ اوس کار بانی الاعمال ہونا اوس کی رعایا کے ذہن نشین ہو جائے قابل ملاحظہ نہیں قرار دی جاسکتی اور نہ اس سے اوس پر کوئی بڑا الزام عاید ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی تاویل بادی النظر میں یوں ہو سکتی ہے کہ اوس کا مطلب اس کوشش سے اس سے زیادہ نہ تھا کہ اوس کی فوج پر اوس کا زیادہ رعب اور اقتدار قائم ہو۔

جب سب انتظام خاطر خواہ ہو چکا تو سکندر شام کو واپس آیا اور اپنی لشکر کے ساتھ جس میں اب پچاس ہزار جنگ آزمودہ اور قواعد دان بہادر موجود تھے مشرق کا رخ کیا۔ دریائے فرات کو عبور کر کے وہ کوہستان میتیا کے دامن دامن سفر کرتا رہا تاکہ سپر پوٹیمیا کے جنوبی میدانوں کی شدید تمازت سے پناہ لے۔ اس رستہ کے اختیار کرنے میں ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ گھوڑوں کے لیے چارہ بلا فراط مل سکا۔ دجلہ کے بائیں کنارے ارمیلا کے قریب اوس کا مقابلہ گیارہ لاکھ کے اوس عظیم الشان لشکر سے ہوا جسے دارا بابل سے لایا تھا۔ ایرانیوں کو باوجود کثرت تعداد شکست ہوئی اور اودن کا بادشاہ مارا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونی سپہ سالار اودن تمام ممالک پر قابض ہو گیا جو دریائے ڈینیوب اور انڈس کے درمیان واقع تھے۔ اس کے بعد سکندر نے اپنی فتوحات کو دریائے گنگا تک وسعت دی جو مال و متاع اوس کے ہاتھ آیدہ قیاس و شمار سے باہر ہے ایرین لکھتا کہ ایک نقطہ سوسا

مین اوسے پچاس ہزار ٹیلنٹ کی رقم ملی۔

زمانہ حال کے فن حرب میں جس شخص کو دستگاہ حاصل ہے وہ ان حیرت انگیز فوجی کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آبنائے ہیلک پانٹ کا عبور۔ غنیم کی مزاحمت کے باوجود دریائے گرینیٹیکس کا مدور۔ موسم سرما میں مفتوحہ ایشیائی کوچک کی تنظیم تیسق۔ بحر روم کے شامی ساحل کے کنارے کنارے فوج کے مہینہ و قلب کی لیٹاٹاٹر کے محاصرہ کی مشکلات صعبہ کا حل۔ شہر غازہ کی تسخیر۔ یونان سے ایرانی سلسلہ تعلقات کا انقطاع۔ بحر روم سے ایران کے جنگی بیڑے کی بے دخلی۔ اتھینس یا اسپارٹا والوں کو رشوت دے کر مقدونیہ کے برخلاف ابھارنے کے متعلق ایرانیوں کی مستمر حکمت عملی کا ٹوٹ مقرر کی فتح اور ایک اور موسم سرما گزار کر ادس کے ملکی و فوجی انتظام کی تکمیل۔ آئندہ موسم بہار میں کل فوج کا بحیرہ اسود اور بحیرہ قلزم کی متخالف سمتوں سے کوچ کر کے مستوپوٹیمیا کے شورہ زار میدانوں میں اجتماع۔ تھبسا کس کے شکستہ پل پر بید مجنون سے ڈھکے ہوئے کناروں والے فرات سے گذر کر دریائے دجلہ کا عبور۔ اربیل کی عظیم الشان اور یادگار زنا جنگ سے پہلے شبینہ طلائیہ گرمی۔ میدان جنگ پر ترچھی سمت میں فوج کی نقل و حرکت۔ قلب غنیم پر ترک تازہ اور یہ وہ چال ہے جس کی تقلید صد سال بعد آسٹرلٹز کے میدان جنگ پر کی گئی۔ شہنشاہ ایران کا ان تھک اور سرگرم تعاقب۔ یہ تمام ایسے کارنامے ہیں جنکے لحاظ سے زمانہ مابعد کا کوئی سپہ سالار سکندر پر فوقیت نہیں لے گیا۔

اس طور پر یونانیوں کی داغی تحریک کو بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان میں ایسے ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے مقدونی فوج کے ہمراہ دریائے ڈیئوب سے لے کر تارہ رود نیل اور رود نیل سے گنگا کے میدانوں تک سفر کیا تھا۔ ممالک آن روئے بحیرہ اسود کی برقرار ہواؤں سے اون کا مغز استخوان تک بھجھ ہوا تھا اور مصری صحراؤں کی آتش بار اور ریگ افشان لوؤں نے اون کے چہرہ کو جھلسا تھا۔ مقرر کے اہرام جنہیں کھڑے کھڑے

میں صدیان گزرجی تھیں۔ لکسار کے مخروطی مینارجن پر مقرر قدیم کے راز بخط تصویر منقوش تھے
تظار اندر قطار ابو الہول جو اسرار انگیز خموشی کا مرتق تھے۔ اون فرمانرواؤں کے دیو ہیکل
مجسمے جنہوں نے صبح آفرینش کی طلوع کے وقت زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ یہ تمام عبرت
افزا منظر اون کے پیش نظر ہو چکا تھا۔ ایسہ ہیڈن کے عالیشان ایوانوں میں وہ اسیر یا
کے اون قدیم بادشاہوں کے تختوں کے سامنے کھڑے ہو چکے تھے جنکے چہرون سے جلال
و رعب ٹپکتا تھا اور جن کے حاجب و محافظ پر دار ساڈتھے۔ بابل کی شہر پناہ جس کا دور کسی
زمانہ میں ساٹھ میل سے اوپر تھا اور جو بدو تین صدیوں اور تین حملہ آوروں کی تاخت و تاراج
کے انٹی فٹ بلند تھی ابھی تک قائم تھی۔ بعل کے سر فلک منبر کے کھنڈر زبان حال سے
پکار پکار کر اس کی گذشتہ عظمت و شوکت کی شہادت دے رہے تھے اور اس کی چھت پر وہ
رصد گاہ موجود تھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار ہیئت دان راتوں کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشن
و تابناک ہستیوں سے ہم کلام ہوا کرتے تھے۔ ابھی تک فرزندایان بابل کے دو معلقون اور
اون شہرہ آفاق معلق باغات کے آثار باقی تھے جن کے متناور درختوں کو دیکھ کر یہ دھوکا
ہوتا تھا کہ فضا نے بسط میں اُگے ہوئے ہن اور جن کلون کے ذریعہ سے ان باغوں میں
دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا اون کے ٹوٹے پھوٹے نشان بھی ابھی تک موجود تھے۔ اس شہر میں
جو مصنوعی جمیل نہروں اور نالیوں کے ایک کثیر التعداد اور پیچ در پیچ سلسلہ کے ساتھ بہ زمانہ
سابق تیار کی گئی تھی وہ کوہستان آرمینیا کی گچھلی ہوئی میخ سے لہریز رہتی تھی اور دریا سے
فرات کا پستہ اس انداز سے باندھا گیا تھا کہ نہروں کے ذریعہ سے جو پانی شہر میں جاے وہ
زاید از ضرورت بہاؤ کا سد باب کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب و غریب شاید وہ سرنگ
تھی جس کے ذریعہ سے دریا سے فرات کے نیچے سے آمد و رفت ہوتی تھی۔

کالدیہ اسیر اور بابل کے حیرت افزا و عظیم الشان آثار تو نہایت ہی قدیم تھے
یہاں تک کہ اون کے آغاز پر زمانہ کی رات کا سیاہ پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے لیکن ایران

بھی زمانہ مابعد کے عجائبات سے خالی نہ تھا۔ پرسپیس (اصطخر) کے ستون دار یونان کو صناعی کا عجائز خانہ کہنا چاہیے جن میں کندہ کاری بہت تراشی مینا کاری کے نفیس و پاکیزہ نمونے۔ سنگ مرمر کی سلون کے کتب خانے۔ مخروطی مینار۔ ابو الہول اور دیوپیکر سائڈ قرینہ سے آراستہ تھے۔ اکہتا مابعد اران ایران کا ایلاق یعنی موہم گرا بسر کرنے کا مقام تھا۔ اس شہر کے گرد اگر دسات فصیلین ترشے ہوئے اور مجلاتیہ کی تھیں۔ ہر اندر کی فصیل باہر کی فصیل سے اونچی ہوتی جاتی تھی۔ یہ فصیلین جو سب سے زیادہ کی بجھی مناسبت سے تیار کی گئی تھیں رنگ میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ شاہی محل کی چھت چاندی کی اینٹوں کی تھی اور شہتیروں پر سونے کے پردن کا غول چڑھا ہوا تھا۔ آدھی رات کو جب روضہ فطی کی شعلوں سے محل میں چراغان کیا جاتا تھا تو جگمگاہٹ کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ آفتاب کی روشنی کا سامان آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک پر فضا باغ جو شاہان مشرق کی دلفریبیوں کا سب سے بڑا سامان ہے لگایا گیا تھا۔ غرض سلطنت ایران ہیٹ سپانٹ سے لے کر انڈس تک گلزار عالم بنی ہوئی تھی۔

ہم نے ان حیرت افزا فتوحات کے حالات کا ذکر بالتفصیل اس لئے کیا ہے کہ حربیات میں جو ترقی یونانیوں نے ان کی وجہ سے کی وہ اسکندریہ میں بندہ دریاضی اور فنون علمی کے اون دارالعلوم کے قیام کا باعث ہوئی جو سائنس کا سب سے بار و منشار ہیں۔ اگر سلسلہ پر سلسلہ سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری تمام صحیح معلومات کا اخذ اصلی یہی مقدونوی فتوحات ہیں۔ ہبولٹ نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان جب کارگاہ ہستی کی نئی اور عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اوس کے قواسم و افنی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ سکندر کے سپاہیوں اور ہمرایوں کو ہر منزل پر غیر مترقب اور دلفریب مناظر دکھائی دئے۔ دنیا کی تمام قوموں میں یونانیوں کی قوت مشاہدہ سب سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور جو کچھ وہ دیکھتے تھے اوس سے بہت جلد اور بدرجہ غایت متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ اگر انہیں

غیر محدود ریگستان نظر آئے تو دوسرے مقام پر ایسے پہاڑ دکھائی دئے جنکی چوٹیاں بادلوں میں بھیپی ہوئی تھیں۔ صحراؤں میں اونہیں سراب نے دھوکا دیا تو دامن کوہ میں صبارنقا بادلوں کے مہیب اور دیوہیکل سایہ نے اپنے جھمبے میں ڈالا۔ غنبرین خراسانوں اور مردین سرود و صنوبر کی سیر کرتے ہوئے وہ جھاؤ اور جھندی کی سرزمین میں پہنچے۔ اریلا کے میدان میں اونہیں ہندوستان کے سدھے ہوئے جنگی ہاتھیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ بحیرہ خزر کے ساحل کے جنگلوں میں اون کی یلغار کی دھمک نے شیربر کو بیدار کیا۔ ایسے ایسے جانور اون کے دیکھنے میں آئے جو یورپ کے جانور دن کے مقابلہ میں نہ صرف عجیب الخلقت بلکہ ہر تائب عظیم الجثہ تھے۔ گینڈا۔ اونٹ۔ دریائی گھوڑا۔ نیل و گنگا کے نہنگ اون کے لئے بمنزلہ عجائبات تھے۔ ایسی ایسی قوموں سے اون کی ٹرائیاں ہوئیں جو شکل و شمایل اور وضع و قطع میں اون سے بالکل مختلف تھیں۔ کبھی وہ سیاہ فام افریقی سے نبرد آزما ہوئے اور کبھی سانولے شامی اور گندم رنگ ایرانی سے اونٹنی بڈبھیر ہوئی۔ خود سکندر کی نسبت یہ واقعہ مشہور ہے کہ بستر مرگ پر پڑے پڑے وہ اپنے امیر البحر تیارکس سے اوس کے دریائی سفر کی دلچسپ سرگزشت سن سن کر جی بہلایا کرتا تھا جو اوس نے دریائے انڈس سے خلیج فارس تک کیا تھا۔ سکندر نے جب اول اول دریا کے مدد جزر کو دیکھا تو اوسے بہت حیرت ہوئی۔ اوسے یہ خیال تھا کہ بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر بھی بحر احمر اور بحر فارس کی طرح جیسا کہ تیارکس نے دریافت کیا تھا کسی بڑے سمندر کی خلیجیں ہوں گی۔ چنانچہ اس قیاس کو پایہ تحقیقات پر پہنچانے کے لئے اوس نے جہاز تیار کرائے تھے۔ اوس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اوس کے جہازوں کا بیڑہ افریقہ کے گرد اگر دچکر لگاتا ہوا آبنائے جبل الطارق میں سے ہو کر بحر روم میں داخل ہو جائے۔ اور یہ خیال اوس کے ذہن میں اس قدیم روایت نے پیدا کیا تھا کہ یہ ہم ایک بار فراعنہ کے زمانہ میں طے ہو چکی تھی۔

مالک مفتوحہ کے بہت سے غرایب و نوا اور ایسے تھے جنہوں نے نہ صرف بڑے سے

بڑے بہادران یونان بلکہ اعلیٰ ترین حکماء یونان کو محو حیرت کر دیا۔ کیلکٹھنیز کو بابل میں
سلسل ایک ہزار نو سو تین سال کے کلدانی مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے جو اس نے ہدیۃ
ارسطو کی خدمت میں بھیج دئے۔ چونکہ یہ رصدی نتائج پختہ اینٹوں پر ثبت تھے اس لئے یہ ممکن
ہے کہ اون کے دو سرے نسخے آثار قدیمہ کے تلاش کرنے والوں کو سریانی سلاطین کو خشتی
کتب خانوں میں سے مل جائیں۔ مشہور مصری ہیئت دان بطلمیوس کو ایک بابلی جد دل ہاتھ
لگی تھی جس میں ۸۰۰ قبل مسیح سے لے کر اس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف
کے تیاج سندج تھے۔ ان تیاج میں سے جو ہم تک پہنچے ہیں بعض کی محققانہ تنقید کے لئے
ضرور ہے کہ ایک عرصہ دراز تک نہایت دقت نظر اور تسلسل سے رصد بینی کی گئی ہو۔ بابلی
مہندسوں نے سال انقلابی کی جو مدت قایم کی تھی وہ زمانہ حال کی متحققہ مدت سے فقط ۲۵
ثانیہ کم ہے اور سال کو کبھی کی مدت کا اندازہ اصلی مدت سے صرف بقدر دو دقیقہ کے زیادہ
ہے۔ استقبال نقاط اعتدال میل و نہار کا بھی اون کو علم ہو چکا تھا۔ کسوف و خسوف کے اسباب

۱۰ ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق تھا۔ ستہاق عین پیدا ہوا۔ اور ۸۰۰ میں اپنی صاف
گوئی کو باعث سکندر کو حکم سی قتل کیا گیا۔ مترجم

۱۱ سال انقلابی سے مراد وہ زمانہ ہے جو زمین کو منقطۃ البروج کے کسی ایک نقطہ مثلاً نقطۃ اعتدال صیفی یا نقطہ
اعتدال شتوی سے روانہ ہو کر پھر اسی نقطہ تک پہنچنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مدت ۲۴۲۲۲۵ ر ۳۶
یوم شمسی ہے۔ مترجم

۱۲ سال کو کبھی سے مراد اون دو حالتوں کا درمیانی فصل ہے جبکہ زمین آفتاب اور کوئی ایک ستارہ ایک ہی ہیئت
میں پائے جائیں۔ اس فصل کی مدت ۲۵۶۳۸ ر ۳۶۵ یوم شمسی ہوتی ہے۔ مترجم

۱۳ زمین چونکہ کمال کرہ نہیں ہے لہذا جس محور پر یہ اپنے گرد گھومتی ہے وہ اس کے مدار کی جانب جھکا ہوا
ہے اور اسی لئے وہ بڑے دایرے جو مدار ارض اور خط استوا کی سطوح کے تقاطع سے افلاک میں پیدا
ہوتے ہیں ایک دوسرے کو دو نقطوں پر قطع کرتے ہیں جنکا نام نقاط اعتدال (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

وہ دریافت کر چکے تھے اور اپنے مجوزہ دور کی مدد سے جس کا نام اون کی اصطلاح میں سیروس تھا وہ ان کے اوقات وقوع کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ اس دور کی مدت اونہوں نے ۶۵۸۶ دن سے کچھ زیادہ قرار دی تھی اور یہ مدت اصلی مدت سے فقط ساڑھے اُنیس دقیقہ کم ہے۔

ان واقعات سے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہم پہنچتا ہے کہ تسوپوٹیمیا میں فن ہیت کو نہایت استقلال اور قابلیت کے ساتھ ترقی دی گئی تھی اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آلات رصد نہایت ہی ناقص اور غیر مکمل تھے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیوں کروہوں نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کر لیا۔ ان قدیم علماء بہیت نے کو اکب کی ایک فہرست تیار کی تھی منطقۃ البروج کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا تھا۔ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے مقرر کیے تھے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ اونہوں نے بہت کچھ حوق احتجاب کو اکب کی تحقیقات میں جو چاند کے حایل ہونے کے باعث واقع ہوتا ہے صرن کیا تھا۔ اون کو نظام شمسی کی ترکیب کا صحیح صحیح علم تھا اور وہ سیاروں کے مقامات کے اعتبار سے تغیرات کی ماہیت سے بھی واقف تھے۔ دھوپ گھڑی۔ پانی کی گھڑی۔ اصطلاب اور دھوپ گھڑی کا کائنات اون کی ایجاد ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) یل و نہار ہے۔ ان فلکی دوائر میں سے ایک کا نام منطقۃ البروج ہے اور دوسرے کا دائرہ استوائیہ۔ دونوں نقطے منطقۃ البروج کے گرد آہستہ آہستہ گھومتے ہیں لیکن یہ گردش لمحاظ نوعیت موجب نہیں ہوتی بلکہ سالہ ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام نقاط اعتدال یل و نہار کا استقبال یا استقبال اعتدالین ہے۔ اس کی وجہ سے دائرہ استوائیہ کے قطب کو منطقۃ البروج کے قطب کے گرد گردش کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کا محور ایک شکل بید البیضوی بناتا ہے جس کا محور منطقۃ البروج کے قطب میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس گردش کا زمانہ ۲۵۸۰۰ سال ہے۔ گویا استقبال اعتدالین کا سالانہ اوسط ۲۵۰۰ ثانیہ ہے۔ مترجم

لہ قرآن ثوابت یا سیارہ اور آفتاب کے درمیان یا سیارہ کا ثوابت اور آفتاب کے درمیان حایل ہو جانا۔ مترجم

اون کی چھپائی کا طریقہ بھی جس کا حال ادس وقت کے موجودہ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے خالی از ہنر نہ تھا۔ جو کچھ چھاپنا ہوتا تھا ایک گردش کرنے والے بیلن پر شرخی حروف میں کندہ کر دیا جاتا تھا اور اس بیلن کو نرم گیلی مٹی کی اینٹوں پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے بیلن کے حروف اینٹوں پر ابھرتے تھے اور پھر نہ سٹ سکتے تھے۔ ان کی اینٹوں کی کتابیں ابھی تک ہماری معلومات متعلقہ ادب و تاریخ میں بہت کچھ اضافہ کرنے والی ہیں۔ مزاحم و مرایا کو اصول سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ مقام مہرود میں جو شیشہ محدب برآمد ہوا ہے ادس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو بڑا کر کے دکھا۔ بنے والے آلات کی ماہیت بھی جانتے تھے۔ فن حساب میں وہ مراتب اعداد کی قیمت سے واقف ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کی مہتم بالشان ایجاد صفر اون سے چھوٹا لگی تھی۔

ان واقعات نے کشور کش ایرانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ آج تک تجربہ اور مشاہدہ سر اونہوں نے کام نہ لیا تھا۔ اون کا سب سے بڑا عقلی کارنامہ اون کے تخیل کی شاعرانہ بلبہ پروازی تھی اور بس۔

یونانیوں کی دماغی ترقی کو جس کے محرک ایک حد تک فطرت کے وسیع مشاہدات ہوئے مالک مفتوحہ کے مذاہب کی واقفیت سے بہت بڑی تقویت پہنچی۔ یونان کی بت پرستی کو ایران نے ہمیشہ نفرت و کراہیت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی فرمان روا یا ان ایران نے یونان پر فوج کشی کی تو یونانی مندردن کو انہدام اور اون کے بہائم صفت دیوتاؤں کی تذلیل و توہین کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب اس قسم کی توہین و تذلیل کی پاداش میں دیوتاؤں کی طرف سے کوئی آفت ایرانیوں پر نازل نہ ہوئی تو لوگوں کی ادس عقیدت میں جو اپنی معبودوں کی طرف سے ادن کے دلوں میں جاگزین تھی ترزل واقع ہو گیا اور یونانی مذہب کی جڑ کھوکھلی ہو چلی۔ اولمپس کے ادن ناپاک دیوتاؤں کے پجاری جن کی فحش کاریاں ہر پاکباز شخص کے اندام تقاریر لرزہ طاری کرنے والی تھیں اب ایسے ہتم بالشان اور

سنجیدہ و متین مذہب سے دوچار ہوئے جس کی بنیاد فلسفہ پر رکھی گئی تھی۔ ہر اس سلطنت کی طرح جس کی مدت حکومت طویل ہوتی ہے ایران میں بھی متعدد مذہبی انقلابات واقع ہو چکے تھے۔ اول اول اس نے زردشت کا موحدانہ مسلک اختیار کیا۔ وحدانیت کے بعد تنزیت کا دور آیا اور تنزیت کی جگہ جوہیت نے لے لی۔ مقدونوی فوج کشی کے وقت اہل ایران کے عقاید یہ تھے کہ ایک عقل کل تمام کائنات کی خالق محافظ اور حکمران ہے جو راستی کا جو ہر پاک اور صداقت و خیر کا سرچشمہ ہے۔ اس کا درجہ ہوتا کو کسی بُت یا تصویر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اور چونکہ اس دنیائے دنی میں ہر شے دو متخالف قوتوں کے آثار کی دو گونہ منظر ہے لہذا قادر مطلق کے زیر فرمان دو ہورن و ہمزاد ازلی وابدی طاقتیں ہیں جنہیں استعارۃً نور و ظلمت کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں ایک ایسی کشاکش اور زور آزمائی میں مصروف ہیں جسکی کوئی انتہا نہیں۔ عالم ان دونوں کا عرصہ کارزار اور انسان ان کا مال غنیمت ہے۔

تنزیت کی قدیم روایات میں مذکور تھا کہ بدی کی طاقت (اہرمن) نے ایک سانپ کو اس کام پر مامور کیا کہ نیکی کی طاقت (یزدان) کے بنائے ہوئے بہشت کو جا کر تباہ کر ڈالے۔ یہی روایات یہودیوں کو اس زمانہ میں معلوم ہوئیں جب وہ بابل میں قید کے دن کاٹ رہے تھے۔

جس طرح نور اور سایہ لازم و ملزوم ہیں اسی طرح عنصر خیر و عنصر خیر کا مستلزم ہے۔ اس دنیا میں جس کا خالق اور حکمران غیر مطلق ہے شرکی توجیہ اگر کی جاسکتی ہے تو صرف اسی طریقہ سے۔ عنصر خیر و عنصر شر یعنی یزدان و اہرمن میں سے ہر ایک کے ماتحت جو سیون کے عقیدے کے بموجب فرشتے اور وزیر اور فوجیں بھی تھیں۔ اس مسلک کی رو سے ہر نیک انسان کا فرض ہے کہ راستی پاکبازی اور محنت کے اصول اختیار کرے۔ او سے یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا لبد خاکی کی قید سے آزاد ہونے کے بعد اسے عالم عقبی میں زندگی عطا ہوگی اور وہ اسی جسم سے

اٹھے گا اوس کی روح کو بقا سے ابدی حاصل ہوگی اور وہ فہم و ادراک کی نعمتوں سے مستفیض ہو کر حیات اخروی بسر کرے گا۔

سلطنت کے دور اخیر میں مجوسی عقاید زردشتی عقاید پر بتدریج بہت کچھ غالب آگئے تھے۔ جو حیدت دراصل پرستش عناصر تھی۔ ان میں سے آگ کو خدا سے برتر کی نیابت کا حق سب سے زیادہ حاصل تھا۔ اون کے آتشکدوں میں جو بجائے مسقف مندروں کے زیر سما قیام کئے جاتے تھے ہمیشہ آگ روشن رہتی تھی اور آفتاب بوقت طلوع انسانی پرستش کا مقصد اعظم سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح بادشاہ کے ہوتے ہوئے اور کسی پر نظر نہیں پڑ سکتی اسی طرح آفتاب کی موجودگی میں باقی تمام اجرام فلکی نظر سے غایب ہو جاتے ہیں اور سختی عبادت نہیں سمجھے جاسکتے۔

س ۲۳ ق ۶ میں سکندر اپنے بڑے بڑے منصوبوں کو ادھورا چھوڑ کر ۳۳ سال کی عمر میں بمقام بابل انتقال کر گیا۔ بعض لوگوں کو اوس کی قبل از وقت موت پر یہ شبہ ہوا کہ وہ نہر مے کر مار ڈالا گیا ہے۔ اوس کی طبیعت ایسی چڑچڑی اور اوس کا مزاج ایسا بے قابو ہو گیا تھا کہ اوس کی فوج کے بڑے بڑے افسر یہاں تک کہ اوس کے بے تکلف دوست اوس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کلائسٹس کو جو اوس کا رضاعی بھائی اور ساتھ کا کھیلوا ہوا دوست تھا اوس نے حالت غیظ و غضب میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ کیلستھینز کو جو اوس کے اور آرزو کے درمیان علمی واسطہ تھا اوس نے سولی دلوادی یا جیسا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے اول شکنجہ میں جکڑ کر انواع و اقسام کے عذاب میں مبتلا کیا اور اوس کے بعد مصلوب کیا۔ ایسی حالت میں بعید از قیاس نہیں کہ محض اپنی جان بچانے کے خیال سے اوس کے گرد و پیش کے لوگوں نے اوس کے قتل کی سازش کی ہو۔ ارسطو کی بھی اس سازش میں شرکت بیان کی جاتی ہے لیکن یقیناً یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ ارسطو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ سوبار مرنا قبول کرتا لیکن ایسے سنگین جرم کے ارتکاب کے معین

ہونے کا مرکز و ادارہ ہوتا۔

اسکندر کی آنکھیں بند ہوتے ہی خوزیری اور خانہ جنگی کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جو کئی سال تک فرو نہ ہوا اور اوس وقت بھی جبکہ اوس کے افسران فوج نے سلطنت کے حصے بخرے کر لیے اور ہر ایک نے ایک نئی اور خود مختار بادشاہت قائم کر لی اس فساد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس طوفان بے تمیزی میں جو قصے قسبے پیش آئے اون میں سے صرف ایک واقعہ ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ بطلیموس ارتینونامی ایک حسینہ و جمیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیلقوس کا بیٹا تھا اور اس لحاظ سے گویا اسکندر کا علاقائی بھائی ہوتا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ باپ نے خفا ہو کر دونوں کو جلا وطن کر دیا۔ اور اوس وقت سے وہ برابر اسکندر کے ہمراہ رہا۔ کوئی ایسی جنگ یا ہم نہ تھی جس میں اوس نے اسکندر کا ساتھ نہ دیا ہو۔ وہ اول مصر کا گورنر اور بالآخر مطلق العنان فرمانروا ہو گیا۔

روڈس کے محاصرہ کے وقت بطلیموس نے وہاں کے باشندوں کی ایسی گران بہا مدد کی کہ ادنیٰ ہونے فرط امتنان سے اوس کی تعظیم و تکریم دیوتاؤں کے برابر کی اور اوسے سوٹر یعنی نجات دہندہ کا لقب دیا۔ مصر کے سلسلہ مقدونیہ کے فرمانروایان مابعد سے اوس کو یہی لقب ممتاز کرتا ہے۔

بطلیموس سوٹر نے بجائے اون شہروں کے جو سابق میں مصر کا پایہ تخت رہ چکے تھے اپنا دار الحکومت اسکندریہ میں قائم کیا۔ جو پٹیرا میں کے مندر کو جاتے وقت اسکندر نے اس شہر کی بنیاد سمجھ کر ڈالی تھی کہ موقع کے لحاظ سے یہ شہر یورپ اور ایشیا کی تجارت کا مرکز اتصال ہو سکے گا۔ یہ امر خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہ خود اسکندر نے بہت سے یہودیوں کو فلسطین سے لاکر یہاں آباد کیا اور نہ صرف بطلیموس سوٹر نے اور ایک لاکھ یہودیوں کو یورشلم کے محاصرہ کے بعد یہاں لایا بلکہ اوس کے جانشین فلیدلفس نے بھی ایک لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی غلاموں کو اون کے مصری آقاؤں سے معقول زر خرید

ادا کر کے آزاد کرادیا۔ ان تمام یہودیوں کو وہ تمام مراعات و حقوق عطا کئے گئے جو خود مقدونیوں کو حاصل تھے۔ اس لطف و انصاف کے برتاؤ کی وجہ سے کثیر التعداد یہودی اور بہت سے اہل شام برضا و رغبت خود آکر مصر میں آباد ہوتے گئے۔ ان لوگوں کو یونانی یہودیوں کا امتیازی لقب عطا کیا گیا۔ سوٹر کی فیاض اور مہربان حکومت کا شہرہ سن کر بیشمار یونانیوں نے بھی مصر کو اپنا ملجا و مادا بنالیا اور پرڈیکاس اور انٹیگونس کے حملوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ یونانی سپاہی دوسرے مقدونی سپاہیوں کی اطاعت سے یہ بات سخت ہو کر سوٹر کی فوج میں آمنے کے لئے بہ آمادگی تمام تیار ہیں۔

اس اعتبار سے اسکندریہ میں گویا تین مختلف قوموں کے لوگ آباد تھے یعنی رومی مصری۔ یونانی اور یہودی۔ اور یہ وہ واقعہ ہے جس کا اثر موجودہ یورپ کے مذہبی عقائد میں صاف نظر آتا ہے۔

یونانی معماروں اور انجینئروں نے اسکندریہ کو اپنی صنعت کے زور سے دنیا سے قدیم کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر بنا دیا تھا۔ عالیشان محلوں خوش نما مندروں اور دل آرا تماشا گاہوں سے شہر کا کوئی حصہ خالی نہ تھا۔ وسط میں دو وسیع ساہی دار پٹرکون کے مقام اتصال پر جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی تھیں چینون فواروں اور مخروطی میناروں کے درمیان وہ شاندار مقبرہ کھڑا تھا جس میں مصریوں کی رسم کے موافق سکندر کی حنوط آلودہ نعش محو آرام تھی۔ سکندر کا جنازہ نہایت طعراق اور شکوہ و جلال کے ساتھ دو سال کے مادی سفر کے بعد بابل سے لایا گیا تھا۔ اول اول تابوت طلائے خالص کا تھا لیکن چونکہ اس کی وجہ سے مقبرہ کو نباشون کی دستبرد کا صدمہ سہنا پڑا لہذا بجائے طلائے احمر کے تابوت سنگ مرمر کا بنادیا گیا۔ لیکن نہ تو فن تعمیر کے یہ نظر افروز اور دل فریب کرشمے اور نہ سفید سنگ مرمر کا وہ عظیم الشان مینارہ روشنی ہی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور اس قدر بلند تھا کہ وہ آگ جو ہر وقت

اس کی چوٹی پر چلتی رہتی تھی جہازوں کو میلون سے نظر آتی تھی۔ مقدونی فرما کر دیا ان مصر کی اصلی حقیقی اور سب سے زیادہ شاندار اور امٹ یا دگار عجائب خانہ اسکندریہ ہے جس کا اثر دنیا میں اس وقت تک قائم رہا ہے گا جبکہ اہرام مصر کی بنیادوں کے سنگریزے تک پس کر گرد و زگار میں بل گئے ہوں گے۔

اس عجائب خانہ کی ابتدا ابطیموس سوٹر کے عہد میں ہوئی اور اس کے بیٹے بطلمیوس فلیڈلفس نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ عجائب خانہ کی عمارت بروشین میں واقع تھی جو شاہی محل کے نزدیک شہر کے اوس حصہ کا نام تھا جہاں امراء اعیان دولت آباد تھے۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی تھی اور اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان میں چل قدمی کرتے ہوئے مکالمہ کا لطف اٹھا سکیں۔ اس کے گردون میں جو سنگتراشی کی صنعت کو نمونے تھے فلیڈلفس کا کتب خانہ تھا اور چاروں طرف نہایت ہی حسین محبسے اور دربار تصویریں قرینہ سے سجائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بالآخر اس کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں اور جب رفتہ رفتہ مزید کتابوں کے رکھنے کی گنجائش باقی نہ رہی تو ایک نکتب خانہ اسی کے قریب سرپیڈان یعنی سرپس کے مندر میں قائم کیا گیا۔ اس دوسرے کتب خانہ میں جو پہلے کتب خانہ کا بچہ کہلاتا تھا آخر میں تین لاکھ جلدیں جمع ہو گئیں۔ اس حساب سے گویا ان دونوں شاہی کتب خانوں میں سات لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

اسکندریہ فقط مصر ہی کا پایہ تخت نہ تھا بلکہ عقل و ادراک کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز حکومت تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل مشرق و عقل مغرب سے ہم آغوش ہوئی۔ یہ قدیم زمانہ کا پیرس ہر طرح کی نشاط انگیز اواباشیوں اور تطلک آفرین آزاد خیالیوں کا نقطہ اتصال بن گیا۔ یہاں کی دلچسپ اور رنگین صحبتوں میں شریک ہو کر یہودیوں تک کے دلوں سے ولولہ حب وطن و جذبہ جوش قومی محو ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آبا و اجداد کی زبان چھوڑ دی اور یونانی زبان اختیار کر لی۔

عجائب خانہ کے قیام سے بطلیموس سوٹرا اور اس کے بیٹے فلیڈلفیس کے پیش نظر تین مقصد تھے:۔ (۱) علوم موجودہ کی بقا (۲) اس کی ترقی اور (۳) اس کی اشاعت۔
(۱) علوم موجودہ کی بقا۔

سرکاری کتب خانہ کو صد متمم کو حکم دیا گیا کہ جو کتابیں مل سکین سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں عجائب خانہ میں کتابوں کی ایک جماعت اس خدمت پر مامور تھی کہ جن کتابوں کو مالک انہیں فروخت نہ کرنا چاہتے ہوں ان کی صحیح نقلیں کرین باشندگان مالک غیر حب کوئی کتاب مصر میں لاتے تھے تو وہ فوراً عجائب خانہ میں بھیج دی جاتی تھی اور نقل مطابق اصل ہونے کے بعد اصلی نسخہ کتب خانہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور نقل مالک کتاب کے حوالہ کر دی جاتی تھی۔ بس اوقات بیش قرار قین معاوضہ یا ہرجانہ کے طور پر بھی دی جاتی تھیں۔ مثلاً بطلیموس یو جینیئر کے عہد کا واقعہ ہے کہ کتب خانہ سے یورپیڈیز سفاقلس اور اسقلس کی تصانیف بہم پہنچا کر اس نے ان کی نقول کو ساتھ پندرہ ہزار ڈالر ہرجانہ کے طور پر اصل نسخوں کے مالکوں کے پاس بھجوا دیے۔ شام کی ہم سے جب وہ واپس ہوا تو اکبتانا اور سوسا سے وہ تمام مصری یادگارین فتح و نصرت کے شادیاں لے جاتا ہوا ہمراہ لایا جنہیں کیقباد اور دوسرے ایرانی حملہ آور مصر سے لوٹ کر لائے گئے تھے۔ ان یادگاروں کو اس نے یا تو ان کے اصلی مقامات پر نصب کر دیا اور یا اپنے عجائب خانوں کو سامان آرائش پر اضافہ کیا۔ جب کسی تصنیف کا نقل کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا تھا تو ایسا بیش قرار معاوضہ دیا جاتا تھا کہ آج کل اس کا یقین کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ بائبل کے نسخہ ”سچوا جنٹ“ کے ترجمہ کے لیے جو بطلیموس فلیڈلفیس کے حکم سے ہوا اسی طرح کا گران قدر معاوضہ دیا گیا۔

(۲) ترقی علوم۔

عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کی ایک بہت بڑی غرض یہ بھی تھی کہ سرکاری خرچ کی ایک ایسی جماعت اشخاص کی کفالت کی جائے جو یہاں رہ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کر لیں

وقف کر دیں۔ بسا اوقات خود فرمانرواے وقت بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تھا چنانچہ ان خورد و نوش کی صحبتوں کے لطایف کی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ علمائے مقیم مجاہد خانہ کو بلحاظ تکمیل علوم و فنون ابتداءً چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی (۱) ادب (۲) ریاضی (۳) ہیئت اور (۴) طب۔ فردعی علوم کو باعتبار مناسبت ان میں سے کسی ایک کو ساتھ شریک کر دیا گیا تھا مثلاً علم حیوانات طب کی ایک شاخ قرار دیا گیا تھا۔ کسی سربراہ اور وہ عالم کو اس دارالعلم کے حاکم اعلیٰ کی خدمت دی جاتی تھی اور وہی اس کے جزو و کل کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول اس عہدہ پر ڈسٹریس فلیئر سس کا تقرر ہوا جو کئی سال تک ایجنٹ کا گورنر رہ چکا تھا اور علم و فضل میں یکتا سے روزگار تھا۔ حاکم اعلیٰ کے ماتحت ہتھم کتب خانہ ہوتا تھا۔ اس خدمت پر بعض ایسے نامور اشخاص مقرر ہوئے جنہی فضیلت کی شہرت ہم تک پہنچی ہے۔ مثلاً ایراٹاسٹھینز اور آپالونئس روڈئس۔

مجاہد خانہ کے متعلق ایک باغ نباتات اور جانور خانہ بھی تھا۔ ان کا مقصد جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ تھا کہ نباتات و حیوانات کے حالات کے اکتشاف میں مدد ملے۔ ایک رصد گاہ بھی قائم کی گئی تھی جس میں فلکی کرے۔ سادہ کرے۔ دوایر متعلقہ انقلابات۔ صیفی دشتوی۔ دوایر استوائی۔ اصطلاب۔ کواکب کے حقیقی و اعتباری مواقع کے مقیاس اور دوسرے مروجہ آلات ہیئت موجود تھے اور پیمائش کے آلات درجون اور درجے کے چھٹے حصوں میں منقسم تھے۔ رصد گاہ کے فرش پر ایک خط نصف النہار کھینچا ہوا تھا۔ وقت اور حرارت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اگرچہ آلات موجود تھے مگر اون کے نامکمل ہونے کے باعث صحیح اندازہ لگانے میں وقت پیش آتی تھی ٹیسیس کی آبی گھڑی سے ٹھیک وقت دریافت نہ ہو سکتا تھا اور حرارت کے درجات کی دریافت کا یہی ایک

لے اسکندریہ کا ایک یونانی مہندس۔ پانی کھینچنے کا آلہ۔ آبی گھڑی اور سامعین یعنی غم دار نلی اوس کی ایجاد دی ہیں

اور اسی لیے وہ زیادہ تر مشہور ہے۔ مترجم

ذریعہ تھا کہ مائیات کے وزن دریافت کرنے کا آلہ پانی کے کنوڑے میں تیرتا رہتا تھا اور پانی کی لطافت یا کثافت سے حرارت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ فلید نفس کو اخیر اخیر میں موت کی طرف سے سخت خوف پیدا ہو گیا تھا اس لیے اس نے بہت سا وقت اکیس حیات کی تلاش میں صرف کیا۔ اس قسم کے مشاغل کے لیے عجائب خانہ میں ایک کیمیا خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے مخالفانہ خیالات کے باوجود طب کے صیغہ کے متعلق علم تشریح کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمرہ چیرنے پھاڑنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس کمرے میں نہ فقط مردوں کی بلکہ اون زہدوں کی بھی چیر پھاڑ کی جاتی تھی جن کی نسبت کسی جرم سنگین کی پاداش میں سزا سے موت کا حکم ہو چکا ہوتا تھا۔

(۳) اشاعت علوم۔

محائب خانہ میں معلومات انسانی کے ہر شعبے پر لکچر دئے جاتے تھے یا سبائے ہوتے تھے یا درس و تدریس کا کوئی اور موزون طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ علوم و فنون کے اس عظیم الشان مرکز میں اطراف و اکناف عالم سے طالب العلم جوق جوق آتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ اس دارالعلوم کے طلبہ کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں کلیائے عیسوی تک کے بعض سربراہان و پیشوا مثلاً کلیئس الگزنڈرینس آرمین اور آرمینیئیس یہین سے تعلیم پا کر نکلے۔

اس عجائب خانہ کے متعلق جو کتب خانہ تھا اسے جوئس سیز نے محاصرہ اسکندریہ کے وقت جلا دیا۔ اس نقصان عظیم کی تلافی کے لیے مارک انٹونی نے یومینیز شاہ برکس کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ملکہ کلیو پٹر کی نذر کیا۔ ابتداءً یہ کتب خانہ بطلموسی کتب خانہ کی ساقبت کے خیال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب یہ کلیو پٹر کے ہاتھ لگا تو سر پیس کے کتب خانہ میں ضم کر دیا گیا۔

اب ہم کو مختصر یہ بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ یہ بے نظیر دارالعلم جس کو قدما نے ازراہ فخر

”مدرسہ الہیہ اسکندریہ“ کا نام دے رکھا تھا کس فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور انسانی معلومات کے ذخیرے میں جن جن باتوں کا اس کی وجہ سے اضافہ ہوا اور ان میں سے بعض کی نوعیت کیسا تھی۔

ہمارا فرض ہے کہ اس بے مثال عجائب خانہ کے جلیل القدر بانی کی یادگار میں ہم ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کو جو داسی کی تصنیف ہے تصانیف علمی کی صف اول میں جگہ دیں۔ بطلمیوس سوڑ جس طرح ایک بہت بڑا سپہ سالار اور ایک بہت بڑا تاجدار تھا اسی طرح ایک بہت بڑا مصنف بھی تھا۔ زمانہ اور احسانات کی یاد کو نہیں مٹا سکا جو اس نے ہم پر کیے ہیں مگر اس کی تصنیف کے ساتھ اس نے اچھا برتاؤ نہیں کیا اس لیے کہ ”تاریخ فتوحات اسکندر“ کا ایک بھی نسخہ آج موجود نہیں۔

سکندر بطلمیوس اور آرسطو کی باہمی دوستی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فلسفہ مشائخہ عجائب خانہ اسکندریہ کا عقلی سنگ بنیاد قرار پائے۔ شاہ فیلقوس نے سکندر کی تعلیم و تربیت پر آرسطو کو مامور کیا تھا جس نے اپنا یہ اثر دکھایا کہ جب سکندر ایران کی تسخیر میں مصروف تھا تو باوجود انہماک مشاغل فوجی کے روپیہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کتاب ”علم خواص الاشیا“ کی تیاری میں آرسطو کی مدد کرتا رہا جو اس وقت لکھی جا رہی تھی۔

آرسطو کے فلسفہ کا اصل اصول یہ تھا کہ جزئیات کے مطالعہ سے بذریعہ استقرا کلیات اخذ کیے جائیں جن واقعات و حقائق پر عمل استقرا کا انحصار ہے اور ان کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر یہ عمل زیادہ صحیح اور زیادہ قرین و ثوق ہوگا۔ اس طریقہ سے بذریعہ تجربہ مشاہدہ واقعات کے جمع کرنے میں بے انتہا محنت پڑتی ہے اور ساتھ ہی واقعات مجتمعہ سے نتائج نکالنے میں بہت کچھ غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقہ گویا عقل و محنت پر مبنی ہے نہ کہ تصور و تخیل پر۔ خواہ آرسطو سے باادقات جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہ اس طریقہ کی بے اعتباری پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ اس کو معتبر ہونے کا

ثبوت دیتی ہیں۔ ان غلطیوں کا اصلی باعث صرف یہی ہے کہ کلیہ قائم کرنے میں جن واقعات کو کام لیا گیا وہ تعداد میں ناکافی تھے۔

آرسطو کے قائم کیے ہوئے بعض کلیات نہایت پر شکوہ ہیں مثلاً ایک کلیہ اوس نے یہ قائم کیا کہ ہر شے حیات کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور تماشگاہ فطرت میں جو مختلف اعضائی صورتیں اور شکلیں ہمیں نظر آتی ہیں یہ حالات و کیفیات موجودہ کے مقتضیات کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و اشکال میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ پس اس طور پر ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہنچتا ہے اور موالید کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ حدود انضمام محسوس نہیں ہوتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ استقراریہ جس کی ایجاد کا فخر آرسطو کو حاصل ہے ایک بہت بڑا زبردست طریقہ ہے اور جو ترقی سائنس نے اس وقت تک کی ہے وہ اسی کی شرمندہ احسان ہے۔ یہ فلسفہ جب تکمیل کو پہنچا تو مظاہر سے اون کے اسباب و علل کا استقرار کیا جانے لگا اور اسباب کے دریافت ہونے کے بعد یہ اتباع طریقہ اشراقیہ سبب سے سبب کی تفصیل مستنبط ہونے لگی۔

اس طور پر اسکندر یہ میں عقلیات کی بنیاد جہاں ایتھنز کے ایک نامور حکیم کے اصولوں پر رکھی گئی اخلاقیات کا سہرا بھی ایتھنز ہی کے ایک دوسرے مشہور حکیم کے سر رہا۔ اس حکیم کا نام زینو تھا جس کی اصل اگرچہ قبرس یا فنیسیا سے تھی لیکن کئی سال سے اوس نے مستقل طور سے یونان کے پای تخت ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اوس کے شاگرد ”اسٹونک“ (جبو) کے نام سے مشہور تھے۔ اوس کے عقاید اوس کے مرنے کے بعد مدتوں قائم رہے اور مصیبت کے وقت میں جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا اوس کے لیے سرمایہ تسکین و تسلی ثابت ہوئے اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومنہ الکبریٰ

اک جلیل القدر حکیموں مدبروں سپہ سالاروں اور فرمانروائوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے رہے۔

نیز نو کا مقصد یہ تھا کہ روزانہ زندگی کے لیے ایک دستور العمل مقرر کیا جائے جس کی بدولت انسان برائی بھلائی میں تمیز کر سکے اور کوشش کی جائے کہ انسان نیک چلن ہو جائیں۔ اوس کا قول تھا کہ تعلیم نیکی کی اصلی بنیاد ہے اس لیے کہ اگر آدمی کو معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا شے ہے تو وہ خواہ مخواہ اوس کی طرف مایل ہوگا۔ علم کا مواد ہم پہنچانے کے لیے ہمیں اپنا دماغ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ باقی رہا اس مواد کی تالیف و ترتیب کا کام سوس کی ذمہ داری ہے۔ اس بارہ میں زینو اور ارسطو کا اتفاق رائے بڑا ہٹ پایا جاتا ہے۔ ہر خواہش یا شہوت یا آرزو ناقص علم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری جبلت یا طبیعت تو مقدر رات سے ہے لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے جذبات کو روکیں اور عقل کی پابندی کے ساتھ آزادانہ فیہانہ اور پاکبازانہ زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ ہماری زندگی ہماری دماغی قوتوں کی مطیع ہونی چاہیے اور زمانہ کے رنج و راحت سے ہم کو نہ کبھی خاطر بد دل ہونا چاہیے نہ مسرور و خرم بلکہ قلب میں سکون و طمانیت کی کیفیت پیدا کرنی چاہیے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنے اہناے جس کے غلام نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو تمام دنیا میں کو بھی اگر جابہ تو ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ خزانہ موت ہے۔ ہمیں یہ امر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ فطرت اپنے عمل درآمد میں عام نتایج کو پیش نظر رکھتی ہے اور افراد کے بچانے کی کبھی فکر نہیں کرتی بلکہ انہیں اپنے مقاصد عامہ کی تکمیل کا آلہ قرار دیتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ تقدیر کے آگے تسلیم خم کرین اور نیکی اعتدال صبر تحمل انصاف اور علم کے اکتساب میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عالم متغیر ہے۔ فنا کے بعد بقا اور بقا کے بعد فنا لازمی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ہر شے مر رہی ہے اور مر رہے گی موت سے ڈرنا یا اوس پر کڑھنا فضول ہے۔ جس طرح ہر سال آبشار کی ایک ہی صورت

رہتی ہے لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہر وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مادہ کی ایک سیل ہر وقت بہ رہی ہے جس کے وجود کو بقا ہے لیکن شکل آنی و فانی ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تفسیر ہے۔ بجز نقصان جزائے لای تجزی اور قوت کے اور کسی شے کو بقا نہیں۔ فطرت کی صورتیں جو ہمارے پیش نظر ہیں چند روزہ ہیں اور ضرور ہے کہ گزر جائیں۔

ہمیں اس واقعہ کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہیے کہ اکثر ان فون کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے خلاف بے ضرورت کوئی بات نہ کہنی چاہیے۔ خود ہمارے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ اگرچہ ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے جو ہر ایک لحاظ سے کامل و مکمل ہے لیکن کسی ہستی کا ملکہ کا وجود مطلق نہیں۔ ایک غیر مرنی جو ہر کے وجود میں تو کلام نہیں لیکن یہ کہنا کہ ایک ایسا شخص یا ذاتی خدا موجود ہے جس میں انسان کی صورت اور جذبات اور اجسامات پائے جاتے ہیں اتنا باعث کفر نہ ہو گا جتنا موجب لغویت الہام و تنزیل کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے اسے ایک غیر معلوم علت کا معلول سمجھنا چاہیے۔ اتفاقات و حوادث تک ایک مقررہ ضابطہ کے پابند ہیں جس سے وہ سر مو تجاوز نہیں کر سکتے۔ تاہم ایزدی یا شان ربانی جس قوت کا نام رکھا گیا ہے اس کا مطلق کہیں وجود نہیں۔ اس لیے کہ قدرت کا طرز عمل اٹل اور امٹ قوانین کا تابع ہے اور اس لحاظ سے کائنات گویا ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے۔ نظام کائنات کی رگ و پے میں جو زندہ طاقت ساری و دایرہ ہر اسے جہلا خدا کہتے ہیں۔ وہ انقلابات اور تغیرات جن کا اثر ہر شے پر پڑتا ہو کسی طرح ٹل نہیں سکتے اور اسی لیے کہا جاسکتا ہو کہ دنیا کی ترقی بجا بندئ قضا و قدر ایک بیج کی طرح ہو جو مرت اوی طریقہ پراگ سکتا ہے جو اس کے لیے پہلے سے معین کر دیا گیا ہے۔

۱۔ حکم زینو نے خدا کا انکار کیا لیکن ایک غیر مرنی جو ہر ایک زندہ طاقت کا اقرار کیا۔ (تبیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

انسان کی روح شعلہ حیات کائنات کی ایک چنگاری ہے۔ حرارت کی طرح اس کا نفوذ ایک جسم سے دوسرے جسم میں ہوتا رہتا ہے اور بالآخر اس کا انضمام یا انجذاب اُس جو ہر کلی میں ہو جاتا ہے جس سے اس کا انفصال ہوا تھا۔ اسی لیے ہم کو عدم یا فنا سے محض کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے بلکہ انجذاب یا اتصال کا یقین رکھنا چاہیے۔ اور جس طرح تھکا ہوا آدمی اداس غفلت کی تمنا کرتا ہے جو نیند سے ہم آغوش ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلاسفہ کو چاہیے کہ مکروہات دنیا سے تنگ آکر اداس حالت مطینہ کو اپنا مطمحہ نظر قرار دیں جو اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد ہی میسر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ باتیں ایسی ہیں جن پر غور کرتے وقت ہمیں ہر قدم پر شبہ و شک سے کام لینا چاہیے اس لیے کہ دماغ اپنے اندرونی ذرائع معلومات ہی سے حقیقت اشیا سے مطلع نہیں ہو سکتا۔ عقل اولیٰ سے بحث کرنا خلاف شیوہ حکما ہے۔ ہمیں صرف مظاہر یعنی ادن واقعات سے سروکار رکھنا چاہیے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ سب سے زیادہ ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کے لیے حقیقت مطلق کا اکتشاف محال ہے۔ مادہ کے متعلق انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کامل العلم ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر اوسے علم کامل حاصل ہو بھی جائے تو اوس کے پاس ایسا کوئی معیار موجود نہیں جس کی بنا پر اوسے اپنی معلومات کے صحیح و کامل ہونے کا یقین ہو سکے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) تاہم ایزدی کو سراپا لیکن قانون قدرت کو سراپا۔ کارفرماے قضا و قدر سے مترابی کی لیکن تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ حاکم کو نہ مانا لیکن حکم کو جائز اور قابل اطاعت سمجھا۔

”فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں“

اس پر بھی جناب باری کی ہستی سے انکار نہ ہو سکا۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ کوئی اوسے کسی طرح مانے کوئی کسی طرح لیکن اس بھندے سے بچ نکلنا محال ہے۔

”ہندو نے ضمن میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ نغان نے راگ گایا تیرا“

”دھری نے کیا دھر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا“ مترجم

ان تمام باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لیے باقی کیا رہا؟ سبجز اس کے اور کچھ نہیں کہ تحصیل علم کی کوشش کریں۔ نیکی اور پاکبازی کو اپنا شعار قرار دیں۔ اپنے اپنا سے جنس سے دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ ایمان داری اور راستبازی کو ہاتھ سے نہ دیں۔ جو کچھ پیش آکر اوس کو صبر و رضا کے ساتھ گوارا کریں اور ایسی زندگی بسر کریں جو ہر اعتبار سے عقل کے احکام کی پابند ہو۔

اگرچہ عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام کا مقصد خاص فلسفہ مشائیہ کی اشاعت و ترویج تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے مذاہب فلسفہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ عجائب خانہ کی بدولت فلسفہ اشراقیہ نہ صرف مد کمال تک پہنچا بلکہ آخرین ارسطو کی حکمت کا ناسخ ثابت ہوا اور جدید اکاڈمی کے ذریعہ سے عیسائیت پر ایک مستقل اور دیرپا اثر چھوڑنا گیا۔ فلاطون کا فلسفیانہ طریقہ ارسطو کے طریقہ کی ضد تھا یعنی اس میں ابتدا کلیات سے

لے لفظ اکاڈمی جس کے معنی بیت الحکمت کے ہیں ایک یونانی لفظ اکاڈمیاس سے مشتق ہو۔ اکاڈمیاس نواح ایتھنز میں ایک مقام کا نام تھا جہاں اول سقراط اور اوس کے بعد فلاطون اپنے شاگردوں کو آکر درس دیا کرتے تھے۔ فلاطون نے پچاس سال تک اس مقام پر حکمت آموزی کی اور یہی وجہ تھی کہ اکاڈمی کے معنی فلسفہ اشراقیہ کی درس گاہ کے ہو گئے۔ فلاطون کی وفات کے بعد جو شاگرد ۶۰ میں واقع ہوئی اوس کے فلسفہ میں ترمیمات ہونی شروع ہوئیں جس کی وجہ سے مذہب اشراقیہ کی تین شاخیں ہو گئیں۔ تینوں شاخیں علی الترتیب قدیم اکاڈمی وسیط اکاڈمی اور جدید اکاڈمی کے نام سے موسوم ہیں۔ قدیم اکاڈمی سے مراد خالص اشراقی عقاید کا مسلک ہے۔ وسیط اکاڈمی کی بنیاد حکیم ارسطو نے ڈالی جس کا سن ولادت ۳۸۴ ق م ہے۔ اس کے بعد ۳۵۴ ق م میں حکیم کارنیادیز نے جو دیوجانس کلبی کا شاگرد تھا جدید اکاڈمی قائم کی۔ کارنیادیز کا خیال تھا کہ ماہیت اشیا اور اک انسانی سے بالا ہے۔ اس سے اوس کی یہ مراد تھی کہ یہ بات ثابت نہیں کی جاسکتی کہ اوراک شے کو مادہ کے جوہر یا عرض کے لحاظ سے شے مد رک کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

کی جاتی تھی جکا وجود ہی مذہبی اعتقادات کی طرح قیاسی ہے اور کلیات سے جزئیات یا تفصیلات کا استخراج کیا جاتا تھا۔ بخلاف اس کے آرسطو استقرا کے عمل کی وساطت سے جزئیات سے کلیات تک پہنچتا تھا۔

اس خصوصیات ظاہر ہے کہ افلاطون کے مذہب کی بنیاد تخیل پر تھی اور آرسطو کی عقل پر۔ فلاطون ایک ابتدائی خیال کو سامنے رکھ کر اس کے تجزیہ سے اس کی تفصیلات تک پہنچتا تھا اور آرسطو جزئیات و تفصیلات سے تیاج استخراج کر کے ایک کلیہ قائم کرتا تھا۔ اسی لیے فلاطون کے طریقے سے بہت جلد بظاہر نہایت شاندار مگر دراصل ناقابل اعتبار نتائج پیدا ہو جاتے تھے حالانکہ آرسطو کے طریقے سے اگرچہ تیاج دیرین نکلتے تھے اور ان کو استخراج میں بے انتہادقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن ہوتے بہت زیادہ مستحکم اور دیر پا تھے۔ ان تیاج کے استخراج کے لیے واقعات کے جمع کرنے میں جس کنج کا دی اور دیدہ ریزی کا کام لینا پڑتا تھا اور تجربہ اور مشاہدہ میں جو جانکا ہی اور عرق ریزی گوارا کرنی پڑتی تھی وہ محتاج بیان نہیں یہی وجہ تھی کہ فلاطون کا فلسفہ گویا ایک شاندار قلعہ ہے جس کی بنیاد ہوا پر ہے اور آرسطو کی حکمت ایک مضبوط اور سنگین عمارت ہے جو بہت سی مخینے برداشت کرنے اور بہت سی ناکامیوں کا رنج اٹھانے کے بعد ایک ٹھوس اور مستحکم چٹان پر بنائی گئی ہے۔

قوت تخیل سے کام لینا بمقابلہ قوت عقلیہ کے عمل میں لانے کے کہیں زیادہ دلاویز ہے۔ جب اسکندریہ کے عقلی انحطاط کا دور آیا تو مشاہدہ کی دیدہ ریزیوں اور فکر و غور کی جانکا ہیوں کے بجائے طبیعتیں زیادہ تر سہل اور آسان طریقوں کی طرف رجوع

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) جو کچھ ثابت ہو سکتا ہے وہ فقط اسی قدر ہے کہ ادراک اور شے مدرکہ میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے جس کا اثر انسان کے نظام معی پر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے کار نیٹو نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی معلومات غیر یقینی ہیں۔ مترجم

ہو گئیں۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کے مدرسوں میں اُمونیسیسیکاس اور پلائٹنیسیسیکاس جیسے تخیل پرست متکلمین کا جوم نظر آنے لگا۔ خدا کی شان ہے کہ قدیم عجائب خانہ کے جفاکش مہندسون کو جانشین ایسے لوگ بنیں جنہوں نے فلسفہ کو بازیچہ اطفال سمجھ رکھا ہو۔

۱۔ ذہنیات اور موجودات خارجی میں باوجود مشائی اور اشراقی توجہات کے جو عقلی تناقض مدتوں سے چلا آتا تھا اوس کے رفع کرنے کے لیے حکما کے ایک گروہ نے جنہیں مسیحی علم کلام کا بانی کہا جاسکتا ہے تیسری صدی عیسوی میں فلسفہ کا ایک نیا مذہب فلسفہ اشراقیہ جدید کے نام سے اسکندریہ میں قائم کیا۔ اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ عقل اور ایمان میں توافق پیدا کیا جائے۔ بہت ہی علی الاطلاق یعنی خدا کی ذات کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ہونا محال تھا لہذا فلسفہ اشراقیہ جدید کے بانیوں نے مکاشفہ کے مسئلہ کو رواج دیا۔ اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادراک کے اجزائے عاقل و منقذہ یعنی نفس ناطقہ و شے مدرکہ باہم مخلوط و منقسم ہو کر ایک ہو جائیں اور ان میں کوئی فرق نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان کی تمنا ہے کہ اوس کو علم مطلق حاصل ہو لیکن اس حصول کے لیے خارجی اشیا کا ادراک یا طریقہ استعمال بیکار ہے۔ علم مطلق اوس کو اومی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ انجلاء نفس اور تزکیہ باطن سے محسوسات اور موجودات خارجی کو وہ اپنا پر تو بنائے اور بیرونی اثرات سے یہاں تک متغنی ہو جائے کہ عالم او معلوم ایک ہو جائیں اور اس طور پر سب چیزوں کا ادراک مکاشفہ یا بصیرت سے ہونے لگے۔ کثرت کے تصور سے جو عقلی مشکلات فلاسفہ کو اکثر پیش آئی ہیں ان سے بچنے کے لیے فلسفہ اشراقیہ جدید کے پیروں نے مسئلہ انفصال کو اصول ہمہ ادست کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ اس مسئلہ سے مراد یہ ہے کہ کائنات مرنی کے جملہ شواہد ضائع علی الاطلاق سے ماخوذ اور اوس کے مظاہر ہیں۔ مترجم

۲۔ ایک یونانی فیلسوف جس کا زمانہ ۵۰۰ء سے ۳۰۰ء تک ہے۔ فلسفہ اشراقیہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ سیکاس کے معنی یونانی زبان میں حال کے ہیں اور یہی اوس کے نام کے رکن ثانی کی وجہ تسمیہ ہے۔ اسکندریہ میں وہ ہماری کا پیشہ کرتا تھا۔ فروریوس کہتا ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

دارالعلم اسکندریہ اوس طریقہ کی پہلی مثال پیش کرتا ہے جس نے زمانہ حال کے ماہرین علم طبیعیات کے ہاتھ میں آکر ایسے حیرت خیز نتایج پیدا کیے ہیں۔ اس طریقہ کے اختیار کر فوڈالون نے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) کہ اوس کے مان باپ عیسائی تھے اور وہ خود بھی ابتدائین عقاید عیسوی کا پابند تھا مگر بعد میں مرتد ہو گیا۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ مرتے دم تک عیسائی رہا لیکن قیاس یہہ چاہتا ہے کہ فلسفیانہ تخیل نے مذہب عیسوی کے اصولوں کی طرف سے اوس کے دل میں شبہات و شکوک پیدا کر دیے اور اوس نے فلسفہ اشراقیہ میں تصوف کا پیوند لگانا چاہا۔ اوس نے اپنے خیالات قلبیہ نہ نہیں کیے بلکہ جو کچھ اپنے شاگردوں کو سکھایا زبانی طور پر سکھایا۔ اور یہ تعلیم مدتوں سینہ بسینہ چلی آئی۔ خدا کو وہ تثلیث کی شکل میں مانتا ہے لیکن اس تثلیث کے ارکان بجائے باپ بیٹے اور روح القدس کے جو ہر مطلق عقل فعال اور قوت تامہ ہیں۔ مترجم

۳۵۰ سنہ ۶ میں مصر میں پیدا ہوا اور ایمونیس سیکلاس سے دس سال تک فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایران یون اور ہندوؤں کے فلسفہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ ہوا۔ چند سال کے بعد وہ روم آیا اور دہان پچیس سال تک درس دیتا رہا۔ فرفور یوس اور لائنجینس اوس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ رہبانیت اوس کی زندگی کا جزو اعظم تھی۔ ایک دفعہ اوس کے دوستوں نے امرار کیا کہ تصویر کھینچو۔ اوس نے جواب دیا کہ انسان ایک سایہ ہے اور سایہ کی نقل آٹارنا حماقت ہے۔ پلاٹینس گوشت نہیں کھاتا تھا اور نہ پاتا بھی نہ تھا۔ شکہ ۶ میں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو طبیب کے معالجہ سے ہی انکار کیا۔ اوس کی تصانیف سے جو تعداد میں چون ۵۰۰ ہیں ایک ہستی کاملہ کے خیال کا پتہ چلتا ہے جو ہر خواہشمند پر اپنی خیر و برکت کا پرتو ڈالنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے۔ پلاٹینس کا خیال تھا کہ فلاسفہ میں ربانی عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ عوام کا لالہ نام کی طرح اس بات کے محتاج نہیں ہوتے کہ علایق مادی سے اپنے آپ کو منقطع کریں۔ خود اوس کی طبیعتوں میں عالم بالا کے حقایق کے اکتساب کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح عشاق میں اوس حسن کے ادراک کی استعداد موجود ہوتی ہے جو جسم سے معرا ہے اور موسیقی کا مذاق رکھنے والے ایک کمتر درجہ میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

وہی خیالی باتوں سے ابا کیا اور اپنی مفروضات و نظریات کو اون واقعات و حقائق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا جو مہندسانہ ثبوت کی تائید سے تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس اصول کو عام طور سے رواج دیا کہ صحیفہ فطرت سے حقائق کے اقتباس کرنے کا صحیح طریقہ عملی تجربہ ہے۔ ارسطیدس کی تحقیقات اشیا کے وزن مخصوص کے متعلق اور بطلیموس کی تصانیف مناظر و مایا کے موضوع پر ہمارے آج کل کے علمی فلسفہ کے اکتشافات سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور زمانہ مابعد کے مصنفین کی فرضی و قیاسی مہملات کی طرف انگشت حقارت سے اشارہ کر رہی ہیں۔ لیپس نے کہتا ہے کہ دارالعلم اسکندریہ کے قیام سے پہلے یونانیوں نے علم ہیئت کے متعلق اگر کوئی عملی کام کیا تو وہ یہ تھا کہ ۳۲ گز مربع میں میٹن اور یوگٹس نے نقطہ انقلاب صیفی کا مشاہدہ کیا۔ دارالعلم اسکندریہ میں پہلی مرتبہ ہم کو اس امر کی مثال ملتی ہے کہ جو مشاہدات کئے گئے اون میں زاویوں کی پیمائش کے آلون اور علم مثلث کے اصولی طریقہ حساب سے کام لیا گیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) جس مجرد کا تعلق کر سکتے ہیں پلاٹینس کی تصانیف کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے بعض مقابلات کا ترجمہ سٹرٹیلر نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۳۲ء) لوئیس نے بھی اپنی تاریخ فلسفہ (مطبوعہ لندن ۱۸۶۶ء) میں پلاٹینس کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم

لیپس ایک مشہور فرانسیسی مهندس اور ہیئت دان ہے جو ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا۔ سائنس میں اس کی اجتہادی عظمت کا یہ پایہ ہے کہ اسے نیوٹن کا سہیم و عدیل سمجھا جاتا ہے۔ نظام شمسی کی حرکات کے اصول کے متعلق اس نے ۱۸۹۹ء میں ایک مشہور و معروف کتاب لکھی جس میں قمر۔ سیارگان۔ اعظم کے اقمار۔ مشتری اور زحل کی ہر دو عدم مساوات اور حقیقت بد و جزر پر نہایت جدت و تحقیق کی بحث کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں پورٹریج نے کیا اور بمقام بوکسٹن ۱۸۶۹ء میں چھپوایا۔ مترجم

نہ تو اس کتاب میں اتنی گنجائش ہے اور نہ اس کا موضوع اجازت دیتا ہے کہ عجائبِ شاہ
اسکندریہ نے معلوماتِ انسانی میں جو جو اضافے کیے ادن کا یہاں مفصل ذکر کیا جائی
جو کچھ بیان کیا گیا ہے اوس کا منظر اسی قدر ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کو ان
ترقیات کی عام نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب ”ہسٹری آف
دی انلیکچرل ڈیولپمنٹ آف یورپ“ (یورپ کے دماغی نشوونما کی تاریخ) کا چھٹا باب
ملاحظہ فرمایا جائے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حکیم زینو کے فلسفہ میں حقیقتِ مطلق کے ادراک کے متعلق
شک ظاہر کیا گیا ہے۔ ادھر زینو ان شکوک و شبہات میں گرفتار تھا اُدھر اقلیدس اپنی اوس
سرکرتہ الآرا تصنیف کی تیاری میں مصروف تھا جو تمام دنیا کے مقابلہ میں کوس متحدی بجا کر
بنی نوع انسان کو یہ دعوت دینے والی تھی کہ اگر دعویٰ ہے تو مجھ میں کوئی نقص نکالو۔ بائس
صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب صحتِ سیلاست صفائیِ اکیلیت اثبات اور استقامت
تمام کا ایک عظیم النظیر نمونہ ہے۔ اس جہندس اعظم کی تصانیف نہ صرف ریاضی کی دوسری
شاخوں مثلاً فصولِ مخروطی یا اشکالِ کثیر النتیج میں پائی جاتی ہیں بلکہ علمِ الاصوات اور علمِ
مناظر و مرآیات بھی بعض رسائلِ ایسے ہیں جو اوس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مناظر و مرآیات
میں اوس نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ شعاعیں آنکھ سے نکل کر اشیائے مرئیہ پر
پڑتی ہیں۔

ارشمیدس نے اگرچہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تسلی میں جا کر اقامت اختیار
کر لی تھی لیکن اوس کا شمار بھی اسکندریہ ہی کے ماہرینِ علمِ ہندسہ و طبیعیات کے زمرہ
میں کرنا چاہیے۔ ریاضی میں اوس نے دو کتا بین کرہ اور اسطوانہ کی ماہیت پر لکھی ہیں۔
ان تصانیف میں اوس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ٹموس کرہ کا جسم مقدار میں اوس اسطوانہ
کی مقدار کا دو ثلث ہوتا ہے جو اس کا محیط ہو۔ اس اکتشاف پر اوسے اس قدر ناز تھا کہ

مرتے وقت اوس نے یہ وصیت کی کہ یہ شکل اوس کی قبر کے تعویذ پر کندہ کی جائے۔ دایرہ اور شکل قریب البیضوی کی تزیج پر بھی اوس نے بحث کی ہے۔ اوس کا ایک رسالہ اشکال میشل مخروط و میشل کرہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اوس چکر دار شکل کو بھی اوس نے اپنی عقل و تبحر کی موٹگانی کا موضوع قرار دیا ہے جو اوس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا خیال اوس کے ذہن میں اول اول اوس کے دوست کانن نے اسکندریہ میں پیدا کیا تھا۔ اوس کے بعد اس پایہ کا ہندس یورپ دو ہزار سال تک پیدا نہ کر سکا۔ طبیعیات میں اوس نے مائیات کی بنیاد لی۔ وزن مخصوص کے دریافت کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیاء کے توازن یعنی مرکز ثقل پر بحث کی۔ بیرم کی ماہیت کا پتہ لگایا اور دریائے نیل سے پانی کھینچنے کے لیے ایک بیج کی شکل کا آلہ ایجاد کیا جو ابھی تک اوس کے نام سے مشہور ہے۔ غیر متناہی تیج اور نیز وہ شیشہ آتشی جس سے سائر اکیوز کے محاصرہ میں اوس نے اہل روم کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا اوس کی ایجادات میں داخل ہیں۔

ایرانا سٹھنیز بھی جو ایک وقت میں کتب خانہ کا صدر مہتمم تھا بہت سی اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کا مصنف تھا۔ خطوط سرطان و جدی کا درمیانی فاصلہ اسی نے دریافت کیا اور زمین کی جسامت کے معلوم کرنے کی کوشش بھی اول اول اسی نے کی۔ براعظموں کے جوڑ اور پھیلاؤ۔ پہاڑوں کے سلسلوں کے مقامات وقوع۔ بادلوں کے عمل۔ طبقات الارض کی غرقابی۔ ڈوبے ہوئے طبقات کے ابھار۔ آبناے دردانیال و جبل الطارق کی افتتاح اور بحیرہ اسود کے تعلقات پر اوس کے مباحث موجود ہیں۔ اوس نے حالات ارضی پر ایک مکمل کتاب تین مقالوں میں لکھی تھی۔ پہلے مقالہ میں طبیعیات سے بحث تھی دوسرے میں ریاضیات سے تیسرے میں تاریخ سے۔ اس کتاب کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر اون مالک کا ایک نقشہ بھی شامل تھا جو اوس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اوس کی ”تاریخ شاہان تھینیز“

کے بعض اجزا زمانہ کی دستبرد سے بچ رہے ہیں اور چند سال سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ہیں درنہ صد ہا سال تک تو ہماری موجودہ دینی تاریخ کے مقابلہ میں جس کی حیثیت ایک مجموعہ لغویات سے زیادہ نہیں ان پر اعتنا ہی نہ ہوا۔

اس مقام پر ادن دلائل کا بیان کرنا ضرور نہیں ہے جو اسکندریہ کے علمائے زمین کو گول ثابت کرنے کے لیے اختیار کیں۔ ان لوگوں کو کرہ زمین۔ قطبین محور زمین۔ خط استوا۔ دائرہ قطب شمالی۔ دائرہ قطب جنوبی۔ نقاط اعتدال لیل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و شتوی۔ سردی اور گرمی کی تقسیم اور مسائل متعلقہ کا صحیح صحیح طور پر علم تھا۔ یہاں صرف آپالوینس کی ادن تصانیف کا نام ہی لیا جاسکتا ہے جو اس نے فصول مخروطی اور مقدار اکثر و اقل پر قلمبندی تھیں۔ الفاظ ”ایلیس“ (شکل ایلیبی یعنی وہ شکل جو کسی جسم مخروطی کو ترچھا ترانے سے پیدا ہوتی ہے) اور ”ہائی پر بلا“ (شکل بید البیضوی) کا اول اول اسی نے استعمال کیا۔ ارسطیس اور تمارکس کی رصد بینی کا ذکر بھی بوجہ قلت گنجائش یہاں اچھا ہوا ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہتقبال نقاط اعتدال لیل و نہار کا عظیم الشان اکتشاف جو ہپارکس نے کیا ہے تمارکس ہی کے ہیئت مشاہدات پر مبنی تھا۔ قمر کی عدم مساوات اولین اور مساوات مرکز کی تحقیقات بھی ہپارکس ہی کی ہے۔ حرکت داری کے اصول پر اجسام فلکی کی ظاہری گردش کی تشخیص کے لیے اس نے وہ مہندسانہ طریقہ ایجاد کیا جس میں دو غیر مساوی دایروں سے اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ چھوٹے دایرہ کا مرکز ہمیشہ بڑے دایرہ کے محیط پر گردش کرتا رہے یا دو مختلف مرکز دایرہ ایک دوسرے کو قطع کرتے رہیں۔ اس نے ستاروں کی ایک فہرست بھی ایک خاص طریقہ کے مطابق تیار کی تھی جس کی رو سے وہ ستارے جو بظاہر ایک خط مستقیم میں نظر آتے ہیں درج فہرست کھو گئے تھے۔

لے خط استوا کے شمال اور جنوب میں دو فرضی دایرہ واقع ہیں جنہیں سرطان اور جدی کہتے ہیں۔ آفتاب موسم شتا و صیف یعنی جاڑے اور گرمی میں خط استوا کے جن بید ترین نقطوں پر ہو کر گذرتا ہے انہیں نقاط انقلاب صیفی و شتوی کہتے ہیں۔ مترجم

جن ستاروں کا فہرست میں اس طور پر اندراج ہوا وہ شمار میں ۱۰۸۰ ہوتے تھے۔ آسمان کی طرح اس نے زمین کے متعلق بھی اسی طرح کی کج گادی کی تھی۔ یعنی عرض بلد اور طول بلد کے خط کھینچ کر دیار و امصار اور دوسرے مقامات کی نشاندہی کی تھی شمس و قمر کی میزانیں بھی اول اہل ادسی نے تیار کی تھیں۔

مہندسین۔ بنجین اور جیبسین کے اس جلیل القدر گروہ کی فہرست میں بطليموس کا نام ہمیں نور کے حرفوں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی شہرہ آفاق کتاب ”سنشکس“ (یعنی عالم بالا کی مہندسانہ ساخت) ڈیڑھ ہزار سال تک ہیت کے متعلق دنیا کا دستور العمل بنی رہی اور نظام بطليموس کا چراغ صرف اس وقت گل ہوا جب کہ نیوٹن نے اپنی غیر فانی تصنیف ”پرنسپیا“ لکھ کر اس مسند کو زینت دی جو پندرہ صدیوں تک ”سنشکس“ کے مصنف کے لیے وقف رہی تھی۔ بطليموس کی کتاب کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ زمین گول ہو اور فضا نے بسیط میں قایم ہے۔ اس میں میزان الاوتار کے بنانے کی ترکیب اور اون آلات کا حال مندرج ہے جن سے نقاط انقلاب صیفی و شتوی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ محققانہ بحث کے بعد اصول اعوجاج طریق الشمس کا استخراج کیا ہے۔ علم یا جیب کو ذریعہ سے ارضی عرض بلد لگانے کا طریقہ بتایا ہے۔ موسون کا حال بیان کیا ہے۔ معمولی وقت کو کوکبی وقت میں تبدیل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ کوکبی سال پر انقلابی سال کو ترجیح دینے کی وجہ بیان کی ہیں نظام شمسی کا ذکر کرتے ہوئے اس اصول کی توضیح کی ہے کہ وہ دو ایرجن میں سیارے آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں مختلف المرکز ہیں۔ مساوات وقت کے اصول کی تشریح کی ہے۔ قمری حرکات پر بحث کرتے ہوئے اس کی عدم مساوات اولین اس کے گہن اور اس کے نقطہ راس و ذنب کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد خود بطليموس کے عظیم الشان اکتشاف یعنی قمر کی عدم مساوات ثانیہ پر بحث کرتے ہوئے بطليموس کے نام کو فنا کے رہین منت ہونے سے بچا لیا اسے اس مہندسانہ اصول کا تاج کیا گیا ہے

جس کے بموجب دو غیر مسادی دایروں میں سے چھوٹا دایرہ اپنے مرکز کو بڑے دایرہ کے محیط پر رکھ کر اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ پھر زمین سے سوچ اور چاند کا فاصلہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر ہپارکس کی تحقیقات یعنی استقبال نقاط اعمدال میل و نہار کا بیان کیا ہے جس کا مکمل زمانہ پچیس ہزار سال ہے۔ بالآخر ۱۰۲۲ ستاروں کی فہرست مرتب کی گئی ہے اور کہکشان کی نوعیت پر نظر انتقاد ڈالنے کے بعد سیاروں کی حرکت پر نہایت متفقانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور امر جس نے بطلیموس کی علمی شہرت کے استحقاق کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے یہ ہے کہ سیاروں کے مدار کی تعمیر میں وہ ہیئت و انان از منہ ماضیہ کے ترصعات سے اپنے مشاہدات کا مقابلہ کرنے کے بعد رائے قائم کرتا ہے۔ چنانچہ زہرہ کے مدار کو معین کرتے وقت اس نے تمارکس کے مشاہدات کو پیش نظر رکھا ہے۔

عجائب خانہ اسکندریہ میں ٹیمپلیس نے آتشین انجن ایجاد کیا تھا۔ اس کے شاگرد ہیرو نے دو اسطوانوں کے اضافہ سے اسے ترقی دی۔ اول اول دخانی انجن سے بھی یہی کام لیا گیا کہ وہ بھی ہیرو کی ایجاد سے تھا اور ایک خاص ترکیب سے چلایا جاتا تھا جو یہ تھی کہ دہات کے ایک کھوکھلے گولے میں جس میں ایک چھوٹا سا منفذ ہوتا تھا پانی بھر دیا جاتا تھا اور نیچے آنج پہنچائی جاتی تھی حرارت پہنچ کر پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا اور بھاپ کے زور سے گولا گردش کرنے لگتا تھا جس سے انجن چلنے لگتا تھا۔ ٹیمپلیس کے ایوانوں کی خموشی میں ٹیمپلیس اور آپالونیس کی آبی گھڑیان خلل ڈالتی تھیں جن میں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کرتے تھے اور وقت کا اندازہ کرتے جاتے تھے۔ جب رومہ البکری کی تقویم اس قدر ناقص ہو گئی کہ سال و ماہ کے حساب میں ہر وقت غلطیاں ہونے لگیں تو جولیس سیزر نے اس کی اصلاح کے لیے ساجینیہ ہیئت دان کو اسکندریہ سے طلب کیا۔ چنانچہ اس کے مشورہ کی بنا پر قمری سال منسوخ کیا گیا اور سرکاری سال شمسی قرار پایا اور اس وقت سے

وہ تعلیم رواج ہو گئی جو جو لیس سیرز کے نام سے منسوب ہے۔

مصر کے مقدونی فرمانرواؤں کو اس برتاؤ کے لحاظ سے جو ادنیوں نے اپنے زمانہ کے مذہبی عقاید کے ساتھ کیا مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ ادنیوں نے مذہب کو اپنی سیاسی مقاصد کی تکمیل کا آلہ بنایا یعنی جہلا اور عوام پر اس کے ذریعہ سے اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھا اور جو سمجھ بوجھ رکھتے تھے ان کی تشفی فلسفہ سے کر دی۔ لیکن بلاشبہ ان کے اس طرز عمل کا سویدہ تجربہ تھا جو یونانیوں کو اپنی ایشیائی فوج کشی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا اور جس کی بدولت وہ اقوام عالم میں ممتاز و سربرآوردہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آبائی وطن کی مذہبی روایات کے بوسیدہ طلسم کو اپنی آنکھوں ٹوٹتا ہوا دیکھ چکے تھے اور ان عجائبات کی ظلمت کو جن کا پردہ قدیم شاعر دن کے تنجیل نے بحرِ روم کے اطراف و جوانب پر ڈال رکھا تھا تجربہ اور معلومات کی تیل روشنی کے سامنے کافور ہوتے ہوئے مشاہدہ کر چکے تھے۔ اولپس کی پراسرار چوٹیوں پر دیوتا غائب ہو چکے تھے اور دیوتا تو ایک طرف رہے خود اولپس کا وجود ایک وہمی و فرضی نسانہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا تھا۔ ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پر وہ تصور سے محو ہو چکا تھا اس لیے کہ خود ہیڈیز ہی کا کہیں وجود نہ تھا۔ ایشیائے کوچک کے سبز جنگلوں سایہ دار شیشیوں اور بہتے دریاؤں سے مقامی دیوتا اور دیبیاں رخصت ہو چکی تھیں یہاں تک کہ ان کے بجا ریوں کو شبہ ہونے لگا کہ یہ مہبود کبھی ان مقامات میں رہتے بھی تھے یا نہیں۔ شامی لڑکیاں اگر اپنے عشقیہ گیتوں میں ابھی تک اڈانس کے حسرتناک انجام کی یاد کو

لے یونانی علم الاضنام کی روایات میں ایک نوجوان کا نام ہے جس پر بوجہ اس کے غایت درجہ حسین و جمیل ہونے کے دیس یعنی عشق و محبت کی دیوی عاشق ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اڈانس پر ایک جنگلی سور نے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ دیس نے اپنے معشوق کے زخم پر اگرچہ شراب آسمانی کے قطرے ٹپکائے جس سے زخموں کے پھول پیدا ہو گئے لیکن وہ اس زخم جانتان سے جان بر نہ ہو سکا۔ مترجم

تازہ رکھتی تھیں تو اوس کی وجہ یہ تھی کہ آڈانس کا حقیقت میں وہ خستہ ہوا جو روایات میں مذکور تھا بلکہ محض بطور تفسیر طبع۔ ایران نے رہ رہ کر اپنا قومی مذہب تبدیل کیا تھا۔ زردشت کے الہامی مذہب کو چھوڑ کر اوس نے مثنوی عقاید اختیار کیے تھے۔ پھر نئے سیاسی اثرات سے متاثر ہو کر جوہیت کو اپنا قومی مسلک قرار دیا تھا۔ اوس نے آگ کی پرستش کی تھی اور اپنی قربانگا ہون کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر مقدس عنصر سے روشن رکھا تھا۔ اوس نے سورج کو اپنا معبود مانا تھا۔ اور جب سکندر آیا تو اوس کا میلان عقیدہ ہمہ اوست کی طرف ہو چلا تھا۔

اوس ملک کے لیے جس کی دستگیری وہاں کے مقامی دیوتا سیاسی مصیبت کی وقت نہ کر سکے ہوں تبدیل مذہب ایک لازمی شے ہے۔ مگر کے قدیم دیوتاؤں کو جبکہ جلال عظمت کی یادگار میں اونچے اونچے مینار اور بڑے بڑے مندر قائم کئے گئے تھے ممالک غیر کے حملہ آوروں کی تلوار کے سامنے پے بہ پے اپنی گردن جھکانی پڑی۔ اہرام و ابو الہول کی سرزمین میں دیوتاؤں کی سورتوں نے کسی زندہ طاقت کے منظر ہونے کا ثبوت دینا مدت سے چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کو اب اون پر مطلقاً ایمان نہ رہا تھا۔ اب ایسے دیوتاؤں کی ضرورت تھی جنہوں نے حال ہی میں جنم لیا ہو اور یہی وجہ تھی کہ آسیرس کی جگہ سرتیس نے لے لی۔ اسکندریہ کے گلی کوچوں میں ہزاروں یہودی ایسے تھے جو اوس خدا کو بھول چکے تھے جس نے سرتیس کے مندر کے سب سے زیادہ مخفی حجرے کو اپنی سکونت کے لیے مخفی کر رکھا تھا۔

روایت الہام یا زمانہ کسی کا اثر باقی نہ رہا تھا۔ یورپین علم الاصلنام کے افسانے ایشیائی الہام کی روایتیں مہری کا ہنوں کے قدامت آلودہ عقاید سب کے سب مٹ چکے تھے یا مٹتے جاتے تھے۔ یہی وہ نشانیاں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر فرمانروایان سلسلہ بطلیموسیہ کی آنکھوں میں مذہبی عقاید کی بے ثباتی کی تصویر بھر گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اون کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو مذہب کی مختلف شکلوں سے زیادہ دیر پا ہے۔ یہ شکلین تو طبقات الارض کے ازمنہ قدیمہ کی اعضائی شکلوں کی طرح ایک دفعہ ناپید ہو کر

ہمیشہ کے لیے پردہ خفایں چلی جاتی ہیں اور دوبارہ منصفہ شہودین نہیں آسکتیں لیکن وہ چیز جس پر اس ظاہر بے حقیقت اس نمود بے بود عالم کا پردہ پڑا ہوا ہے کیا حیرت ازلی وابدی حقیقت !!

یہ حقیقت ہم کو اون پادرواروایتوں سے نہیں معلوم ہو سکتی جو ادن لوگون سے ہیں ترکہ میں پہنچی ہیں جنہوں نے صبح تمدن کے طلوع کے وقت عالم ہستی کا جلوہ دیکھا تھا اور نہ اون بزرگوں کا خواب وخیال اس کا ماخذ ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ملہم من اللہ تصور کرتے تھے بلکہ اس کا مبداء منشا ہندوستانہ تحقیقات اور فطرت کا نظری و عملی تجربہ ہے۔ جس سے بنی نوع انسان پرستقل بے شمار درجے بہا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

وہ دن کبھی نہ آئے گا جبکہ تحریر اقلیدس کی ایک شکل سے بھی کسی کو الٹا رہوگا۔ ایراتھستیس کے اس دعوے کی تردید کی کبھی کسی کو مجال نہ ہوگی کہ زمین گول ہے۔ اسکندریہ اور سائیراکیوز میں جو عظیم الشان طبعی ایجادات واکتشافات ہو چکی ہیں وہ لوح روزگار سے کبھی مٹ نہ سکیں گے۔ ہپارکس۔ اپالونیسس بطلمیوس اور ارشمیدس کے نام ہر مذہب وملت کے لوگ اس وقت تک جب تک کہ انسان کے سر میں دماغ اور منہ میں زبان ہے تعظیم کے ساتھ لیے جائیں گے۔ اس طور پر عجائب خانہ اسکندریہ کے بطن سے علوم جدیدہ پیدا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ اس عجائب خانہ کے قیام سے مدتوں پہلے چین اور سو پوٹیمیا میں اجرام فلکی کے مشاہدات ہو چکے تھے اور ہندوستان میں فن ریاضی کو ایک حد تک ترقی دی جا چکی تھی لیکن ان ممالک میں سے کسی میں بھی علمی تحقیقات میں تسلسل اور ربط نہیں پایا گیا۔ اور نہ عملی تجربوں ہی سے کام لیا گیا۔ یہ فخر موجودہ سائنس کی طرح اسکندریہ میں سائنس ہی کو حاصل ہے کہ اس نو مشاہد محض کی حد سے بڑھ کر فطرت کے مطالعہ اور عملی تجربہ کی وادی میں قدم رکھا۔

دوسرا باب

عیسائیت کی ابتدا

شاہی اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس کی قلب باہیت۔ اس کا تعلق سائنس کے ساتھ
 رومانی جمہوری حکومت کی مذہبی حالت۔ جمہوریت کے مبدل بہ حکومت شخصی ہونے سے
 لوگوں کا میلان تو حد کی طرف ہو جاتا ہے۔ سلطنت رومین مذہب عیسوی کی اشاعت۔ عیسائیت
 کو حکومت جس طریقہ سے ہاتھ آتی ہے اوس کے سیاسی مقدمات عیسائیت اور بت پرستی کے
 باہمی اتحاد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ عیسائیت کے مفاد اور رسوم کے متعلق مٹلین کا بیان۔
 قسطنطین کی حکمت عملی کا مغرب اثر۔ عیسائیت کا اتحاد طران جماعت کے ساتھ۔ عیسائیت اور
 سائنس کا تناقض باہمی کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی اور تحصیل فلسفہ کی مانفت۔ اگسٹائن کے
 فلسفہ اور پادریوں کے علوم کی حقیقت۔ کتب مقدس کو سائنس کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔

سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت روم متہ الکبریٰ نے دنیا کے
 لیے چھوڑا۔

جب روم نے جمہوری طرز حکومت چھوڑ کر شخصی حکومت کا طریقہ اختیار کیا تو وہ تمام آزاد
 و خود مختار قومیں جو بحر روم کے چاروں طرف آباد تھیں روم کی مطیع و متقاد ہو چکی تھیں۔ اون کا
 یکے بعد دیگرے سخر ہونا بجائے اس کے کہ اون کو تباہ کرتا اون کے حق میں موجب سلامتی
 ثابت ہوا اس لیے کہ وہ ہمیشہ کی لڑائیاں جو ان کو ایک دوسرے سے دست و گریبان رکھتی
 تھیں موقوف ہو گئیں اور وہ مصیبتیں جو ان آئے دن کی خونریز معرکہ آرائیوں سے پیدا ہوتی تھیں

عالمگیر امن سے مُبدل ہو گئیں۔

نہ صرف اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بلکہ فاتحانہ رعونت کے جذبہ کے اقتضا سے دولت روم نے مفتوح اقوام کے دیوتاؤں کو اپنے پایہ تخت میں لالسا یا اور اوس رواداری اور مسالمت کے ساتھ جس سے بوسے استغنا آتی تھی اوس نے ان سب کی پرستش کو جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اصلی وطن میں جو غیر محدود اقتدار ہر دیوتا کو اپنی بجا یوں پر حاصل تھا وہ اُن دیوتاؤں اور دیمیون میں شامل ہونے کی وجہ سے جن کا ایک جم غفیر اوس کی طرح دوسرے ممالک سے لایا گیا تھا عقدا ہو گیا۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے، جبرائیلی اکتشافات اور فلسفیانہ تنقید کی بدولت لوگوں کے قدیم مذہبی عقاید میں پہلے ہی بہت کچھ متزلزل واقع ہو چکا تھا۔ رومنہ الکبریٰ کے اس طرز عمل کی بدولت جو رہا سہا اعتقاد تھا اوس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تمام ممالک مفتوحہ کے فرمانروا تخت سے اتارے جا چکے تھے اور اُن کی جگہ ایک شہنشاہ سدا آراء حکومت تھا۔ اسی طرح دیوتا بھی سب کے سب معدوم ہو چکے تھے۔ سیاسی اور مذہبی خیالات میں جو تعلق ہمیشہ قائم رہا ہے اوس کے لحاظ سے یہ بات ہرگز قابل تعجب نہ تھی کہ متعدد معبودوں کی پرستش کے بجائے ایک معبود سے لو لگانے کا خیال دیوتاؤں میں گھر کر جائے۔ رومین بھی ایسا ہی ہوا۔ اول اول شہنشاہ کے مرنے پر اوسے ربانی اعزاز دئے گئے اور رفتہ رفتہ زندہ شہنشاہ خود پجئے لگا۔

جس آسانی سے دیوتا پیدا کر لیے جاتے تھے دیوتاؤں میں اس کا ایک زبردست اخلاقی اثر پیدا ہوسے بغیر نہ رہا۔ جب کوئی نیا دیوتا لوگوں کی عقیدت کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا تھا تو پُرانے دیوتا کی لامحالہ تضحیک ہوتی تھی۔ مشرق میں اوتاروں نے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دہار کر اویس کی ربانی آبادی کو بہت جلد جلد بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایشیا کا اگر یہ قاعدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروزی رنگ کے

اند رظاہر ہوتے تھے تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا۔ روم کے دامن اعتقاد کو تشنگ کی جس گرد نے آلودہ کیا وہ یونان سے نہ اٹھی تھی بلکہ کثرت مذاہب کی وجہ سے رومین خود بد اعتقاد دی کی خاک اڑنے لگی تھی۔

تقد دے تو حد کی طرف رجوع کرنے میں روم کی آبادی کے تمام طباقوں نے یکساں سرعت کے ساتھ کام نہیں لیا۔ تجارت قانون دان اور سپاہی جو اپنے مشاغل کی نوعیت کے لحاظ سے سرد و گرم زمانہ کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں اور دماغی قابلیت سے بھی نسبتاً زیادہ بہرہ اندوز ہوتے ہیں سب سے پہلے متاثر ہوئے۔ ان کے بعد کاشتکاروں اور مزدوری پیشہ لوگوں کی باری آئی۔

جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روم انتہائے ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روم کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اون کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ العیش بنا دے۔ پاکبازی حفظ نفس کے نوان نصت پر بینہ نگہدان ہے اور اعتدال سلسلۂ حفظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اون کے دستہ خوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچے کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اون کے ملازم زرق برق کی پوشاک میں پہنے اون کی خدمت کے لیے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے۔ ماہر ویان روماء جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں اون کی سستی انگیز صحبتوں کا لطف دو بالا کر سنے کے لیے مونا زار رہتی تھیں۔ عالیشان حماموں و لکشا تماشا گاہوں اور جوش آفرین دنگونوں میں جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اوس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لیے خاک و خون میں سوجائے اہل روم کے سامان

تعمیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے۔ اس لیے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اوس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکا ہیون اور عرقریون سے پیدا ہوا ہے۔ مال دالملاک کی ضبطی۔ صوبجات کے محاصل کی تشخص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانرواے دولت روم اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔ غرض روم کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اوس نمایشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔

اس زمانہ میں جسکا ہم ذکر کر رہے ہیں دولت روم کے ایک مشرقی صوبہ یعنی شام میں ایک طبقہ ادنیٰ کے چند بے بضاعت لوگوں نے ایک مذہبی برادری قائم کر لی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنا سچے جنس کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا جائے۔ ان لوگوں کے اصول ہمہ گیر اخوت کے اوس جذبہ سے توافق کلی رکھتے تھے جسکا پیوند ممالک مفتوحہ کے الحاق و انضمام نے اخلاق کی شاخ میں لگایا تھا۔ یہ اصول حضرت عیسیٰ ابن مریم کی تلقینات سے تھے۔

اس زمانہ میں بنی اسرائیل کا بعض روایات کی بنا پر یہ عقیدہ تھا کہ اون کی قوم میں سے ایک نجات دہندہ پیدا ہوگا جو اون کے گزرے ہوئے جاہ و جلال اور کھوئی ہوئی عظمت و توقیر کے احیاء و رجعت کا باعث ہوگا۔ حضرت عیسیٰ کے شاگرد تو او نہیں وہ مسیح موعود سمجھ کر اون پر ایمان لے آئے جس کے ظہور کی بشارت بزمانہ سابق دی جا چکی تھی لیکن یہودی کاہنوں نے یہ دیکھ کر کہ جناب مسیح کی تعلیم اون کی اغراض کے سنائی ہے اون کی شکایت رومی گورنر سے کر دی جس نے کاہنوں کی رضا مندی مقدم سمجھ کر او نہیں بہ تامل بسیار موت کے حوالہ کیا۔

جناب مسیح کی فیاضانہ تعلیم جس میں انسانی اخوت کا نکتہ مضمون تھا اس واقعہ کے بعد بھی

زندہ رہی۔ حواریان مسیح نے منشر ہونے کے بجائے اپنا ایک جتھا قائم کر لیا۔ اصول مساوات جایدا د کی بنا پر اس برادری کا ہر رکن جایدا د مشترکہ میں اپنا اپنا سرمایہ اور آمدنی شریک کر دیتا تھا۔ اس طور پر جماعت مسیحی کی ہواؤن اور یتیموں کی پرورش اور مفلسوں اور مریضوں کی نگہداشت ہونے لگی۔ اس بیچ میز و کس سپرس جماعت نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک نئی اور جیسا کہ واقعات نے آگے چل کر ثابت کر دیا ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر لی جس کا نام کلیسا تھا۔ کلیسا کو نئی تحریک تو اس لیے کہنا چاہئے کہ اس قسم کی کوئی جماعت اس سے پہلے وجود میں نہ آئی تھی اور زبردست اس لیے کہ مقامی کلیساؤن نے جواول اول منتشر و منفرد تھے اپنی مشترکہ اغراض کے تحفظ کے خیال سے اجتماعی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اور ان سب کے باہمی اجتماع سے ایک کلیسا پیدا ہو گیا۔ اسی اجتماع کی بدولت عیسائیت کو تمام سیاسی فتوحات میسر ہوئیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں روم کے جنگی تسلط کی وجہ سے عالمگیر امن قائم ہو چکا تھا اور اقوام مفتوحہ میں برادرانہ ارتباط کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ لہذا سلطنت کے طول و عرض میں جدید تحریک یعنی مسیحی تعلیم کی سریع السیر اشاعت کے لیے رستہ صاف تھا۔ یہ تحریک ارض شام سے شروع ہوئی اور تمام ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی قبرس یونان اور اٹلی میں جا پہنچی اور بالآخر وہاں سے مغرب کی طرف بڑھتی ہوئی فرانس اور برطانیہ پر مسلط ہو گئی۔

مسیحیت کے اعلیٰ میں ادون منادوں نے بہت بڑا حصہ لیا جو ہر طرف اس دین کی منادی کرتے پھرتے تھے۔ اور یہ وہ طریقہ تھا جس سے فلسفہ کے قدیم مذاہب کے پیروں نے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔

اس نئے مذہب کی حد بندی میں سیاسی حالتیں ایک بڑے درجہ تک معین ہوئیں۔ چنانچہ آخر الامر عیسائیت ادون تمام ممالک میں پھیل گئی جن پر رومی پھر براڑا تھا۔ اور بجا کر

یورشلیم کے جس کے مشہد مسیح ہونے میں کلام نہیں تو باجہان پطرس کا وفات پانا مشتبہ ہے مذہبی پایہ تخت ہو گیا۔ لیکن باوجود اون متبرک و مقدس یادگاروں کے جو جنتیں اور کیٹوری کے ساتھ وابستہ ہیں بہتر یہی تھا کہ عیسائیت کا پرچم سات پہاڑیوں والے شنشاہی دارالامارہ پر لہراتا ہوا نظر آئے۔

سالہا سال تک مذہب عیسوی صرت تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا یعنی حق اللہ حق اللذات اور حق العباد۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تحکیم کرے۔ ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے اپنا سہ جس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اول اول جب یہ مذہب کمزور تھا تو اس نے لوگوں کو نرمی اور انکسار کے ساتھ دعوت دی لیکن جب مسیحی جماعت تعداد اور اثر کے لحاظ سے غالب ہو چلی تو اس میں سیاست پر نشان نمودار ہوئی اور حکومت کے اندر حکومت اور سلطنت کے اندر سلطنت قائم کرنے کا رجحان اس میں پایا جانے لگا۔ چنانچہ یہ رجحان اس وقت سے لے کر اب تک برابر قائم رہا اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا میلان اس کے نشوونما کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمانروایان تو اس نے اس کی اس ایج کو اپنی نظم و نسق سلطنت کی راہ میں مزاحم پاکر اس کا سد باب جنگی قوت سے کرنا چاہا۔ اور ایسا کرنے میں انہوں نے اپنے اُن فوجی اصولوں کو پیش نظر رکھا جن کی رو سے شہنشاہانہ افوق کے برقرار رکھنے کا ذریعہ بجز دباؤ کے اور کچھ نہ تھا۔

سنہ ۳۲۵ء کے موسم سرما میں بعض پلٹنوں کے عیسائی سپاہیوں نے اُن مذہبی رسوم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا جو دیوتاؤں کی پوجا کرنے اور انھیں بھینٹ دینے کے لیے قدیم سے چلی آتی تھیں۔ یہ بغاوت اس سرعت کے ساتھ پھیلی اور حالت ایسی نازک ہو گئی کہ قیصر ڈیو کلیشن کو مجبوراً ایک مجلس شوریٰ اس غرض سے منعقد کرنی پڑی کہ اس موقع پر کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جو مشکلات پیدا ہو گئیں تھیں اُن کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قیصر کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں کی دونوں مسیحی المذہب تھیں۔ قیصر

ایک نہایت بیدار مغز اور فرزانہ و دور بین شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی جماعت کے زور کو توڑنا جس کے بغیر چارہ نہیں ایک سیاسی ضرورت ہے لیکن پھر بھی جب اس نے فرمان انطفائے بغاوت جاری کیا تو یہ صراحت کر دی کہ خوزیزی سے احتراز کیا جائے۔ لیکن ایک غیظ آلود انہوہ کے جوش و خروش کو کون روک سکتا ہے۔ نیکو میڈیا کے گرجے کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ اس کا جواب مسیحی جماعت نے یہ دیا کہ قیصر کے محل کو آگ لگا دی۔ ایک شاہی فرمان کی علانیہ توہین کی اور اسے پرزے پرزے کر ڈالا۔ مسیحی افسران فوج ملازمت سے بڑھ کر کئے گئے۔ قتل عام کی نوبت پہنچ گئی۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ واقعات کی سیل جوار کا بہاؤ اس قدر زبردست تھا کہ قیصر بھی اس کی روک تھام نہ کر سکا۔

اب یہ بات روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ عیسائی گروہ نے جو سلطنت کا ایک رکن اعظم ہے اور سفاکانہ مظالم کی وجہ سے جوش میں آکر جو اس پر ردار کھے گئے تھے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ اب ان سختیوں کو برداشت نہ کرے گا۔ ڈاکٹیشن نے سنہ ۱۸۷۰ء میں اپنی مرضی سے تخت چھوڑ دیا۔ قسطنطین نے جو تخت و تاج کے سابقین میں سے تھا ازراہ غایت مال اندیشی کھلم کھلا مسیحیت کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر حصہ میں مرد عورت بچے بوڑھے اس کی جان نثاری اور ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاہی افواج میں جو مسیحی بہ تعداد کثیر موجود تھے وہ اس کی جانبازانہ متابعت کے لیے تیار ہو گئے۔ سٹولیا کے پل کے قریب ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں اسے کامل فتح حاصل ہوئی اور اس کے تمام منصوبے بار آور ہو گئے۔ پہلے میکسن اور اس کے بعد لاسینیس کی موت نے اور تمام رکاوٹوں کو جو اس کی راہ میں حایل تھیں دور کر دیا۔ اور اولین مسیحی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس نے قیصرہ کے تخت پر قدم رکھا۔

فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے

اور مرتبے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی خس برابر بھی پروانہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جو شیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن باطن مشرک و بت پرست تھے لہذا اون کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین نے کہ وہ بھی انہیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے اون کے اس منافقانہ طرز عمل کا سد باب ہو۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے اون مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔

اون ترمیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے جو مذہب عیسوی میں بیرونی عناصر کی آمیزش کی وجہ سے پیدا ہوا کراچ کے دن تک قائم ہیں اور جن کی بدولت اس مذہب کو سرکش کے ساتھ دست و گریبان ہونا پڑا جوین معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں جب اس دین کا چشمہ گدلا نہ ہوا تھا اس کی کیا حالت تھی۔ حسن اتفاق سے یہ کیفیت ہمیں ٹرلین کی اس تحریر سے بھی سمجھتی ہے جو اس نے قیصر یورس کے زمانہ میں جبکہ عیسائیوں پر ظلم و ستم کے عظیم دور سے تھے مقام روما تکب کی تھی۔ یہ تحریر جس میں عیسائیوں کی طرف سے اون الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو اون پر یورسچون نے لگائے تھے قیصر کے نام نہیں ہے بلکہ اس کا رو سے سخن اون حکام عدالت کی طرف ہے جو ملزمین کے مقدمات کی دریافت کی غرض سے سامروے تھے۔ اس میں نہایت سلیقہ اور متانت کے ساتھ اون تمام دلائل و دلائل کا استقصا کیا گیا ہے جو راقم عیسائیت کی تائید میں پیش کر سکتا تھا اور تمام دنیا کو سچی عقاید اور مسیحیوں کی حالت سے روشناس کیا گیا ہے۔ وہ سخت دشواری جو یورین کے طرز خطاب کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اس میں نام کو نہیں پائی جاتی بلکہ ہر برسرے تاریخی متانت و ثقاہت ٹپک رہی ہے۔ عہد قدیم کی مسیحی تصانیف میں جو جڑ اس تحریر کو حاصل ہے کسی اور تصنیف کو میسر نہیں ہوا۔ ٹرلین کی اس تحریر کا زمانہ

مسئلہ ہے۔

ٹرلین اپنا بیان صفائی نہایت قابلیت سے شروع کرتا ہے۔ وہ حکام عدالت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مسیحیت دنیا میں نئی نئی آئی ہے اور اس ملک میں جو اس کا اصلی وطن نہیں ہے اگر اسے دشمنوں سے سابقہ پڑے تو اس میں کوئی اچھے کی بات نہیں۔ اس کی استدعا صرف اسی قدر ہے کہ روم کے میجر ٹریٹ او سے برارت کا موقع دیں اور اس کا بیان سماعت کئے بغیر اس کے خلاف تجویز صادر نہ کریں۔ اگر اسے ایسا موقع دیا گیا تو سلطنت کے قوانین آفتاب و ماہتاب بن کر چلکین گے لیکن اگر اسے اپنی برارت میں زبان ہلانے کی اجازت نہ دی گئی تو اس انصاف کی اغراض پوری نہ ہوں گی جس کے لحاظ سے رومنہ الکبریٰ شہرہ آفاق ہے۔ کسی شے سے خواہ وہ فی الحقیقت نفرت ہی کے قابل کیوں نہ ہو ایسی حالت میں نفرت کرنا جبکہ ہم کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو خلاف شیوہ معذرت ہے۔ روم کے قوانین کا تعلق دن و افعال سے ہے جو اشخاص سے سرزد ہوں نہ کہ اشخاص کو اس سے۔ لیکن افسوس ہے کہ بائین ہمہ بعض اشخاص روم کی عدالتوں میں سزا یاب ہوئے ہیں نہ اس لیے کہ ان سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ مسیحی کہلاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مسیحیت کی ابتدا۔ اس کی ماہیت اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس کی بناء عبری اناجیل پر ہے جو سب کتب سے زیادہ متبرک اور قدیم ہیں۔ اور اس مسئلہ کے متعلق میجر ٹریٹون سے اس طرح خطاب کرتا ہے:۔ صحت موسیٰ جن میں خدا نے یہودی اور اس لحاظ سے عیسائی مذہب کو ایک بیش بہا خزانہ کی طرح محفوظ کیا ہے آپ لوگوں کی قدیم ترین کتب بلکہ آپ کی سرکاری عہدات آپ کی قائم کی ہوئی حکومت آپ کے بڑے بڑے شہروں آپ کے تاریخی کارناموں آپ کی زمانی یادگاروں اور آپ کی اوس ابجد کے حروف کی ایجاد سے بھی زیادہ قدیم ہیں جو علوم و فنون کی موقوف اور عجائبات قدرت کی محافظ ہے۔ بلکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حالین

آپ کے دیوتاؤں آپ کے مندروں آپ کے غیب گو کا ہنوں اور آپ کی رب النوعی قربانیوں سے بھی عمر میں زیادہ ہیں ان صحایف کی تنزیل کا زمانہ محاصرہ ٹرا سے ایک ہزار سال اور ہومر سے پندرہ سو سال پہلے کا ہے۔ زمانہ راستی کا حلیف ہے اور ارباب فہم و تمیز بجز اداں باتوں کے جو تحقیق اور مسلم ہوں اور جن کی تصدیق زمانہ کرچکا ہوا اور کسی بات کو نہیں مانتے۔ ان صحف مقدسہ کی صحت کا سب سے بڑا انحصار اداں کی غیر معمولی قدامت پر ہے۔ سلسلہ بطلموسیہ کے سب سے زیادہ فاضل فرمانروا فلیدلفس نے جس کی الکلیت مسلم الثبوت ہے ڈیٹرٹرس فایرس کے مشورہ سے ایک نسخہ ان کتب سماوی کا ہم پہنچایا تھا جواب تک اوس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کتب کے سماوی الاصل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے ان میں مذکور ہے اور جو واقعات ان ان کو ان کے نازل ہونے کے بعد سے پیش آئے ہیں وہ سب ان میں مسدج ہیں۔

کیا کسی پیشین گوئی کا پورا ہونا اوس کی سچائی کی دلیل نہیں ہے؟ اداں واقعات نے جو پیش آچکے ہیں جبب اداں پیشین گوئیوں کی سچائی پر ہر لگادی ہے جو ان کے متعلق قبل اقبل کی گئی تھیں تو کیا اداں واقعات کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے جنکے وقوع کے متعلق دوسری پیشین گوئیاں اسی قبیل کی موجود ہیں ہم مورد الزام قرار دئے جاسکتے ہیں؟ پس چونکہ ہم اداں باتوں پر ایمان لائے ہیں جنکے متعلق اناجیل میں پیشین گوئی کی جاچکی ہے اور جو پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آئیں لہذا ضرور ہے کہ ہم دوسری باتوں پر بھی ایمان لائیں جو ابھی ظہور میں نہیں آئیں لیکن اداں کے متعلق اوناہیل میں دوسری پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

اناجیل مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے جس نے کائنات کو عدم سے پیدا کیا اور جو اگرچہ ہر روز نظر آتا ہے لیکن پھر بھی آنکھوں سے نہاں ہے۔ اوس کی غیر محدودیت

کا حال بجز اوس کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ اوس کی بے انتہا بڑائی نے اوسے چھپا رکھا ہے لیکن ساتھ ہی ظاہر بھی کر رکھا ہے۔ اوس نے انسان کے اعمالِ حسنہ وِسنیہ کے لحاظ سے جزا و سزا مقرر کی ہے۔ یومِ نشور کے دن تمام وہ انسان جو آفرینش کائنات سے اوس کے خاتمہ تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں اوس کے حکم سے دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے دنیوی قالبِ اختیار کریں گے۔ اس کے بعد وہ اُن کے اعمال کی جانچ کرے گا اور جو نیک ہوں گے انہیں تولدتِ جاودانی عطا فرمائے گا اور جو بد ہوں گے انہیں ابدی شعلوں میں جھونک دے گا۔ دوزخ کی آگ سے مراد وہ چھپے ہوئے شعلے ہیں جو قعرِ زمین میں بھڑک رہے ہیں۔ زمانہ گزشتہ میں وہ منادوں یا پیغمبروں کو اخلاق و روحانیت کی تعلیم کے لیے مامور کر چکا ہے۔ اس تدبیرِ زمانہ کے پیغمبرِ یہودیوں کی قوم میں پیدا ہوئے اور انہوں نے غیب کی آواز بنی اسرائیل تک پہنچائی جنہوں نے اس آواز کو بشکلِ اناجیلِ قلبندہ کر لیا۔ ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم ایک انسان کی پرستش کرتے ہیں بنی اسرائیل کے خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارے دلوں میں جنابِ مسیح کی طرف سے جو ارادت و عقیدت جاگزیں ہے اوس سے جو خدا کی اوس عظمت میں جس کا ہمیں اعتراف ہے کوئی فرق نہیں آتا۔

ان بزرگانِ دین کی برگزیدگی کی وجہ سے یہودیوں پر خدا نے اپنے خاص احسانات اور برکتیں نازل کیں۔ اور اُن کو شرفِ ہم کلامی عطا کیا۔ تاہم ایزدی سے وہ مراتبِ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ لیکن خبثِ نفس کے باعث یہ سرکش قوم خدا کو بھول گئی اور اُس کے قوانین پر جس پرستی کو ترجیح دینے لگی۔ اس پر خدا نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم بازنہ آؤ گے تو میں تم سے زیادہ وفادار اور اطاعت شعار بندوں کو اپنی رحمتوں کا شرف بخشوں گا لیکن جب اُن کے تھمرونے اس انتباہ کو بھی نظر انداز کیا تو خدا نے اُن کو اُن کے وطن سے خارج کر دیا اور وہ دشتِ غربت میں سرگشتہ و سراپسہ بھٹکنے لگے۔ آج وہ تتر بتر ہو کر تمام عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے نصیبوں میں ذلت و خواری ہے۔ وہ در بدر مارے مارے پھرتے ہیں

اوس ہوا سے اون کے مشام نا آشنا ہیں جس کے جھونکون نے اون کے گہوار دن کو جھلایا تھا۔ اوس زمین کو اون کی آنکھیں ترس گئی ہیں جہاں اونہون نے اول اول عالم ہستی کا تماشا دیکھا تھا۔ اب اون کا سر پرست نہ خدا ہے نہ انسان۔ خدا نے جس بات کی اونہیں دھکی دی تھی وہ پوری کر کے دکھا دی۔ اوس نے دنیا کے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام سے ایسے بند دن کا انتخاب کیا جو اون کے مقابلہ میں زیادہ وفادار تھے۔ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اوس نے یہ بشارت دی تھی کہ ان نئے بند دن پر اوس کی خاص رحمتوں کا نازل ہوگا اور اون میں ایک مسیحا پیدا ہوگا جو اون میں ایک نئی شریعت کی اشاعت کرے گا۔ یہ مسیحا جناب عیسیٰ تھے جو خدا بھی ہیں اس لیے کہ جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع جلتی ہے اسی طرح ایک خدا سے دوسرا خدا پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا اور اوس کا بیٹا متحد الوجود ہیں۔ روشنی دونوں شمعوں کی ایک ہی ہے۔

کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ابن اللہ کا ظہور دنیا میں دو مرتبہ ہوگا۔ پہلی مرتبہ بحالت عجز و انکسار۔ دوسری مرتبہ محشر کے روز جاہ و جلال کے ساتھ۔ یہودیوں کو یہ کل باتیں اون کی پیغمبر پیشتر سے جھلا چکے تھے لیکن اون کے گناہوں کی تاریکی اون کی آنکھوں پر کچھ ایسی چھا گئی تھی کہ جب وہ پہلی مرتبہ آیا تو اونہون نے اسے بالکل نہ پہچانا اور اس وقت تک اوس کی آمد آمد کا فضول انتظار کر رہے ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مسیح کے معجزے آسمانی نشان نہ تھے بلکہ جادو کے کرشمے تھے۔ ملائے مذہب اور پیشوایان دین اوس کو حد کی نظر سے دیکھنے لگے اور حاکم وقت پالیٹ کے دربار میں جا کر اوس پر طرح طرح کے بہتان باندھے۔ اوس کو صلیب پر چڑھایا گیا اور جب اوس کا دم نکل گیا اور وہ زمین میں دفن کر دیا گیا تو تین دن کے بعد وہ قبر سے اٹھا اور چالیس دن تک اپنے حواریوں میں رہا۔ اس کے بعد وہ بادل میں پٹا ہوا سیدھا آسمان کو چلا گیا اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی شہادت رومیوس یا کسی اور رومی بادشاہ کی معراج کی انسانی شہادت سے بدرجہا زیادہ معتبر ہے۔

اس کے بعد مٹلین نے شیطان اور اوس کے گروہ کثیر الانفار کی تشکیل اور ماہیت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ شیاطین اپنے فرماؤ ابلیس کے حکم سے طرح طرح کی بیماریاں تفسیرات ہوا۔ امراض و بانی اور پیداوار ارضی کی تباہی کے بانی ہوتے ہیں۔ انہیں کے درغلانہ سے انسان بتوں کو بھینٹ دیتا ہے تاکہ انہیں قربانیوں کا خون جو ان کی غذا ہے چوسنے کو ملے۔ شیاطین پرند دن کی طرح سبک سیر ہوتے ہیں اس لیے ریل مسکون میں جو واقعات گزرتے ہیں سب ان کو معلوم ہو جاتے ہیں اور چونکہ اون کی بود و باش ہوا میں ہے لہذا اون کو عرش کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کو دھوکا دے کر غلط باتیں باور کرا دیتے ہیں اور غیب گوئی بھی کرتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرتی ہے۔ مثلاً رومائین شیاطین نے اس واقعہ کا اعلان کیا کہ شاہ پرسیوس پر رومی فوجوں کو فتح حاصل ہوگی لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پشین گوئی اوس وقت کی گئی جب کمر فتح کی خبر اون کو مل چکی تھی۔ وہ بیماروں کو جھوٹ سوٹ اچھا بھی کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ادل تو کسی شخص کے جسم میں حلول کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور اوس کے بعد کوئی نختہ تجویز کر کے اوس کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور آسیب زدہ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اوسے دقہی شفا ہو گئی۔

اگرچہ عیسائی شہنشاہ کو خدا انہیں مانتے مگر پھر بھی وہ اوس کی ترقی و دولت و اقبال کے لیے ہمیشہ دست بدعا رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ عظیم تہلکہ جو دنیا میں پڑنے والا ہے اور وہ بلائے برہم جس سے نظام عالم کا شیرازہ بکھرے کا خوف ہے اسی وقت تک رکی ہوئی ہے جب تک کہ یہ سلطنت قوی شوکت قائم ہے۔ عیسائیوں کی یہ دعا ہے کہ خدا اون کو دنیا کا یہ ہونناک خاتمہ نہ دکھائے۔ وہ فقط ایک جمہوری سلسلہ کے قایل ہیں لیکن یہ سلسلہ تمام عالم کو محیط ہے۔ اون کی ایک برادری ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں اور نجات اخروی کے امید دار ہیں۔ وہ صرف شہنشاہ اور حکام ہی کے لیے نہیں بلکہ قیام اس کر لیے

بھی دعا کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتب مقدسہ کو اس فرض سے پڑھتے ہیں کہ اون کے ایمان میں استواری
اون کی امیدوں میں وسعت اور اوس بھروسے میں استحکام پیدا ہو جو اونہیں خدا کی ذات
پر ہے۔ اون کی مجلسیں انہام و تغیم کی غرض سے منعقد ہوتی ہیں۔ وہ بدکرداروں کو اپنی جماعت
سے خارج کر دیتے ہیں اور اون کے پیشوایان دین اون کو افراد کی رائے سے منتخب
ہوتے ہیں جنہیں انکا اقتدار کرنا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کے ختم پر ہر جماعت کے ہر شخص کو اختیار ہے
کہ اپنی قدرت کے موافق کچھ رقم بطور چندہ دے لیکن چندہ دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔
جو رقم اس طور پر جمع ہوتی ہے وہ گویا چندہ دینے والوں کے زہد و اتقا کی نمائندگی ہے۔
یعنی اپنے نفس کی آسائش پر صرف نہیں کی جاتی بلکہ مساکین کی پرورش اور تحریز و تحکیم کیلئے
اور نادار یتیم بچوں کی خبر گیری، ضعیف العمر خاندان دین کی امداد اور اون لوگوں کی اعانت دین
اٹھائی جاتی ہے جسکے جہاز تباہی میں آگئے ہوں یا جن کو دین حق پر ثابت قدم رہنے کی وجہ
سے جلا وطنی یا قید یا کانون میں مزدوری کرنے کی سزا دی گئی ہو۔ عیسائیوں میں بجز اون کی
بیمیوں کے اور کل مال و متاع مشترک الاستعمال ہے۔ نہ تو وہ اس حرص سے پیٹ بھرتے
ہیں کہ گویا کل ہی مر جائیں گے اور نہ عمارتیں ایسی عالیشان بناتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ
قیامت کے بورے پیشین گے۔ اون کی زندگی کا مقصد پاکبازی انصاف صبراعتدال
اور عصمت ہے۔

ٹرٹلین نے جہان اپنے زمانہ کے مسیحی عقاید اور روش زندگی کی یہ دلپذیر تصویر
کھینچی ہے وہاں حکام عدالت کو ایک عظیم الشان واقعہ کے متعلق جو عنقریب پیش آئے والا
تھا ان الفاظ میں بے دھڑک دھکی بھی دی ہے :- اگرچہ ہماری جماعت کے قیام کو کچھ زیادہ
عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ کونسا مقام ہے جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر۔ قلعے۔ جزیرے۔ صوبے
انجمنیں شہر کے گلی کوپے۔ شاہی محلات۔ وکلاء جمہور کے اجلاس۔ فوجی بارکین غرض ہر
اوس مقام پر جو آپ لوگوں کی قوت کی خارجی علامت ہے ہم لوگ ہر ابرپائے جاتے ہیں۔

بجز آپ کے مندر دُن کے ہم نے آپ کے قبضہ میں اور کوئی شے نہیں چھوڑی غور کیجئے کہ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان عظیم بپا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو ہمارا مذہب جس کی تعلیم یہ ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے نہ روکے ہوئے ہو تو کس سرعت اور مستعدی سے ہم مسلح ہو کر آپ کے خلاف معرکہ آرا ہو سکتے ہیں۔

اپنا بیان صفائی ختم کرنے سے پیشتر ٹرٹلین نے اوس دعوے کا از سر نو ذکر کیا ہے جس پر ازمنہ مابعد میں غلط رائے ہونے سے یورپ کی علمی ترقیوں پر ایک بہت بڑا اثر پڑا۔ اوس کا دعویٰ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کو وہ گنج شایگان سمجھنا چاہیے جس سے دنیا نے علوم و فنون اور دانش و حکمت کے موتی اور جواہر ریزے حاصل کیے ہیں۔ اگر کسی حکیم نے فلسفہ کا کوئی نکتہ بیان کیا ہے تو انہیں صحف کے اسرار حکمیہ سے فیض پا کر اور اگر کسی شاعر کو کوئی اچھوتا مضمون ہاتھ آیا ہے تو انہیں مقدس کتابوں کی تخیل آفرینی کی بدولت۔ غرض اوس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہود جدید و عتیق صدق و حقیقت کا معیار مطلق ہیں اور جو مسئلہ ان کے اصول کے مطابق نہ ہو وہ لامحالہ غلط ہے۔

ٹرٹلین کی اس فاضلانہ تحریر سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جب عیسائیت معاندین و مخالفین کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنی ہوئی زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو اوس وقت اوس کی کیا حالت تھی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شہنشاہانہ اقتدارات حاصل کرنے کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیویرس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بت پرستی اور مذہب عیسوی کے مخلوط ہو جانے کے دو بڑے اسباب تھے۔ اول نئے خاندان شاہی کی ملکی مصلحتیں اور سیاسی ضرورتیں۔ دوم وہ طرز عمل جو نئے مذہب نے اپنی اشاعت کے لئے اختیار کیا۔

(۱) اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قومی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اوس نے اپنی گون کا بچھا

اوسے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اوسے پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی
بت پرستی کا استیصال کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کو اصول
شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی
شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ
اسلام نے اپنے مد مقابل کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقاید کو بلا کسی آمیزش
کے شائع کیا۔

قسطنطین کا طرز عمل ہمیشہ اوس کے اس عندیہ کی شہادت دیتا رہا کہ وہ اپنی رعایا کے
کل طبقہ کو ایک آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے فریق کا میاب کی وکالت کو اپنی فرمانروائی کا
اصول نہیں قرار دینا چاہتا۔ پس جہاں اوس نے گرجا تعمیر کئے بت پرستوں کے لیے مندر
بھی بنوا دیے۔ اگر باور یون کی سرگوشیوں پر کان دہرا تو بت پرست کا ہون سے بھی مشورہ
کیا۔ نائسیائی سبھی کونسل منعقد کی تو دولت کے بت پر بھی چڑھاوے چڑھائے۔ طباغ
کی رسم کو قبول کیا تو ایک تہذیب بھی مسکوک کرایا جس پر اوس کا ربانی لقب ثبت تھا۔ قسطنطین
میں سنگ ستاق کے ایک منار کی جوٹی پر اوس کا جو مجسمہ نصب کیا گیا وہ اصل میں آپالودوتا
کی ایک تہذیب مورت تھی جس کے خط وخال بدل کر قسطنطین کی صورت سے مشابہ بنا دی گئے
اور سر کے ارد گرد دیکھ کر بھی نہ بت بیان کیا جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرتے وقت
کا فریون لائی گئی تھیں اس صنعت گری کے ساتھ چانی گئیں کہ عظمت و جلال کے تاج کی

لٹا ایشا۔ یہ کوئی ایک تہذیب نہیں جسے سکھ کی فوج کے ایک انڈرائیگ کانس نے بسایا اور دوسرے
انڈرائیگ کانس نے اپنی بی بی کی یادگار میں اس کا نام بایا رکھا۔ مترجم

۱۷۰۰ء میں ہر طرح مسلمانوں میں شریعت کے تین ماخذ ہیں قرآن، حدیث اور اجماع ماسی طرح عیسائیوں میں
بھی اور ان کے متعلق جو امور التنازع ہوتے تھے اور جن کا تعلق فیہ اناجیل سے نہ ہو سکتا تھا باور یون کی
کونسلین منعقد کی جاتی تھیں چنانچہ اس قسم کی پہلی کونسل ۳۲۵ء میں بصرہ قسطنطین نائسیائی منعقد ہوئی۔

شکل پیدا ہو گئی۔

اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دل میں شکست لے جو ناسور ڈال دیا ہوا اس کا اندمال مراعات خاص اور نواز شہائے پنہان کے مرہم سے ضروری ہے قسطنطنین نے اپنے دربار میں بت پرستی کی رسموں کی تجدید و تردید سے نہ صرف اغماض کیا بلکہ ان کو ششون کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو ششون میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اوس کے خاندان کے اراکین تھے۔

(۲) اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت تھے اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت و ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لیے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پڑانے عقاید کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔ اس انضمام و اختلاط کی بزم آرائی میں شہنشاہ کی ماں ہلینا نے شاہی دربار کی بیگمات کے ساتھ مل کر شمع انجمن کا کام دیا۔ مصلحت شناس اور مزاجدان لوگوں کو ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایک نئی تدبیر ہاتھ آگئی بیت المقدس کے امک فار سے حضرت عیسیٰ کی صلیب۔ دونوں چور دن کی صلیبیں۔ واقعہ تصلیب کا کتبہ اور وہ میخیں جو اس موقع پر استعمال میں لائی گئی تھیں تین صدیوں تک امانت رہنے کے بعد برآمد کی گئیں۔ اور ایک مناسب حال معجزہ سے جس کے تصنیف کرنے میں ان بزرگواروں کو ذرا بھی دقت پیش نہ آئی ان متبرک آثار کی تصدیق بھی ہو گئی۔ غرض اچھی خاصی آثار پرستی شروع ہو گئی۔ یونانیوں کے اوہام باطلہ اور سرنو نمودار ہو گئے۔ اور اوس زمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی جبکہ وہ آلات جن سے

محاصرہ ٹرائے کا شہر برنجی گھوڑا تیار کیا گیا تھا بیٹھا پانچم میں رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ جبکہ پیلا پس کا عصا شاہی کر دیا میں۔ ایکلیز کا نیزہ فیسیلیس میں اور میمن کی تلوار

لے ٹرائے کے محاصرہ کو جسے ہومر نے اپنی مشہور کتاب "ایڈ" میں زندہ جاوید کر دیا ہے جب دس سال کی مدت گزر چکی اور یہ شہر یونانیوں سے سرزد ہو سکا تو یوسیز کو جو بہادران یونان میں بوجہ اپنی ذکاوت و فراست کے ایک خاص شہرت رکھتا تھا ایک حیلہ سوچا۔ اس نے پیتل کا ایک گھوڑا تیار کیا اور اس کے جوف میں خود چھپ گیا اور اس گھوڑے کو شہر پناہ کے قریب لے جا کر راتوں رات رکھ دیا۔ مصورین اسے ایک اچھٹے کی بات سمجھ کر اندر اٹھالے گئے۔ اس ترکیب سے یوسیز شہر کے اندر داخل ہو گیا اور گھوڑے سے باہر نکل کر شہر کا پچھاٹک کھول دیا اور محاصرین شہر پر قابض ہو گئے۔ مترجم

یہ مشہور جزائیہ نویس اسطرابو لکھتا ہے کہ جنوبی اطالیہ کا یہ شہر سنہ قبل مسیح میں فلیج ٹائٹم کے کناسے آباد کیا گیا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح تک اس کا شمار دولت یونان کے سب سے زیادہ آباد اور مرفہ الحال شہروں میں ہوتا رہا۔ لیکن ہنری بال افریقی سپہ سالار کی فوج کے زمانہ کے بعد سے اس میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ ایسا مٹا کہ جب تسیر کا زمانہ آیا تو بجز چند بوسیدہ دیواروں اور کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ حکیم فیتا غورث کی زندگی کے آخری دن یہیں گزرے اور تسیر کے زمانہ تک اس کی قبر کے آثار بھی یہاں موجود تھے۔ مترجم

یہ قدیم یونانی روایات میں اپنی بہادری اور شجاعت کے لحاظ سے بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس کے باپ ٹیٹلس نے ایک دفعہ دیوتاؤں کی دعوت کی اور بیٹے کو ذبح کر کے مہمانوں کے سامنے دستہ خوان پرچن دیا۔ صرف ایک دیوتا کو دھوکا ہوا اور وہ مقتول کا ایک بازو کھا گیا۔ اس کے بعد ہرٹس نے آب حیات چھڑک کر اسے زندہ کر دیا اور جس دیوتا نے اس کا بازو کھا یا تھا بجائے گوشت و خون کے بازو کے عاج کا بازو لگا دیا۔ مترجم

یہ قدیم یونان کا ایک شہر جس پر اہل ایجنز نے شکست کی غین قبضہ کیا۔ اسی مقام پر سکندر کے باپ شاہ قلیقوس نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوجوں کو شکست (بقیہ صفحہ ۶۵)

نکوئیڈ یا مین کا ہٹا موجود تھی۔ جبکہ اہل ٹیچیا کیلیدہ دنیا کے جنگی سور کی کھال دکھا سکتے تھے اور بہت سے شہر دن کو یہ دعویٰ تھا کہ اون کے پاس شہر ٹرائے کے محافظ دیوتا کا اصلی بت موجود تھا۔ جبکہ منروادی ہی کے ایسے ایسے مجسمے پیش کئے جاسکتے تھے جو برچھے ہلا سکتے تھے۔ ایسی ایسی تصویریں دکھائی جاسکتی تھیں جو ہنس سکتی تھیں۔ ایسی ایسی مورتیں موجود تھیں جنہیں پسینہ آسکتا تھا اور ایسے ایسے ہزار ہا معبد اور ہیکل اطراف ملک میں پھیلے ہوئے تھے جہاں معجزہ دن سے مریض اچھے کیے جاسکتے تھے۔

جون جون زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقاید کی تفصیل ٹرملین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند نگر باہیہ اخلاقی سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقاید میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ اولمپس تو وہی پہلا سا موجود ہو گیا مگر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) فاش دے کر ان ریاستوں کی خود مختاری کا ختمہ کر دیا تھا۔ اس شہر کے کچھ کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ مترجم

۵۵ "ایڈ" کے مشاہیر میں سب سے زیادہ ممتاز و سربر آوردہ پہلوان کا نام۔ مترجم
۵۶ قدیم یونانی روایات کے بموجب ہمیش کا ایک شاہزادہ تھا جو ٹرائے کی جنگ میں لشکر لے کر محصورین کی کمک کے لیے آیا تھا۔ اور بہت کچھ دوشجاعت دینے کے بعد آخر ایکیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مترجم

۵۷ نکوئیڈ یا دولت روما کا ایک آباد اور پررونق شہر تھا جسکی بنا نکوئیڈ نیرادل نے مسلمان ۶ میں ڈالی تھی۔
۵۸ قیصر ڈیو کلیشن قسطنطین اوس زمانہ میں جبکہ رومی افواج مالک مشرقیہ کے سحر کرنے میں مصروف تھیں یہیں بودو باش رکھتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کا انتقال ۳۳۷ میں مسیح کو اسی مقام میں ہوا۔ اسکندر

اعظم کا دقایع نویس آیرن یہیں پیدا ہوا تھا۔ مترجم
۵۹ یونانی علم الادنان میں مذکور ہے کہ اینٹس شاہ کیلیدہ ان نے آرمیس دیہی کو بھینٹ نہیں دی تھی۔
اس پر دیہی نے غضب ناک ہو کر ایک جنگی سور کو مامور کیا کہ اس بادشاہ کی سلطنت کو تباہ کر ڈالے
چنانچہ یہ آفت آسمانی ملک کو برباد کرنے لگی۔ بادشاہ کے بیٹے میجر نے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

زیر تاؤن کے نام بدل دئے گئے۔ سلطنت کے جن صوبوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی وہاں کے باشندوں نے علی رغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقاید اختیار کر لیے۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا۔ نہ صرف آتمس کی پرستش بہ تبدیل نام از سر نو ہونے لگی بلکہ اوس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلال کے قوس پر رکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا از سر نو نمودار ہو گیا۔ اس دیوی کا مجسمہ جو گود میں اپنے بچے ہو رس کو لیے ہوئے ہے بت تراشی اور نقاشی کی صنعتوں کے ذریعہ ہمارے زمانہ تک حضرت مریم اور ادون کی معصوم فرزند کی دربار تصویر کی شکل میں پہنچا ہے۔ نئے لباس میں قدیم تصورات کی اس تجدید کا ہر جگہ بہ استیقامت تمام خیر تمام کیا گیا۔ جب اہل آفریقا کے سامنے اس امر کا اعلان کیا گیا کہ وہاں کی سچی مجلس نے بصدرت بطریق سائرل یہ فیصلہ کیا ہے کہ مریم عذرا کو ”خدا کی ماں“ کے لقب سے یاد کیا جائے تو ان لوگوں نے خوشی کے آنسوؤں سے اپنے بطریق کے قدم دھوئے۔ یہ اشک ریزی اسی قدیم ناسور کی تراوش تھی جس پر اگرچہ سیحیت کے اثر کی وجہ سے انکو آچلا تھا مگر وہ مناسب ہنوز اندر باقی تھا۔ اگر ادون کے آبا و اجداد کے زمانہ میں ڈائنا دیوی کے لیے یہی بات کی جاتی جو جناب مریم کے لیے کی گئی تو ادون کے دلون پر بھی یہی اثر ہوتا۔

دنیا دارنوسیحون کی تالیف قلوب کا یہ طریقہ جس پر ادون کے رسوم و عقاید کے اختیار کر لینے سے عمل کیا گیا ادون لوگوں کے اعتراض سے نہ بچا جنکی بصیرت اس کی علت غائی کی نہ کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ فاسٹس نے قیصر اگستائین سے بر ملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا: ”تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ادون کی جماعت علیحدہ۔ در نہ افعال دونوں کے ایک

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یونان کے بہت سے سوراؤن کے ساتھ مل کر اس بلاے ناگہانی کے استیصال کی غرض سے ایک عقائد قائم کیا اور بالآخر اسے ان پر بھی ہلاک کر ڈالا اور اس کی کھال پر بطور نعم و نصرت کی نشانی کو قبضہ کر لیا۔

ہی سے ہیں۔ اون کے ہاں قربانیاں ہوتی ہیں جن میں بدستون کا زور ہوتا ہے تمہارے ہاں بزمِ محبت ترتیب دی جاتی ہے جو مذہبی شکل میں ہوسنا کی اور عیش پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اون کے ہاں بت پہنچتے ہیں تمہارے ہاں شہداء و اولیاء کی پرستش ہوتی ہے۔ تم اون کی طرح مُردوں کی روحوں کی تواضع شراب و کباب اور چنگ درباب سے کرتے ہو۔ بُت پرستوں کے تمام مذہبی تیوہار تمہارے ہاں اسی ذوق و شوق سے منائے جاتے ہیں غزہ ماہ اور راس الجدی و راس السلطان میں آفتاب کی تحویل کے وقت تم وہی رسمیں ادا کرتے ہو جو بُت پرستوں کے ہاں رائج ہیں۔ اور طرزِ مازہ و لہو و اور عادات و اطوار کے لحاظ سے تو تم مین اون میں مطلق فرق نہیں بلکہ غرض کہ بُت پرستی۔ کہ تمام رسم و رواج جاری ہوئے چل جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شادیوں میں عشق و محبت کی دیوی وینس (زہرہ) کے بھجن گائے جاتے تھے۔

اس مقام پر غلطی دیر کے پہلے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عیسائیت کے ساتھ بُت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال۔ نے بالآخر لوگوں کو انحطاطِ اعتقادی کے کس طبقہ سا فل تک پہنچا دیا۔ بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائشی اور بھگوار طریقے جاری ہو گئے۔ پادریوں نے پرنکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دی۔ کافر میں سمیعین ہونے چاندی کے گلدان مراسمِ مذہبی کے لوازم میں داخل ہو گئے۔ عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام مقرر کرنے لگی۔ قربانی کے ذریعہ سے ہلارت ہونے لگی۔ ردی بت پرست کا ہنوں کی جادو کی چھڑی عیسائی استغ کی حکومت پائی کا عصا بن گئی۔ اگر جاشہدا کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور اون کی تطہیر و تقدیس اون رسموں کے ذریعہ سے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً اون کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دئے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اُتارنے کا

سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہید کے مزاروں کی زیارت و طواف کے لیے لوگ ہزار ہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منون خاک دہول لاکر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے۔ اور اس مٹی کو شیطان کے ذبیحہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دم کٹے ہوئے پانی کے اوصاف و خواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ مورتیں اور تبرکات، گرجاؤں کے ضروری لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانہ سابق میں بت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارق عادات اور معجزات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز و کرامات کے مرکز قرار دیئے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ رجون کو حضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحیں اطراف عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر سٹلا رہی ہیں۔ مندروں اور قربان گاہوں کی تعداد خارج از حد شمار تھی۔ توبہ اور ازالہ معصیت کے لیے غلطی کو جو تکلیف دہ اور ایذا رسان لباس پہنا پڑتا تھا اس کی بہت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریم کی عیدِ تطہیر کا تیوہار اس غرض سے قائم کیا گیا کہ جو بت پرست نئے نئے عیسائی ہوئے تھے ان کے دلوں سے پتھر دیوتا کے یومِ جشن کے منسوخ ہونی کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں، صلیب کے ٹکڑوں، ہڈیوں، کیلون اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام رواج پا گئی گویا اچھی خامی جاد پرستی پر رائج ہو گئی۔ ان آثارِ متبرکہ کی تصدیق کا انحصار دو برابریں پر تھا یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر۔ اولیا کے پٹھے پرافز کپڑوں اور ان کی قبروں کی خاک تک متبرک سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں لائی گئیں اور ان کی نسبت بوثوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جیمس اور دوسرے اولیا سے عہدِ سابق کے آثارِ جسمانی ہیں۔ بت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اس کا تصرف بھی معاملات انسانی میں ربانی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور

اولیا قائم ہو گئے۔ اس کے بعد عشاے ربانی کی پراسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہو کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مرد و فردن نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا۔ نئے نئے تیوہار منائے جانے لگے جن میں سے ایک تو اس برچھے کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا جس سے حضرت عیسیٰ کے پہلو میں چرکا دیا گیا تھا۔ ایک اون میخون کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اوس تاج کی یاد کو تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ بیسیون خالقا ہون میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں۔

پادری نیوٹن نے اس تعلق کی نسبت جو عیسائیت اور بت پرستی میں پیدا ہو گیا تھا جو خیالات ظاہر کئے ہیں اون کا اقتباس اس مقام پر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں :-
 ”دیکھا آج کل اولیاء ملائکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانہ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے ؟ صرف نام کا فرق ہے۔ باقی سب کچھ یکساں ہے۔ بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ عیسائیوں نے اپنے بزرگان دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس قسم کی پرستش کو مذہب عیسوی میں رائج کیا وہ خوب جانتے تھے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک طریقہ عبادت کی جگہ دوسرے طریقہ عبادت نے لے لی ہے۔ اور چونکہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں لہذا ان کی رسمیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ وقت واحد میں متعدد قربانگاہوں پر نوبان یا خوشبوی کی دھونی دینا۔ گرجاؤں کو جاتے اور وہاں سے واپس آتے وقت آب متبرک یا نمک ملے ہوئے پانی کا اون میں چھڑکاؤ کرنا۔ دن دوپہر صد ہا چراغوں اور موم بتیوں کا بتوں کی قربانگاہوں اور مورتوں کے سامنے جلانا۔

بیماریوں اور خطروں سے فوق العادہ طور پر شفا یا نجات پانے کے شکرانہ میں نذر و نیاز گذرانا اور نیتیں چڑھانا۔ گذرے ہوئے بزرگان دین کو دلی یا خدا قرار دینا۔ ہر ایک صوبہ یا ضلع کو کسی گذرے ہوئے نامور بہادر یا دلی یا پیر کی حمایت میں خاص طور سے سونپنا۔ قبروں اور مزاروں پر جا کر مردوں کی پرستش کرنا یا اون کے آثار و نوں کو پوجنا۔ بتوں کی تق۔ بیس اور اون کو سجدہ کرنا اور اون کو صاحب اعجاز و کرامات جاننا۔ گذرگا ہوں شاہ راہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بت خانوں قربان گاہوں اور مورتوں کا قیام کرنا۔ گلاب باجے دھوم دھڑکے کے ساتھ بتوں اور آثار و نوں کے جلوس نکالنا۔ خاص خاص اوقات پر مجاہدہ اور ریاضت کے دھوکے میں جسم کو دتے مار مار کر ایذا پہنچانا۔ پادریوں کے مختلف فرقے اور برادریاں قیام کرنا۔ پادریوں کا خاص انداز سے اپنی چاند مندوانا ازدواجی تعلقات سے عمر بھر محتر ز رہنے کو جنس ذکور و اناث دونوں کے زہد و اتقا کی دلیل سمجھنا۔ یہ سب وہ رسمیں ہیں جو اور بہت سی رسموں کے ساتھ بت پرستوں اور پوپ رول کے پیروں کے توہمات کی اجزائے لاینفک ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہی مند راوری بعد جو ایک زمانہ میں جو پیٹرا اور اوسس کی برادری کے دوسرے خناسوں سے نامزد تھے آج مریم عذرا اور دوسرے سیسی اولیا سے منسوب ہیں۔ دونوں کی عبادت کی یہیں اور کتبے ایک سے ہیں اور جو معجزے اور کرامتیں زمانہ سلف میں بت پرستوں کا منہاج ارادت تھیں وہی آج کے دن سیحیت کی عقیدت کی تکیہ گاہ ہیں۔ غرض کل کی کل بت پرستی سیحیت میں منتقل ہو گئی ہے۔ دونوں کا مبداء و منشا ایک ہے اصول و فروع ایک ہیں۔ یہاں تک کہ قدیم و جدید اور بت پرست و سیسی رد مابین طریقہ عبادت کے لحاظ سے نہ صرف توافقی بلکہ تطابقی تام پایا جاتا ہے پادری بتوں صاحب کی رائے سے استفادہ کرنے کے بعد اب ہم پھر قبطیوں کے زمانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اگرچہ قدیم اور عام پسند عقاید کی بقا بلکہ اون کی

ترویج میں ان مراعات و بدعات کے ذریعہ سے حصہ لیا گیا لیکن مسیحی فریق نے جو فریق غالب تھا اپنے فیصلوں کو بزور حکومت نافذ کرانے میں کبھی بھی ایک لمحہ کا تامل نہ کیا اور حکومت کی طرف سے بھی ان فیصلجات کے نفاذ میں پوری طرح سے تائید کی گئی۔ اس طور پر قسطنطین نائسیا کی کونسل کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرتا رہا۔ ایترس کے معاملہ میں تو اس نے

لے تیسری صدی عیسوی کے وسط میں بمقام لیبیا پیدا ہوا۔ اور چوتھی صدی کے شروع میں اسکندریہ کا نائب پادری مقرر ہوا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق عیسائیوں کا عام عقیدہ تیسری صدی میں یہ تھا کہ خدا بشکل انسان یسوع مسیح کے قالب میں نمودار ہوا لیکن اس کی باسانی حیثیت اس کی ربانی حیثیت کو تابع تھی۔ باغلاظ دیگر بیٹا اگرچہ خدا تھا لیکن باپ پر فوقیت نہ رکھتا تھا اور نہ اس کے مساوی تھا بلکہ اس سے دوسرے درجہ پر تھا۔ لیکن چوتھی صدی کے شروع میں بوجہ اون لواحقین کے جو اہنیت و الوہیت کے اس پر اسرار و ناقابل فہم مسئلہ میں پائے جاتے تھے لوگوں میں اختلافات راسے پیدا ہو چلا۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ بیٹا باپ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن جو زیادہ خوش عقیدہ تھے اور بیٹے کی جناب میں زیادہ ارادت رکھنے کے مدعی تھے وہ دعویٰ کرنے لگے کہ بیٹا اور باپ مساوی ہیں۔ ایترس آخر الذکر جماعت کا مخالف تھا اور اس مخالفت میں اس نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اگر بیٹے کا درجہ باپ سے کم ہے تو وہ خدا سے مطلق نہیں یعنی باپ کے برابر نہیں۔ اور چونکہ برابر نہیں اس لیے اس کا جو ہر یا اصل خدا کے جو ہر یا اصل سے مختلف ہے۔ اور اگر برابر ہے تو اس کا جو ہر کامل اور نقص سے برابر ہے اور اس لیے وہ خود بھی کامل اور بے عیب ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خدا موجود ہو گئے جو ہر ایک لحاظ سے مساوی الٰہیت ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ خدا کے علاوہ جو غیر مخلوق ہے اگر کوئی شے موجود ہو سکتی ہے تو وہ مخلوق ہستیٰ ہیں یعنی وہ موجودات حادث جنہیں خدا سے قدیم نے عدم سے پیدا کیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ بیٹا قدیم نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب کہ وہ نہ تھا اس لیے وہ زمانی اعتبار سے محض اول و اشرف مخلوقات ہے۔ رحمت ہو ایترس کی روح پر جس کے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

یہاں تک حکم دے دیا کہ جس شخص کو اس کا فرائض کی کوئی کتاب ملے اور وہ اسے جلا نہ دے
اوس کی گردن مار دی جائے۔ اسی طرح شہنشاہ تھیوڈوسیوس اصغر کے زمانہ میں دستور
کو جلا وطنی کی سزا دے کر صحرائے افریقہ کے ایک دور دراز حصہ میں جہاں درختوں کے
ایک جھنڈ اور پانی کے ایک چشمہ کے سوا صد ہا فرسنگ تک ریگ روان اور موم سوزان
کا عمل تھا بھیج دیا گیا۔

بُت پرست فریق میں سلطنت کے قدیم طبقہ امرا کے بہت سے ذی وجاہت
خاندان شریک تھے۔ اور پڑائے فلسفیانہ مذاہب کے تمام پیرواس کے حامی و
مددگار تھے۔ فریق مخالف کو یہ لوگ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا
یہ دعویٰ تھا کہ ان کو علم صرف مشاہدے اور عقل کے ذریعہ سے محنت اٹھانے کے بعد
حاصل ہوتا ہے۔

بہ خلاف اس کے مسیحی فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ کل علم اناجیل و روایات کلیسا میں
محفوظ ہے اور خدا اپنی الہامی کتابوں میں انسان کے لیے نہ صرف حق و صدق کا معیار
قرار دے چکا ہے بلکہ اوس کی دانست میں جن باتوں کا جاننا ہمارے لیے ضروری تھا
وہ سب ہمیں بتا چکا ہے۔ اس لیے کتب مقدس انسانی معلومات کا مجموعہ ہیں جس پر اضافہ
ہونا غیر ممکن ہے۔ اور اس علمی اجارہ میں پادری بحایت شہنشاہ کسی رقیب یا حریف کی
مسابقت گوارا نہیں کریں گے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) یہ سچے مسیحیانہ عقاید دو صدی تک تنلیت کے ظلم کو توڑنے
کی کوشش میں سرگرم رہے۔ لیکن بت پرستی عیسائی مذہب کی رگ رگ میں سرایت
کر چکی تھی۔ ساتویں صدی کے خاتمہ سے پہلے ایٹکس کے مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض
یہی عقاید تھے جن کی وجہ سے جیساٹ ایٹکس کا فرائض قرار دیا گیا اور
جلا وطن ہوا۔ مستہجم

یہاں سے علم کی دو قیمیں ہو گئیں علوی دھنلی۔ اور دو مخالف فرقے پیدا ہو گئے جن میں ہر ایک نے اپنا ہادی و رہبر عقل کو قرار دیا اور دوسرے نے الہام کو۔ بت پرست جماعت کو ایندی فلاسفہ کے علم و فضل پر غرہ تھا اور عیسائیوں کو اپنے بزرگان دین کے الہام پر۔

اس طور پر کلیسا نے علم و حکمت کا مبدار و نشان بن کر اوس کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اوس کے فیصلوں کی تعمیل کے لیے زور حکومت ہر وقت تیار رہنے لگا۔ اس طرز عمل نے اوس کے آئندہ کارناموں پر جبر و محکم کی مہر لگا دی اور ایک ہزار سال تک وہ یورپ کی دماغی ترقی کا سہ راہ بنا رہا۔

قیصر قسطنطین کے عہد سے مسیحیت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جبکہ اوس نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کیا اور اوسے دنیوی سلطنت حاصل کرنے کی فکر شروع ہوئی۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذہب گرتے گرتے بت پرستی کی شکل میں نسخ ہو گیا لیکن دوسرے اعتبار سے یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا کہ اس نے ترقی کرتے کرتے قدیم یونانی اصنام پرستی کی نشو و نما پذیر فوج صورت اختیار کر لی۔ یہ اصول کہ جب دو جسم آپس میں ٹکراتے ہیں تو دونوں کی صورت بدل جاتی ہے طبیعیات و عمرانیات دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔ بت پرستی نے مذہب عیسوی کے اصول میں تغیر پیدا کر دیا اور مذہب عیسوی نے بت پرستی کی ہیئت بدل دی۔

مصر میں جہاں قدیم الاہام سے تثلیث کا زور رہا ہے سچی تثلیث کے معرکہ الآرا مسئلہ کا چھڑنا ایک لازمی بات تھی۔ سب سے زیادہ اہم بحث اس مسئلہ میں یہ تھی کہ ابن اللہ ہونے کی حیثیت سے مسیح کا کیا جب قرار دیا جائے۔ اسکندریہ میں ان دنوں ایک پادری ایریس نامی رہتا تھا جو ایک دفعہ بشپ (اسقف) کی خدمت کا اُمیدوار تھا مگر محروم رہا۔ اوس نے یہ بحث پیش کی کہ بلحاظ رشتہ فرزند کی و پدری ضرور ہے کہ ایک وقت ایسا ہو جو جبکہ بیٹے کا وجود نہ تھا۔ اس لیے کہ باپ کی عمر بیٹے سے زیادہ ہونی چاہیے پس حضرت مسیح

قدیم نہیں بلکہ حادث ہیں۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس بحث کا منشا یہ تھا کہ ہرہ افراڈ تثلیث ازلی نہیں ہیں۔ تینوں کے تینوں ہم مرتبہ مساوی الٰہیت نہیں ہو سکتے۔ ایک کو باقی دونوں پر ضرور فوقیت ہونی چاہیے۔ اور جب صورت یہ ہے تو ضرور ہے کہ ایک وہ وقت تھا جب تثلیث کا وجود نہ تھا۔ اس پر اوس شپ نے جس کو ایریس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی مجالس عامہ میں اس مسئلہ پر اپنی روانی تقریر کے جوہر دکھانے شروع کئے اور جب مناظرہ نے طول کھینچا تو یہودیوں اور بت پرستوں نے جو اسخندریہ کی آبادی کا جزو غالب تھے اس بحث کے متعلق ناظکون میں مضحکہ انگیز نقلیں کرنی شروع کیں۔ ان نقول میں دل لگی کی سب سے بڑی بات یہ ہوتی تھی کہ باپ اور بیٹے کو مساوی السن ظاہر کیا جاتا تھا۔ اس بحث کا جوش و خروش جب حد سے بڑھ گیا اور فتنہ و فساد کا اندیشہ پیدا ہو چلا تو معاملہ شہنشاہ کے پاس تصفیہ کی غرض سے بھیجا گیا۔ پہلے تو منزخات سمجھ کر اوس نے توجہ نہ کی اور شاید دل میں ایریس کے دعوے کو حق بجانب خیال کیا کہ باپ کی عمر حقیقت میں بیٹے کی عمر سے زیادہ ہونی چاہیے لیکن اوس پر اس قدر دباؤ چارون طرف سے ڈالا گیا کہ آخر مجبور ہو کر اوس نے نائسیا کی کونسل کے انعقاد کا حکم دیا۔ اس کونسل نے جھگڑا اٹھانے کے لیے ایک فیصلہ صادر کیا جس کی ذیل میں تکفیر و لعنت کا یہ قومی درج تھا: ”جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ کسی وقت میں خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا یا پیدا ہونے سے قبل وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اوس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے ایسے شخص کو کلیسا سے مقدس ملعون قرار دیتا ہو“ اس فتوے کے صادر ہوتے ہی قسطنطین نے اس کو بڑو حکومت نافذ کر دیا۔

اس کے چند سال بعد شہنشاہ تیموڈوسیوس نے قربانیوں کی ممانعت کر دی اور جانوروں کے رودون کے ذریعہ سے استخارہ کرنے کے طریقہ کو سنگین جرم قرار دیا۔ اوس نے مندر دان میں جانے آنے کے متعلق بھی امتناعی احکام جاری کئے اور ایک محکمہ

اعتساب مذہبی لوگوں کے عقاید کی جانچ پرتال کے لیے قائم کیا۔ ایک شاہی فرمان اس مضمون کا صادر ہوا کہ جن لوگوں کے عقاید ردِ ما کے بشپ ڈامسس اور اسکندریہ کے بشپ پیٹر کے عقاید سے مطابق نہ ہوں گے وہ جلاوطن کئے جائیں گے اور ان کے حقوق ہاکی چھین لیے جائیں گے۔ اور جو شخص ایسٹریکی عید اوسی روز منائے گا جس روز یہودی مناتے ہیں اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یونانی زبان کا چرچا مغرب میں بہت ہی کم ہوتا تھا اور علوم صحیحہ مفقود ہو گئے تھے۔

اس زمانہ میں اسکندریہ کا بشپ تھیوفیلس تھا۔ آسیرس کا ایک قدیم مندر سیحون کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ اس کو سمار کر کے اس کی جگہ گرجا بنایا جائے۔ نئی عمارت کی بنیاد کھودتے وقت قدیم پرستش کے بعض نقش آثار برآمد ہوئے۔ تھیوفیلس نے عبادتِ مریم کے جذبات کو حرارت مذہبی کے طاق پر رکھ کر ان علاماتِ قبیحہ کی تشہیر کی۔ تثلیث کی بحث کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے مذہب کی نامکون میں توہین و تذلیل کی جاتی تھی اس وقت بیچارے عیسائی تو چپ چاپ رہے لیکن اس موقع پر جب کہ خود بت پرستوں کی باری آئی تو ان سے ضبط و تحمل نہ ہو سکا۔ وہ فساد پر آمادہ ہو گئے اور ایک عام بلوہ ہو گیا۔ ”سریپین“ کو ادھون نے اپنا بنگاہ بنایا اور وہ فساد اور غوغا میزی ہوئی کہ شہنشاہ کو مداخلت کرنی پڑی اس نے تھیوفیلس کے نام اس مضمون کا فرمان بھیجا کہ ”سریپین“ کو منہدم کر دیا جائے اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتاب خانہ جسکو تاجدارانِ سلسلہ بطلموسیہ نے جمع کیا تھا اور جو بیس سینز کی آتش زنی سے بچ رہا تھا اس جاہل و متعصب پادری کی ہاتھوں برباد ہو گیا۔

تھیوفیلس کے بعد اسکندریہ کی دینی پیشوائی کی خدمت اس کے بھتیجے سینٹ سائرل کو ملی جو اپنے دلپذیر اور پر تاثیر مواعظ و خطبات کی وجہ سے اسکندریہ کے مذہبی ملقون میں مشہور و ہر لغزیز ہو گیا تھا۔ حضرت مریم کی پرستش اسی کی کوششوں سے اسکندریہ میں

عام ہو گئی۔ لیکن جو اثر اوس کی عالم پسند تقریروں نے اہل اسکندریہ کی عجیب طبیعتوں میں پیدا کیا تھا اوسے ایک عورت ہامی پیشیا نامی نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔ ہامی پیشیا جس کا باپ تھیمان بڑے پایہ کا جہندس تھا نہ صرف فلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی شایع تھی بلکہ اپالونیس اور دوسرے جہندسون کی تصانیف پر بھی اوس نے عالمانہ شرحیں لکھی تھیں۔ ہر روز اوس کے مدرسہ کے سامنے امرا و اعیان کے رتھوں کا ایک جہوم رہتا تھا۔ اور اسکندریہ کے تمام ذیع و شریف اوس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ جن سائل پر اوس کی تقریریں ہوتی تھیں وہ دہی سے دین جن پر ہمیشہ سے بحث ہوتی چلی آئی ہے لیکن آج تک حل نہیں ہو سکے یعنی ”میں کیا ہوں“؟ ”کون ہوں“؟ ”کہاں ہوں“؟ اور ”میرے علم کی کیا حد ہے“؟

ہامی پیشیا اور سائرل! ایک کو علم و حکمت میں قہر دوسرے کو جہل و تعصب میں توغل!! بھلا اجتماع ضدین کیونکر ممکن تھا؟ سائرل نے سمجھ لیا کہ اگر یہی لیل و نہار رہا تو ہامی پیشیا کے آگے اوس کی مشیخت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اور یہ سمجھ کر اوس نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑے اپنے حریف کا خاتمہ کر دے۔ ایک دن ہامی پیشیا مدرسہ کو جا رہی تھی کہ سائرل کی امت کے ایک گروہ کثیر الانفا یعنی بہت سے پادریوں نے اوسے آگھیرا۔ ان سب نے مل کر بیچ بازار میں اوس کے کپڑے فوج کھسٹ ڈالے۔ اوسے بالکل برہنہ کر دیا اور پھر کھینچتے کھینچتے ہوئے ایک اگر جابین لے گئے جہاں عصائے پطرس کی ستوا تر ضرلوں سے اوس کا سر توڑا گیا۔ اوس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ گوشت و پوست کو سمیپوں سے چھیلا گیا اور ہڈیاں آگ میں جھونک دی گئیں۔ اس خوفناک جرم کے متعلق سائرل سے جواب تک نہ لیا گیا۔ گویا تسلیم کر لیا گیا کہ چونکہ مقصد محمود تھا اس لئے اوس کی تکمیل کا جو ذریعہ اختیار کیا گیا وہ بھی محمود ہو گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ کا اسکندریہ سے چرچا اٹھ گیا اور اوس علم کا

جس کی اشاعت کے لیے فرمازدایان سلسلہ بطیموسیہ نے اس قدر کوششیں کی تھیں قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ ”سیرتین“ کا کتب خانہ برباد ہو ہی چکا تھا جو کچھ رہی وہی اسٹیکن فلسفہ و حکمت کے اکتساب کی دلوں میں باقی تھیں اون کا ہاتھی پیشیا کے عبرتناک انجام سے یوں خون کر دیا۔ انسانی خیال کے پاؤں میں مذہب نے پیریاں ڈال دیں۔ آزادی خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ غرض سال ۱۸۷۶ء وہ تاریخ ہے جبکہ انسان کو متنبہ کر دیا گیا کہ ہر شخص صرف اونہیں خیالات کو ذہن میں جگہ دے سکتا ہے جس کی اجازت حکام کلیہ صادر کریں۔ آئینہ من بھی فلسفہ دم توڑ رہا تھا۔ جٹینن نے اس کی تعلیم کی ممانعت کر دی اور اس شہر کے تمام مدارس بند کر دیے۔

سلطنت روم کے مشرقی صوبجات میں تو یہ واقعات گزر رہی رہے تھے لیکن مغرب میں بھی وہ قوت رنگ لائے بغیر نہ رہی جو ان واقعات کی محرک ہوئی تھی۔ ایک برطانوی راہب جس نے اپنا نام پلمچیس رکھ لیا تھا مغربی یورپ اور شمالی افریقہ کے علاقوں سے ہو کر گذرا۔ وہ جہان جاتا تھا یہ وعظ کرتا تھا کہ موت دنیا میں حضرت آدم کے گناہ کی وجہ سے نہیں آئی بلکہ وہ طبعاً اور فطرتاً فانی تھے اور اگر اون سے گناہ سرزد نہ بھی ہوتا جب بھی وہ ضرور مرتے اون کے گناہوں کی ذمہ داریاں اونہیں کی ذات تک محدود تھیں جو اون کی اولاد کی کسی طرح عاید نہیں ہوتیں۔ ان مغربی دکبری سے پلمچیس نے جو مذہبی نکتے اخذ کئے وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔

رومان پلمچیس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن کارتھج میں سینٹ اگسٹائن کے ایسا سے اوس پر بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اور اوسے بدعتی قرار دیا گیا۔ ٹوایپوس میں ایک بڑی مجلس اون الزامات کی تحقیقات کے لیے منعقد کی گئی جو اس پر لگائے گئے تھے اور اگرچہ ارکان مجلس نے اوسے بری کر دیا لیکن جب آؤسنٹ اول روم کے بطریق اعظم سے اس معاملہ میں استفتا کیا گیا تو اوس نے پلمچیس کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس فتوے کی

تفصیل نہ ہونے پائی تھی کہ آئوٹسٹ کا انتقال ہو گیا اور اوس کے جانشین آسپیس فرقتوے کو منسوخ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ پلیجس کے عقاید درست ہیں۔ وہ جماعت جو پوپ کی معصومیت کی منکر ہے ابھی تک ان مخالف و متضاد فتاویٰ کو اپنے فریق مخالف کی تردید میں پیش کرتی ہے۔ پلیجس کی قسمت یوں پٹے کھا ہی رہی تھی کہ افریقہ کے عیار اور چال باز پادریوں نے ٹک وٹ ڈیپرس کو گانٹھ کر قیصر تک رسائی پیدا کر لی۔ وہاں سے یہ فرمان صادر ہوا کہ پلیجس بیشک کافر ہے وہ اور اوس کے ساتھی جلا وطن کیے جائیں اور اون کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے۔ یہ کہنا کہ موت کا گزند دنیا میں ہبوط آدم سے پہلے ہو چکا تھا گویا ایک سرکاری جرم تھا۔

جن اصول پر یہ عجیب و غریب فیصلہ مبنی تھا اون پر غور کرنا خالی از نفع نہ ہوگا۔ چونکہ مسئلہ زیر بحث محض فلسفہ کا ایک مسئلہ تھا اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ اوس پر جو بحث کی جائے گی وہ قوانین فطرت کی رد سے کی جاوے گی لیکن ایسا نہ کیا گیا بلکہ فقط مذہبی پہلو سے بحث کی گئی۔ جس شخص نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے اوسے یاد ہوگا کہ طلمین نے مذہب عیسوی کے جوارکان بیان کئے ہیں اون میں گناہ اولین۔ ثقادت مطلق۔ سرفروشت ازلی۔ عفو اور کفارہ کے مسائل کا کہیں ذکر نہیں۔ عیسائیت کے جو مقاصد اوس نے بیان کئے ہیں اون میں حصول نجات کے اوس طریقہ کا نشان تک نہیں پایا جاتا جو دو صدی بعد مذہب عیسوی کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔ ان اہم مسائل کی توضیح و تشریح کے لیے ہم سیدھا گشت کا تجربہ کیے رہیں منت ہیں۔

اس مسئلہ کا تصفیہ کرتے وقت کہ موت کا گذر اس دنیا میں حضرت آدم کے ہبوط سے پہلے ہو چکا تھا یا وہ نقطہ اون کے گناہوں کی پاداش میں بطور سزا تجویز کی گئی تھی یہ تو کسی نے نہ پوچھا کہ آیا پلیجس کے خیالات قانون فطرت کے موافق ہیں یا مخالف بلکہ دریافت کیا گیا تو یہ کیا گیا کہ وہ سینٹ اگسٹائن کے عقاید سے بھی مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس کا

نیتجہ دہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ جس عقیدہ کو پادریوں نے اس شد و مد کے ساتھ سراپا
حقیقت قرار دیا اوس کو آج کل کے مسلم الثبوت علمی اکتشافات نے تہ دبا لا کر دیا ہے۔ انسان
کے ظہور سے مدتوں پہلے کروڑوں افراد بلکہ مخلوقات کی ہزار ہا نوعیں اور جنسین نیست
دنا بود ہو چکی تھیں اور جو باقی ہیں وہ ایک ادنیٰ اور ناچیز جزو ہیں اودن بے شمار گروہوں کا
جن کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

۱۔ اس حقیقت کو جس پر علوم جدیدہ کو اس قدر ناز ہے اور جس کے اکتشاف کے لیے اوسے علماء و حکما کے
بے تعدا تجربوں اور مشاہدوں کا شرمندہ احسان ہونا پڑا کہ کے ایک امی نے جو نہ اشراقی تخیل سے
آشنا تھا نہ مشائی نقل میں دسترس رکھتا تھا جس کو نہ کبھی مہندسانہ تجربہ سے سابقہ پڑا نہ طبیعیانہ
مشاہدہ کا اتفاق ہوا ان روشن الفاظ میں رہ رہ کر دہرایا ہے۔ ”کل من علیہا فان و یبقی
وجہ ربک ذوالجلال والاکرام“۔ ”کل نفس ذائقۃ الموت“۔ جس ہمہ گیر
اصول کی طرف ان ربانی الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے اوس کا اطلاق اشرف المخلوقات آدم سے
لے کر اذل موجودات جراثیم تک یکساں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معارف و حقائق پر انسان
کی عقل مجرد کے علاوہ ایک اور طاقت بھی روشنی ڈال سکتی ہے اور وہ طاقت مذہب ہے۔
مذہب اور سائنس گوا اپنے اپنے موضوع اگر لحاظ سے مختلف اشیا کے حقیقت آموز ہیں۔ لیکن
یہ ممکن نہیں کہ ضماً اگر کسی ایسے مسئلہ کا ذکر مذہب میں آجائے جس پر بحث کرنا سائنس کا کام ہو تو
مذہب کو کوئی ایسی بات کہہ جائے جسے عقل انسانی غلط ثابت کر سکے۔ اس لیے کہ مذہب اور سائنس
روشنی کی دو کرنیں ہیں جو ایک ہی شعلہ سے نکلی ہیں۔ ایک خدا کا کلام ہے دوسرا خدا کا کام۔
دونوں میں تضاد ممکن نہیں۔ مسئلہ حد و ثغات بعد از بہبوط یا قبل از بہبوط آدم کے متعلق
جیسا نیت نے جو غلطی کی ہے وہ جیسا کہ نو مصنف نے ظاہر کر دیا ہے اوس مذہب سے منسوب
نہیں کی جاسکتی جس کی تلقین مڑیلین نے کی تھی اگرچہ الوہیت مسیح کے متعلق اوس زمانہ کے عقاید
بھی فاسد ہو چکے تھے ماکہ۔ رومن کیتھولک پادریوں کے اختراعات (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

اس بحث و مباحثہ کے اخیر فیصلہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ مترتب ہوا۔ کتاب پیدائش کو بنائے مذہب عیسوی قرار دیا جا چکا تھا۔ پس جب اس کی اس روایت کو کہ حضرت آدم ہی بہشت میں گناہ سرزد ہوا جس کی اون کو سزا دی گئی مذہبی لحاظ سے اس قدر موثق مانا گیا تو کیا وجہ ہے کہ بزرگان دین عیسوی اس کتاب کو تمام فلسفہ اور علوم کا محکم و معیار نہ قرار دینا چنانچہ یہی ہوا۔ ہیئت طبقات الارض جغرافیہ۔ علم الانسان۔ علم تاریخ غرض کہ معلومات انسانی کے کل شعبوں کو اس سے تطبیق دے دی گئی۔

چونکہ سینٹ اگسٹائن کے عقاید نے دینیات کو سائنس کا حریف بنا دیا ہے لہذا اس ذمی اثر بزرگ کے بعض خالص فلسفیانہ خیالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ اوس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ”کنفشنس“ (اقبالات) ہے۔ اس کتاب کی گیارہویں بارہویں اور تیرہویں فصل میں اوس نے کتاب پیدائش کے پہلے باب کی تفسیر لکھی ہے جس کے بعض موزون مقامات کا ہم ذیل میں التقاط کرتے ہیں۔ یہ مقامات حکیمانہ مباحث سے معمور ہیں اگرچہ اکثر حصہ مجذوب کی بڑے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ایک مقام پر خدا سے دعا مانگی ہے کہ بارالہا مجھے توفیق عطا فرما کہ اس کتاب مقدس کو سمجھ سکوں اور اوس کے معانی مجھ پر ظاہر ہو جائیں۔ اوس کا بیان ہے کہ یہ کتاب حشو و زوائد سے پاک ہے لیکن ایک ایک لفظ سے صد ہا معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

خلقت کی صورت سے ظاہر ہے کہ اوس کا خالق ضرور ہوگا۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس خالق نے زمین اور آسمان کو کیوں کر بنایا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ غرض حقیقت ہر جگہ ایک ہے خواہ اوس کا اظہار مذہب کے ذریعہ سے ہو خواہ سائنس کی وساطت سے۔ اسلام نے جو شرک بت پرستی اور توہمات باطلہ کی آمیزش سے شروع ہی سے پاک راہ کو چمکھایا ہر وہ ہمارے اس دعوے پر گواہ عادل ہی۔ مترجم

اوس نے ان کو زمین اور آسمان کی حدود کے اندر بنایا ہوا اس لیے کہ دنیا دنیا کے اندر موجود رہ کر نہیں بنائی جاسکتی اور نہ وہ ایسی حالت میں بنائے جاسکتے تھے جبکہ اون کے بنانے کے لیے کوئی سامان ہی موجود نہ تھا۔ اس ابتدائی ہیستان کا مل سینٹ اگسٹائن نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ ”تو نے کہا اور زمین و آسمان بن گئے“

مگر یہ شکل یہاں ہی طے نہیں ہو جاتی۔ سینٹ اگسٹائن لکھتا ہے کہ جو الفاظ خدا نے کہے اون کے اجزائے ترکیبی میں بوقت اظہار فصل واقع ہوا ہوگا یعنی الفاظ و حروف یکے بعد دیگرے ادا کئے گئے ہوں گے۔ ضرور ہے کہ کوئی شے مخلوق ان الفاظ کا ذریعہ اظہار بنی ہو۔ پس وہ شے گویا آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے موجود ہوگی حالانکہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مادی شے زمین و آسمان سے قبل کیونکر موجود ہو سکتی ہے۔ اس شعر کا مخلوق ہونا لازمی ہے اس لئے کہ الفاظ منہ سے نکل کر ختم ہو گئے مگر ہم کو معلوم ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ الفاظ یکے بعد دیگرے ادا ہوئے ہوں بلکہ الفاظ وقت واحد میں ادا ہوئے ہوں گے ورنہ حدوث اور زمان لازم آتا ہے۔ تدیرج کے لیے زمان کی قید لازمی ہے حالانکہ اوس وقت سوائے قدم و بقا کے اور کچھ موجود نہ تھا۔ خدا کا علم اور قول اون امور کی بابت جو بقید زمان حادث ہوتے ہیں ازل و ابد سے متصف ہے۔

پھر بہت کچھ اخلاق کے ساتھ سینٹ اگسٹائن نے کتاب پیدائش کے افتتاحی الفاظ ”ابتدائین“ کی شرح کی ہے۔ اس شرح میں اوس نے کتاب مقدس کی ایک اور آیت سے مدد لی ہے جو یہ ہے :- ”اے خدا تیری صنایع ان کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ تو نے ان کو اپنی حکمت سے بنایا۔“ پس ”یہ حکمت“ ہی گویا ”ابتدا“ تھی اور اسی ”ابتدائین“ خدا نے زمین و آسمان بنائے۔

آگے چل کر سینٹ اگسٹائن کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ چھوٹے بیٹھے کہ آسمان و زمین بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا۔ اگر اوس کی صفت خالقیت کسی خاص وقت سے

شروع ہوئی تو اس سے زمان لازم آتا ہے نہ کہ قدم اور قدم میں کوئی شے حادث نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ موجود دستخیز ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب مینے میں اوس لئے اوس بلاغت آفرینی سے کام لیا ہے جس کے لحاظ سے وہ مشہور ہے۔ ”وہ کہتا ہے:-“ میں اس سوال کے جواب میں یہ تو نہ کہوں گا کہ خدا زمین و آسمان بنانے سے پہلے اون لوگوں کے لیے جو اوس کے اسرار اور کنہ کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جہنم کے بنانے میں مصروف تھا۔ البتہ مستفسر کو یہ جواب دون گا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے خدا نے کوئی شے نہیں بنائی اس لئے کہ مخلوق ہونے سے پہلے کوئی شے مخلوق نہیں ہو سکتی۔ زمانہ خود مخلوق ہے اور اس لیے ممکن نہیں کہ خلقت کے قبل اوس کا وجود ہو۔ پھر زمانہ کیا ہے؟ زمانہ گذشتہ تو ہر نہیں۔ زمانہ مستقبل بھی معدوم ہے۔ رہ گیا زمانہ موجودہ۔ اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہے۔ اگر ہو تو شاید وہ شے ہو جسے دو عدومن کے درمیان کوئی بقا نہیں۔ زمانہ طویل یا زمانہ قلیل عملات ہیں اس واسطے کہ جب ماضی مستقبل ہی موجود نہیں تو ان کا وجود کیسا۔ ان کا وجود سوار وح کے اور کہیں نہیں۔“

جس عبارت میں سینٹ الگسٹائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گویا ایک مجذوبانہ بڑ ہے جس کا مخاطب خدا ہے۔ اوس کی تصانیف کی حقیقت خواب پریشان حکے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں۔ اس خیال سے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کی تصدیق کر سکیں ہم بلا انتخاب کسی ایک مقام سے اوس کی عبارت کے چند فقرہوں کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت بارہویں فصل سے نقل کی جاتی ہے۔

”پس اے میرے خدا یہی وہ بات ہے جو میری سمجھ میں آتی ہے جبکہ میں تجھے اپنے کلام پاک میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین نہ تو دکھائی دیتی تھی نہ اوس کی کوئی شکل تھی۔ اور سمندر پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تو نے یہ نہیں فرمایا کہ تو نے ان کو کس دن پیدا کیا۔ یہ ہے وہ بات جو میری سمجھ میں

آتی ہے اور اس کی وجہ فلک الافلاک ہے یعنی وہ عقلی آسمان جس کی عقل کو سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے ٹھوڑا ٹھوڑا کر کے اس طرح نہیں معلوم ہوتا کہ گویا چاروں طرف اندھیرا چھا یا ہوا سہے یا کوئی چیز آئینہ میں سے نظر آ رہی ہے بلکہ کل کا کل تیرا منظر بن کر دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شے کا علم اب ہو اور ایک شے کا ٹھوڑی دیر کے بعد بلکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان عقل کو بلا تدریج یا فصل زمان سب کچھ ایک ہی دفعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین غیر مرئی اور غیر مُشکل اور تدریج زمانی سے عاری ہے۔ اور تدریج یا فصل ہی وہ حالت ہے جس کے باعث ایک شے اب ظاہر ہوتی ہے اور ایک شے کچھ دیر کے بعد اس لیے کہ شکل یا صورت کے موجود نہ ہونے سے اشیاء میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ پس ہر شے کا وجود انہیں دونوں کے ساتھ وابستہ ہے یعنی ایک تو اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جو شکل پکڑ چکی تھی اور ایک اس ابتدائی ہستی کے ساتھ جس کی کوئی شکل نہ تھی۔ ایک فلک تھا لیکن فلک الافلاک تھا۔ دوسری زمین تھی لیکن وہ زمین جو متحرک اور بے شکل تھی۔ انہیں دونوں کی وجہ سے یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اے خدا تیری کتاب مقدس بلا تخصیص ایام کہتی ہے کہ ابتدا میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ کیونکہ ساتھ ہی اس امر کی بھی تشریح و توضیح کر دی گئی کہ معبود ذہنی کونسی زمین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ قہ لا جوردی دوسرے دن پیدا کیا گیا اور اس کا نام آسمان رکھا گیا۔ جس سے ہم کو بلا تعین ایام معلوم ہو جاتا ہے کہ کس آسمان کا پہلے ذکر کیا گیا۔ اسے خدا تیرا کلام بھی کس قدر گہرا ہے جس کی سطح ہمارے سامنے ہو۔ ہم بچوں کی طرح ہیں اور وہ ہمارا دل بھاتی ہے۔ اے میرے خدا تیرے کلام کی گہرائی تعجب خیز ہے اور بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اس گہرے کنوئین میں جھانکتے ہوئے دل پر ہیبت چھا جاتی ہے وہ ہیبت جو عزت و آبرو میں لپٹی ہوئی ہے اور لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ لرزہ جو عشق و محبت کا پیدا کیا ہے۔ اس کے دشمنوں سے مجھو سخت

نفرت ہے۔ کاش تو اپنی تیغ و دودم سے قتل کر ڈالتا تاکہ وہ تیرے کلام سے دشمنی کرنے کے قابل نہ رہے اور میرے نزدیک اذن کا اپنے نفس کے اندر مارا جانا بہت ہی پسندیدہ ہی اس لیے کہ اس طور پر وہ تیری ذات کے اندر بقا حاصل کر سکیں گے۔“

ذیل کے فقرہ کا اقتباس سینٹ الگسٹائن کی کتاب ”اقبالات“ کی تیرہویں فصل سے کیا جاتا ہے جس میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مسند تثلیث کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ اس اقتباس سے ہمارا مقصود اس کی شان تفسیر نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ وہ کتاب مقدس کا سرشار و غوامض کی گتھیاں کیوں کر سلجھاتا ہے۔

”اب مجھ کو تثلیث نظر آ رہی ہے اور اس طرح نظر آ رہی ہے جیسے آئینہ میں کوئی چیز دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہو۔ اور یہ اے میرے خدا تیرا جلوہ ہے کیونکہ تو نے باپ ہونے کی حیثیت سے آسمان و زمین کو اس کا مظہر بن کر پیدا کیا جو ہماری عقل و تمیز کا مبداء ہے اور جو تیری عقل ہے اور تجھ سے پیدا ہوا اور ازل و ابد میں تیرا شریک و سہم ہے یعنی تیرا بیٹا۔ ہم فلک الافلاک کا بہت کچھ حال بیان کر چکے ہیں اور اس زمین کا جو دکھائی نہ دیتی تھی اور بغیر کسی صورت کے تھی۔ اور تاریک سمندر کا بھی بلحاظ اس کی مسخ شدہ روحانیت کے زلزل اور بے ثباتی کے ہم نے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اس کی شکل اختیار کر لی ہو جس نے بقدر اس کی نشو و نما کو موجودہ کے اس میں جان ڈالی تھی اور اس کی روشنی کی وجہ سے حسن و جمال کے سانچہ میں ڈھل کر وہ فلک الافلاک بن گیا ہو جو آگے چل کر اس طرح قائم کیا گیا کہ اوپر نیچے پانی ہی پانی تھا۔ اس طرح خدا کے نام کے ذریعہ سے مجھ کو باپ کی حقیقت کا علم ہوا جس نے یہ کائنات بنائی اور ابتدا کے نام کے ذریعہ سے مجھے بیٹے کی ماہیت معلوم ہوئی جس میں ساری ودایر ہو کر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ اور اپنے خدا پر شکل تثلیث ایمان لا کر جب میں نے اس کے کلام پاک کو اور زیادہ تجسس اور تفحص کی نظر سے دیکھا

تو مجھے روح القدس کا جلوہ سطح آب پر نظر آگیا۔ پس اسے میرے خدا مجھ پر تثلیث یعنی باپ بیٹے اور روح القدس کی حقیقت آسمن کا راہو گئی کہ وہی آفرینندہ کون و مکان ہے، یہ سینٹ اگسٹائن کی تصانیف کو اہل مذہب پندرہ سو برس سے مستند مانتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے ہم کو بھی لازم ہے کہ اون کا ذکر ادب سے کریں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم کو سو راہی کی ضرورت بھی نہیں۔ جن فقرات کا ہم نے اون کی تصنیف سے اوپر اقتباس کیا ہے وہ اپنی تنقید خود کر رہے ہیں۔ سائنس اور مذہب میں جو نزاع پیدا ہو گئی اس کو بانی مہائی ہی حضرت ہیں۔ کتاب مقدس کی اصلی غرض یہ تھی کہ لوگوں کو نیکی اور پاکبازی کا رستہ دکھائے۔ ان بزرگوں نے علوم انسانی کی قسمت کا فیصلہ جو اس کے بس کا نہ تھا اس کے حوالے کر کے نہایت بے باکی کی راہ سے انسان کے قوای عقلی پر چاہرانا حکومت کا سلسلہ قائم کر دیا۔ مثال تو قائم ہو ہی چکی تھی پیر و بہت سے پیدا ہو گئے۔ مشاہیر فلاسفہ یونان کی تصانیف کو ان مقدس پیروان کلیسا نے علوم سفلی کی ذیل میں داخل کیا۔ عجائب خانہ اسکندریہ کے عظیم المثال اور روشن کارناموں پر جہالت تعصب اور غیر ممکن الفہم مہلات کے کالے بادلوں کی گھٹا چھا گئی جس میں سے پادریوں کے قہر و انتقام کی بجلیاں رہ رہ کر کوندنے لگیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ علوم و فنون میں جن کا مدار علیہ الہام ربانی ہو کسی تغیر یا تبدیل یا ترقی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر الہام کو سائنس کا سرچشمہ مان لیا جائے تو تمام نئے

لے جن دو مقامات کا اقتباس یہ بیان کیا گیا ہے اگرچہ بہتر یہی ہوتا کہ وہ نہیں قلم انداز کر دیا جاتا اس لیے کہ انکا مطلب باتو خود جناب اگسٹائن نے سمجھا ہوگا اور یادہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کو روح القدس کے فیضان سے خاص طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا ہو لیکن اس خیال سے کہ ناظرین بھی سینٹ اگسٹائن کی ہرزہ سرائی یا بقول معتقہ مجذوبانہ بڑکا لطف اٹھائے میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں اصل عبارت کا عقلی ترجمہ درج کرنا ہم نے ضروری خیال کیا۔ مترجم

اکتشافات غیر ضروری ٹھہرتے ہیں۔ جو باتیں خدا کو بتانی منظور تھیں وہ اس نے بذریعہ کتب مقدس انسان پر ظاہر کر دیں۔ ان کے سوا اور کسی قسم کی دریافت کی کوشش گویا خدا کی کنہ کی بیہودہ اور گستاخانہ تلاش ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس مقدس سائنس کی حقیقت کیا ہے جو بذریعہ الہام ربانی حاصل ہوا اور جس پر بزرگان دین یعنی پادری صاحبوں نے معلومات انسانی کا حصر کر دیا۔ یہ علم وہ علم ہے جو کائنات کے تمام مادی و روحانی مظاہر کو افعال انسانی کے مشابہ قرار دیتا ہے۔ اور خداے قیوم کو ایک عظیم الجثہ انسان سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس کی رو سے زمین ایک چٹھی سطح ہے جس پر آسمان گنبد کی طرح قائم ہے یا بقول سینٹ اگسٹائن جہلی کی کھنچا ہوا ہے۔ آسمان میں سورج چاند اور ستارے اس غرض سے حرکت کرتے ہیں کہ ان کو شبانہ روز روشنی پہنچائیں۔ زمین اس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا اور تمام حیوانات و نباتات سمیت جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے اور زمین کے نیچے ایک تاریک و آتشین مقام میں دوزخ ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع اور اس کے فائدہ کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا۔ اول اول وہ اکیلا تھا مگر بعد میں اس کی ایک پسلی سے عورت بنائی گئی۔ ان ان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے خدا نے فردوس میں جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا رہنے کو جگہ دی۔ وہ نہایت عاقل اور پاک تھا لیکن چونکہ اس نے نمر منوعہ کھا کر خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی لہذا اس کی مشقت اور موت کی سزا دی گئی۔ اس انسان اول کی اولاد کو اس کی سزا سے کچھ عبرت نہ ہوئی بلکہ ان سے ایسی ایسی بدیان اور شرارتیں سرزد ہوئیں کہ خدا کو ان کے تہاہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس لیے ایک ایسا طوفان عظیم رو سے زمین پر نازل کیا گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیاں تک پانی میں غرق ہو گئیں۔ جب یہ طوفان انسان کو غارت کر چکا تو ایک

ہوئے تندھلی جس نے پانی کو خشک کر دیا۔

اس آفت سے حضرت نوحؑ اور اہل بیتہٴ ہام کے تین بیٹے ہام، سام اور یافت مع اپنی بیویوں کے ایک کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو از سر نو آباد کیا ہام نے افریقہ کو اور یافت نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت مقدس پادری صاحبوں کو معلوم نہ تھی اس لیے اس کی آبادی کے مورث اعلیٰ کے نام کی گنجائش نہیں نکالی گئی۔

اب ذرا سنئے کہ یہ بزرگوار اپنے دعاوی کی تائید میں کس قسم کے دلائل پیش فرماتے ہیں۔ لکٹنٹسٹیس نے زمین کے کردی اشکل ہونے کی تردید ان الفاظ میں کی ہے :-

”دیکھنا یہ ممکن ہے کہ انسان اس درجہ لغو اور بھل ہو کہ یہ بات باور کرے کہ درخت اور پودے زمین کی دوسری طرف نیچے کو ٹٹک رہے ہیں یا وہاں کے باشندوں کے پاؤں اوپر ہیں اور سر نیچے۔ اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان مہلات کی کیا توجیہ کرتے ہو اور کیوں یہ چیزیں زمین پر سے گر نہیں جاتیں تو وہ کہتے ہیں کہ خاصیت اشیاء یہی ہے کہ بہاری چیزیں پہلے گر آردن کی طرح مرکز کی طرف یائل ہوں اور ملکی چیزیں مثلاً بادل دھواں اور آگ مرکز سے اوپر کی طرف اٹھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو کیا کہوں جو ایک بار غلطی کرنی ہیں تو اس مسئلے پر سے اس پر قائم ہو جاتے ہیں کہ ایک حاکم کی تائید میں دوسری حاکم پیش کرتے ہیں“ مسئلہ تقابل رطلین یعنی اس مسئلہ کے متعلق کہ زمین کے دوسری طرف جو انسان آباد ہیں ان کے پاؤں کے تلوے ہمارے پاؤں کے تلوے کے مقابل ہیں سیٹنٹ اگسٹائن ہون ارشاد فرماتے ہیں :- ”زمین کے اوس طرف آبادی کا ہونا محال ہے اس لیے کہ کتاب مقدس میں حضرت آدم کی اولاد میں سے کوئی قوم اس قسم کی بیان نہیں کی گئی“ لیکن شاید سب سے زیادہ زبردست اور لاجواب دلیل زمین کے کردی اشکل ہونے کے خلاف یہ پیش کی جاتی تھی کہ اوس طرف کے باشندوں کو مضر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترنا کیوں کر نظر آئے گا۔

دنیا میں موت کی آمد۔ واقعات عالم میں روحانیت کا پیہم نصرت۔ ملائکہ شیاطین کے مناسب۔ زمین کا ایک وقت معبودہ پر آگ سے جل جانا۔ بائبل کے مینارہ کا واقعہ۔ زبانوں کا اختلاف۔ بنی نوع انسان کا رو سے زمین پر پتھر ہونا۔ مظاہر قدرت مثلاً کسوف و خسوف و قوس قزح کی تادیل۔ یہ تمام ایسے سایل ہیں جن پر مہیاں بحث کرنا فضول ہے۔ خصوصاً اودن تصورات پر جو مقدس پادری صاحبوں نے خدا کی ذات و صفات کے متعلق قائم کیے ہیں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لیے کہ ان تصورات کے پردہ پر خدا کی جو شبیہ کھینچی گئی ہو وہ انسان سے بہت ہی مشابہ اور شان ایزدی سے بہت ہی گری ہوئی ہے۔

البتہ کاساس انڈیکا پلیوسٹینز کے بعض خیالات کا التقاط اس مقام پر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ یہ خیالات چھٹی صدی میں عام طور سے رائج تھے۔ اس شخص نے ایک کتاب ”کریچین ٹاپوگریفی“ (سیحی جغرافیہ) کے نام سے لکھی تھی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس ملحدانہ عقیدہ کی تردید کی جائے کہ زمین کروی شکل ہے اور نیز بت پرستوں کے اس دعویٰ کا ابطال کیا جائے کہ منطقہ حارہ کے جنوب میں منطقہ معتدلہ واقع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیہ کے صحیح اور سچے اصول کی رو سے زمین ایک سطح ذوالبلتہ الزدایا ہے جو بقدر چار سو دن کی مسافت کے مشرق سے مغرب تک اور شمالاً جنوباً اس سے نصف فاصلہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن پر آسمان قائم ہے۔ شمال میں ایک پہاڑ واقع ہے جو سب پہاڑوں سے بڑا ہے۔ جب یہ پہاڑ آفتاب کی شعاعوں کا حایل ہو جاتا ہے تو دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے جسے رات کہتے ہیں۔ زمین بالکل سطح نہیں ہے بلکہ جنوب کی طرف تھوڑی سی جھکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریاے فرات و دجلہ و فرہ جیسے بہاؤ کا رخ جانب جنوب ہے نہایت تیزی سے بہتے ہیں لیکن دریاے نیل کا دھارا بلند دی پر چڑھنے کی باعث بہت سست رفتار ہے۔

بیلجوساتوین صدی میں اسی طبقہ کا ایک مصنف ہو گزرا ہے لکھتا ہے: ”دنیا

پچھ دن میں پیدا کی گئی اور زمین اس کا مرکز اور سب سے بڑا جسم ہے۔ آسمان ایک آتشین اور سیال جسم مدور ہے جو زمین پر نشا میا نہ کی طرح تباہ ہوا ہے اور مرکز زمین سے اس کا ہر ایک حصہ مساوی ^{البتہ} ہے۔ یہ ہر روز نہایت تیزی سے گھومتا ہے مگر اس تیزی میں سات سیاروں کی مزاحمت کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ تین سیارے زحل مشتری اور مریخ آفتاب سے اونچے ہیں۔ ان کے نیچے آفتاب ہے اور آفتاب کے نیچے باقی تین سیارے ہیں یعنی زہرہ عطارد اور قمر ستارے اپنے مقررہ دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ اور شمالی ستاروں کا مدار سب سے چھوٹا ہے۔ عرش معلیٰ کی حدود مقرر ہیں۔ اس میں ملائکہ آباد ہیں جو زمین پر اتر کر انسانی شکل اختیار کرتے ہیں اور انسانی فرایض ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ آسمان کی حرارت بیخ کے ٹھنڈے پانی سے معتدل ہوتی رہتی ہے ورنہ اسے آگ لگ جائے۔ فلک ادنیٰ کا نام آسمان ہے اس لیے کہ یہ آب فوقانی و تحتانی کے درمیان حد فاصل ہے۔ آسمانی عالم آب فلک الارواح سے نیچا مگر تمام جسمانی اشیاء سے اونچا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ذخیرہ ایک دوسرے طوفان کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے لیکن ہمیں ادون لوگوں کے ساتھ اتفاق ہو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ عالم آب ثابت کی حرارت کے اشتداد میں اعتدال پیدا کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔

جہل تعصب اور خیرہ چشمی کی بھی کوئی حد ہے! کیا انہیں لغو اور بھل خیالات کی اشاعت کو لئے فلاسفہ یونان کی تصانیف سے ابا کیا گیا تھا؟ لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ ایک دن ان جہلات کی قلعی کھلنے والی تھی۔ جب ”ریفارمیشن“ (اصلاح گشت) کا دور آیا تو ادون فاضل نقادوں نے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان تمام مصنفین کی کتابوں کا ایک دوسری سے مقابلہ کرنے کے بعد ان کو حقارت کی اس ٹوکری میں جھونک دیا جو ان کے لیے صد ہا سال سے تیار کی جا رہی تھی آج کے دن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے ہم نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔

علوم و فنون کا جو نظام اس طور پر مدون کیا گیا اوس کا سب سے زیادہ عجیب و غریب جزو اس کی منطق اور اس کو مدون کے ثبوت کا ڈھنگ تھا۔ اثبات و عادی کے لیے معجزات پیش کیے جاتے تھے اور ایک واقعہ کے ثبوت میں ہمیشہ کسی غیر متعلق واقعہ کی مثال پیش کر کے سمجھ لیا جاتا تھا کہ ثبوت مکمل ہو گیا۔ ایک عربی عالم نے اس طرز ثبوت کی نسبت کیا خوب لکھا ہے: ”اگر کوئی بھانبتی کا تماشا کرنے والا مجھ سے کہے کہ تین کا عدد دس سے زیادہ ہے اور اس کا ثبوت چاہو تو میں اس چھڑی کا سانپ بنا کر دکھا دیتا ہوں تو میں بیشک اوس کے ہتھکھنڈ کو تو قایل ہو جاؤں گا مگر اوس کے دعویٰ کو کسی طرح تسلیم نہ کروں گا۔“

با این ہمہ ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک یہی منطق یورپ بھر میں رائج رہی اور اسی قسم کے لغو دعویٰ ایسے ہی غنجل و مہمل ثبوت پر صبح مائے جاتے رہے۔

چونکہ وہ فریق جو سلطنت میں برسر اقتدار ہو گیا تھا اس قسم کی کتابیں تصنیف کرنے سے عاجز تھا جنہیں بت پرست معنفین کی شہوت تصانیف سے عقلی طور پر راز و مساقت ہو سکے اور یہ ممکن نہ تھا کہ فریق مذکورہ مقابل کو دانش و حکمت میں اپنے سے بڑھ کر تسلیم کرے لہذا مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ علوم سفلی یعنی فلسفہ و طبیعیات کی اشاعت کی راہ میں نہ صرف روڑے اٹکائے جائیں بلکہ فلاسفہ و طبیعیین پر سختیوں کی جائیں تاکہ وہ اکتساب و ترویج علوم و فنون سے بالکل ہی دست بردار ہو جائیں اور علم کا چراغ گل ہو جائے۔ قیصر و تیکنائمن کے عہد میں جو مظالم حکماء اشرافین پر روا رکھے گئے ان کی محرک یہی بولٹیک مصلحت تھی۔ اون پر جادوگری کا الزام لگایا گیا اور بہت سے فلاسفہ قتل کر دئے گئے۔ فلسفہ کو قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ فلسفہ دانی سرکاری جرایم کی فہرست میں شامل ہو گئی۔ علم و حکمت کی جگہ اب عجائبات و توہمات نے لے لی جن سے طبیعتوں کو مشق پیدا ہو گیا۔ اور تھر سکے جن مشاہیر نے عجائب خانہ اسکندریہ کو بقائے دوام کی چادر اڑا دی تھی ان کو جانشین جاہل اور ایدہام پرست راہبوں کے گردہ بن گئے۔

تیسرا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ مسئلہ توحید پہلی یعنی جنوبی اصلاح

اہل معرامر کرتے ہیں کہ مریم عذرا کی پرستش کو رواج عام دیا جائے۔ قسطنطنیہ کا بطریق نسطورادون کی مخالفت کرتا ہے لیکن انجام کار بوجہ ادس رسوخ کے جو مصریوں کو دربار قیصرین حاصل ہے وہ نسطور کو جلا وطن کر دیتے ہیں۔ اور نسطور کے پیروں منتشر ہو جاتے ہیں۔

اصلاح جنوبی (یعنی اسلام) کا آغاز۔ حملہ ایران۔ اس کے اخلاقی نتائج۔
اصلاح عرب۔ حضرت محمد نسطوری فرقت کے راہبوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے اصول اختیار کر کے ان اصول پر اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مریم عذرا کی پرستش مسئلہ تثلیث اور ادس عقیدے سے جو توحید باری سے توافق نہیں رکھتا وہ ابا کرتے ہیں۔ عرب کی بت پرستی کو یہ جبر مٹا دیتی ہیں اور دولت روم پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ ان حضرت صلعم کے جانشین شام مصر ایشیائے کوچک شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کو مسخر اور فرانس پر حملہ کرتے ہیں۔

اس کشمکش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحدت واجب الوجود کا اصول دولت روم کے اکثر حصہ میں رائج ہو جاتا ہے۔ سائنس از سر نو زندہ ہوتا ہے اور سچی دنیا کے بہت سے شہور مرکز حکومت مثلاً اسکندریہ کاترجمہاں تک کہ بیت المقدس تک عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔

دولت روم کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت کے باشندوں کو کفار سیحی نما بنا دیا تھا۔ بت پرست اور عیسائی بلحاظ عقاید ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے بلکہ یون کہنا چاہیئے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر غم ہو گئے تھے۔ عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا۔ یہ دو غلامذہب دولت روم کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔

اس اختلاط سے جو عظیم الشان توسیع مترتب ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سیحی جماعت دولت مند ہو گئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہو گیا۔ سرکاری مالگزاری کی رقم خطر کا ایک بہت بڑا حصہ کلیسا کے خزانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس دولت پر دست مسابقت دراز کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامہ ریائی پہن کر حقیقت میں اس کے دنیوی فوائد سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔

قیصر ہر زمانہ سابق کے عہد میں فتوحات کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ سلطنت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ سپاہیانہ زندگی کے مقاصد اصلی سب ختم ہو چکے تھے۔ جنگ و جدل تغلب و تصرف اور لوٹ مار کا زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن اہل حرص و ہوا کے لیے ایک اور رستہ بھی کھلا تھا اور اودن کی مقصد برآریوں کے اور یہی بہت سے طریقے تھے۔ کلیسائی زندگی کی کامیابی میں اودن عظیم الشان فوائد کا راز چھپا ہوا تھا جو عہد گزشتہ کے جنگی کارناموں کے مقابلہ میں سود مندی کے اعتبار سے کسی طرح کم نہ تھے۔

اس زمانہ میں مذہبی بلکہ یون کہنا چاہیئے کہ سیاسی تاریخ کے پرکار کار مرکز کش قسطنطنیہ اسکندریہ اور روم کے بطریقوں کی مسابقتانہ جدوجہد تھی۔ ان میں سحر ایک یہی چاہتا تھا کہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا کر عنان سلطوت و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔

قسطنطیہ کے دعویٰ تفوق کا انحصار اس واقعہ پر تھا کہ وہ قیصر کا پایہ تخت ہے۔ اسکندریہ کو اپنی تجارتی اور علمی حیثیت پر ناز تھا اور روم اپنی گزشتہ عظمت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ لیکن قسطنطیہ کے بطریق کے منصوبوں کی راہ میں ایک بڑی مشکل بھی حایل تھی اور وہ یہ کہ قیصر کی ہر وقت اوس پر نظر رہتی تھی اور وہ کسی معاملہ میں خود سرانہ کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ بخلاف اس کے اسکندریہ اور روم کو مرکز حکومت سے دور ہونے کے باعث شہنشاہ کی مداخلت کا خوف نہ تھا اور وہ بے کھٹکے من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔

مشرق میں مذہبی سبائیت عموماً خدا کی ذات و صفات کے متعلق ہوتے رہے ہیں لیکن مغرب میں اس قسم کے مناقشہوں کا میلان تعلقات و حیات انسان کی طرف رہا ہے۔ یہ خصوصیت اول تغیرات میں اسات فلورے نمایاں ہے جن سے مذہب عیسوی ایشیا و یورپ میں متاثر ہوا۔ اوس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت روم کے مشرقی صوبوں میں ایک عقلی پلچل پھیلی ہوئی تھی۔ تثلیث۔ جو ہر ذات باری تعالیٰ۔ درجہ ابن اللہ۔ ماہیت روح القدس۔ ائمہ اربعہ عذرا۔ وہ مسایل تھے جن پر نہایت سختی کے ساتھ مذہبی حلقوں میں مناظرے اور مجادلے ہوتے تھے۔ آج ایک فریق نقارہ فتح و نصرت بجاتا تھا تو کھل دوسرا فریق اپنی کامیابی کا اعلان کرتا تھا اور تنہا صمیم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کبھی معجزے اور کرامتیں پیش کرتے تھے اور کبھی نوبت تیغ آزمائی تک پہنچتی تھی جس سے خون کی ندیاں بہ نکلتی تھیں۔ یہ کوشش کبھی نہ کی جاتی تھی کہ آراء متقابل کو منطقیانہ استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے کھرے کا امتیاز کر لیا جائے۔ لیکن ان سب متخالف فرقوں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ تھا کہ بت پرستانہ مسلک کی تمام قدیم تشکیلیں باطل تھیں اس لیے کہ جس آسانی سے ان مذاہب کا استیصال ہو گیا وہ خود ان کو بطلان پر دلالت کرتی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے بہ بانگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ جب امتحان کا

وقت آیا تو دیوتاؤں کی مورتیں اپنی حفاظت میں انگلی تک نہ اٹھا سکیں۔

یورپ کی جنوبی اقوام نے ہمیشہ تعدد ذات باری تعالیٰ کو اپنا کیش و آئین قرار دیا ہے اور سامی اقوام کا میلان عقیدہ وحدت واجب الوجود کی طرف پایا گیا ہے۔ شاید زمانہ حال کے ایک مصنف کے خیال کے مطابق اس کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑوں وادیوں جزیروں دریاؤں اور خلیجوں کی رنگارنگ منظر آرائیاں ان کے دل میں معبودوں کی کثرت کا تصور پیدا کر دیتی ہیں اور ایک وسیع و وسیع ریگستان اور ناپید اکتا سمندر کا نظارہ اوس کے دماغ پر جناب باری کی یکمائی کا نقش مرسم کرتا ہے۔

ملکی مصلحتوں نے قیصران روم سے سفارش کی تھی کہ عیسائیت اور بت پرستی کی کٹھن کو بنظر استحسان دیکھیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس طرز عمل نے دونوں حریفوں کی باہمی رقابت کی تلخی کو کمی قدر کم کر دیا تھا۔ عام پسند مذہب عیسوی کی بہشت وہی تہذیب اولیٰ پس قرار دیا گیا تھا جس میں یونانی دیوتاؤں کا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس بہشت میں بجائے یونانی دیوتاؤں کے جو وہاں سے نکال دئے گئے تھے ایک بہت بڑے سفید تخت پر باپ یعنی خدا بٹھا دیا گیا تھا۔ اوس کے دہنے ہاتھ کی طرف بیٹا تھا۔ بیٹے کے برابر مقدس مریم زریفت کا خلعت پہنے انواع و اقسام کے زیور وں سے لدی ہوئی جلوہ افروز تھیں اور خدا کے بائیں طرف روح القدس شکن تھی۔ اس تخت کے گرد اگر د ملائکہ کا ایک جم غفیر ہاتھوں میں بانسریان لیے پر اجمائے کھڑا تھا۔ ملائکہ کی صفوں سے گذر کر ایک وسیع میدان نظر آتا تھا جہاں اطعمہ لذیذ و اشربہ نفیسہ سے لدی ہوئی میزین بھیجی ہوئی تھیں جو نیک اور پاکباز بندوں کی ارواح پر فوج کے کام و زبان کے لئے سرمایہ لذت جادو دانی ہم پہنچاتی تھیں۔

عوام و جہال کے اطمینان کے لیے تو راحت و سرور کی یہ تصویر کافی تھی اور شاید اودن کا ذہن اس تصویر کے دوسرے رخ کی طرف کبھی منتقل بھی نہ ہوتا ہوا اور اودن کے

دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوتا ہو کہ آخر ایسے غیر متغیر و غیر متحرک نظارہ میں جس کو دیکھ دیکھ کر طبیعت کا کبھی نہ کبھی اچاٹ ہو جانا لازمی ہے لذت آفرینی کی قابلیت کس حد تک موجود ہو سکتی ہے لیکن جو ذرا سمجھ دار تھے ان سے عوام کا لانا عام کی تقلید کی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ طبقہ اعلیٰ کے دقیقہ سنج و نکتہ رس پیشوایان دین میں بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے ان تصورات کو جو مادہ پرستی اور ہوس رانی کی آلائشوں سے آغشتہ تھے کمال حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا اور حاضر و ناظر و قادر مطلق خدا کی ذات و صفات کو ان ناپاک قیود سے بری کرنے کے لیے اپنی آواز بلند کی۔

عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو ہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر طریق کو ہر دفعہ یز بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے اپنے مقتدیوں کے عقاید کو عام اس سے کہ ان عقاید کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسند تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقاید کو عیسائیت میں زبردستی داخل کر لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے یہاں سے آئس کی قدیم پرستش کو از سر نو زندگی کیا جائے۔

انہیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیئس نے تصور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور ساکن بالیوٹیا کا ہم مسلک تھا قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۳۸۰ء)۔ ان ذیل تجزیہ عقاید سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے تصور کو انکار تھا۔ اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدا احد و الجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری دوایر ہے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ تصور پر ارسطو کے فلسفہ نے نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقاید مشائیہ کو خالص مسیحی عقاید کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اوس میں اور اسخندریہ کے بطریق سکیرل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا

کی اوس جماعت سے تھا جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اوس فریق کا سرگروہ تھا جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائیرل بھی ہے جس نے ہاتھی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سائیرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی مان ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مقصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے برابر قرار دیتے ہوئے اوس نے ازراہ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی مان ہو؟ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر اوس نے اور جو خطبے پڑھے یا مضامین لکھے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مریم کو خدا کی مان نہ سمجھنا چاہیے بلکہ حضرت مسیح کے انسانی حصہ کی مان تصور کرنا چاہیے اور یہ انسانی حصہ ربانی حصہ سے ایسا ہی جدا ہے جیسا معبود اپنے مبعود سے۔

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پاکر قسطنطنیہ کے پادریوں نے ”خدا کی ان کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طویل کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبور ہو کر حکم دینا پڑا کہ افسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائیرل نے اس اثنا میں دربار شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سہ مشاغل سونے کی رشت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر آسمانی دربار کی مقدس دوشیزہ کو اپنے ہی ہم جنسوں میں سے ایک حمایت کرنے والی شہنشاہی دربار کی مقدس دوشیزہ کی شکل میں ہاتھ آگئی۔ سائیرل مردوں اور عورتوں کے ایک جم غفیر کو جو طبقہ اراذل و الفارسے تھا ہمراہ لیے ہوئے کونسل میں پہنچا اور خود بخود صدر نشین مجلس بن بیٹھا۔ اوس کے ہمراہیوں نے شور مچانا شروع کر دیا اور اس شور و غل میں قبل ازاں کہ شامی بطریق جو کونسل میں شریک ہونے کے لیے طلب کیے گئے تھے پہنچیں شہنشاہ کا فرمان پڑھوا دیا گیا۔ اس طور پر سائیرل نے ایک دن میں میدان مار لیا اور اپنے

حریف کو شکست فاش رہے کہ خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارا کہ اوس کے غدرات تو سن لیے جائیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا اودن کو ایک نظر دیکھ تو لیا جائے لیکن اوس کی ایک پیش نہ گئی۔ بلا اس کے کہ اوس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اوس پر فرد قرار داد جرم لگا دی گئی۔ جب شامی بطریق جو نسطور کے طرف دار تھے پہنچے تو اونہوں نے ایک جلسہ میں اس فیصلہ سے ناراضی و بیزاری کا اظہار کیا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین میں فساد ہو گیا۔ سینٹ جان کے گرجا میں لاٹھی چل گئی اور بہت کچھ سر پھٹول ہوئی۔ نسطور مور و عتاب ہوا اور جلا وطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اوس کو دشمن عمر بھر اوس کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے رہے اور جب اوس کا انتقال ہوا تو اوس کی مرثیہ خوانی ان الفاظ میں کی گئی کہ ”اوس کی کفر بچنے والی زبان میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اگر یہ وہ مصری ریگستان کی جھلسنے والی لوؤں کی پٹ سے مرکب لکھا ہے لیکن یقین ہے کہ اب اوس کا جسم جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھول لگا جائے گا“

لیکن نسطور کی شکست اور سزایابی اوس کے عقاید کو کسی طرح نہ مٹا سکی۔ سینٹ یسےو کی کتاب کے پہلے باب کی آخری آیت اور اسی کتاب کے تیرھویں باب کی چھپنویں اور چھپنویں آیتوں کے صاف اور صریح الفاظ کو جسکے مفہوم میں تاویل کو دخل نہیں پیش نظر رکھ کر وہ اور اوس کے پیرواس بات کا اعتراف نہ کر سکتے تھے کہ آسمان کی نئی ملکہ کی حالت دو شیرگی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی صفت ہے۔ اودن کو فلسفیانہ رجحانات کی جھلک بہت جلد اودن کے طرز عمل میں نظر آنے لگی جس زمانہ میں نسطور ریگستان افریقہ میں قید کاٹ رہا تھا اوس کو بہت سے پیر و ہجرت کر گئے اور دریائے فرات کے کنارے جا آباد ہوئے جہاں اونہوں نے کلیسائے کلدانیہ قائم کیا۔ انہیں کی ساعی نے ایڈیسا کے مشہور دارالعلم کی بنا ڈالی۔ سیس (نسیب) کے دارالعلم سے وہ علما و حکماء تاج فضیلت سر پر رکھ کر نکلے جنہوں نے نسطوری عقاید کو شام عرب ہندوستان تاتار مصر اور چین میں پھیلا دیا۔ نسطوریوں نے

فلسفہ مشائخہ کو اپنا عقلی مسلک قرار دیا اور آرسطو کی تصانیف کا ترجمہ شامی اور ایرانی زبانوں میں کیا۔ اس کے علاوہ ادنیوں نے زمانہ مابعد کے دوسرے مصنفین مثلاً پلاینی کی تصانیف

سے تاریخ میں اس نام کے دو مشاہیر کا تذکرہ موجود ہے۔ اکبر و اصغر۔ یہاں پلاینی اکبر سے مراد ہے جو نہ صرف دولت و رومۃ الکبریٰ کے اراکین سلطنت میں ایک خاص درجہ رکھتا تھا بلکہ کثیر التعداد کتابوں کے مصنف ہونے کے لحاظ سے مصنفین عہد قدیم کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ مسیح ۶ میں بمقام دیمودنا پیدا ہوا۔ روم نے جب جرمنی پر فوج کشی کی تو اسے بھی فوج کے ایک دستہ کی کمان ملی۔ اس وقت اس کی عمر ۲۲ سال تھی۔ اس فوج کشی کی تاریخ اوس نے سینس جلد دن میں لکھی ہے۔ اس کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہد دن پر اوس کا تقرر ہوتا رہا لیکن باوجود انہماک مشاغل سرکاری وہ تالیف و تصنیف کے لیے بہت کچھ وقت نکالتا رہتا تھا۔ اوس کی کتاب ”ہسٹوریا نیچرلیس“ (صحیفہ فطرت) اوس کی علمی مستندی کی سب سے بڑی یادگار ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس کتاب کی سینتیس جلدیں ہیں اور جیسا کہ مصنف مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے اس میں سینس ہزار مسائل پر بحث ہے جن کا ماخذ دو ہزار مختلف المضامین کتابیں ہیں۔ پلاینی کی اس تصنیف کا ترجمہ یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ پلاینی کی موت کا واقعہ عجیب و غریب ہے۔ مسیح ۶ میں جب وہ دولت روم کا امیر البحر تھا ایک دن اوس نے ماہِ سنم سے جہان اوس کا بیڑہ متعین تھا کوہ ویسوئس کی چوٹی سے دھوان اٹھتا دیکھا۔ اس کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے وہ ایک پسوبی پر سوار ہو کر پہاڑ کے قریب چلا گیا۔ اور ساتھ اپنی نوٹ بک بھی لیت گیا تاکہ جو کچھ دیکھے اوس پر درج کرتا جائے۔ قلعہ کوہ کی آتش افشانی کا منظر اور زیادہ قریب سے دیکھنے کی غرض سے وہ کشتی سے اتر کر دامن کوہ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہوئے انگاروں اور اُبلتی ہوئی راکھ کا سینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اوس کے نوکر تو جان بچا کر بھاگ گئے مگر وہ خود وہیں تلف ہو گیا۔ مشہور

کا بھی ترجمہ کیا۔ یہودیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے جندی ساہور میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا۔ اون کے منادوں نے عیسائیت کو منطوری شکل میں اطراف و اکناف ایشیا میں پھیلانے تک پھیلا دیا کہ اس کے پرستش کرنے والوں کی تعداد بالآخر کلیسا کے یونان و کلیسا کے رومن کیتھولک کے یوہرین پرودوں کی مجموعی تعداد سے بھی بڑھ گئی۔ یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ عربین منطوری مسیحیوں کا ایک بھڑائی موجود تھا۔

غرض قسطنطنیہ اور اسکندریہ کی ان مذہبی سرگم آرائیوں نے ایشیا کے مغربی حصہ کو بہت سے فرقوں کی جولانگاہ بنا دیا جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رھتے۔ تھے اور چونکہ دربارِ سامی نے ان میں سے اکثر کو سخت سخت منرائیں دی تھیں اور ان پر طرح طرح کی سختیاں کی تھیں لہذا ان کے دلوں میں شہنشاہ کی طرف سے نفرت اور کینہ کا طوفان ہوتا ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ ایک بہت بڑے مذہبی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا اثر آج کے دن تک سچا محسوس ہوتا ہے۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر تھا کہ تمام دنیا اس کی پیٹ میں آگئی۔ اس مہم بالمشان واقعہ کو عجم طور پر سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اسے دو جدا گانہ اجزائیں تحلیل کر کے ہر ایک پر بار بار ماری سے نظر ڈالی جائے یعنی اول تو ایرانیوں کے ہاتھوں ایشیائی مسیحیت کی ہنگامی و عارضی پایائی اور دوم وہ قطعی اور فیصلہ کن اصلاح جو عربوں کے ذریعہ سے عالم میں آئی۔

اولاً مشرقی دربار اپنے آئے دن کے انقلابات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ اسی طرح کہ ایک انقلاب اسے خسرو دلیعہ تخت ایران کو مارتس قیصر بروم کے دربار میں جا کر پناہ لینے اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور کیا۔ مارتس نے اپنے شاہی جہان کی دلجوئی کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اور ایک لشکر جرار اس کے ہمراہ کر دیا جس کی مدد سے خسرو مالک تخت و تاج ہو گیا۔ لیکن وہ نمایاں فتوحات جو اس لشکر نے ایران میں حق کو حق دار تک پہنچانے کے لیے حاصل کی تھیں خود مارتس کے دولت و اقتبال کی محافظت نہ کر سکیں۔ یعنی رومی فوج میں

خبر بپا ہو گیا۔ اس بغاوت کا سرغنہ ایک شخص فوکا س نامی تھا جو فوج میں سوسپاہیوں کی کمان کے عہدہ پر مامور تھا۔ قیصر کے مجسمے منہدم کر دئے گئے اور قسطنطنیہ کے بطریق نے اس اعلان کے ساتھ کہ فوکا س کے مذہبی عقاید کلیسا کے مقدس کی میزان احتساب میں پورے اترتے ہیں اوس کی تاجپوشی کی رسم اپنے ہاتھ سے ادا کی۔ برگشتہ بخت مار سس ایک خافقہ سے جہان اوس نے پناہ لی تھی کٹان کٹان باہر لایا گیا۔ اوس کو پانچ بیٹے یکے بعد دیگرے اوس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے گئے اور آخر میں اوس کی گردن ماری گئی۔ اوس کی ملکہ کو سینٹ صوفیا کے گرجے سے بلطایت الحیل باہر نکلنے کی ترغیب دی گئی اور جب وہ اس مقام امن سے اپنی تین کم سن بیٹیوں کو لیے ہوئے باہر نکلا تو ان چاروں کو طرح طرح کے عذاب دے کر تہ تیغ کیا گیا۔ شاہی خاندان کے ہوا خواہوں پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے۔ ظالموں نے بعض کی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ بعض کی زبان گدی سے کھینچوا ڈالی۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے۔ بعض کو کوڑے مار مار کر مار ڈالا اور بعض کو زندہ جلا دیا۔

جب یہ خبر روم میں پہنچی تو بطریق گریگوری نے خوشیاں منائیں اور دعا مانگی کہ فوکا س کو خدا اپنے دشمنوں پر غالب آنے کی توفیق بخشے۔ اس ذلیل چالوسی کے سلعین اوسے اسقف اعظم کا لقب دیا گیا۔ اوس کی اور نیز بطریق قسطنطنیہ کی متحدہ مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مار سس کی نسبت یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ ایرانیوں سے راہ و رسم رکھنے کے باعث اوس کا میلان کسی عقاید کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے کلی کو چون میں جب اوسے تشہیر کیا گیا تو عام الناس نے اوس پر پھتیاں اڑائیں اور آوازے کسے اور اوس کو ازراہ استحقاق مجوسی کہہ کر پکارا۔

خسر و کو جب اپنے دوست کے قتل کا حال معلوم ہوا تو دنیا اوس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور غم اور غصہ کا ایک طوفان اوس کے دل میں اُمنڈ آیا۔ فوکا س نے مار سس اور

اوس کے بیٹوں کے سرکسری کے پاس بھیج دئے تھے۔ جب یہ کٹے ہوئے سراوس کے دربار میں پیش ہوئے تو اوس نے لرز کر اپنا منہ پھیر لیا اور اپنے محسن کے قاتلون سراوس کا انتقام لینے کے لیے فوراً دولت روم پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

آفریقہ کے نائب السلطنہ ہرقلس کو بھی جو سلطنت کا رکن اعظم تھا اس دردناک سانحہ کے سننے سے نہایت صدمہ ہوا اور اوس نے دل میں ٹھان لی کہ جو ہو سو ہو قیصران روم کے تخت کو ایک کر یہ النظر اور فرمایہ فوجی افسر کی غاصبانہ دستبرد سے بچایا جائے۔ نوکاس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اوس کا قد چھوٹا اور اوس کی صورت مکروہ تھی۔ اوس کی نالامیم گھنی بھودن اوس کے سُرخ رنگ کے بالوں اور اوس کی نیکی ٹھڈی نے جس پر ڈاڑھی کی علامت تک نہ تھی اوس کے چہرے کے ایک مہیب داغ کے ساتھ مل کر اوس کی شکل کو نہایت ہی گھناؤنا اور ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ وہ جاہل مطلق اور کنہ ناتراش تھا۔ ملک کے قوانین سے بالکل نابلد تھا حتیٰ کہ صحتیاریوں کے استعمال سے بھی واقف نہ تھا۔ اور عیاشی اور شرابخواری اوس کی گھٹی مین پڑی تھی۔ پہلے تو ہرقلس نے اوسے خراج دینے اور اوس کی اطاعت کرنے سے انکار کیا۔ پھر کھلم کھلا علم مخالفت بلند کیا لیکن چونکہ ضعف پیری اور انحطاط قوائے اوسے اس قابل نہ رکھا تھا کہ میدان جنگ کی غیبتوں اور صعوبتوں کی خود تاب لاسکے لہذا یہ خطرناک مہم اوس نے اپنے بیٹے کو کہ اوس کا نام بھی ہرقلس تھا سوینی۔ زبوان ہرقلس ایک جراتور جنگی بیڑا لے کر روانہ ہوا اور موافق ہواؤن کی مدد سے بہت جلد قسطنطنیہ کے سامنے پہنچا۔ زمانہ کی ادا پہچاننے والے پادری۔ ارکان سلطنت اور شہر کے باشندے فتح کا پلہ اوس کی طرف جھکا ہوا دیکھ کر اوس کے شریک ہو گئے۔ آخر غاصب گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

لیکن قسطنطنیہ کا یہ انقلاب فرمانروا سے ایران کی یلغار کا مزاحم نہ ہوا۔ کسریٰ کے مجوسی ہیر بدون نے یونانیوں کی دروغ آمیز اور ظالمانہ اوہام پرستیوں کے خلاف اوس کی

کان اچھی طرح سے بھردئے تھے اور اوس کو جلا دیا تھا کہ یونانیوں کی ایک نہ مننی چاہیے بلکہ جو کچھ کرنا چاہیے اپنی قوتِ میزہ کے بھروسے پر کرنا چاہیے۔ غرض خسرو نے دریائے فرات کو عبور کیا۔ شام کے مسیحی فرقوں نے جو قسطنطنیہ کی طرف سے فار کھائے بیٹھے تھے اوس کی فوج کے رستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ حملہ آور کا غیر مقدم ہر جگہ نہایت تپاک سے کیا گیا۔ جس شہر میں اوس کا گذر ہوا وہاں کے باشندے روم کی اطاعت کا جوا کندھ سے اتار کر اوس کے ساتھ ل گئے۔ اس طرح اٹھاکہ قیصر یہ اور دمشق کے بعد دیگرے نہایت آسانی سے مسخر ہونے ہوئے چلے گئے۔ بیت المقدس کسی قدر مزاحمت کے بعد ایک ہفتہ میں سر ہو گیا۔ ایرانیوں نے مرقدِ مسیح اور قسطنطنین و ہلینا کے گرجاؤں میں آگ لگا دی۔ میلپ عیسوی کو بطور یادگار فتحِ ایران بھیج دیا۔ گرجاؤں کا مال و متاع لوٹ لیا۔ مقدس تبرکات کو جنہیں دستِ اوہام نے بڑے چاؤ سے جمع کیا تھا نسبت و نابود کر دیا۔ پھر مقرر پر حملہ کیا اور اوسے فتح کر کے سلطنتِ ایران کے ساتھ شامل کر لیا۔ اسکندریہ کے بطریق نے بھاگ کر قبرس میں جا پناہ لی۔ ساحلِ افریقہ طرابلس تک ایرانی فوج کے قبضہ میں آ گیا۔ شمال کی جانب ایشیائے کوچک کل کا کل مسخر ہو گیا اور اس سال تک ایرانی فوجیں قسطنطنیہ کے سامنے باسفورس کے ساحل پر ڈیرے ڈالنے پڑی رہیں۔

جب ہرقلس پر سخت ہی آہنی تودا اوس نے بارہ ہجوری صلح کی التجا کی۔ لیکن پھر غور اور متکبر کسر می نے یہ جواب دیا کہ جب تک شہنشاہِ روم اپنے مولوب خدا سے ابا کر کے آفتاب کی پرستش نہ کرے گا میں اوس کی التجا سے صلح قبول نہ کروں گا۔ آخر بعدِ وقتِ سات سو سن ہونا اسی قدر چاندی ایک ہزار خلعت ہاسے فاخرہ ایک ہزار گھوڑی اور ایک ہزار صاحبِ جمال دوشیزہ لڑکیاں سلطنتِ روم کی آزادی کا فائدہ یہ قدر پائیں۔

لیکن ہرقلس کی یہ اطاعت چند روزہ تھی۔ اوس نے کچھ عرصہ کے بعد نہ صرف وہ

ملک جو خسر دے اوس نے پھیننا تھا واپس لے لیا بلکہ ایران پر چڑھائی کر کے وہ جنگی کارنامے یاد دلادے جن کے لحاظ سے دولت روم کا سب سے زیادہ روشن زمانہ یاد گار تاریخ ہوا۔ اگرچہ سلطنت روم کی جنگی عظمت اس طور پر بحال ہو گئی تھی اور اگرچہ اوس نے وہ تمام ملک جو اوس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے لیا تھا لیکن ایک نقصان اوس سے ایسا پہنچا تھا جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یعنی دولت ایمان گئے وقت کی طرح پھر نہ آسکتی تھی۔ جو سیت نے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے مسیحیت کا خاکہ اُٹرایا تھا۔ اور حضرت مسیح کو مزار کو آگ لگا کر۔ گرجاؤں کو لوٹ کر اور مٹا کر۔ بیش بہا تبرکات کو خاک کی طرح ہوا میں اُڑا کر اور صلیب کو ہر طرح کے تسخرو تضحیک کے بعد مال غنیمت میں ملا کر مسیحیت کے مقدس ترین مقامات یعنی بیت اللحم جنین اور کیلوری کی توہین کی تھی۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ شام مصر اور ایشیائے کوچک میں معجزہ دن کی بھبرا مچ گئی۔ کوئی گرجا ایسا نہ تھا جو ایک طول و طویل فہرست آسمانی نشانات کی پیش نہ کر سکتا ہو۔ بات بات پر معجزے اور کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ لیکن اس نازک موقع پر جب آسمانی نشانات کی ایسی سخت ضرورت تھی ایک بھی نشان ظاہر نہ ہوا۔

ارض مشرق کی سیمی آبادی نے جب دیکھا کہ مجوسی حملہ آور دن نے اون کو گرجاؤں کو آگ لگا دی اون کی خانقاہوں کو مسمار کر دیا اون کی پاک یادگاروں کی بے حرمتی کی اور اس پر بھی حملہ آور دن پر عذاب آسمانی نازل نہیں ہوا تو اس بوالعجبی نے اون میں کچھ دیر کے لیے ساکت و صامت کر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کا قبران کفار پر بجلی بن کر گرنے لگا۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ زمین پھٹ جائے گی۔ خدا کی تلوار برق خاطف کی طع اوچ فلک پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی اور ان دین مقدس کی بر حرمتی کرنے والوں کا حشر بھی وہی ہوگا جو سنا چرب کا ہوا تھا۔

لہ ایک سریانی بادشاہ تھا جس کا زمانہ ۳۷۵ء سے ۳۹۵ء قبل مسیح تک ہے۔ اس کی عظیم الشان فتوحات اور عالیشان محلوں کی تعمیر کا ذکر اون خشتی کتابوں کے مخروملی حروف میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک آسمانی نشان بھی اس موقع پر ظاہر نہ ہوئے پایا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ لوگوں کا تعجب مبدل بہ خوف ہو گیا اور خوف کی جگہ بد اعتقاد ہی نے لہی۔
 نمانیا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ایرانی فتوحات کے نتائج مسیحیت کے حق میں سخت خطرناک تھے لیکن ان نتائج کو بھڑکائی اور ہتھم بالشان واقعہ کا محض ایک مقدمہ سمجھنا چاہیے جس کا ذکر اب آتا ہے یعنی مسیحیت کے خلاف جنوبی اقوام کی بغاوت۔
 اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہومالک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے اور ان کا نو دسواں حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا یعنی ایشیا و افریقہ کا اور یورپ جزیرہ مسیحیت کی حلقہ گوبشی سے آزاد ہو گیا۔

۱۱۵۷ء کے موسم گرما میں اونٹون کا ایک قافلہ شہر بصرہ میں پہنچا جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ کاروان مکہ سے آیا تھا اور جنوبی عرب کی گران ہہا پیداوار اپنے ساتھ لایا تھا۔ کاروان سالار کا نام ابوطالب تھا جس کے ہمراہ اس کا ایک دوازدہ سالہ بھتیجا بھی تھا۔ چچا بھتیجے شہر کی نسطوری خانقاہ میں اُتارے گئے جہاں کے مہمان نوازا رہبوں نے اون کی بہت کچھ خاطر و مدارات کی۔

خانقاہ کے راہبوں کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اون کا غور و سال مہسان

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) موجود ہے جو کلدانی و سریانی آثار قدیمہ کی ذیل میں برآمد ہوئی ہیں۔
 سے پایا جاتا ہے کہ اس نے ہنیشیا تھر اور جوڈیا پر چڑھائی کی تھی۔ لیکن خدا کو اس کی سرکشی پسند نہ آئی اور اس پر عذاب آسمانی نازل کیا گیا چنانچہ ملائکہ کے جنو مجتہد نے راقون رات اس کے لشکر جبار کو تباہ کر ڈالا اور وہ بحالت تباہ اپنے پایہ تخت سینوہ کو لوٹ گیا۔ ہر اوٹس یونانی مورخ ملائکہ کے بجائے جوہن کی ایک عظیم الشان فوج کا ذکر کرتا ہے جو مصریوں کے مخالفین برہم کر کے اون کے نیردن کانون اور ڈھالوں کو نکل گئی اور اس طور پر وہ جب ہتھے رہ گئے تو مارے گئے۔ سنا چرب اس لحاظ سے گویا یہودیوں کا ابرہہ ہے۔ مترجم

جس کا نام جلیبی یا تمغہ تھا عربوں کے مقدس مبد کعبہ کے محافظ کا بھتیجا ہے۔ ان میں سے ایک راہب بحیرہ نامی نے کوشش کی کہ جس طرح ہوا اس لڑکے کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے زایل کیا جائے۔ بحیرہ نے دیکھا کہ لڑکا نہایت ہونہار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے۔

تمغہ کے اہل وطن یعنی مکہ کے باشندوں کا سب سے بڑا مہو و ایک کا لڑا پتھر از قسم شہاب ناسب تھا جو تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بت کالے پتھر کے توابع تصور ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں شمسی سال تین سو ساٹھ دن کا محسوب ہوتا تھا لہذا ہر بت سال کے ایک دن سے منسوب تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کلیسا عیسوی کا شیرازہ پادریوں کے حب جاہ اور خباثت نفس کی وجہ سے پر اگندہ ہو رہا تھا۔ اجتہادات کو شان اجماع بخشنے کے بہانے سے اکثر کونسلوں کے اجلاس منعقد ہوتے تھے لیکن اس انعقاد کا اصل مقصد پوشیدہ رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات ان کونسلوں میں جبر۔ ارتشا اور بددیانتی کا سامان نظر آتا تھا۔ مغرب میں بطریق کا عہد دولت و تمول عیش و عشرت اور شکوہ و طمطراق کی ایسی نیت آزما ترغیبات پیش کرتا تھا کہ اس عہد پر کسی پادری کے نامزد ہوتے وقت خوریز ہنگاموں کا واقع ہونا سادہ ہو گیا تھا۔ مشرق میں دربار قسطنطنیہ کے طرز عمل نے کلیسا کو مباحثوں مناقشوں اور مجادلوں کی جولانگاہ بنا رکھا تھا۔ جو بے شمار فرقے ان مذہبی سرکر آرائیوں نے پیدا کر دیئے تھے

لے جناب رسالت آج مختلف القاب سے یاد فرمائے گئے ہیں۔ مخالفین و معاندین نے اگر ازراہ خبت نفس آپ کو ایوب کشہ یا راعی نا آئیر کہا ہے تو موافقین و متقدین نے بقا ضا سے ارادت آمین۔ مصطفیٰ اور تجلی کے لقب سے یاد کیا ہے لیکن کوئی روایت ہند صحیح اس مضمون کی ہمارے علم میں موجود نہیں ہے کہ آپ جلیبی بھی پکارے جاتے ہوں۔ ”جلیب“ اونٹنی کے دودھ یا دودھ و دھوا لے کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں مصنف کو یہ نام کیسے ہاتھ آیا اور اس کی کیا اصلیت ہے۔ مترجم

ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ایرمن۔ سیلیڈن۔ کارپوکرشٹن۔ کالیرٹڈن۔ یوٹیشن۔
 ناسٹک۔ جیکوٹاٹ۔ ماریوناسٹ۔ ماریوناسٹ۔ نسطورین۔ سبیلین۔ ویلنٹائن۔
 بنفد ان کے تیر یوناسٹ فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ تثلیث کے ارکان حسب ذیل ہیں :- باپ خدا
 بیٹا خدا اور مہم عذر خدا۔ فرقہ کالیرٹڈن حضرت مریم کو خدا سمجھ کر پرستش کرتا تھا اور ان
 کی صورت پر عثمائی کا پڑاؤ پڑھاتا تھا۔ فرقہ نسطوری جیسا کہ ہم کو معلوم ہی ہے اس عقیدہ کو
 انکار کرتا تھا کہ خدا کی بھی مان ہو سکتی ہے۔ اس فرقہ کو اس امر پر ناز تھا کہ وہ یونان قدیم کے
 علوم و فنون کا وارث و مالک ہے۔

یہ تمام فرقہ تہذیبی عقاید میں ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن ایک بات قدر مشترک
 کے طور پر ایسی بھی تھی جس پر ان سب کا اتفاق تھا اور جس کے لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے
 حلیف کہلا سکتے تھے اور وہ بات تھی ان کی باہمی نفرت اور عداوت جس نے ہر فرقہ کو دوسرے
 فرقہ کا دشمن بنانے کا باعث بنی۔ عرب جس کو اپنی حریت اور خود مختاری پر ناز تھا جس کو کسی کی
 کشمکشانی سحر نہ کر سکتی تھی اور جس کی وسیع سرزمین بحر ہند سے لے کر ریگستان شام تک پھیلی
 ہوئی تھی آڑے دست میں ان میں سے ہر ایک کا لطبا وادائی بنا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔
 قدیم سے یہی ہونا چلا آیا تھا۔ جب کوئی قوم مغلوب ہوئی اور فریق غالب نے اس کا قافیہ
 تنگ کر دیا تو اس نے بھاگ کر عرب ہی میں پناہ لی۔ چنانچہ جب رومیوں نے فلسطین کو
 فتح کیا تو یہودیوں کی ایک تعداد کثیر یہیں آکر پناہ گزین ہوئی۔ سینٹ پال اہل کلیسیا سے
 مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ بے مشرب بہ اضطباغ ہو کر میں نے اپنے آپ کو برطرف سے مخالفین
 کے زمرہ میں گھرا ہوا پایا تو فوراً عرب چلا آیا۔ غرض عرب کی دادیوں اور صحراؤں میں عیسائی
 راہبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آنے لگے۔ مٹی تباہی کو ششون نے عرب کو سربر آوردہ
 قبایل میں سے اکثر کو دایرہ مسیحیت میں داخل کر لیا۔ جابجا گرجے بھی بن گئے۔ اور عرب کا
 جنوبی صوبہ تین حبش کے نسطوری العقاید سی فرماؤں کے قبضہ میں آگیا۔

تجیرہ راہب نے بصرہ کی خانقاہ میں حضرت محمد کو سطوری عقاید کی تعلیم دی اور اپنے
مظالم کی داستان شریع سے آخر تک حزن و غم کہہ سنائی۔ یہ انہیں ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ
آنحضرت صلعم کے دل میں کیسا شہسوار کی بت پرستانہ رسموں کی طرف سے عموماً اور اوثان
و اصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی جس کو کئی قوت مٹا نہ سکی۔ اور تجیرہ
راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب و غریب زندگی کے دوران میں جس کے
کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ مسیح
ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا۔ آپ کے ماتر بیت یافتہ لیکن مستند و اخاذ و دماغ نے
نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور یہ وہ اتالیق
تھے جنہیں آرسطو کے جانشین اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر
ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ
نسطوریوں کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا چنانچہ اس ارادت و محبت کا
جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت
اس انس و عقیدت کا کیا ہو گا کہ آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقاید کی توسیع
و اشاعت کے لیے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے
اون کے علمی و مشائی اصول اختیار کر لیے اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

۱۰۷ عیسائی مصنفین جو نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اون تعلقات کی ماہیت کو نہیں جان سکتے جو
خدا اور اوس کے برگزیدہ مرسلین کے درمیان وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے ہیں عام طور سے جب ہمارے
رسول مقبول کا ذکر آتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ وہ لکھے پڑھے تھے یا انہوں نے
تورات و انجیل کا اسمان نظر مطالعہ کیا تھا یا عیسائی راہبوں سے انہوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی تعلیم کا
یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے دنیا کے سامنے وہ مہتم بالشان اور زندہ جاوید تحریک پیش کی جس کا نام اسلام
ہے۔ یورپین مصنفین کی ایک خصوصیت یہی ہے کہ ان کو اگر ایک چھوٹا سا (بقیہ مندرجہ بر صفحہ آئین)

جب حضرت محمدؐ سن رشد کو پہنچے تو آپؐ نے ارض شام کے اور بھی سفر کیے۔ یہ خیال کرنا بید از قیاس نہ ہو گا کہ ان موقعوں پر آپؐ کی مسطورہ مخالفتاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز (بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) واقعہ مل جائے تو اس سے سینکڑوں تیاج اپنے مفید طلب بلا تامل نکالتے ہوئے چلے جاتے ہیں خواہ وہ تیاج مقدمہ کے صغریٰ و کبریٰ سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ سوئی کا پھاڑا اور رائی کا پر بت بنا دینا ان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ پسل کے دم سے خاکے پر ایسی ایسی رنگ آمیزیاں کرتے ہیں کہ دیکھنے والا جو سطح سے نیچے جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا بے اختیار فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر مصنف کتاب ہذا بھی باوجودیکہ اسلام اور بانی اسلام کا ذکرہ قولیت سے کرتے ہیں اور ان کی تحریر سے اس تعصب کی بو نہیں آتی جو یادیون کی تحریر دن کا خاصہ ہے اس لغزش سے نہیں بچ سکے۔ نقطہ ایک اتنے سے واقعہ سے کہ رسول اللہؐ گیارہ بارہ برس کی عمر میں شام گئے تھے اور تجرہ راہب سے ملے تھے اور یہ وہ متفق علیہ واقعہ ہے جو بسند ابن اسحق و ابن ہشام ہم تک پہنچا ہے ڈاکٹر ڈریپر نے نتیجہ نکال لیا کہ تجرہ نے آپؐ کو مسطورہ عقاید کی تلقین کی اور آپؐ نے اس تلقین سے متاثر ہو کر مسطوریت کو بالآخر بنام اسلام دنیا میں شائع کیا۔ تجرہ کے علاوہ اور جس شخص کا اثر رسول اللہؐ پر بقول ڈریپر پڑا تو قرہ ابن نوفل مترجم انجیل تھا جس سے ان حضرتؐ کو مذہبی امور پر گفتگو کرنے کا بار ہا اتفاق ہوا۔

اسلامی تاریخوں اور روایتوں سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ بعثت سے قبل آنحضرتؐ کی رسم و راہ یہودیوں اور عیسائیوں سے رہی ہو اور آپؐ نے ان کے مذہبی پیشواؤں سے مذہبی تعلیم حاصل کی ہو اور ایسی حالت میں جبکہ اسلام اور اس کے مقدس و محترم بانی کے متعلق مغربی مصنفین کی کل معلومات کا انظار اسلامی تاریخیں اور روایات ہی ہوں اس قسم کے نتیجہ پر پہنچ جانا جس پر کہ ڈاکٹر ڈریپر پہنچے ہیں ان کی قوت تنقید کی شگرت آخری پر ایک گواہ مادل ہے۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ایک گیارہ برس کا عرب کا لڑکا (کیونکہ رسول اللہؐ جب اپنے چچا کے ساتھ شام کو تشریف لے گئے ہیں تو آپؐ کی یہی عمر تھی) جو بت پرستی و جاہلیت کے حوالی سے گمراہ ہو اتنا ہم تشنگ کی اوس عجیب و غریب بحث کو سمجھنے کی قابلیت رکھ سکتا ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئینہ)

لمیکنون سے جنہیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا ضرور ملے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک شام کی آپ کے دل میں بڑی وقعت تھی۔ مکہ کی ایک دولتمند بیوہ جن کا نام خدیجہ تھا اپنی شامی

(بقیہ مضمون بر صغیر آئندہ) جسے مسیحیت کا چھ صدیوں کا فلسفہ بھی سلجھا نہ سکا تھا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ

اس لڑکے نے اسی پراسرار بھول بھلیان میں سے توحید کی وہ سیدھی اور سچی راہ کیوں کر ڈھونڈ نکالی جو فلسفہ

و مذہب دونوں کی نگاہ سے اب تک پوشیدہ تھی۔ منطوریٹ باوجود اس میلان کے جو اسے توحید کی جانب

تھا پھر بھی شرک کے دائرہ کا مرکز تھی۔ مانا کہ وہ مسیح کے جسمانی حصہ ہی کو بطن مریم سے نسبت دیتی تھی لیکن

مسیح کے ربانی حصہ سے تو اس کو انکار نہ تھا۔ یہ الفاظ دیگر وہ اس بات کی توفیق تھی کہ خدا انسان کا روپ

ایک طرح سے دھار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت کے دوسرے عقاید مثلاً کفارہ جو اصل اصولی نجات

ہونے کے اعتبار سے مذہب عیسوی کا سنگ بنیاد ہے منطوریٹ میں بالکسی ترمیم کے داخل تھے۔ ورقہ کا اثر

اگر رسول اللہ پر پڑا تو وہ بھی گویا زیادہ سے زیادہ ایک منطوری المذہب عیسائی کا اثر تھا۔ یہودیوں سے

توحید کا خیال اگر رسول اللہ مستعار لیتے تو اس میں بھی تجسیمیت کے مادی عناصر شامل تھے۔ پھر وہ کون سی

قوت تھی جس نے مکہ کے اس تیم دیس اور امی بچے کے قلب میں ابتدا ہی سے ادنیٰ عقاید کو جمع کرنا شروع کر دیا

جن کی روشنی میں اسے تمام ادیان و مذاہب موجودہ کی اچھائیاں اور برائیاں نظر آنے لگیں اور جب

ارتقا کے اس ہمہ گیر عمل نے جس سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اس کے قوائے ذہنی کو ترقی و ترقی و ترقی

اور تجربہ کی مدد سے منتہائے کمال پر پہنچا دیا یعنی بعثت کی باعث قریب آئی تو اس نے اچھائیوں کو چن لیا

اور انہیں ایک دلاویز دلدل آرائش میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اس زبردست اور فوق العادت تائید کی بدولت جو ہمیشہ اس کے شامل حال

رہتی ہے درجہ معرفت و یردان شناسی پر خود بخود پہنچ جاتا ہے اور اس کی مثال بعینہ حضرت ابراہیم کی سی

مثال ہوتی جو جی نسبت قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جب اونہوں نے بتارے کو چمکتا ہوا دیکھا تو اون کی

قوت مدرکہ نے جو ایل بہ ایمان تھی اون کو یہ بھایا کہ ہونہ ہو یہی اون کا معبود ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو اون کو

معایہ خیال پیدا ہوا کہ فنا ہو جانی والی چیز معبود و خالق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح (بقیہ مضمون بر صغیر آئندہ)

تجارت کا کل کاروبار آپ کے سپرد کر چکی تھیں۔ آپ کی قابلیت اور ایماندارمی نے جناب خدیجہؓ کو آپ کا گرویدہ بنا دیا اور چونکہ مبادیہ فیاض سے حسن کامل اور خلق عظیم آپ کے حصہ میں آیا تھا لہذا وہ آپ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئیں۔ عورتوں کا دل ہر ملک اور ہر زمانہ میں اسی قسم کے جذبات کی جولانگہ بنا رہا ہے۔ غرض جناب خدیجہؓ نے ایک کنیز کے ذریعہ سے اپنے دل کا حال آپ پر ظاہر کیا اور دونوں کا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد چوبیس سال تک جناب خدیجہؓ زندہ رہیں۔ اس مدت دراز میں آن حضرتؐ نے اپنے آپ کو اون کا وفادار شوہر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) درجہ بدرجہ اون کو چاند اور سورج نظر آئے اور انہوں نے ان اجرام مادی کو قرص کی غفلت و تجلی کو دیکھ کر پہلے کی طرح انہیں کو اپنا خدا سمجھا مگر جب یہ بھی غیب ہو گئے تو انہوں نے ان سے یہ کہہ کر ابا کیا کہ میں آفلین سے محبت نہیں رکھتا۔ استدلال و استنباط کے انی روحانی زینہ کے ذریعہ سے وہ اس خالق ذوالجلال کے بام معرفت پر جا پہنچے جو آسمان و زمین و نبات و ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ بھی تائید ایزدی سے خود بخود معراج عرفان پر پہنچے۔ اس منزل کے طے کرنے میں نہ اون کو تجربہ نہ مدد دی نہ قدرت نے نہ زید بن عمر کی راست رومی نے ہدایت کی نہ اسمیہ ثقیفی کی دین حنیف نے خدا خود اون کا رہبر تھا اور تائید ایزدی خود اون کی پیشہ اتھی۔ بت پرستی سے اون کو نفرت دلائی تو خدا نے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت پاک ظاہر کر رہی ہے و وجدك ضالک فہدی اور شرک و رجس سے اون کے دل میں کراہت پیدا ہوئی تو خدا کی تحریک سے الم نشرح لك صدارك و وصعنا عنك و ذرناك الذی الفرض ظہر لك۔ رسول اللہؐ اگر قبولِ وریہ پر سطوریت کو اصول ہی کی تلقین کرتے تو آج دنیا میں اقا نیم ثلث کا ایک دوسری صورت میں راج ہوتا۔ وہ خالص توحید جو اسلام کا خاصہ ہے مفقود ہوتی۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پروفیسر فھسن نے اپنی ایک قابل قدر تصنیف میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے: "بہت کم انہیں کرول اللہ کے معاصرین میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو بت پرستی سے کارہ تھے۔ انہیں کھاتے تھے اور مکن ہے کہ ان کا اثر رسول اللہؐ پر پڑا ہو لیکن اون میں (بقیہ مضمون برمنی آئندہ)

نابت کیا اور ایک ایسے ملک میں جہاں کثرت ازدواج کی رسم عام تھی آپ کبھی دل میں یہ خیال تک نہ لائے کہ دوسرا نکاح کر کے جناب خدیجہ کی توہین و دل آزاری کا موجب بنیں۔ کئی سال کے بعد جب آپ کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک دفعہ جناب عائشہ صدیقہ زوجہ حسن و جمال کے لحاظ سے عرب بھر میں مشہور تھیں آپ سے جناب خدیجہ الکبریٰ کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ”کیا وہ بڑھیا نہ تھی؟ کیا مجھے آپ کے حوالہ عقد میں لاکر خدائے آپ کو اوس سے ابھی بی بی عطا نہیں فرمائی؟“ آن حضرت یہ سن کر بے قرار ہو گئے اور اوس لہجہ میں جس سے بڑے امتنان آتی تھی یہ جواب دیا: ”واللہ کہ خدیجہ سے بہتر بی بی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب اور لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائی۔ جب میں کوڑی کوڑی کو محتاج تھا اور دنیا میرے درپے آزار تھی تو اوس نے مجھے نہال کر دیا۔“

جناب خدیجہ سے عقد کرنے کی بدولت آپ مساش کی طرف سے فاسخ البال ہو گئے اور اب آپ کو اوس مذہبی غور و فکر کا پورا موقعہ ہاتھ آیا جس سے آپ کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ جناب خدیجہ کے چچا زاد بھائی ذرقہ نے جو یہودی تھا اس زمانہ میں دین عیسوی اختیار کر لیا تھا۔ اور عیسائی ہونے کے بعد پہلا کام جو اوس نے کیا وہ یہ تھا کہ بائبل کا ترجمہ عربی میں کر ڈالا۔ آنحضرتؐ کو مذہبی امور پر ذرقہ سے گفتگو کرنے کا بار ہا اتفاق ہوا اور ان مکالمات نے اوس نفرت کو جو آپ کے دل میں بت پرستی کی طرف سے جاگزیں تھی اور زیادہ راسخ کر دیا۔

جس طرح تارک الدنیا سچی راہوں سے صحراؤں میں آبادی سے دور باغیچہ بنیٹے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور محمدؐ میں یہ فرق تھا کہ ان کو تو اپنی ہی نجات کی پڑی تھی اور انہوں نے

ذاتی اغراض کی حدود سے تجاوز ہو کر تمام دنیا کی منتقل جان میں نور ایمان کی چراغی ڈال دی ہے

گفت آن کلیم خویش بر دن آورد و سوج

دین جہمی کند کہ بر آرد و غریب را

مترجم

ڈال رکھے تھے جن میں وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اسی طرح آنحضرتؐ نے کوہ حرا کی ایک غار میں جو کہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا عزلت گزین ہو کر خدا کی عبادت کرنی شروع کی اور آپ کا وقت مراقبہ و اشراق میں کٹنے لگا۔ اس عالم تنہائی میں آپؐ نے خدا سے قوم و ذوالجلال کی صفات جلالی پر غور و خوض کرتے کرتے ایشیائی مسیحیت کے عقاید پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اقا نیم ثلثہ کے عقدہ کو جب سلجھانا چاہا تو یہ شکل پیش آئی کہ ایک طرف تو حضرت مسیحؑ کو نسبت ابوت قادری مطلق سے وابستہ کیے ہوئے ہیں دوسری طرف حضرت مریمؑ ہیں کہ ایک ہی وقت میں شان و دشیزگی بھی لیے ہوئے ہیں۔ گو دیکھی بھری ہوئی ہے اور آسمان کی ٹمکے بھی ہیں۔ ان مشکلات نے آپؐ کے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس قسم کے عقاید اختیار کرے اور پھر بھی گناہ میں مبتلا نہ ہو یا کفر و شرک کے خطرات میں گرفتار نہ ہو۔

غار حرا میں مدتوں محو غور و فکر رہنے کے بعد حضرت محمدؐ اس نتیجہ پر پہنچے کہ متضاد و متباہین عقاید کے بدلون کا جو گھٹا ٹوپ ہر طرف چھایا ہوا ہے اس میں ایک بڑی حقیقت یعنی توحید باری کی روشنی نظر آسکتی ہے۔ چنانچہ ایک کھجور کے درخت کے تنے سے پیچھ کو

لے آئے مصنف کو حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی۔ یا تو اس پر اصرار تھا کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ حاصل کیا تجرہ سے حاصل کیا اور اپنی طرف سے جو کچھ کیا یہ کیا کہ منطوریت کی اشاعت کر دی اور یا اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ رسول اللہؐ مدتوں محو غور و فکر رہ کر توحید باری کے نکتہ پر پہنچے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تجرہ بت پرستی کا اثر رسول اللہؐ کے دل سے مٹا چکا تھا اور منطوریت کے تمام اسرار ادنیٰ سمجھا چکا تھا تو پھر ادنیٰ غار حرا میں مدتوں محو غور و فکر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگے چل کر مصنف نے اپنے اس خیال کی کہ رسول اللہؐ اسلام کی اشاعت کے لحاظ سے منطوریت کے شرمندہ احسان تھے صاف الفاظ میں یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ ”لہذا اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپؐ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے منطوری اساتذہ نے آپ کو سکھائی تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل ادن کی تائید نہ کر سکتی تھی۔“ مترجم

لپکا دے کر آپ نے اپنے خویش و اقارب کے سامنے اس بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کر سہے ہوئے علیٰ رحمہ اللہ! شاہد فرمایا کہ آپ اس حقیقت کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی کو وقف فرمادیں اپنے مخلصوں میں اور نیز قرآن میں بار بار آپ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے: ”میں تو محض ایک مسند ہوں..... اور خدا کی وحدانیت کی تلقین کرتا ہوں“ آپ کی نبوت کے متعلق خود آپ کا خیال یہی تھا۔ چنانچہ اس دن سے اپنی وفات کے وقت تک آپ اپنی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنے رہے جس کے نگینہ پر یہ الفاظ کندہ تھے: ”محمد الرسول اللہ“

اطباء اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو شخص صائم الدہر ہوتا ہے اور عرصہ تک دامغی پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا رہتا ہے اسے التباس حواس کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے یعنی وہ چیزیں محسوس ہونے لگتی ہیں جنکی خارجی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ نفس کشش راستہ باز اور مستقیم العزم اشخاص نے جن مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے ادن میں سے شاید ایک بھی مذہب ایسا نہ ہوگا جس میں فوق العادہ آزمائشات و امتحانات اور فوق القدرت احکام و اوامر کی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ پراسرار آدازین عربی پیغمبر کو سنائی دیتی تھیں جس میں آپ کو استقامت کی ہدایت ہوتی تھی اور عجیب و غریب صورتوں کی پرچھائیاں آپ کے سامنے سے گذرتی ہوئی

لے تو اسے کبوتر بام حرم جہمی دانی طہیدن رگ مرغان رشتہ بر پارا
کیا اطباء کو یقین دلا سکتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ ہی پاک نفس اور پاک شریعت انسانوں کو جو حقیقتیں نظر آتی ہیں ادن کا وجود ذہن میں بھی نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت اشیا کا راز ادن کی خارجی اصلیت ہی میں مرکوز ہے؟ روحانی کوششوں کو اطباء چاہے التباس حواس سے تعبیر کریں چاہے اختلال دماغ کہیں ادن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ادس التباس حواس پر جس کا نتیجہ قرآن کا سامعہ التزام کلام اور اسلام کی سلی خلاق آموز حقیقت اتما فائد رساں اور ہمہ گیر تحریک ہو ہزار شاہی و اشراقی فلسفے قربان ہیں۔ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں لاکھ لاکھوں شخص ایسے گذری ہیں جنہوں نے روزے بھی رکھے ہیں ریاضتیں بھی کیں ہیں دامغی پریشانیوں اور فکروں میں بھی مبتلا ہوئے ہیں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی میں کوئی نشان نہ پیدا ہو سکی۔ مترجم

معلوم ہوتی تھیں دور سے گھنٹی کے بجنے کی سی آواز ہوا کو حیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں پڑتی تھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت عالم خواب میں جبریل امین آپ کو کلمہ سے بیت المقدس لے گئے اور وہاں سے دونوں نے آسمان کا رخ کیا۔ چھ آسمانوں کی سیر میں تو جبریلؑ نے آپ کی مشاہدت کی لیکن ساتویں آسمان کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے ادن کے بھی پر چلے۔ اس لیے آپ تنہا اس حبیبِ مادل میں داخل ہوئے جس کا نقاب ہمیشہ قادرِ مطلق کے چہرے پر پڑا رہتا ہے۔ اور جب باری تعالیٰ کے سر دہاتھ کا لمس آپ کو اپنے شانہ پر محسوس ہوا تو آپ کا دل دہل گیا۔

ادل اول آپ کے مواعظ و نصائح کی لوگوں نے بہت مخالفت کی اور آپ کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بت پرستوں نے آپ کو کلمہ سے نکال دیا اور آپ کو مدینہ میں جہان بہت سے یہودی اور نصطوری موجود تھے پناہ یعنی پڑی۔ نصطوریوں نے فوراً آپ کا مذہب قبول کر لیا جس سے فی الجملہ آپ کو تقویت ہو گئی۔ کفار کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر آپ نے اپنی صاحبزادی اور بعض صحابہ کو پہلے سے حبش بھیج دیا تھا جہاں کافر ناز و نصطوری المذہب عیسائی تھا۔ چھ سال کی مدت میں صرف پندرہ سو آدمی آپ کے مذہب میں داخل ہوئے۔ لیکن تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں بدر احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے۔ چنانچہ اس خیال کو آپ نے

لے معلوم نہیں یہ نعرہ اور مہل فقرہ کہاں سے ڈریہ کو ہاتھ لگ گیا۔ سراج کے تعلق رویت کے امکان پر قرآن نے نقابِ قوسین اور ادنیٰ کا پردہ ڈال رکھا ہے لیکن آپ تجسیمیت کے درجہ مافیل میں پہنچ کر انسان کی قوتِ لامرہ کو خدا کے احساس کا شرعِ عطا کرتے ہوئے مائل نہیں فرماتے۔ غالباً اسی بنا پر آپ نے اگرچہ اسلام تجسیمیت کا الزام لگایا ہے۔ مگر

انفوس ہے کہ معتقد نے اسلام کے اصول سے ناواقف اور اون واقعات سے بے خبر ہونے کے باعث جو فزوات نبوی کے محرک ہوئے یہ تحکمانہ اصول قائم کر دیا کہ (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

اور فصیح الفاظ میں جو مشرق سے آپ کو میراث میں ملے تھے اس طرح ظاہر کیا ہے۔ بڑی جنت تلوار دن کے سایہ کے نیچے ہے۔“ غزوات کے ایک کامیاب سلسلہ نے آپ کے دشمنوں کا استیصال کلی کر دیا۔ عرب کی بت پرستی نیست و نابود ہو گئی۔ اصول لا الہ الا اللہ کو جس کا آپ نے اعلا فرمایا تھا آپ کے ابناء و ملن نے یک زبان ہو کر تسلیم کر لیا اور آپ کی نبوت پر بھی ایمان لے آئے۔

آذاب ہم آپ کی طوفان انگیز زندگی کے بہم بالشان کارناموں سے قطع نظر کریں اور سنیں کہ جب آپ کے دولت و اقبال کا آفتاب بعد آب و تاب چلک رہا تھا اور آپ کی حیات مستعار کا آخری وقت قریب آچلا تھا تو آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور آپ نے اس وقت کیا کیا خیالات ظاہر کیے۔

عقیدہ وحدت باری تعالیٰ کے اسٹ نقش کو اپنی لوح ایتقان پر مرسم کیے ہوئے آپ اوس حج کے قصد سے جس کے بعد پھر کوئی حج آپ نے نہیں کیا مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ ایک لاکھ چودہ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آپ کے پیچھے پیچھے تھا۔ اونٹن، بکریاں، اونٹن کے بارون سے آراستہ و مزین تھے۔ لہرتے ہوئے پرچموں سے اس پر شکوہ کاروان کی سچ و دھج دد بالا ہو رہی تھی۔ اس شان و شوکت کے ساتھ جب آپ مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ نے یہ دعا کی: ”اے نبی تیری عبادت کے لیے یہاں موجود ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تجھی کو عبادت سزا دار ہے۔ تو ہی مالک الملک ہے۔ کونین کی سلطنت میں تیرا کوئی شریک

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اسلام کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے۔ اگر مصنف کی حین حیات میں پروفیسر آرمسٹریک کی کتاب ”اشاعت اسلام“ ہی شایع ہو گئی ہوتی تو شاید یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے قائل ہوتا۔ اسلام تو اپنے سلسلہ حقوق کی حفاظت ہی میں تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے مگر وہ مذہب مذاہب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں جن اصول تو یہ ہے کہ مارنے سے ماراجا نا بہتر ہے مگر مل یہ ہو کہ جکڑ کو کسی پامال کر کے مسلمہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ مترجم

دسہیم نہیں۔

آپ نے اپنے ہاتھ سے اونٹوں کی قربانی کی۔ اس قدیم رسم کی نسبت آپ کا یہ خیال تھا کہ نماز اور قربانی مساوی الفضائل ہیں۔ جو دلیل ایک کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے اسی سے دوسری کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔

کعبہ کے ممبر پر چڑھ کر آپ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! میں بھی تمہاری طرح محض ایک انسان ہوں۔ جب یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے تو سننے والوں کو معاً وہ واقعہ یاد آگیا جب ایک شخص ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب آیا تھا اور آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ مجھے اس قدر کیون سے جاتے ہو میں کچھ بادشاہ تو ہوں نہیں۔ ایک غریب عرب عورت کا بیٹا ہوں جو اونٹ کا گوشت دھوپ میں سکھا کر کھایا کرتی تھی۔

مج کر کے آپ نے مدینہ کو مراجعت کی۔ آپ کی زندگی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ وقت آگیا کہ آپ دنیا سے رحلت کریں۔ آخری تقریر جو آپ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے کی اس کے الفاظ یہ تھے: ”ہر شے خدا کی مرضی کے تابع ہے۔ اور اس کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے جس میں نہ تقدیم کو دخل ہے نہ تاخیر کو۔ جس نے مجھے دنیا میں بھیجا تھا میں اس کی طرف مراجعت کرتا ہوں اور تم کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ بھائی بھائی ہو کر رہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ کرو۔ وقت پر ایک دوسرے کے کام آؤ۔ اور ایک دوسرے کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور نیک عمل کرنے کی ہدایت کرو۔ میں جب تک زندہ رہا تمہاری بھلائی کی تدبیریں کرتا رہا اب مرتے وقت بھی اگر مجھے کوئی خیال ہو تو تم لوگوں کی پہنچو دی کا۔“

یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر قرآن مجید کی اس آیت پر پڑ گئی ہوگی ”فصل لربک وانحر“ لیکن نماز اور قربانی کو مساوی الفضائل قرار دینا اور اس مساوی فضیلت کے خیال کو جناب رسالت آپ سے منسوب کرنا مصنف کی کئی معلومات پر مبنی ہے۔ مترجم

حالت نزع میں آپ کا سر حضرت عائشہؓ کے زانو پر تھا۔ فرط کرب سے آپ رہ رہ کر اپنا ہاتھ پانی کے طشت میں جو پاس رکھا ہوا تھا ڈالتے تھے اور اپنا چہرہ تر کرتے تھے۔ آخر اس کی بھی طاقت نہ رہی۔ آپ کی نگاہیں عرش برین کی طرف اٹھ گئیں اور ٹوٹے ہوئے لہجہ میں یہ آخری الفاظ آپ کے منہ سے نکلے: ”الہی.... میری گناہ معاف کر.... آمین.... میں آیا“

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا نام تعظیم و تکریم کے ساتھ نہ لیا جائے؟ یہ شخص وہ ہے جس کے اصول آج کے دن بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصہ کے رہنما پیشوا ہیں۔

حضرت محمد اپنے ملک کے قدیم بت پرستانہ عقاید سے تو پہلے ہی ابا کرچکے تھے۔ اون اصول کے تسلیم کرنے سے بھی آپ نے انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے نسٹوری اساتذہ نے آپ کو سکھائے تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل اون کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کے ابتدائی صفحوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اون صحابفت آسمانی کو جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئے منجانب اللہ سمجھا اور ان دونوں انبیائے کرام کو بھی آپ نے واجب التعظیم خیال کیا لیکن باری تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم و تکریم کا جلوہ خصوصیت کے ساتھ قرآن کی ہر سورت میں نظر آتا ہے۔ الوہیت مسیح کا مسئلہ آپ کو نہایت ہی قبیح و مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا کی مان کی حیثیت سے حضرت مریم کی پرستش کو اور عام طور سے سورتوں اور تصویروں کی عبادت کو آپ ایک دلیل درجہ کی بت پرستی تصور کرتے ہیں۔ آپ تثلیث کے قطعی منکر ہیں جس کی نسبت آپ کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کی بجز اس کے اور کوئی تاویل ممکن نہیں کہ تین خدا علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔

آپ کا مقصد خاص صرف اسی قدر تھا کہ مذہب کی اصلاح کی جائے اور جو خرابیاں اوس میں پیدا ہو گئی ہیں اونہیں دور کیا جائے یعنی عربوں کی بت پرستی کو مٹا کر اوس وحشیانہ فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا جائے جس نے عیسائیت کو فساد کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ خیال کہ آپ ایک نیا مذہب قائم کرنا چاہتے تھے ایک بہتان تھا جو آپ پر قسطنطنیہ میں باندھا گیا جہاں آپ

ویسے ہی برے سمجھے جاتے تھے جیسا کہ صدیوں کے بعد تو تھرردامین سمجھا گیا۔

لیکن اگرچہ آپ نے فرط حقارت سے ادنیٰ تمام باتوں کو رد کر دیا جن سے مسئلہ وحدت باری تعالیٰ کی کچھ بھی نفی ہوتی تھی پھر بھی تجسسی تصورات کی قید سے آپ اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ قرآن کا خدا بالکل انسان کے مشابہ ہے بلکہ اگر موزونی الفاظ اجازت دے تو کہا جاسکتا ہے کہ جسمانی اور دماغی ہر ایک اعتبار سے یہ خدا مثیل انسان ہے۔ لیکن مسلمان بہت جلد ان ادنیٰ درجہ کے خیالات کی پستی سے نکل کر ادنیٰ رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و ادراک کی لطافتیں اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

لے اسلام پر چند سو قیانا اعتراضات عیسائی پادریوں کے تعصب سے یورپین مصنفین کو ترک زمین پہنچے ہیں اور میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور انسانی حیثیت سے کیا گیا ہے اور قرآن کا خدا اگر بائبل و یوپیکر انسان ہے جس میں تمام عادات و خصایل وہی پائے جاتے ہیں جو عام طور سے بنی نوع انسان میں پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ڈریپر جیسا نکتہ رس شخص بھی جو وسیع النظر ہونے کے علاوہ اسلامی تعلیم کو رد و اداری اور رسالت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اس اعتراض کو صحیح سمجھتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی بے مثل کتاب الکلام حصہ دوم میں اس مضمون پر ایک لطیف بحث لکھی ہے جس کی یہ عبارت ہمیں نہیں بھولتی :-

”دنیا اس عالمگیر تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دھندل اسلام نے اگر تمام غلط خیالات اور مستعدات کا پردہ چاک کر دیا۔ اس نے بتایا کہ خدا واحد محض ہے اور زمان و مکان جہت و اشارہ تحت و فوق ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے سبرا ہے۔ یہ وہ تقدیس و تنزیہ تھی جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی اور گنہگار بنے کہا کہ جب زمان و مکان و جہت و اشارہ تمام خصوصیتوں کو الگ کر لیا جائے تو خیال کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی تقدیس کی بنا پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی کا استیصال کر دیا کیونکہ اسلام نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا وہ ایسا تھا کہ خدا کا تصور جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر دلوں میں نہ آسکے۔ ہندو۔ مصری۔ عبتائی۔ رومن کیتھولک سب خدا کے تصور کے لیے جسمانی تمثیل کے محتاج تھے اور (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

اسلام کی ابتدائی صورت کا جو خاکہ یہاں کھینچا گیا ہے اس پر بڑے بڑے قابل اور
نکتہ سنخ اہل آراء کا صاف ہے۔ سر ولیم جونس نے یہ اتباع لاک یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام
(بقیہ مضمون منقطع شدہ) اسی وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے لیکن اسلام میں باوجود سینکڑوں ہزاروں
فرتون کے پیدا ہو جانے کے بھی کسی فرقہ کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آ سکا۔

اگر ڈاکٹر ڈیرپر نے قرآن کی آیات کو بصیرت کی نظر سے دیکھا ہوتا تو جو اعتراض اوہوں نے کیا ہے
کبھی نہ کرتے۔ ہم مثال کے طور پر کلام مجید سے مرت چند مقامات کا استعفا کرتے ہیں:-

(۱) اللہ لا الہ الا هو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ ولا نوم لما فی السموت
وما فی الارض من الذی یشفع عنده الا باذنه یعلم ما بین
ایدیہم وما خلفہم ولا یحیطون بشی من علم الا بما شاء وسع
کرسیہ السموت والارض ولا یؤدہ حفتہما وهو العلی العظیم
(۲) هو اللہ الذی لا الہ الا هو الملک القدوس السلام المؤمن
المہیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔ هو اللہ
الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنی یسبح له ما فی السموت
والارض وهو العزیز الحکیم۔

(۳) اللہ نور السموت والارض مثل نورہ کشفواۃ فیہا مصباح
المصباح فی زجاجہ الزجاجۃ کانہا کوب وری یوقد من شجرۃ
مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیتہ ولا غربیتہ یکاد نریتہا
یضی دلوم تمسہ نار نور علی نور یهدی اللہ لنورہ من یشاء
ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شی علیہ۔

(۴) لیس کثلہ شی وهو السميع العليم۔

(۵) قل هو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد (بقیہ مضمون بر منقطع آئندہ)

اور عیسائیت کا سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مسلمان مسیح کو نہ تو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور نہ بیٹے کو الوہیت کی حیثیت سے باپ کا ہم درجہ مانتے ہیں۔ بلکہ خدا کی وحدانیت اور صفات کے متعلق ایسے ایسے خیالات رکھتے ہیں جن سے انسان کے قلب پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ "اٹلی میں اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے۔ ڈینیٹ کا خیال تھا کہ اسلام عیسائیت کی محض کی ایک نئی شاخ ہے اور مسلمانوں کو آئرس کے پیر دون کا ایک فرقہ سمجھنا چاہیے۔ انگلستان میں دھیملی اسلام کو عیسائیت کی ایک مسخ شدہ شکل سمجھتا ہے۔ لیکن ہماری ذاتی مبالغے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) ولہ یکن لہ کفوا احد۔

اس قسم کے بیسوں جو اہریریزے جن سے یہ گنج شایگان جگہ گارہا ہے تشنگ و الحاد کی نگاہ کو خیرہ کرنے کے لیے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص جو ذرا بھی انصاف پسند ہے دعویٰ کر سکتا ہے کہ خدا کا وہ تصور جو ان آیات سے ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے شان تجسیم لیے ہوئے ہے۔ یا اون صفات میں سے جو ان آیات میں گنائی گئی ہیں کوئی صفت ایسی ہے جو مطلقاً انسان میں پائی جاتی ہو۔

ڈاکٹر ڈیریر فرماتے ہیں کہ مسلمان ان ادنیٰ درجہ کے تصورات کی قید سے بہت جلد آزاد ہو کر اون رفیع الشان تصورات تک پہنچ گئے جن میں حکمت و فلسفہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مابعد الطبیعات میں آیات قرآنی کا شایع ہے اور بس۔ ابن رشد ابن تیمیہ ابن حزم غزالی ابن عربی فخر رازی جاتمی بوعلی سینا فارابی شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت کے امام ہو گزرے ہیں اور آزاد خیالی میں ڈیریر سے بھی دو قدم آگے ہی ہیں لیکن توحید رسالت اور معاد کی حقیقتوں کے متعلق جو کچھ ان مشاہیر نے لکھا ہے وہ یا تو قرآن کی تشبیہ ہے یا تاویل۔ پروفیسر نفیس جن کا حوالہ ہم ایک مرتبہ پہلے بھی دے چکے ہیں لکھتے ہیں کہ اوس بیس سال کی مدت میں جو رسول اللہ کی بعثت اور آپ کے انتقال کے درمیان منقعی ہوئی آئینہ سلون کے مسلمانوں کی ہر سیاسی اور عقلی ترقی کی بنیاد قائم کی جا چکی تھی۔ دنیا میں محمد صلعم سر بیڑہ کر (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

یہ ہے کہ اسلام منطوری مذہب کی ایک شاخ تھا جس کے مقاصد ابتدائی محدود تھے۔ جب تک کہ یونانی سیحیت کو بہت سی نتیجہ خیز لڑائیوں میں نیچا دکھا کر یہ مذہب بہ سرعت تمام ایشیا و افریقہ میں پھیل نہ لیا اور اپنی حیرت انگیز فتوحات کے نشہ میں چور نہ ہو لیا اوس وقت تک اس نے اپنی ابتدائی مقاصد کو پس پشت نہ ڈالا اور ایک نئی شرع کے بانی ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور کسی شخص نے اپنی قوم کے مقدر کو اپنے خاص اثر کے سانچے میں نہیں ڈھالا۔ اور اگرچہ مسلمان تمدن کی دوڑ میں بہت جلد آپ سے کوسوں آگے نکل گئے لیکن ہر ہر منزل بلکہ ہر ہر قدم پر ہر مسئلہ کے حل کرنے میں وہ آپ ہی سے استناد و استشارہ کرتے رہے۔ مترجم

۱۔ آج تک کسی اہل الرائے کو یہ دعویٰ کرنے کا جہد نہ ہوا تھا کہ آیہ الیوم اٹملت لکم دینکم کی تنزیل کے بعد ان اصول میں جو اسلام دنیا کے سامنے علی رؤس الاشہاد پیش کر چکا تھا یا ان مقاصد پر جن کا اظہار ان کی اصلاح معاش و معاد کے متعلق قرآن میں علی الاعلان کیا جا چکا تھا کوئی اضافہ کیا گیا یا ان اصول و مقاصد میں کوئی ترمیم یا رد رکھی گئی۔ تعجب ہے کہ مصنف کو باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اسلام کا دار و مدار قرآن پر ہے اور حال قرآن یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی حجت حق ختم ہو گئی جس میں نہ آج تک کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی اس عجیب و غریب دعوے کی جرات کیوں کر ہوئی کہ رسول اللہ کی وفات تک تو اسلام کے مقاصد محدود تھے لیکن ایشیا و افریقہ میں پھیلنے کے بعد بوجہ اس کے کہ وہ اپنی فتوحات کے نش میں چور ہو گیا تھا اس نے ان مقاصد کو پس پشت ڈال دیا اور ایک نئی شرع کی ترویج کا دعویٰ ہوا۔ اس قسم کے اغادی سبھی جہلا کو خوش کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں سے اور مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ بالغ نظر و آزار خیال سبھی مستشرقین تک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ انہیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیں گے گویا دن دہاڑے دن کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام اور اوس کے مقاصد سے جو شخص تہوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس اصولی نکتہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کسی ایک قوم یا ملک یا زمانہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اوس نے تمام دنیا کو اپنے آغوش اثر میں لینے کا ڈھنگ ڈال دیا تھا چنانچہ اوس کی یہ شان (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

حضرت محمدؐ کی قریباً ساری زندگی اپنے ہی وطن کا مذہب بدلنے یا اسے فتح کرنے میں بسر ہوئی۔ لیکن اخیر دنوں میں آپؐ کی قوت اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ مسلمانوں کو شام اور

(بقیہ مضون صفحہ گذشتہ) ہمہ گیری آیہ کریمہ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین میں نظر آ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی مقاصد محدود تھے یعنی اوس کا ظہور مرن عربوں کی بت پرستی کے استیصال کے لیے ہوا تھا وہ گویا اپنے آپ کو اوس برادری میں داخل کرتا ہے جس کی جبین معلومات پر ”ندانند و بداند کہ بداند“ کا قشقہ لگا ہوا ہے۔

یہ دعویٰ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ اسلام نے تمام دنیا میں پھیلنے اور نشہ فتح و نصرت میں سرشار ہونے کے بعد اس امر کا ادعا کیا کہ وہ ایک نئی شرع کا بانی ہے۔ اول تو سرے سے اس ادعا کو اوس سے منسوب کرنا ہی غلطی ہے اس لیے کہ قرآن میں بار بار جتایا گیا ہے کہ جو دین محمد مصطفیٰ صلعم کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا وہ محض او یا ن سابقہ کا مصدق اور حقایق ماضیہ کا موبد ہو۔ آیات قرآنی کے سیاق سے ہر مقام پر یہ نکتہ مترشح ہوتا ہے کہ اسلام نے اون سچائیوں کو جکا انظہار ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے مرسلین نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا اون کہ در تون اور آلائشون سے پاک کر کے جن سے وہ بوجہ استد اور وزگار آلودہ ہو گئی تھیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ جا بجا اوس فی اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ وہ معرفت اور یزدان شناسی کی دہی پڑانی شراب ہے مگر نئی بوتل میں اور اخلاق و روحانیت کا دہی قدیم پیکر نورانی ہے مگر نئے لباس میں۔ ثنائاً اگر ڈاکٹر ڈریسپر کی خاطر سے یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ مسلمانوں نے اس قسم کا متناقض دعویٰ ایشیا اور افریقہ کی تسخیر کے بعد اپنی فتوحات کے نشہ میں چور ہو کر علی رغم وحی منطوق و نص صریح کسی موقع پر کیا ہے تو اوس کا اثر اسلام پر کیا پڑ سکتا ہے۔ اسلام پر اگر کوئی الزام لگایا جاتا ہے تو آیات قرآنی کا حوالہ دے کر اوسے ثابت کیا جائے ورنہ دعویٰ بے دلیل سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر ڈریسپر کا یہ خیال بھی انوکھا ہے کہ اسلام منطوریت کی ایک شاخ ہے۔ جیسا کہ ہم ایک گذشتہ نوٹ میں ظاہر کر چکے ہیں منطوریت اور مجبئی صمدی عیسوی کی مسخ شدہ عیسائیت میں (بقیہ مضون بر صفحہ آئندہ)

ایران پر حملہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو چلا تھا۔ چونکہ آپ نے سلطنت کو اپنے خاندان میں قائم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا لہذا آپ کی جانشینی کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ گیا۔ آخر بہت کچھ

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) بجز اس مسئلہ کے اور کسی بات میں فرق نہ تھا کہ منطوری حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے ربانی و جسمانی عناصر کو جدا جدا خیال کرتے تھے اور حضرت مریم کو اون کے غصہ جسمانی کی والدہ تصور کرتے تھے۔ باقی ہر ایک لحاظ سے وہ اون کی الوہیت کے قایل تھے یعنی حضرت عیسیٰ کی فطرت ربانی و جسمانی کو متحد و غیر منفصل سمجھتے تھے اور اون کا ایمان تھا کہ مسیح کے افعال جسمانی شان ربانی لیے ہوئے ہیں۔ اقامتِ ثلاثہ کو بھی وہ اسی تریسم کے ساتھ قایل تھے اور کفارہ و عشاءِ ربانی اور دوسرے غوامضِ مسیحیت سب اون کے عقاید کا جزو نہایت تھے۔ اور یہی وہ باتیں تھیں جنکی نسبت ڈیرپیر نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے اون اصول کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا جو اگرچہ آپ کے منطوری اسلام نے آپ کو سکھائی تھے لیکن آپ کا ضمیر اور عقل اون کی تائید نہ کر سکتی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو منطوریت کی ایک شاخ قرار دینا معصفت کی خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبرِ اولوالعزم کی لوح بصیرت بمنزلہ ایک ذکی المحس آئینہ عکسی کے ہوتی ہے جس پر ادس کے اخلاقی حوالی کے باریک سے باریک نقوش شمع ادراک سے اثر پذیر ہوتے ہی قلم ہو جاتے ہیں۔ حقایق کے اس مرتق کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنی قوتِ میزہ کی مدد سے جو فیضانِ باری کی مطرح خاص ہوتی ہے اون صورتوں کا انتخاب کر لیتا ہے جن سے اقوامِ دایم فیض یاب ہو کر قدرت کے فشارِ اخلاقی کی تعمیل کرتی ہیں۔

حضور سرورِ کائنات جو انبیائے اولوالعزم کے سر تاج ہیں ادس زمانہ میں مبعوث ہوئے جبکہ دنیا کی توہین ارتقائے اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی تھیں لیکن اون کی روحانیت گوئن کے زاویہ المراس سے گر کر مایل بہ قاعدہ فساد ہو رہی تھی۔ وحدت واجب الوجود۔ بقا و قدرت باری تعالیٰ۔ عدم تغیر قوانین ایزدی بقائے روح۔ حیات اخروی۔ حسن اخلاق۔ اخوت جماعت انسانی۔ یہ تمام اصول انسان کو معلوم ہو چکے تھے اور ان کے فروغ ہندومت۔ بدھ مت۔ مجوسیت۔ موسویت۔ مسیحیت میں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

کنکمش اور جدوجہد کے بعد جناب عائشہؓ کے والد حضرت ابو بکرؓ جانشینی کے لیے نامزد ہوئے اور پہلے خلیفہ یا نائب رسول اللہ مقرر ہوئے۔

اشاعت اسلام و اشاعت مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی بھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولت روم کی بت پرستی کا قلع و قمع کر سکتی۔ جس قدر اس کو ترقی ہوئی اسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ ایک مذہب کی قدیم مشکلیں زندہ ہو کر دوسرے مذہب میں آئیں اور نتیجہ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں تفصیل بتایا جا چکا ہے یہ ہوا کہ مسیحیت بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہو گئی۔

لیکن عرب میں حضرت محمدؐ نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رکھا۔ جن عقاید کی آپؐ نے اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے تلقین کی اور ان میں بت پرستی کا ڈھونڈے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔ وہ حجر اسود جو آسمان سے گرا تھا اور وہ بت جو اس کو گردِ حلقہ زن تھے سب نظر سے غائب ہو گئے۔ نئے مذہب کا اصل اصول یعنی لا الہ الا اللہ دنیا میں بغیر کسی قسم کی مشرکانہ آمیزش کے پھیل گیا۔ جنگی فتوحات نے قرآن کے مذہب کو دنیوی اعتبار سے بہت کچھ نفع بخش ثابت کیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مذہب کا اصل اصول خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جب تلواریں زور ہوتا ہے تو بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب کی حلقہ

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) موجود تھے لیکن انسان کے طغیان و عصیان نے ان نورانی حقیقتوں پر شرک و ریش کا تاریک پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس پردہ کے اٹھانے کے لیے ایک ایسے مامور میں اللہ باری کی ضرورت تھی جس کی زبردست شخصیت اور تمام شکلات سے عہدہ برا ہو سکے جن کا پیش آنا اس مکر کے میں لازمی تھا۔ دفعۃً قدرت ایزدی کی شان آشکارا ہوئی اور محمد مصطفیٰؐ نے سند رسالت پر جلوہ افروز ہو کر ایک مجدد اعظم و مصلح اکبر ہونے کی حیثیت سے اور تمام سچائیوں کا جوادیان و مذاہب سابقہ میں پہلے سے موجود تھیں اقتباس و انقطاع و انتخاب کر کے شیرازہ باندھا اور اس دلکش و دلایز تالیف کو بنام اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مترجم

بگوشی کے لیے تیار نہ ہی جاتے ہیں۔

اسلام کے باقی عقاید کو جو مشہور و معروف ہیں میں یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔ جن ناظرین کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ میری کتاب ”ہسٹری آف دی اٹلیکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ“ (یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ) کا گلیا ہوا ان باب ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے قرآن پر تنقید کی ہے۔ اس مقام پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ مسلمانوں کی بہشت کی سات منزلیں ہیں اور ہر منزل گویا فرمانروایان مشرق کا ایک محل ہے جس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سیاہ آنکھوں والی حوریں اور غلمان بھرے پڑے ہیں۔ اسلام کے خدا کی صورت

لے یہ ایک اور مضحکہ انگیز الزام ہے جو اسلام پر لگایا جاتا ہے۔ باوجودیکہ وہ لوگ جو اس قسم کی مین میک نکالنے کے عادی ہیں خود بہت بڑے مادہ پرست ہیں اور اون کا بال بال اجزائے دیمقراطیسی میں بند ہوا ہے جن کے ازلی وابدی اور ناممکن الفنا ہونے پر اونہیں اب ہی یقین ہے جیسا اپنی ہستی پر لیکن جب کبھی حیات اخروی کے عذاب و ثواب میں اونہیں جسمانی شان نظر آتی ہے خواہ وہ برسبیل تمثیل ہی کیوں نہ ہو تو اون کا ستون تقاضت و منانت مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ایسے بے سرو پا اور لغو اعتراضات پر اتر آتے ہیں کہ ہم سے مبہم ہوے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ ہم اون لوگوں سے جو بہشت کے اسلامی تصور پر یہ کہہ کر نکتہ چین ہوا کرتے ہیں کہ اس میں ہر طرح کی جسمانی لذتیں پائی جاتی ہیں اور جن کو سورون غلمانوں کے ذکر سے اس قدر چڑھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کے خرمن تقدس پر برق خاطن گر پڑی یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ خدا اور اس کی تنزیہ و تقدیس کے قایل ہیں تو آخر اس دنیا میں ناز و نیاز اور اس کی متعلقہ لذتوں کے پیدا کرنے سے اس کے دامن تقدس و تنزہ میں کون سا ایسا دھبہ لگ گیا جو عقبی میں سورون اور غلمانوں کی عدم موجودگی سے چھوٹ جائیگا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اس دنیا میں کچھ اور ہے اور اسے والی دنیا میں کچھ اور ہو جائے گا وہ ایک انوکھی منطق سے کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معترضین اصل حال سے تو بے خبر ہیں (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ مبہم اور بارعب ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ادن لوگون کے مولون سے مخمنین ہو سکتا

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) لیکن شوقِ محکمۂ عینی قلم کو عین نہیں لینے دیتا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں انبیاء کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگون سے ادن کی عقل و علم کے لحاظ سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ اسی خیال کو امام فخر الدین رازی نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا روئے سخن عوام و خواص کی طرف یکساں ہے لیکن چونکہ عوام اکشر امور میں اپنے افتادِ طبیعت کے لحاظ سے حقانیت کے ادراک سے قاصر ہیں لہذا اصطلاحات یہ تھی کہ ایسے الفاظ میں ادن نہیں مخاطب کیا جائے جو ادن کے خیالات و تصورات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ قرآن کے ادن مقامات کا مطالعہ کرتے وقت جن میں بہشت و دوزخ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں اسی حکیمانہ اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ان پڑھ اور اکھڑ بھلا کے غیر نشو و نما یافتہ دماغ کے پردہ پر اعمالِ حسنہ کی جزا کی تصویر اگر کھینچی جاسکتی تھی تو صرف ادن نعمتوں اور لذتوں کے تذکرہ جن کا احساس یا ادراک ادن کے لیے ممکن تھا۔ بہشت کا وہ تصور جس میں حور و ناز و غلمانوں اور بہتی ہوئی نہروں اور لہلہاتے ہوئے چمنوں کا عنصر شریک ہے تنہا یہ پیرایہ میں عوام کا لالچہ و جادو دانی مسرتوں سے روشناس کرنے کا فلسفیانہ ذریعہ ہے۔ ورنہ اس بہشت کا تصور بھی اسلام میں موجود ہے۔ جس میں داخل ہو کر بڑے سے بڑے مشائی یا اشتراقی فیلسوف کو بھی یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی طبیعت کسی زمانہ میں اس کی خوشیوں سے اچاٹ ہو جائے گی۔ حیاتِ اخروی کا وہ اصل الاصول اور غایت الغایات جس کے حصول کے لئے اسلام کے حکمے عظام و صوفیہ کرام نے اپنی عمریں وقف کر دی ہیں لغائے باری تعالیٰ یا وصال ذاتِ ذوالجلال و الجلال ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی تشریح حضور سرور کائنات نے ایک صحابی کے اس استفسار پر کہ بہشت کی ماہیت کیا ہے ان الفاظ میں فرمائی تھی لا عینِ سرائع و لا اذنِ سمعت و لا خطر علی قلب بشر یعنی بہشت کی لذت وہ لذت ہے جس کا ادراک سامعہ و بامرہ تو ایک طرف سے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

جو حکمت آشنا نہیں ہیں۔ اون کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو سیکل انسان ہے جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے اور ٹانگیں زمین پر ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے مسند خلافت پر شکن ہوتے ہی حسب ذیل اعلان شایع کیا :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کرنے اور محمد رسول اللہؐ پر درود بھیجنے کے بعد ابو بکرؓ تمام مسلمانوں کے لیے دعا مانگتا ہے کہ اون پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں اور اون کو صحت و عافیت کی نعمت میسر ہو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو واضح ہو کہ میرا ارادہ مسلمانوں کو شام کی جانب روانہ کرنے کا ہے تاکہ یہ ملک کفار کے ہاتھوں سے لے لیا جائے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) تصور و خیال تک سے نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کا انکشاف قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتا ہے یا ایتھا النفس المطمئنة امر جعی الی سربك راضیة مضیة ایک اور مقام پر جناب باری نے لذت نجات کی حلاوت سے حقیقی معنوں میں بہرہ اندر ہونے والوں کو ان الفاظ میں بشارت دی ہے کہ وہ اخیر فیصلہ والے دن اپنے خدا کے جمال عالم آرا کا مشاہدہ کریں گے۔ اسی طرح ایک نص صریح اس مضمون کی موجود ہے کہ کسی نفس کو اس سرست ابدی کا علم نہیں ہے جو پوشیدہ طور پر اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ اون اعمال حسنہ کے انعام کے طور پر اس کو رحمت کی جائے جو اس سے اس دنیا میں صادر ہوں۔ فلسفیانہ اصطلاح میں ان مضامین کو انجذاب یا وصال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ قرآن کا بہشت وہ بہشت ہے جس سے عامی و جاہل عالم فلسفی اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے یکساں لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک خدا شناس فلسفی اسی کو اپنی خوشیوں کی معراج تصور کرتا ہے کہ اوس کی روح اس خاکدان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد روح کائنات یعنی ذات باری تعالیٰ میں ضم ہو جائے تو یہ انتہائی خوشی بھی قرآن کے توسل سے اوس کو حاصل ہو سکتی ہے اور اگر ایک ادنیٰ درجہ کا دین دار عامی جس کی آرزو صرف اسی قدر ہے کہ حورون سے ہم کنار ہو کر شراب و طہور کے پیالے پیا کرے اور طوبی کے پھل توڑ توڑ کھایا کرے تو ڈر پیر یا اوس کے ہم خیال بزرگوں کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ اس خوشی سے اس بچا پرے کو محروم کرنے کے لیے جوڑ توڑ کریں۔ مترجم

میں تم سب کو یہ جلا دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کی حمایت میں لڑنا خدا کی اطاعت کرنا ہے۔
 پہلی لڑائی میں جب عربی فوج کے سپہ سالار خالد کا قافیہ غنیم نے تنگ کیا تو اوس نے
 اپنی سب فوج کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں خدا سے دعا مانگی: ”بار الہا یہ بد بخت
 مشرک بتوں کا نام لے لے کر دعا مانگتے ہیں اور تیرے سوا دوسرے خدا کی پرستش کرتے
 ہیں حالانکہ ہم تیری توحید کے قایل ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں
 پس ہم نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ
 علیہ وسلم کے طفیل ہماری مدد کر اور ہمیں ان بت پرستوں پر فتح دے“ عربوں نے فتح
 شام میں حرارت دینی کا حد سے زیادہ اظہار کیا۔ شامی عیسائیوں کے عقاید ان کے
 دلوں میں غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کے طوفان بپا کر کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک
 موقع پر خالد کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: ”میں اوس کفر بکنے والے بت پرست
 کی کھوپری پھوڑ ڈالوں گا جو اللہ جل جلالہ کی شان میں یہ کہے گا کہ وہ بھی بیٹے والا ہے۔“
 حضرت عمر فارح بیت المقدس ہرقلس قیصر روم کو خط لکھتے ہیں جس کے ابتدائی الفاظ یہ
 ہیں: ”حمد ہو اللہ کو جو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے اور جس کے نبی نبی ہے اور نبی
 اہل عرب عیسائیوں کو مشرک کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ عیسائیوں نے مریم و عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ
 جل شانہ کا شریک بنا رکھا تھا۔“

حضرت ابوبکر کا یہ قصد نہیں تھا کہ فوج کی کمان خود کریں۔ یہ خدمت نام کو ابو عبیدہ
 اور دراصل خالد کے سپرد کی گئی۔ رخصت کو وقت جب خلیفۃ المسلمین نے فوج کا جائزہ لیا تو
 افسروں اور سپاہیوں کو تاکید کی کہ فریق مقابل سے انصاف اور رحم کا برتاؤ کریں
 اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہیں۔ بیہودہ گفتگو سے بچیں۔ شراب خواری سے پرہیز کریں۔
 پانچون وقت پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں۔ جہان جہان گزریں عام لوگوں کے ساتھ بہ ملاحظت
 پیش آئیں مگر اودن کے پادریوں پر ذرا رحم نہ کریں۔

دریائے نذرہ دن کے مشرق کی جانب بصرہ کا مستحکم شہر واقع ہے جہاں رسول عربیؐ اول
 اول اپنے نسطوری معلموں سے ملے تھے۔ دولتِ روم کے جو قلعے ارضِ شام میں جا بجا بنو
 ہوئے تھے انہیں میں بصرہ کے قلعہ کا بھی شمار تھا۔ فوجِ عرب نے اس کے سامنے ڈیرے
 ڈال دئے۔ قلعہ بند فوج کی طاقتِ غنیم کے مقابلہ میں کچھ کم نہ تھی اور اس طاقت میں
 ارن مقدس صلیبوں اور متبرک جھنڈوں نے اضافہ کر دیا تھا جنہیں محصورین کی خوش اعتقادی
 نے فسیل پر بلند کر رکھا تھا۔ اہل قلعہ عرصہ داز تک اپنی حفاظت کر سکتے تھے لیکن قلعہ دار
 رومینس کی نیت بدل گئی اور اوس نے چپکے سے پھاٹک کھول دئے۔ اوس کے اس طرز
 عمل سے ظاہر ہے کہ اہل شام کی حالت کیسی بری ہو رہی تھی۔ جب فوجِ محاصرہ شہر میں داخل
 ہو گئی اور رومینس نے قلعہ کی کنجیاں سپہ سالار عرب کے حوالہ کر دیں تو اہل قلعہ کو اوس نے
 حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا: ”آج سے میں تم لوگوں سے جدا ہوتا ہوں۔ دنیا و عقبی
 دونوں جگہ میری تمہاری راہیں الگ الگ ہوں گی۔ مجھے اوس خدا سے انکار ہے جو مصلوب
 ہوا تھا اور جو لوگ اوس کی پرستش کرتے ہیں میں اوس سے بھی بیزار ہوں۔ میرا خدا آج سے
 خدا سے واحد ہے۔ میرا مذہب آج سے مذہبِ اسلام ہے۔ میرا قبلہ آج سے مکہ معظمہ ہے۔
 میرے بھائی آج سے مسلمان ہیں اور میرا رسول آج سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا اور جس نے علیٰ رغمِ مشرکین
 اعلا سے کلمۃ الحق میں کامیابی حاصل کی۔“ ایران کے حملہ کے بعد ایشیائے کوچک، شام
 بلکہ سطنطین میں بھی ٹکڑا ہوا اور مرتد دن کا ایک گروہ کثیر ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عربوں کے
 ساتھ مل جانے کے لیے صرف موقع کا منتظر تھا۔ رومینس کا شمار بھی اون ہزار ہا لوگوں میں تھا
 جو ایرانی فتوحات کی وجہ سے بد اعتقاد ہو گئے تھے۔

شام کا پایہ تخت دمشق بصرہ سے صرف بہتر میل جانب شمال واقع تھا۔ فوجِ عرب
 بلا توقف اسی طرف روانہ ہوئی۔ اہل دمشق سے کہا گیا کہ تین باتوں میں سے جو چاہو

اختیار کر دینی یا تو اسلام لاؤ یا جزیہ دو یا مقابلہ کرو۔ شہنشاہ ہرقل اس وقت انطاکیہ میں مقیم تھا جس کا فاصلہ دمشق سے بہت شمال صرف بقدر ڈیڑھ سو میل کے رہ گیا تھا۔ حملہ آوردن کی پیش قدمی کی خبر وحشت اثر سن کر ہرقل کے ہوش اڑ گئے اور اس نے فوراً ستر ہزار فوج غنیم کا رستہ روکنے کے لیے روانہ کی۔ عربوں کو مجبوراً دمشق کا محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ اخبارین کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور رومی فوج شکست فاش کھا کر بحالت تباہ منتشر و پراپن ہو گئی۔ یہاں سے مظفر و منصور ہو کر خالد فری پھر دمشق کے سامنے اپنا علم جس پر سیاہ عقاب کا نشان بنا ہوا تھا بلند کیا۔ اور ستر دن کے محاصرہ کے بعد اہل دمشق نے ہتھیار ڈال دئے۔

عربی تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک افواج عرب کی حالت نہ ہی جیٹوں کی ایک بے قاعدہ جمعیت سے کچھ بہتر نہ تھی۔ بہت سے سپاہی ایسے ہوتے تھے جنہیں تن ڈھکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص فوج کی صف سے نکل کر میدان میں اکٹھا ہوتا تھا اور فریق مقابل سے مبارز طلب کرتا تھا اور یہ دونوں اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک کہ ایک کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ مرد تو ایک طرف رہے عورتیں تک شریک جنگ ہوتی تھیں اور داد شجاعت دیتی تھیں۔ چنانچہ ان کے ان بہادرانہ کارناموں کی بہت سی دلچسپ روایتیں تاریخوں میں موجود ہیں۔

کوہستان لبنیس کی بربت سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور دریائے آرافس کے خوش بو اور پرنفعا کناروں کی رہ نمائی سے عربی فوج دمشق کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ رستہ میں بعلبک اور حمص و دوشہر پڑتے تھے۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے اس نے سوکھا۔ ہرقل اس کی خبریں سن گئی تھیں حملہ آوردن کی مزید پیش قدمی کا سد باب کرنے کے لیے اس نے ایک لاکھ چالیس ہزار کا لشکر جوار جمع کیا۔ یرموک کے میدان جنگ میں دونوں فوجوں کا

لہ یا اندازہ اس بقدر ایک لاکھ کے کم ہو۔ اس سہرک میں مسلمانوں کی فوج چالیس ہزار تھی اور عیسائیوں کی دو لاکھ چالیس ہزار تھی

سامنا ہوا۔ پہلے حملہ میں عربی فوج کے مہینہ کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن عرب عورتوں نے ہزیمت
 لکھائے ہوؤں کے دلون میں اپنے غیرت آفرین الفاظ سے نیا جوش پیدا کر دیا۔ وہ پلٹے اور
 اس بے جگر می سے لڑے کہ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ رومی فوج اون کے حملہ کی تاب نہ لاسکی
 اور اسے شکست فاش ملی۔ چالیس رومی قید ہوئے اور ہزاروں میدان جنگ میں کام آئے۔
 اب تمام ملک فاتحون کے قبضہ میں آگیا۔ چونکہ اونہوں نے دریا سے زردن کے مشرق کی جانب
 پیش قدمی کی تھی لہذا صاف ظاہر تھا کہ ایشیائے کوچک پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے فلسطین
 کے مستحکم اور سربرآوردہ شہروں کا مسخر ہو جانا ضروریات سے ہے۔ سرداران فوج میں اس
 مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہوا کہ اول قیصر یہ پر حملہ کرنا چاہیے یا بیت المقدس پر جب
 بحث اس اختلاف کا تصفیہ نہ کر سکی تو دربار خلافت سے استہد کیا گیا۔ خلیفہ کی عقل سلیم نے
 بیت المقدس کی فتح کے اخلاقی فوائد کو تسخیر قیصریہ کے جنگی فوائد پر ترجیح دی چنانچہ عربی فوج جو
 سپہ سالار کے نام اس مضمون کا حکم پہنچا کہ بیت المقدس پر اول حملہ ہو اور جس طرح بن پڑے
 اسے سر کیا جائے۔ غرض اس شہر کا یہ سرگرمی تمام محاصرہ کیا گیا۔ یہاں کے باشندوں کو ایرانی
 حملہ کے وقت مزار مسیح کی توہین فراموش نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اونہوں نے محافظت و دافعت
 کی بہت بڑی تیاریاں کیں۔ اور جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ لیکن چار مہینے کے محاصرہ کے بعد جب
 اونہوں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو بطریق سفرائٹنس فصیل شہر پر اکھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ
 اگر ہم کو امان دی جائے اور شرائط طے ہو جائیں تو ہم لوگ ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہیں۔
 چونکہ فتح دمشق کے وقت سرداران فوج کی غلط فہمیوں کی وجہ سے باشندگان شہر کا قتل عام
 ہوا تھا لہذا سفرائٹنس نے یہ شرط پیش کی کہ بیت المقدس خلیفہ کی موجودگی میں مسلمانوں کے
 حوالے کیا جائے گا۔ یہ شرط منظور کر لی گئی اور حضرت عمرؓ جو اس وقت خلیفہ تھے بیت المقدس پر
 قبضہ کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ نے سفر اس حیثیت سے کیا کہ ایک
 سرخ رنگ کے اونٹ پر سوار تھے اور زادراہ کی قسم سے آپ کے ساتھ ایک تھیلے میں

کچھ اناج تھا۔ ایک تھیلے میں کچوریں تھیں۔ ایک لکڑی کی رکابی تھی اور پانی کے لیے ایک پھڑے کی چھاگل تھی۔ غرض اس شان کے ساتھ عرب فاتح عیسائی بطریق کی سواری کے ہمراہ بیت المقدس میں داخل ہوا اور مسیحیت کا صدر مقام بغیر کسی شور و شر اور بغیر کسی خونریزی کے پیشوا سے اسلام کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ ہیکل سلیمانی کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی جائے خلیفۃ المسلمین نے مدینہ کو مراجعت کی۔

ہرقلس سے یہ بات بھی نہ تھی کہ جو تباہیان اور مصیبتیں عیسائیت پر پیہم نازل ہو رہی ہیں اودن کا باعث مخالف العقاید مسیحی فرقوں کا تفرقہ ہے۔ اسی لیے جہان اوس نے سلطنت کی حمایت میں تلوار اٹھائی وہ ان اختلافات کے مٹانے کی بھی بدل کوشش کی۔ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر اوس نے یہ اصول سیمی دنیا میں شائع کرنا چاہا کہ چونکہ مسیح کی ربانی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی ہیں اور جدا جدا نہیں لہذا مسیح کی مشیت بھی جس سے اوس کے ربانی و انسانی افعال صادر ہوتے ہیں ایک ہے اور وہ مشیت ایزدی ہے مشیت انسانی نہیں۔ لیکن یہ کوشش ہرقلس نے اوس وقت کی جب پانی صحرے سے گزر چکا تھا۔ بیت المقدس کی تغیر کے بعد مسلمان ایشیائے کوچک کی طرف بڑھے اور حلب اور انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ وہ برابر بڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے اور کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اودن کی فتوحات کے سیلاب کو روک سکے۔ خود ہرقلس کو جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ اور شام کا مہربہ جسے جوئیس سیزر کے رقیب پامپی اعظم نے سات سو سال پہلے دولت رومۃ الکبریٰ کے ساتھ ملٹی کیا تھا جو عیسائیت کا زاد بوم تھا جہاں اس کی مقدس اور قیمتی یادگارین موجود تھیں جہاں سے خود ہرقلس نے ایک مرتبہ ایرانی حملہ آوروں کو نکال دیا تھا اب ایسا ہاتھوں سے نکلا کہ پھر واپس نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ جس جہاز میں ہرقلس سوار ہو کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا جب اوس نے لنگر اٹھایا تو ہرقلس حسرت بھری نگاہوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی پہاڑیوں پر ٹھنگی جا کر درد و کرب کے لہجہ میں پکارا:-

”الوداع اے شام ہیشہ کے لیے الوداع“

فتوحات عرب کے باقی واقعات کی تفصیل اس مقام پر درج کرنی ضروری نہیں ہے۔ طرابلس اور طیار (صور) کا خود اپنے ہی انسر دن کی غداری سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جانا۔ قیصریہ کا فتح ہونا۔ کوہستان لبنان کے درختوں اور فیتشیا کے ملاحون کی مدد سے ایک بیڑے کا تیار کیا جانا اور اس بیڑے کا روم کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر ہیلپناٹ کی طرف بھگانا۔ قبرس روڈس اور سکیڈس کا تاخت و تاراج ہونا اور کلاسس کے مجسمہ کا جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتا تھا ایک یہودی کے ہاتھ جو اس کے پتیل سے نوسو اونٹ لا کر لے گیا بکنا۔ اور اسلامی فوج کا بحیرہ اسود کی طرف بڑھنا بلکہ قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے ڈیرے ڈالنا۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں جن کی فتح بیت المقدس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

فتح! اور وہ بھی بیت المقدس کی!! عیسائیت کے پایہ تخت کی!! کس طرح ممکن تھا کہ لوگ اس واقعہ کو اسلام کے غلبہ اور مسیحیت کی شکست سے تعبیر نہ کریں۔ دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر اس یقین کے ساتھ کہ فتح سچائی کو ہوگی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا اور فیصلہ خدا پر چھوڑا تھا۔ خدا نے فتح اسلام کو عطا کی اور فتح کا تمغہ بیت المقدس کی شکل میں مسلمانوں کو دیا۔ اور اگرچہ حروب صلیبیہ کے دوران میں عیسائیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہزار سال کی جدوجہد کے بعد آج بھی وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ دولت قسطنطنیہ کے مورخین پر وقایع نگاری کا جو طریقہ اختیار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے اس کے لحاظ سے وہ ایک حد تک قابل معافی ہیں۔ ”اوسٹون نے کلیسائے شرقی کی تباصی کے اہم مسئلہ کو چھو تک نہیں“ باقی رہا کلیسائی غربی۔ سو اس کی یہ حالت ہے کہ ازمنہ وسطے یعنی دور حروب صلیبیہ کے ذلیل اساقف تک کی رگ حسیت پھڑکنے لگتی تھی جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہم روم کو اس جھوٹی روایت کی بنا پر

کہ سینٹ پیٹر نے یہاں قدم رنج فرمایا تھا مجبور ہو کر مسیحیت کا پایہ تخت قرار دے رہے ہیں حالانکہ عیسائیت کا اصلی مرکز حکومت یعنی مسیح کی ولادت زندگی اور وفات کا عظیم الشان اور مقدس مقام کفار کے قبضہ میں ہے۔ یورپ کے مسیحی مصنفین نے ہرمون پر قلم اٹھاتے وقت خواہ اوس کا موضوع تاریخ ہو یا مذہب یا سائنس جب اپنے فتنہ مخالفین کا ذکر کیا ہے تو اسی طرح زہر لگلا ہے۔ اون کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جس چیز میں وہ کوئی منقصت کا پہلو نہ نکال سکیں اوسے چھپائیں اور جس چیز کو چھپا نہ سکتے ہوں اوس کی تنقیص کریں۔

قلت گنجائش اور نیز اس کتاب کا موضوع ہم کو اجازت نہیں دیتا کہ جس طرح فتح بیت المقدس کا ذکر ہم نے تفصیل کیا ہے اسی طرح پوری وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے واقعات لکھیں جبکہ بدلت آگے چل کر ایک ایسی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی جو جغرافیائی وسعت میں اسکندر کی سلطنت بلکہ دولت رومۃ الکبریٰ پر بھی بمراتب فوقیت لے گئی۔ لیکن اس مضمون پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ہم اس قدر کہنا بے موقع نہیں سمجھتے کہ عیسائیت پر جو طمانچہ پڑا تھا مجوسیت نے اس سے بھی زور کا تھپڑ لکھایا۔ قادیسیہ کی جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ مدائین کے لٹنے پر خزانہ واسلحہ شاہی اور بے انتہا مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا۔ مگر کہ نہادند کو عرب مورخوں نے جو ”فتح الفتوح“ کا لقب دیا ہے وہ کچھ غیر موزون نہیں ہے۔ ایک طرف تو وہ بحیرہ خزر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف جنوبی سمت میں دجلہ کے کنارے کنارے اصفہر کا رخ کیا۔ فرمانروائے ایران اوس شہر کے میناردن اور پتھر کی مورتوں میں سے گذر کر جو اسکندر کی محفل و نوشی کی رات سے اجڑا پڑا تھا صحرائے نمک میں سیہوتا ہوا جان سلامت لے کر بھاگ گیا۔ عربی فوج کا ایک حصہ اوس کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اوس کو جیون عبور کرایا جہان اوسے ترکون نے قتل کر ڈالا۔ اوس کے بیٹے کو

چین میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ فغفور چین کی فوج میں کپتان ہو گیا۔ جیون کے اوس پار کا علاقہ بھی مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا اور خراج میں دو لاکھ اشرفیان دینی منظور کیں۔ غرض ایک طرف تو فغفور چین اپنے پایہ تخت پیکن سے مدینہ میں اپنا سفیر بھیج کر خلیفۃ المسلمین التجائے صلح و آشتی کر رہا تھا اور دوسری طرف علم نبوی دریائے آئندس کو کناروں پر لہرا رہا تھا۔

شام کی لڑائیوں میں جن سرداران فوج نے علم امتیاز بلند کیا اون میں سے ایک عمرو بن العاص بھی تھا جس کے مقدر میں فاتح مقرر ہونا لکھا تھا۔ خلفائے اپنی شمالی و شرقی فتوحات ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اب مغرب کی طرف نگاہ اٹھائی اور افریقہ کے الحاق کی تیاریاں شروع کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مذہبی فرقوں کا باہمی عناد و تفرقہ اون کی کامیابی کا باعث ہوا۔ فرقہ ”جیکو باٹ“ نے مسلمانوں کو اپنا ذریعہ خلاصی سمجھ کر عرب فوج کا خیر مقدم صدق دل سے کیا۔ فرقہ منوسفطانیہ نے جو بقول پیروان مذہب سینٹ آئینسیس ذات ابن اللہ کی الوہیت و انسانیت کو مخلوط سمجھتا تھا اپنے سرگروہ مقوقس کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کیا کہ ہم یونانیوں سے نہ دنیا میں تعلق رکھنا چاہتے ہیں نہ عقبی میں اور ظالم قیصر قسطنطنیہ اور اوس کی کونسل سے جس کا مستقر جیل سیڈان ہے ہمیشہ کے لیے ابرا کو تو ہیں۔ غرض انہوں نے خلیفۃ الاسلام کو خوشی خوشی خراج دینا قبول کیا۔ مگر کون اور پلون کی مرست خود کردی اور حملہ آور فوج کو نہ صرف رسد بہم پہنچائی بلکہ اوس کے لٹو جاسوسی کی خدمت بھی انجام دینے میں درہنہ نہ کیا۔

مقوقس پر جو فراغ کے زمانہ میں مصر کا پایہ تخت تھا مسلمانوں کا بہت جلد قبضہ ہو گیا اور اس کے بعد افواج اسلام نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ چونکہ اسکندریہ کے پس پشت سمندر کی راہ کھلی تھی لہذا ہر قلعہ کو محصورین کے لیے لنگ بھیجنے کا موقع ملتا رہا۔ اہم حضرت عمر نے بھی جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے فوج محاصرہ کی امداد کے لیے شہم

کی جنگ آزمودہ سپاہ روانہ کی۔ محاصرین کی طرف سے بہت سے دھماکے ہوئے اور مصوریں نے بہت دفعہ نکل نکل کر مسلمانوں پر حملے کیے۔ ایک دفعہ مصوریں نے عمرو کو گرفتار کر لیا مگر وہ ایک غلام کی جانب ازانہ عیاری سے بچ کر نکل آیا۔ غرض چودہ مہینے کے محاصرہ کے بعد جس میں مسلمانوں کی تیئیس ہزار فوج کام آئی اسکندریہ کو اسلام کے آگے سرسجدہ ہونا پڑا۔ عمرو بن العاص نے جب دربار خلافت میں فتح اسکندریہ کا قلمرو بھیجا تو مغرب کے اس شہر غدار کے شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس میں چار ہزار محل چار ہزار حمام چار سو تماش گاہیں بارہ ہزار پھل ترکاری اور اناج کی دکانیں ہیں اور چالیس ہزار باج گذار یہودی آباد ہیں۔

اس طرح عیسائی دنیا کا دوسرا شہر بھی کشور کشایان اسلام کی سلک فتوحات میں منسلک ہو گیا اور جو مشربیت المقدس کا ہوا تھا وہی اوس اسکندریہ کا بھی ہوا جس کو اپنی سیحی آثار پر ناز تھا جس نے آئینیسٹس اور ایریسٹس اور سائرل کو گودیوں میں کھلایا تھا جس نے کلیسا کے عقاید کی شاخ میں اقامت ثلاثہ اور پرستش مریم کا پیوند لگایا تھا۔ ہر فلس قسطنطنیہ میں تھا کہ یہ جانکاہ خبر پہنچی۔ اس صدمہ سے اوس کی کمر ٹوٹ گئی اور دنیا اوس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا عیسائیت کے زوال سے اوس کی حکومت کے ماتھے پر کلنک کا امٹ ٹیکا لگنے والا ہے۔ فتح اسکندریہ کے صدمہ نے اوسے ایک مہینہ سے زیادہ زندہ نہ رہنے دیا اور وہ اسی رنج میں کھل کھل کر مر گیا۔

اسکندریہ کا ہاتھ سے نکل جانا قسطنطنیہ کے لیے ایک دہرا دھکا تھا۔ اس لیے کہ مذہب کے مرکز ہونے کے علاوہ اوس کا وجود رومرہ کی رسد رسانی کے لحاظ سے بھی قسطنطنیہ کے لیے ضروریات سے تھا۔ مقررہ میوں کے لیے اناج کی منڈی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زبردست جنگی بیڑوں اور جرار فوج کی مدد سے دو دفعہ اس مقام کو مسلمانوں سے چھین لینے کی کوشش کی گئی اور دونوں دفعہ عمرو کو یہ شہر گویا از سر نو فتح کرنا پڑا۔ فاتح

اسکندریہ نے جب یہ دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر واقع ہونے کے باعث اس شہر پر غنیمت
 آسانی حملہ آور ہو سکتا ہے جس کے دفعہ کی ترکیب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ شہر بنیاد کو ہی
 مسمار کر دیا جائے تو اوس کے منہ سے بے اختیار یہ کلمات نکلے :- ”قسم ہے خدا نے
 قیوم کی کہ اگر تیسری مرتبہ پھر یہی کوشش اختیار کی طرف سے ہوئی تو میں اسکندریہ کو کسی طوائف
 کے دروازہ کی طرح تمام دنیا کے لیے کھول دوں گا۔“ یہ دھکی پوری ہو کر رہی۔ عرو نے جو کچھ
 کہا تھا اوس سے زیادہ کر دکھایا۔ یعنی فوراً شہر کی فسیلون اور دھسون کو زمین کے برابر کر دیا
 جس پر اس کی قوت مزاحمت و دافعت سلب ہو گئی۔

خلفائے اسلام کا قصد یہ نہ تھا کہ اپنے دائرہ فتوحات کو مصر ہی تک محدود رکھیں۔
 حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث نے افریقہ کے کل شمالی ساحل کی تسخیر و الحاق کا عزم کیا۔ چنانچہ
 آپ کے سپہ سالار عبداللہ نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ ممفس سے روانہ ہو کر صحرائے
 برقہ کو قطع کرتے ہوئے طرابلس کا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ فوج میں وبا پھوٹ پڑی اس لئے
 اوسے مجبوراً مقرر کو واپس آنا پڑا۔

اس کے بعد بیس سال تک مسلمانوں نے کوئی پیش قدمی نہ کی لیکن تقریباً رجب ۷۱۱
 کا جوش کشور کشائی بواند رہی اندر کسی چشمہ کی طرح ابل رہا تھا کب تک رکاوٹ رہتا۔ آخر یہ
 جوش ظاہر ہوا اور فتوحات کا ایک سیلاب شمالی افریقہ پر چھا گیا۔ عقبہ وادی نیل سے
 آندھی کی طرح اٹھا اور کوہ دھردشت و بیابان کو قطع کرنا شہروں اور ملکوں کو حلقہ بگوش
 خلافت بنانا ہوا بحر اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچا۔ اور جب سمندر کی موجوں نے
 اوس کے اسپہ صبار رفتار کے سمون کو جزائر کنیری کے بالمقابل بوسہ دیا تو یہ الفاظ
 اوس کے منہ سے نکلے :- ”سبحان ذی الکبریٰ والجللوت ! اگر یہ سمندر میرا فرما نہ ہوتا
 تو میں مغرب کے نامعلوم ملکوں میں برابر بڑھا ہوا چلا جاتا اور خدا نے بزرگ و برتر کی
 وحدانیت کا ڈنکا بجاتا ہوا دن تمام سرکش قوموں کو تلوار کے گھاٹ اُتار تا جو خدا نے

واحد کے سوا کسی دوسرے خدا کی پرستش کرتی ہیں۔“

عربوں نے یہ چڑھایا کہ میان ملک کے اندرونی علاقوں پر کی تھیں۔ اس لیے کہ ابھی تک تاجرہ روم پر فرمانروایان قسطنطنیہ کے اقتدار کا علم لہراتا تھا اور جو شہر ساحل پر واقع تھے وہ بحری قوت کی بدولت ان کے قبضہ میں تھے۔ آخر کار خلیفہ عبدالملک نے کار تھج کی تسخیر کا عزم کیا جو ان شہروں میں سب سے زیادہ آباد اور طاقتور تھا بلکہ گویا شمالی افریقہ کا دارالسلطنت تھا۔ اموی سپہ سالار حسن نے کندین اور شیرہیان لگا کر ایک بلہ میں اسے سر کر لیا لیکن چونکہ کار تھج والوں کو قسطنطنیہ سے لگک پہنچ گئی اور اس کے علاوہ سسلی اور گارتھ کی فوج بھی ان کی مدد کے لیے آگئی لہذا حسن کو پسپا ہونا پڑا۔ لیکن یہ کامیابی چند روزہ ثابت ہوئی۔ حسن نے چند مہینے کے بعد سنہیل کر پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ غلبہ پانے کے بعد کار تھج کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا۔

بیت المقدس اور اسکندریہ پہلے ہی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ کار تھج کی تسخیر سے عیسائی طاقت کا ایک اور زبردست مرکز کم ہو گیا۔ قسطنطنیہ کا فتح ہونا بھی صرف چند دن کی بات تھی۔ اس کے سفر ہو جانے کے بعد عیسائیوں کے پاس بے دھر کر ایک صرف رہا باقی رہ جاتا تھا۔

عیسائیت کے نشوونما میں کار تھج نے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ اسی کی بدولت یورپ میں رومن کیتھولک مذہب نے رواج پایا۔ اسی کی خاک سے اس مذہب کے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں سینٹ اگسٹائن کے سے شہرہ آفاق پادری نے جنم لیا۔

جب ہم دنیا کے مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سرعت و وسعت اشاعت میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسلام کوہ الطائوس سے لے کر بحر اوقیانوس اور وسط ایشیا سے لے کر افریقہ کی

مغربی حد و تک کوس لمن الملک الیوم بجار ہاتھا۔

اب خلیفہ ولید کا دور آیا اور اس نے فرمان صادر کیا کہ یورپ پر چڑھائی کی جائے اور اندلس یعنی مغرب الاقصیٰ کو سلطنت اسلام میں شامل کر لیا جائے۔ مذہبی تفرقہ اور ملکی ٹکڑائی ہمیشہ سے اسلامی حملہ آوروں کی اعانت کرتی چلی آئی تھی۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے سپہ سالار موسیٰ کو یہی دو پرانے رفیق مجسم ہو کر ٹالیڈو کے استقف اور گاتھ فوج کے سپہ سالار کاؤنٹ جولین کی شکل میں مل گئے۔ جنگ زیریں زمین میں اس وقت جبکہ مسلمانوں اور مسیحیوں میں برابر کی جوشن چل رہی تھیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فریقین میں شکست کون پائے گا اور فتح کس کو ہوگی مسیحی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ٹالیڈو کے پادری اور کاؤنٹ جولین کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ آلا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور دریائے گواڈلکویور کی موجوں نے اسے غلیم کے تعاقب سے ہمیشہ کے لئے امان دے دی۔

موسیٰ کا نائب طارق بہ سرعت تمام ٹالیڈو کے میدان جنگ سے شمال کی طرف روانہ ہوا اور رستہ میں جو شہر ملا اسے فتح کرتا ہوا برق و باد کی طرح بڑھا چلا گیا۔ جب موسیٰ شمالی افریقہ سے جہان وہ کچھ عرصہ کے لیے چلا گیا تھا واپس آیا تو طارق کی تلوار تمام جزیرہ فاطمی اسپین کو سخر کر چکی تھی اور گاتھ فوج کا بقیۃ السیف بحال تباہ کوہستان پرینیز سے گذر کر فرانس میں جا پناہ گزین ہوا تھا۔ تیسرا اسپین کو اپنی فتوحات کی پہلی منزل قرار دے کر طارق نے اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ فرانس کو فتح کرتا ہوا ٹلی میں جا پہنچے اور پوپ کے محل میں توحید کا تقارہ بجا کر قسطنطنیہ پر فوج کشی کرے پھر دولت رومۃ الکبریٰ کو ہمیشہ کے لیے خاک و خون میں سلاتا ہوا دمشق پہنچ کر اپنی مظفر منصور تلوار کو خلیفۃ المسلمین کے قدموں پر جا رکھے۔

مگر کار پر وازان قضا و قدر کو یہ بات منظور نہ تھی۔ موسیٰ نے طارق کے ان روشن

کار ناموں کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھ کر اسے طرح طرح کی ذلتیں دین۔ طارق کے بھی دربار خلافت میں بہت سے ہوا خواہ موجود تھے۔ انہوں نے موسیٰ کی اس بے سلوکی کی کیفیت خلیفہ سے خوب نمک مریخ لگا کر بیان کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق سے ایک سفیر روانہ ہو کر اسپین پہنچا۔ موسیٰ اپنے خیمہ میں تھا کہ زینے آکر شاہی فرمان سنایا اور اسے گرفتار کر کے دمشق لے گیا۔ موسیٰ جب دربار خلافت میں پہنچا تو خلیفہ نے اس پر بے حد عتاب کیا اور حکم دیا کہ سب کے سامنے اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اس بے عزتی نے موسیٰ کا دل توڑ دیا اور وہ اس مدد سے جان بر نہ ہوسکا۔

طارق کا منصوبہ تو برصغیر سے کار نہ آسکا لیکن بعض دوسرے اسلامی سپہ سالاروں نے فرانس پر ضرور فوج کشی کی۔ پہلی ہی ٹرائی میں فرانس کا وہ علاقہ جو دریائے گیرڈن اور دریائے لائر کے درمیان واقع ہے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد اسلامی سپہ سالار عبدالرحمن نے فوج کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک جماعت کو ہمراہ لیا اور مشرق کی طرف بڑھ کر دریائے رڈن کو عبور کرنے کے بعد آلس کا محاصرہ کیا۔ جیسی فوج محصورین کی کمک کے لیے آئی تھی اسے سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس کی فوج کے دوسرے ٹکڑے کو بھی جس نے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تھی نمایان کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حصہ فوج نے دریائے ڈارڈون سے گزر کر ایک اور جیسی فوج کو جو اس کا رستہ روکے پڑی تھی سخت شکست دی اور اس کا ایسا سخت نقصان ہوا کہ خود اون لوگوں کا جو میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگے یہ بیان ہے کہ ”مقتولوں کی تعداد کا خدا ہی کو علم ہے“ تمام وسط فرانس پر عرب ہی عرب چھا گئے اور دریائے لائر کے ساحل تک تمام علاقہ پر مسلط ہو گئے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی برسوں کی جمع کی جوئی دولت اون کی لوٹ میں آئی اور وہ جیسی پیر اور دلی جو اپنی روحانی تصرفات کے کرشمے آئے دن بے وجہ و بلا ضرورت دکھایا کرتے تھے آج جبکہ اون کی کراستوں کی ایسی سخت ضرورت تھی ایسی شئی بھولے کو ایک بھی

کراست یا معجزہ نہ دکھاسکے۔

آنحضرتؐ عین چارلس مارٹل نے حملہ آوردن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ ٹورس اور پائشیرس کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ ہوئی جو سات دن تک رہی۔ اس ہوکر مین عبد الرحمن شہید ہوا اور عرب پسپا ہوئے۔ اس کے بعد ادھنین بہت جلد کوہستان پھینچے سے گذر کر اسپین واپس آنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس لحاظ سے گویا دریائے لائر کا ساحل مغربی یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدمی کی انتہائی حد ہے۔ لیکن ان مہتمم با نشان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے: ”جبل الطارق سے لے کر تائبہ ساحل لائر عربوں نے فتح و نصرت کا ایک مسلسل خط کیسج دیا تھا جس کی لمبائی ایک ہزار میل سے اوپر تھی۔ اگر اسی قدر فاصلہ وہ اور طے کرتے تو پولینڈ کی حد و تک اور دوسری طرف اسکاٹ لینڈ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے“ اسلام کے ان جنگی کارناموں پر ان واقعات کا اضافہ کرنا غیر ضروری ہے کہ کیونکر بحر روم میں اپنے فحمند بیرون کو لے جا کر ادھنون نے اول کریٹ کو فتح کیا پھر تسلی کو سفر کیا اور ادس کے بعد روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ البتہ اس امر کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی اٹالیہ اور تسلی میں ادن کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو ایک بہت بڑی تحریک پہنچی۔

برسبیل تذکرہ چارلس قلم سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں کہ اسلام نے روما کو ذلیل و رسوا کیا۔ حقیقت میں ادن واقعات سے زیادہ اور کیا امر اس کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہو سکتا تھا جو مسلمانوں نے پیش آنی۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جمیعت دریائے ٹائبر میں ہوئی ہوئی روما کی دیواروں کے سامنے آکر انداز ہوتی ہے۔ اس قدر طاقت تو اس جہات میں ہے نہیں کہ زبردستی شہر میں داخل ہو جائے لہذا وہ حوالی شہر ہی کو لوٹتی ہے۔ مگر جاون اور خانقاہوں کی بے حرمتی کرتی ہے اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے مزاروں کو پاؤں

تسے روئندتی ہے۔ خود اگر شہر کا شہر تاخت و تاراج ہو جاتا تو اوس کا اخلاقی اثر ایسا بُرا نہ ہوتا جیسا اس حالت میں ہوا۔ مسلمانوں نے سینٹ پیٹر کے گرجا سے اوس کی چاندی کی قریبا لگا لاکھ ٹنڈا لیا اور اوسے بطور یادگار غلبہ اسلام افریقہ بھیج دیا۔ مسیحیت کے ہلکے میں اس سے زیادہ ناسور اور کیا پڑ سکتا تھا کہ سینٹ پیٹر کی وہی قریبا لگا لاکھ ٹنڈا جو اس کی سب سے بڑی مذہبی علامت تھی یون غارت ہو جائے۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ عرب پہلے ہی کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اس کی تسخیر ممکن نہ سکتی تھی۔ صرف معرض التوائین پڑی ہوئی تھی۔ روم کی ایسی سخت توہین ہوئی تھی کہ اوس کے تصور و خیال کے اندام ارادت پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایشیائی کوچک کے قدیم کلیسا معدوم ہو چکے تھے۔ کوئی مسیحی مسلمانوں کی اجازت کے بغیر بیت المقدس میں قدم تک نہ رکھ سکتا تھا۔ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمر ٹھہری تھی۔ اسکندریہ کے کھنڈروں میں ”مسجد رحمت“ اوس عرب سپہ سالار کی یاد کو تازہ کرتی تھی جس نے قتل عام سے یہ ہو کر رسولِ عربیؐ کے بچے کچھے دشمنوں کو جنہیں ڈھونڈے سے بھی راہ فرار نہ ملتی تھی حثارت آمیز رحم کے ساتھ امان دی تھی۔ جہان ایک زمانہ میں کار تیج کا پر رونق اور دلکش شہر آباد تھا وہاں اب بجز اوس گڑگاہ میں بھلے ہوئے کھنڈروں کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور مذہبی سلطنت دفعۃً پردہ عدم سے نکل کر نصف شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا ایک سر بجز اوقیانوس پر تھا تو دوسرا دیوار چین پر۔ ایک حد بحیرہ خزر کے کنارے سے ملتی تھی تو دوسری بحر ہند کے ساحل سے۔ اس پر بھی ایک لحاظ سے یہ سلطنت اپنے فتنائے عروج پر نہ پہنچی تھی۔ اس لئے کہ ایک دن وہ آنے والا تھا جب وہ قیصر کے جانشینوں کو اون کے دار الحکومت سے نکال کر اور جریزہ نمائے یونان پر اپنا پھریرا اڑا کر ایک طرف تو یورپ کے قبضہ کے لیے اس براعظم کے بیچون بیچ عیسائیت پر حملہ کرنے والی تھی اور دوسری طرف افریقہ کے آتشیز مہمراؤں اور دبا انگیز جنگلوں میں اپنے موحدانہ عقاید کی تلقین کرتی ہوئی ساحلِ بحرِ روم پر

خطا استوار کے پرے سرے تک نفاذ انا ولا غیر ہی بجانے والی تھی۔

اسلام کو اگرچہ ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی تھیں لیکن سلطنت خلفائے نصف انہماک کمال پر پہنچ چکی تھی۔ یورپ کو اسلام کی حلقہ گبوشی سے جس چیز نے بچا یا وہ چارلس مارٹل کی تلوار نہ تھی بلکہ عربوں کی وسیع سلطنت کے اندر دینی فسادات تھے۔ اگرچہ خلفائے بنو امیہ کی حکومت سے شام کے لوگ خوش تھے لیکن باقی ہر جگہ وہ غاصب اور جابر سمجھے جاتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ اصلی ستمی خلافت آل رسولؐ ہے۔ تین جماعتوں نے جو اپنے اپنے علموں کے رنگ سے ممتاز ہوئیں خلافت کو اپنے فسادوں اور نزاعوں سے پارہ پارہ کر دیا اور ادن کے وحشیانہ مظالم سے اس کی وہ بے وقربی اور بے حرمتی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے بنی امیہ نے سفید رنگ اختیار کیا۔ بنی فاطمہ نے سبز اور بنی عباس نے سیاہ۔ آخر الذکر جماعت آنحضرتؐ کی اولاد عم تھی۔ ان خانہ جنگیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دسویں صدی میں سلطنت اسلام کے تین حصے ہو گئے اور تین علیحدہ علیحدہ خلافتیں بغداد قاہرہ اور قرطبہ میں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کا اب خاتمہ ہو گیا اور مسیحیت کی جان مین جان آئی۔ لیکن مسیحیت کی سلامتی کا باعث تائید آسانی نہ تھی بلکہ مسلمان فرمانرواؤں کی رقابت اور باہمی نزاع۔ اندر دینی فسادوں اور خانہ جنگیوں کو اغیار و اجانب کی دست اندازیوں نے اور زیادہ مہلک بنا دیا اور جب ترک اور بربر برسر اقتدار ہوئے تو اس عربی تحریک کا جس نے دنیا کی عقلی و دماغی ترقی میں اتنا بڑا حصہ لیا تھا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی خانہ جنگیوں میں عرب اس درجہ مہلک ہو رہے تھے کہ انہیں یورپ کی مخالفت کی خس برابر بھی پروا نہ رہی تھی۔ آٹلی اپنی تاریخ میں سچ کہتا ہے کہ ”عربوں میں ایک بھی سپہ سالار یا جرنیل یا کپتان ایسا نہ تھا جو یورپ بھر کی متفقہ فوجوں سے اگر اپنی توہین کر لیتا تو اسے اپنی بہت بڑی ذلت اور رسوائی نہ خیال کرتا۔ اور اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا وہ تھی کہ یونانیوں نے ان شوخ چشم حملہ آوروں کے استیصال کے لیے جان نہ لڑ دی

تو جو شخص ان لوگوں کی طبیعتوں سے واقف ہے اس کے لئے یہ جواب کافی ہو گا کہ عمرو بن العاص اسکندریہ میں برسر حکومت تھا اور معاویہ دمشق میں۔“

یورپ والوں کو مسلمان جس حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کا انداز اس مثال پر ہو سکتا ہے کہ جب نائسیفورس قیصر مردم نے خلیفہ ہارون الرشید کو ایک خط لکھا جس میں خلیفہ کو دھمکی دی گئی تھی تو اس سے یہ جواب ملا:-

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امیر المؤمنین ہارون الرشید کی طرف سے نائسیفورس رومی کتے کے نام۔ ادبے ایمان مان کے بیٹے میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اس خط کا جواب بخوگا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔“

تاریخ گواہ ہے کہ یہ جواب خون و آتش کے حروف میں فریجیا کے میدان جنگ کے صف پر لکھا گیا۔

کسی قوم سے اگر ملک چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر اس کے خزانے لوٹ لئے جائیں تو وہ بھر بھی پنب سکتی ہے۔ بڑے سے بڑا تادان جنگ ادا کرنے کے بعد بھی اس کی حالت کا سدھر نامکن ہے لیکن جنگ کے اس نہایت ہی خوفناک عمل کے بعد یعنی اس کے بعد کہ اس قوم کی عورتوں کو فواج اپنے ذرت میں لے آئے اس قوم کی بقا محال ہے۔ جب ابوعبیدہ نے فتح انطاکیہ کی خبر دربار خلافت میں بھیجی تو حضرت عمرؓ نے جو اس وقت خلیفہ تھے ابوعبیدہ کو اس بات پر ملامت کی کہ کیوں اس نے فوج کو سپاہیوں کو عورتوں کی صحبت سے روکا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:- ”اگر وہ شام میں شادی کرنا چاہیں تو کرنے دو اور لونڈیاں بھی جتنی رکھنی چاہیں رکھنے دو۔“ حقیقت یہ ہے کہ کثرت ازدواج کی رسم جس پر ممالک مغربہ کی عورتوں کو اپنے جلالہ تصرف میں لاتے وقت مسلمانوں نے عمل کیا اسلامی حکومت کے ثبات و قیام کی مدد ہوئی۔ ان شادیوں سے جو اولاد پیدا ہوئی اس کے لیے فاتحانہ کی نسل سے ہونا مایہ فخر و ناز ہو گیا۔ اس حکمت عملی کے موثر و کارگر

ہونے کا سب سے بڑا ثبوت شمالی افریقہ میں ملتا ہے جہاں کثرت از دواج کا قوی اثر ملک کی سیاسی و عمرانی حالت کے بدلنے میں نہایت حیرت انگیز ثابت ہوا۔ ایک بھی نسل نہ گزرنے پائی تھی کہ اس علاقہ کے حکام نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ خراج اب سو قوت ہونا چاہیو اس لئے کہ یہاں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں سب مسلمان ہیں اور سب کے سب عربی بولتے ہیں۔

اسلام کو جس صورت میں اس کا بانی چھوڑ گیا اوس پر اگر نظر غایر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک تجسیمہ مذہب ہے۔ اس کا خدا محض ایک کوہ پیکر انسان تھا۔ اس کی ہست جسمانی لذتوں کا ایک عیش آفرین محل تھی۔ لیکن ان ناقص خیالات کی قید سے اوں مسلمانوں نے جو زیادہ فطین و فہیم تھے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور بجائے ان کے زیادہ فلفیہانہ اور زیادہ صحیح خیالات قائم کیے۔ آخر کار لا اوریت کے حکیمانہ عنصر کی آمیزش کی بدولت ان خیالات کو اوں خیالات کے ساتھ مطابقت ہو گئی جنہیں آج کے دن پایا محروما کی کونسل بھی صحیح سمجھتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی کا قول ہے :- ”خدا کا علم اوس علم کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو اپنے یا اپنی روح کے متعلق حاصل ہے۔ خدا کی صفات کو انسان کی صفات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اوس کی شانہ نشی اور آئین حکمرانی کا نہ مقابلہ ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“



لے مصنف کو شاید یہ معلوم نہیں کہ امام غزالی کا یہ قول قرآن کے مشہور و معروف آیت لیس کمشدہ شعی کی شرح ہو جو علی رؤس الاشہاد اس الزام کی تردید کر رہی ہے کہ اسلام ایک تجسیمہ مذہب ہے۔ مترجم

پوٹھاباب

جنوب میں سائنس کا احیا

نسطوریوں اور یہودیوں کے اثر کی وجہ سے عرب الکتاب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تضاد قدر اور سرفروخت ازلی کے متعلق ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کائنات کی ہیئت ترکیبی کا ان کو صحیح صحیح علم ہو جاتا ہے۔ وہ زمین کی جستا اور شکل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے خلفاء عظیم ان کتب خانوں کی بنا ڈالتے ہیں علوم و فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور رمہد کا بن قائم کرتے ہیں۔ وہ فن ریاضی کو ترقی دیتے ہیں الجبرا ایجاد کرتے ہیں اور فن ہندسہ و فن مثلث پر بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ فنون ریاضی و ہیئت کے متعلق قدیم یونانی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور انکا عربی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ارسطو کے طریقہ استقراء تام پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بہت سے دارالعلم قائم کرتے ہیں اور نسطوریوں کی مدد سے موجودہ وضع کے مدارس کھولتے ہیں۔ عربی سیاق و اعداد اور فن حساب کو رواج دیتے ہیں اور ستاروں کی فہرستیں مرتب کر کے ان کے نام رکھتے ہیں۔ موجودہ فنون ہیئت و کیمیا و طبیعیات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فلاح و صنعت و معرفت کو بہت کچھ ترقی دیتے ہیں۔

خلیفہ چہارم حضرت ثانی کا قول ہو کہ میں نے اپنی طویل طویل زندگی میں اکثر یہ بات دیکھی ہو کہ انسان عادات و خصایل میں اپنے آبا و اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہمعہرون سے۔ رسول عربی کے والد کا یہ حکیمانہ مقبولہ نہایت ہی درست ہے اس لیے کہ گو کسی شخص کے جسمانی حلیہ و

یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فلان نسل سے ہے لیکن اوس کی ترکیب و مافی اور اس لحاظ سے اوس کی خیالات کا رجحان اودن حوالی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے جب حضرت عمرؓ کے نائب عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کر کے عربی سلطنت میں شامل کیا تو اسکندریہ میں اوس کی ملاقات یوحنا عرف فلوپئس ایک یونانی نحوی سے ہوئی۔ فلوپئس ایک سوزانی لفظ ہے جس کے معنی محنت پسند کے ہیں۔ رفتہ رفتہ عمرو اور یوحنا میں دوستی ہو گئی اور اس دوستی کے بھروسے پر محنت پسند نے عمرو سے درخواست کی کہ کتب خانہ اسکندریہ کی جو کتا بین حوادث جنگ - مردرد ہو اور مذہبی تعصب کی پیچیدہ سے بچی بچائی باقی چلی آتی ہیں وہ اسے دے دی جائیں۔ عمرو نے اس بارہ میں خلیفہ سے استصواب کیا۔ وہاں سے یہ جواب آیا کہ اگر یہ کتا بین کلام الہی یعنی قرآن مجید سے مطابق ہیں تو اودن کا رکھنا فضول ہے اور اگر نہیں مطابق ہیں تو ضرر رسان ہیں لہذا انہیں ضائع کر دو۔ اس فرمان کی بنا پر سب کتا بین اسکندریہ کے حاکموں میں تقسیم کر دی گئیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ اودن کے جلنے میں چھ جہینے کی مدت لگی۔ اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا۔ وہ نوشت و خواند سے عاری تھے اودن کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر اودنہوں نے یہ حکم دیا تو کون تعجب کی بات ہے۔ عمرؓ کے اس فعل نے گویا علیؓ کے قول کی تصدیق کر دی۔

لیکن یہ نہ قیاس کرنا چاہیے کہ وہ کتا بین جو یوحنا و محنت پسند کو اس درجہ عزیز تھیں وہ کتا بین تھیں جو تاجداران سلسلہ بطلموسیہ کے مشہور کتب خانہ یا یونیورسٹی پر گیس کے کتب خانہ کا سرمایہ اعتبار تھیں فیئد نفس کو کتب خانہ قائم کیے ہوئے ایک ہزار سال کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اس کتب خانہ کی اودھی کتا بین تو جو تئیس سینہ رٹے جلادی تھیں اور بانی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام سے ضائع کرادی تھیں۔ اور دسویں صدی میں ان الفاظ میں حکمی کوئی دوسری تاویل لے اسپین کا ایک مورخ تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے۔ سلسلہ میں (تقریباً ۵۰۰ء)

نہیں ہو سکتی بیان کیا ہے کہ سینٹ سائرل کا چچا تھیا فیلس جب شہنشاہ تھیوڈوسیوس سے کتاب خانہ کی بربادی کا فرمان حاصل کر کے تمام کتابوں کو ضائع کر چکا تو اس کے بیس سال بعد اس نے کتابوں کی الماریوں کو اپنی آنکھوں دیکھا کہ وہ سب کی سب خالی تھیں اور ادون میں ایک کتاب باقی نہ تھی۔ اور اگر بغرض محال یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ایسی وحشیانہ بربادی کے بعد بھی عظیم الشان کتاب خانہ بچ رہا تو ہزار سال کی فرسودگی اور شاید تصرف بجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ یوحنا کو اس کے عرت کی مناسبت سے سندھی اور مشغولیت کا خواہ کیسا ہی بڑا تمغہ کیوں نہ عطا کیا جائے لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک اکیلے یوحنا کی محنت پسندی کیوں کر پانچ لاکھ کتابوں کی نگہداشت اور اہتمام سے عہدہ برا ہو سکتی تھی۔ اور کس طرح ایک ادنیٰ درجہ کا غریب نحوی اس مہتمم باشان کتاب خانہ کو قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا شغل ہو سکتا تھا جس پر پطیمونیون و کشا بانہ محال کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ کتاب خانہ کی جلنے کی جو مدت بتائی گئی ہے اور اس سے بھی کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مہملی کو کاغذ سے زیادہ بڑی ایندھن کا ہونا ممکن نہیں۔ کاغذ اور پٹیل اگرچہ اچھی طرح جل سکتا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) اس لئے انگٹائن کی ملاقات کی غرض سے افریقہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کی مشہور کتاب ”سائینج عالم“ اسی ملاقات کا نتیجہ ہے۔ انگٹائن نے اس کتاب کی تصنیف کی فرمائش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ اس میں اس بات کو ثابت کرنا چاہیے کہ ددات روبا بہت پرستی کے زمانہ میں بھی ویسی ہی حیثیتوں نازل ہوئیں جیسی سیحیت کے زمانہ میں ہو رہی ہیں۔ کارٹیج سے اور دسٹیس بیت المقدس گیا اور دبان چند دن تک پتھیس کی مخالفت میں اس کے حریفوں کا ہم سفر رہا۔ ہنگ رہ کر وطن کو لوٹا۔ رستہ میں اسکندریہ پڑتا تھا۔ چند روز یہاں کی بھی سیر کی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سینٹ سائرل کا مستعصب اور دشمن علم پادری جس نے ہائی پشیا کے حشیانہ قتل و محنت کے گلے پرائی پھری پھیر دی تھی اسکندریہ کا بطریق تھا۔ اول تو سائرل کا چچا تھیا فیلس ہی کتاب خانہ اسکندریہ کی تمام بچی بچی کتابوں کو برباد کر چکا تھا اور بغرض محال اگر کچھ بچ رہی ہوں تو فرور ہے کہ ہائی پشیا کے حشی قاتل نے انہیں ضائع کر ڈالا ہو۔ (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

لیکن ان کتابوں میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جو جھلی پر لکھی ہوئی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکندریہ کے حامیوں نے دو سرا ایندھن چھوڑ کر چرمی اور ارق جلائے پسند کیے ہوں جن کی آغ جیسی تیز ہو سکتی ہو وہ تو ظاہر ہے البتہ چراند کے ہر طرف پھیل جانے میں کچھ شک نہ تھا۔

پس اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یا تو یہ سمجھ کر کہ کتابیں کسی معرفت کی نہیں اور یا اس خیال سے کہ اون کے پڑھنے سے لوگ بد اعتقاد ہو جائیں گے اس کتاب خانہ کے جلائے کا حکم ضرور دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حروب صلیبیہ کے دوران میں بھی پیش آیا جبکہ عیسائی

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور اس لیے اور سیس کی اس تاریخی شہادت کی سچائی میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے کتاب خانہ کو جاکر دیکھا تو اس میں ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ گویا حضرت عمرؓ کی خلافت سے دو سو بیس سال قبل کتاب خانہ اسکندریہ عیسائی پادریوں کی جہالت اور تعصب کے ہاتھوں تمام و کمال برباد ہو چکا تھا۔

۱۴۔ کتاب خانہ اسکندریہ کا بعد حضرت عمرؓ حکم حضرت اقدس جلا یا جانا ایک ایسا الزام ہے جس کی اصل حقیقت کا انکشاف علامہ شبلی کا سحر آفرین قلم کر چکا ہے۔ ہمارے ناظرین میں سے جن صاحب کو اس بحث کی تفصیل مطلوب ہو وہ علامہ مدح کی تعریف ”رسائل شبلی“ کا سامان نظر مطالعہ کریں۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ باوجود اون تمام براہین و دلائل کو جو اس الزام کے جواب میں پیش کی جاسکتی تھیں ڈیرپیر نے یہاں خود پیش کر دیا ہے پھر بھی اسے امر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کتاب خانہ کے جلا دئے جانے کا حکم ضرور نافذ فرمایا۔ ڈیرپیر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ فسخ اسکندریہ کے وقت ”سرمیان“ یعنی فلیڈلفس کے کتاب خانہ کی کوئی کتاب موجود نہ تھی اس لیے کہ تمام کتابیں کچھ تو جو تیس سیرز کے عہد میں جل چکی تھیں اور جو باقی تھیں وہ محکم شہنشاہ تھیوڈوسیوس بطریق تھیانکس کی نگرانی میں منشر کی جا چکی تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اور سیس جو ایک سیچی مورخ ہے اپنے چندید حالات کی بنا پر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ شہنشاہ تھیوڈوسیوس کے حکم کی تعمیل کے بیس سال بعد جب اس نے کتاب خانہ کو جاکر دیکھا تو ایک کتاب موجود نہ پائی۔ اس کے علاوہ مصنف اون اندر دنی و ذیلی مشہداتون کا بھی مقرر ہے جو اس اصولی ثبوت کی موید ہیں مگر با این ہمد اوس امر ار دہستید اسے کام لے کر جو معقولیت سے کو سو نہ دو رہے اور جس میں کسی سو فسطائی کی کٹھ جھتی کی شان نظر آرہی ہو (بقیہ مضمون صفحہ آئندہ)

مجاہدوں نے کتب خانہ طرابلس کو جس کے نسخوں کی تعداد ازراہ مبالغہ تیس لاکھ بیان کی گئی ہے۔ آگ لگا دی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب عیسائی کتب خانہ طرابلس کے پہلے کمرہ میں داخل ہوئے تو اونہیں بجز قرآن کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس سے اونہوں نے یہ قیاس کر کے کہ باقی کتب بھی ان حضرتؑ کی تصانیف ہوں گی تمام کتب خانہ کو آگ میں جھونک دیا۔ ان دونوں تصون میں

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) یہ کہے جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے کتب خانہ جلا دیا گیا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ وہ نوشت و خواند سے عاری تھو اور ان کے چار دن طرقت تعصب اور جہالت کا بادل چھایا ہوا تھا لہذا اگر اونہوں نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ افسوس ہے کہ اگر ڈیرہ پیر نے اس مقام پر ایسے جہل مرکب کا ثبوت دیا ہے جس کی ایسے عالم و فاضل شخص سے ہم کو ہرگز توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ کو نوشت و خواند سے عاری اور تعصب و جاہل سمجھنا تاریخ کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ جو شخص عربی میں یہ طوطی رکھنے کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی دستگاہ دانی رکھتا ہو جس نے فقہی علم اصول قانون جیسے دانش آزمائش کی بنیاد قائم کی ہو۔ جس کی تختہ انہ عظمت تیردو سو سال سے ایمان کے دونوں جاگیرین ہو۔ جو شعر و سخن سے ایک خاص مذاق رکھتا ہو اور اشعار و نثر و لطیف کے سب سے بڑے نقاد ہونے کی حیثیت سے فنون لطیفہ کے اس شہسوار خاص کا بہت بڑا سر پرست مانا گیا ہو۔ جس کو علم الانساب موروثی طور پر ترکہ میں ملا ہو۔ جس نے تعلیم کو جن معنوں میں کہ یہ لغت اسلام کے فروع اولیٰ میں مستعمل تھا عام بلکہ ایک حد تک جبری کر دیا ہو۔ جس نے سب سے اول قرآن کے جمع و مدون کئے جانے کی تحریک کی ہو۔ جس کو قرآن ”قول رب زدنی علما“ اور حدیث سے ”اطلبوا العلم ولو کان بال صمدین“ کا سبق ملا ہو۔ جو مدیتہ العلم کے خرم فیوض کا خوشبین اور باب العلم کا ہم چشم و ہم نشین ہو۔ جس کی مسالت۔ رواداری۔ الفان۔ سیاست و حکمت شہرہ آفاق ہو اور جاہل و تعصب کہنا و اگر ڈیرہ پیر بھی کا کام ہے۔

مصنف نے حضرت علیؓ کے اس قول کو کہ انسان مادات و خصایل میں اپنے آباؤ اجداد سے اتنی مشابہت نہیں رکھتا جتنی اپنے ہم عمروں سے۔ حضرت عمرؓ کے جہل و تعصب کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جہالت و تعصب کے حوالی میں زندگی بسر کرنے کے باعث اگر (بقیہ مضمون بر صفحہ آئینہ)

کسی قدر اصلیت اور بہت کچھ مبالغہ ہے۔ لیکن مجنونانہ تعصب نے ہمیشہ اس قسم کی حرکتوں سے اپنا نام کیا ہے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا تو ڈھیر کے ڈھیر اودن کتابوں کے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) حضرت عمرؓ بھی اپنے معاصرین کی طرح جاہل و متعصب تھے تو پھر انہیں حوالی میں سے حضرت علیؓ کا ساجیم اور غلشنی کس طرح پیدا ہو گیا جس کی حکمت کا خود ڈریسہ کو بھی اقرار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ جہات الامور میں حضرت عمرؓ کو صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے اور کوئی اہم مسئلہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں حضرت علیؓ کی رائے نہ لی جاتی ہو۔ پس اگر حضرت عمرؓ نے اوس کتب خانہ اسکندریہ کے جلاے جانے کا حکم دیا جس کا وجود بلال قاطع و براہین ساطع متعصب پادریوں اور اودن کے جوتامشائس ہم صغیروں کے دماغ ہی میں ٹھکن ہونا ثابت ہے تو اس الزام میں حضرت علیؓ بھی حضرت عمرؓ کے برابر کے ساجھی ہیں۔ لیکن شاید ڈریسہ کو حضرت علیؓ پر بھی جاہل و متعصب ہونے کا الزام لگاتے ہوئے تامل ہو گا۔ مترجم

۱۵۱ کتب خانہ اسکندریہ دس لاکھ تصدین تو ہم نے ثابت کر دیا کہ مبالغہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ پادریوں کی طرف سے ہے لیکن مسیحی مورخ اس واقعہ کی تکذیب و تردید نہ کر سکیں گے کہ حردوب ملیبیہ کے جاہل و وحشی سوراؤن نے کتب خانہ طرابلس کو اوس وقت جلایا جبکہ اوس میں لاکھوں کتابیں جمع تھیں۔ کتب خانہ اسکندریہ کا تو حضرت عمرؓ کے عہد میں سرے سے وجود ہی نہ تھا مگر جب عیسائی سوراٹا طرابلس پر حملہ آور ہوئے ہیں تو کتب خانہ طرابلس اپنی پوری علمی شان کے ساتھ موجود تھا۔ یہ واقعہ مسلم و متحقق ہے کہ پندرہویں صدی تک یہ حیثیت مجنونانہ جہالت اور مجنونانہ تعصب کی مترادف تھی جس کا خیا زہ علوم و فنون کو رہ کر کھینچنا پڑا بخلاف اس کے مسلمان علم و حکمت کے علم بردار اور غفلت کن تمدن کی شیعہ تھے۔ ایسی حالت میں اگر وحشی و خونخوار مسیحیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہو کہ اودہوں نے کئی لاکھ کتابیں جو مسلمانوں نے جمع کی تھیں جلادین تو اودن کے حامیوں کا یہ فرمانا کہ کئی لاکھ نہیں بلکہ صرف چند ہزار کتابیں جلائیں واقعہ آتش زنی کی سنگینی اور مسیحیوں کے تعصب و وحشیانہ پن کے اشتداد کو کم نہیں کر سکتا۔ مانا کہ کتب خانہ طرابلس میں کئی لاکھ نسخے نہ تھے بلکہ کئی ہزار تھے لیکن اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ حردوب ملیبیہ کے مسیحی سوراؤن نے ان سب کو آگ میں جھونک دیا۔ بجائے کئی ہزار کے اگر کئی لاکھ نسخے ہوتے تو کیا اودن کی بے محابا آتش زنی سے بچ جاتے ہترجم

جن میں امریکہ کے قدیم تمدن کی داستان بظہر من الشمس تصور محفوظ تھی کمال وحشیانہ پن سے جلاوٹے اور یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی زمانہ نہیں کر سکتا۔ ہسپانیہ کے ایک متعصب پادری ریکر دخیل زمین نے غناطہ کی چوک میں عربی زبان کے انٹی ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگا دی۔ ان میں سے بہت سے نسخے شاہی مصنفین زمانہ قدیم کی تصانیف کے عربی تراجم تھے۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اسکندر کی ایرانی فتوحات نے فن انجینیئری کے متعلق یونانیوں کی قابلیت کو ترقی دے کر فرمانروایان سلسلہ بطلمیوسیہ کی سرپرستی میں سائنس کے نشو و نما میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ یہاں ہم تاریخ کے سبق کو دہرا کر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عربوں کے فوجی کارناموں سے بھی اسی طرح کے نتائج مترتب ہوئے۔

فاتح مصر محمد بن العاص اور یوحنا بن خلیفہ کی باہمی دوستی صاف ظاہر کرتی ہے کہ عربی دماغ ترقی کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کعبہ کی بت پرستی سے محمد صلعم کی وحدانیت تک پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ادب و انشا اور فلسفہ و حکمت کے بہارستان کی سیر کے لیے تیار پایا۔ عربوں کی اس ترقی کے اسباب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو دو اثرات نمایاں نظر آتے ہیں یعنی (۱) شام میں نسطوریوں کا اثر اور (۲) مصر میں یہودیوں کا اثر۔

گذشتہ باب میں ہم نے اون غتیوں کا ذکر کیا ہے جو نسطور اور ادس کے پیروں کو بخانیہ کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑیں۔ اگرچہ اون کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے اور اون میں سڑی بہت سے مارے گئے لیکن وحدت باری تعالیٰ کے اصول سے اونہوں نے کبھی منہ نہ موڑا۔ اولپس کے دیوتاؤں اور دیویوں سے اونہوں نے ہمیشہ نہایت سختی کے ساتھ اور قطعی طور پر انکار کیا۔ اون کا قول ہے کہ ”آسمان کی ملکہ کو چار دور ہی سے سلام ہے۔“

ان خاص عقاید کی وجہ سے نسطوریوں کو اپنے عرب فاتحوں کے ساتھ مل جانے میں کچھ بھی وقت پیش نہ آئی۔ مسلمان اون کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور سلطنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر اونہیں نہایت فراخ دلی سے مقرر کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو

ہر تہیہ تمام ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ نسطوریوں کے اعتقاد عظیم
جسوسیاس کے ساتھ خود ان حضرت اور اوان کے بعد حضرت عمرؓ نے معاہدے کئے اور آگے
چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی سلطنت کے تمام مدارس کا ناظم ایک نسطوری المذہب عالم
جہان مانس کو مقرر کیا۔

نسطوریوں کے اثر کے ساتھ یہودیوں کا اثر بھی شامل ہو گیا۔ جب عیسائیت میں بت
پرستی کی آئینہ نش کے آثار شروع ہوئے تو یہودیوں نے مذہب عیسوی میں داخل ہونا ترک کر دیا
اور جب عیسائیت میں اتانیم تلمتہ کا عمل ہوا تو یہ مذہبی تبدیلی مطلقاً موقوف ہو گئی۔ مقرر اور شام کے
شہر دن میں یہودی کثرت سے آباد تھے۔ ایک فقط اسکندریہ ہی میں جب عمرو بن العاصؓ نے اسے
فتح کیا ہے چالیس ہزار یہودی ایسے تھے جو حکومت کو خراج ادا کرتے تھے۔ صدیوں تک وقف
مظالم و مصائب رہنے کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ وحدت ذات باری میں اور زیادہ راسخ
ہو گئے تھے اور بت پرستی کی طرف سے اوس قلبی نفرت کا اشتداد اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا
جسے وہ اپنے سینہ میں بابل کی اسیری کے زمانہ سے امانت کے طور پر جگہ دے چلے آتے تھے۔
نسطوریوں کے ساتھ شریک ہو کر ادنیہوں نے فلسفہ کی بہت سی یولانی دلاطینی کتابوں کا شامی
زبان میں ترجمہ کیا اور اس شامی ترجمہ کا پھر عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان دونوں فرقوں کو اسلامی تمدن
کے ساتھ دو مختلف حیثیتوں کا تعلق رہا۔ نسطوریوں نے مسلمان امرائے بچوں کی تعلیم و تربیت کا
ذمہ لیا اور یہودی طبیب بن کر ان گھرانوں تک پہنچے۔

ان اثرات سے مسلمانوں کا تقصیر کم ہو چلا۔ ادن کے اخلاق پسندیدہ ہو گئے ادن کو
خیالات میں شہسنگی آگئی۔ جس سرعت سے ادنیہوں نے دولت و ماکہ صوبوں کو تاخت و تاراج
کر ڈالا تھا اسی سرعت سے فلسفہ اور سائنس کی ملکیتوں کو سفر کر لیا۔ اور اسلام کی عامیہ ناظیوں کو
چھوڑ کر سائنس کا حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں ہارون طرف بت ہی بت بچ رہے تھے عربوں کی تلو اور خدا نحر

ذوالجلال کے توحید کی حمایت میں چکی اور تقدیر کو مٹا کر رسی۔ اس کامیابی کا سہرا تقدیر کے اوس مسئلہ کے سربراہ جس کی تلقین قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :- ”کوئی شخص اپنے مقدر کو ٹال نہیں سکتا۔ تقدیر کی سماعت نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر ہم بدعت مشین میں بھی محفوظ ہوں تو موت سے نہیں بچ سکتے۔ خدا نے ہر شخص کی موت کا مقام ازل سے مقرر کر رکھا ہے۔“ رسول اللہ کا قول ہے کہ ”کوئی شخص جھاگ کر اپنی تقدیر سے بچ نہیں سکتا۔ شہسواران قضا و قدر رات کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں..... خواہ نیم بستر پر سوتے ہو خواہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہو ملک الموت کی آنکھ سے نہیں بچ سکتے“ حضرت علیؑ جبکی دانش و حکمت کا ذکر ہم پیشتر کر چکے ہیں کہتے ہیں کہ ”مجھے یقین ہے کہ معاملات انسانی میں ہمارے انتظام کو دخل نہیں بلکہ خدا کے فیصلہ کو دخل ہے۔“ غرض مسلمان وہ ہیں جو راضی برضاے الہی ہو کر خدا کے آگے گردن تسلیم جھکا دیں۔ وہ جبر و اختیار میں یہ کہہ کر توافق پیدا کرتے ہیں کہ نقاش قضا نے ہمیں خاک کی گھینچ کر دے دیا ہے اوس میں رنگ آمیزی ہم اپنے اختیار اور مرضی سے کرتے ہیں۔ اون کا قول ہے کہ قوانین قدرت پر غالب آنے کے لیے ہمیں اون کا مقابلہ نہیں بلکہ موازنہ کرنا چاہیے۔

اس عجیب عقیدے نے مسلمانوں کو اون کا رہاے نمایان کے لیے تیار کر دیا جو بظاہر انسانی کوشش کی رسائی سے باہر تھو لیکن جن کو عربوں نے انجام دے کر دکھا دیا۔ اسی عقیدے نے مایوسی کو مبدل برضا و تسلیم کر کے انسان کو امید سے مستغنی ہونا سکھا دیا۔ عربوں میں ایک مثل تھی کہ مایوسی حریہ ہے اور امید عہد۔

لے اسلام کی تعریف مولوی سید امیر علی صاحب اپنی کتاب ”اسپرٹ آف اسلام“ میں باین الفاظ کر آہیں :-
 ”اسلام مادہ سلم سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی طینان قلب۔ سکون نفس۔ بجا آوری فرض۔ ادا کر دین۔
 کامل آشتی دامن اور بالآخر اپنے آپ کو اوس ذات پاک کے تئیں سوئپ دینے کے ہیں جس کے ساتھ رشتہ آشتی دامن قائم کیا جائے۔ جو اسم اس مادہ سے مشتق ہے اوس کے معنی امن (بقیہ مضمون پر صفحہ آئندہ)

لیکن جنگ میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے صاف طور سے ثابت کر دیا کہ تقدیر ایک بڑی حد تک تابع تدبیر ہے۔ تجربہ سے عربوں کو معلوم ہو گیا کہ دواسے دردم کھینچتا ہے مہم پٹی کرنے سے زخم بھر سکتا ہے اور جو شخص دم توڑ رہا ہو اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو طبیب کی سیجائی سے گویا از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ اطباء یہود قرآن کو مسئلہ تقدیر کی تردید کی زنجیر مثال بن گئے۔ رفتہ رفتہ قسمت اور تقدیر کے مسئلہ کی سختی

بقیہ مضمون ص ۱۰۵ گذشتہ قطع سلامتی اور نجات کے ہیں۔ عام طور پر اس لفظ سے مطلقاً راضی ہو کر رہا ہے آہی ہونا مراد لیا جاتا ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے معنی ہیں نیک بننے کی کوشش کرنا۔ مترجم

۱۔ کلام مجید میں اگرچہ بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور و محض ہے چنانچہ (۱) لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ (۲) هو القاهر فوق عباده (۳) وما تشاءون الا ان یشاء اللہ (۴) قل کل من عند اللہ لا مطلب بادی النظر میں یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے انسان کو کچھ اختیار نہیں دیا گیا لیکن یہ مطلب اسی آیات ہی وہی لوگ نکالتے ہیں جو ظاہر میں ہیں اور مسلح کے نیچے جانے کی زحمت اپنے دماغ کو نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کائنات مجموعہ اضداد ہے یعنی ہر شے کے لیے ایک بدی کا ہونا لازم ہے ہر ہندی ایک پستی کو چاہتی ہے ہر نور ایک ظلمت کا محتاج ہے غرض دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور اس کی ضد کے بغیر ممکن ہو اسی طرح مسئلہ جبر بھی اپنی ضد یعنی مسئلہ اختیار کا مستلزم ہے۔ یہ فلسفیانہ بحث قرآن کی اون بظاہر متعارض مگر باطن متوافق آیات میں مضر ہے جن میں سے کسی میں اگر یہ کہا گیا ہو کہ تم کسی بات کو نہ چاہو گے جب تک کہ خدا نہ چاہے تو کسی میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ جبر و اختیار کی یہ آمیزش اس نکل اور ازلی قانون کے مقتضیات میں سے ہے جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے (۱) لا تبدل خلق اللہ (۲) خلق کل شیء فقد رآہ تقدیرا (۳) فلن تجد لسنة اللہ تبدیلا (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۵۶)

کم ہو گئی اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ انفرادی حیثیت سے انسان کے افعال کو تئیا ج معلل بہ اختیار ہوتے ہیں اور خاص خاص حدود کے اندر جو افعال اوس سے سرزد ہوتی ہیں اون کی ذمہ دار خود اوسی کا ارادہ یا مرضی ہوتی ہے۔ لیکن اقوام چونکہ ذاتی یا شخصی طور پر خدا کو آگے اپنے افعال کی جواب دہ نہیں ٹھہر سکتیں بلکہ اون کی اجتماعی حیثیت خدا کے بلا واسطہ احتساب سے بالا ہے لہذا وہ قدرت کے غیر تغیر پذیر قانون کے تابع ہیں۔

اس بارہ خاص میں مسیحی اور مسلم اقوام میں فرق تھا۔ مسیحی کو معاملات انسانی میں خدا کی مسلسل دست اندازی پر پورا ایمان تھا۔ اوس کا عقیدہ یہ تھا کہ انتظام کائنات میں قاعدہ قانون کوئی چیز نہیں۔ دعاؤں اور التجاؤں سے انسان خدا کو صورت معاملات کے بدلنے پر

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اس سے زیادہ یکسا نہ توجیہ کائنات کے کسی ارادی یا غیر ارادی حادثہ کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اسباب و علل کے ایک محکم و متعین سلسلہ کے ذریعہ سے اوس مدبر اعظم کی ذات پر جا بھتی ہوتا ہے جو علت العلل اور مظاہر عالم کا سبب اولین ہے۔ لیکن مقدرات کے اس جبر یہ عنصر میں علت العلل نے جس کی حکمت آفرین شان پر ”الذی خلق فسو می“ گواہ ہے ارادہ انسانی کا اختیاری عنصر بھی ایک خاص حد تک شامل کر دیا ہے جس کا اندازہ ”والذی قدر فہدی“ سے کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی رو سے انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار مطلق۔ وہ اون حدود کے اندر جو فطرت انسانی کے ارتقا کو عقلی و روحانی و اخلاقی کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں اپنے افعال کا مختار ہے لیکن ان حدود سے آگے بڑھنے پر قادر نہیں۔ اسلام کی نسبت یہ سمجھنا کہ اوس نے اپنے پیروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی تلقین کی ہے اور یہ سکھایا ہے کہ اگر مر لیض کو مرنا ہے تو طیب سے رجوع کرنا فضول ہے اس لیے سرے سے علاج ہی نہ کرنا چاہیے اس کی تعلیم کا ایک جاہلانہ اور شعصابانہ اندازہ کرنا ہے۔ جس کی نفی نہ صرف قرآن کی آیات بلکہ شایع علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرون اولی کے اون مسلمانوں کی زندگیاں کر رہی ہیں جن سے زیادہ شریعت کا راز دان اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ جبر و اختیار کے معنی کو معارف دستگاہ مولانا روم فرماں سادہ الفاظ میں حل کر دیا ہے۔

(بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

آبادہ کر سکتا ہے اور اگر خدا کی بارگاہ میں اوس کی دعا مقبول نہ ہو تو پھر مسیح یا مریم کی توجہاں کی مطلب برآری کے لیے کافی ہے اور اگر یہاں سے بھی وہ محروم رہا تو پھر بزرگان دین کی شفاعت یا دن کے تبرکات اور ہڈیوں کا اثر مشیت ایزدی کا رد عمل کر سکتا ہے۔ اگر خود اوس کی منت و ساجت یا عجز و الحاح سے کام نہ چلے تو حلقہ کے پادری یا کلیسا کے دوسرے مقدس پیشواؤں کی سفارش خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اوس کی طرف سے کوئی چڑھاؤ یا چڑھا یا گیا ہو یا بندھی رقم بطور نذرانہ پیش کی گئی ہو اوس کی حاجت روائی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ غرض مسیحی دنیا کو یقین تھا کہ فوق الانسان ہستیوں پر اثر ڈال کر وہ معاملات دنیوی کے دہارے کو جس رخ میں چاہے بدل سکتی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کا دار و مدار اس اصول پر تھا کہ خدا کی مشیت قابل تغیر نہیں ہے انسان کو لازم ہے کہ اس کے آگے تسلیم و رضا کا سر جھکا دے۔ عیسائی کی دعا آدہ جلب منفعت ہوتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ بصد عجز و الحاح خدا سے اپنی مراد میں مانگتا تھا اور مسلمان کی دعا اون نعمتوں کا استننا آمیز شکر یہ ہوتی تھی جن سے وہ فائز و بہرہ اندوز ہو چکا تھا۔ دونوں نے گویا دعا کو ہندوؤں کے گیان اور دھیان کا قائم مقام قرار دی رکھا تھا۔ عیسائی کی نظر دن میں ترقی دنیا غیر مربوط حادثوں اور ناگہانی حیرتوں کا ایک سلسلہ تھی مسلمان کے نزدیک اس ترقی میں کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ہر جسمانی حرکت کسی حرکت سابقہ سے وابستہ ہے۔ ہر خیال کسی خیال مابین کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہر تاریخی واقعہ کسی گزشتہ تاریخی واقعہ سے ماخوذ ہے۔ ہر انسانی فعل کسی گزرے ہوئے اور انجام پائے ہوئے فعل کا نتیجہ ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو قرنہا قرن پر محیط ہے آج تک ایک بھی

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ)

گفت پنیسہ بہ آواز بلند بر توکل زانوائے اشتربہ بند

ہم کو اپنی طرف سے مقدمہ رجحان کو شش کرنی چاہیے۔ اور نتیجہ کے لیے اوس لطیفہ ضعی کا منتظر رہنا چاہیے جو عقل پر حکمت و پابند قانون غیر ممکن التعمیر ہے۔ مترجم

واقعہ ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جو ایک ایک طور پر من آگیا ہو۔ علت و معلول اور سبب و مسبب کی سلسلہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے اس ترتیب و تدریج کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ کہیں فصل نظر نہیں آتا۔ مقدار ایک آہنی زنجیر ہے جس کے ملتے واقعات ہیں۔ ہر حلقہ اسی جگہ نصب ہے جہاں خدا و قضا و قدر نے اسے قائم کر دیا تھا۔ ایک حلقہ بھی اپنی جگہ سے آج تک نہ ہلا ہے اور نہ طبع کیا گیا ہے۔ جب انسان عالم میں آتا ہے تو اسے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ جب وہ یہاں سے رخصت ہوگا تو شاید اپنی مرضی کے خلاف رخصت ہوگا۔ پس کیا وجہ ہے کہ وہ جامع تسلیم و رضا پس کر نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار نہ کرے۔

انسان کی شخصی زندگی کے تابع مقدر ہونے کے متعلق جب خیالات میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تو دنیا کی بہت ترکیبی کے بارہ میں بھی خیالات نے پلٹا دکھایا۔ قرآن کی روش زمین ایک سطح مربع ہے جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں اور ان پہاڑوں کا یہ دہرا فائدہ ہے کہ ایک توان کی وجہ سے زمین اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور دوسرے آسمان ان پر لٹکا ہوا ہے۔ اس وسیع بلورین گنبد کو جو بغیر کسی فتور یا حد سے کے اپنی جگہ قائم ہو دیکھ کر ہمیں خدا کی طاقت و حکمت کے لحاظ سے اس کی حمد و ثنا کرنی چاہیے۔ آسمان کے اوپر بہشت کی بنیاد ہے جس کی سات منزلیں ہیں۔ سب سے اونچی منزل خدا کا سکُن ہے جہاں وہ دیوبکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کڑوا لجنخ بیل ہیں جیسے قدیم سہ یانی باو شاہوں کے محل میں ہوتے تھے۔

سے خدا کی شان وہ لوگ جو عربی کا ایک حرف تک نہیں جانتے جی کل معلومات قرآنی کا ماخذ وہ ذیل لفظی ترجمے ہیں جو تبیل جیسے تعصب اور نا اہل پادریوں نے کیے ہیں اس بات کے مدی ہوں کہ وہ قرآن کو حقیقی معانی کے سمجھنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

مصنف کا توان تعال ہو چکا ہے اس لیے ہمارا رویہ سخن اُن کی طرف نہیں ہو سکتا البتہ جو لوگ اُن کے ہم خیال ہیں اُن کی خدمت میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

ریخیالات کچھ اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہیں۔ ہر قوم نے اپنے دماغی نشوونما کے ایک خاص درجہ پر پہنچ کر انہیں وحی آسانی سمجھا ہے۔ لیکن جو مسلمان زیادہ ترقی یافتہ تھے انہوں نے (بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) تحریف شدہ انجیل کی طرح قرآن نے اس قسم کا نودعویٰ کہیں نہیں کیا کہ زمین ایک سطح پر ہے جس کو چاروں طرف پہاڑ ہیں یا یہ کہ زمین غیر متحرک ہے جس پر آسمان ٹکا ہوا ہے یا یہ کہ بہشت آسمان پر ہے اور سب سے اونچے آسمان پر خدا ایک انسان کی شکل میں قیامت پر بیٹھا ہے جس کے دو ذون طرف پر دار ہیل کھڑے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی دن مذہب اور رائے کی حدود کو الگ الگ کر دیا تھا۔ رسول کے مبعوث ہونے کا مشاہدہ تھا کہ لوگوں کو اخلاق صحت سکھائے اور ایک آلے والی زندگی کے حقائق سے آگاہ کرے نہ یہ کہ انہیں جغرافیہ و ہیئت اور فلسفہ و طب کا سبق دیتا پھرے۔ حضور رسالت بنا ہوا صاف صاف یہ فرمایا ہے کہ انتم اعلمہ باموراد نیا کہ۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جابجا البسی آیات پائی جاتی ہیں جس میں آسمان زمین بہشت جہنم کی سی یاد کرے لیکن افلا ینظرون الی الارض کیف سلطت سے یہ معنی لینا کہ زمین ایک سطح پر ہے یا اللہ منجمل الجبال اور تاداک کی یہ تاویل کرنا کہ میاں زمین میں یخون کی طرح ٹھکے ہوئے ہیں اور اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے۔ یا لہ استوی علی العرش کا یہ مفہوم سمجھنا کہ باری تعالیٰ باعتبار جہت و اشارہ دلچسپانہ تحت و فوق سب سے اونچے آسمان پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا ما تدری فی خلق السموات من تفاوت فارجم البصر اهل تدری من فطور کا یہ مطلب سمجھنا کہ آسمان ایک بلورین گنبد ہے جو نیکی کی راہ کے اپنی جگہ قائم ہے فن بلاغت کے اس اصول کی گردن پر اٹھی چھری پھیرنا کہ جس میں خطابیات کے تقبی اثر کارا ز چھپا ہوا ہے۔

علامہ شبلی الکلام میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مباحث اور مسائل اور حقائق سے متعرض نہیں ہوتے اور اس قسم کے امور کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں تو انہیں کی روایات اور خیالات (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

ان کے بجائے وہ خیالات قائم کر لیے جو از روئے سائنس درست و صحیح تھے۔ پھر بھی عیسائی ممالک کی طرح اسلامی ملکوں میں بھی حامیان مذہب کی مخالفت کے بغیر یہ ترقی نہ ہو سکی۔ مثلاً جب آلمامون کو زمین کا ردی الشکل ہونا معلوم ہوا اور اس نے اپنے مہندسوں اور ہیئت دانوں کو ایک درجہ ارضی کی پیمائش کا حکم دیا تو علامہ تقی الدین نے جو اس زمانہ کے مشاہیر علمائے دین میں سے تھے خلیفہ کے اس فعل کو بدعت قرار دے کر ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو ایک جھوٹے اور مشرکانہ فلسفہ کی اشاعت سے گمراہ کرنے کی پاداش میں خدا یقیناً آلمامون پر عذاب نازل کرے گا۔ لیکن آلمامون نے اس فتوے کی کچھ پروا نہ کی۔ اور اپنے حکم کی تعمیل کراہی کر رہا۔ بحیرہ قلزم کے ساحل پر شنار کا میدان اس پیمائش کو لیے تجویز کیا گیا۔ ایک مہرلاب کی مدد سے دو مقامات پر جو ایک ہی خط نصف النہار پر واقع تھے اور جن کا باہمی فاصلہ پورا ایک درجہ تھا افق سے

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) کے مطابق اور اس میں بھی استعارات اور محازات سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست قومی سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ دخل نہیں دیتے مثلاً کائنات الجو یعنی بارش گہن ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب۔ نباتات اور حیوانات کے عجائبات۔ چاند سورج کی رفتار کی مقدار۔ حوادث یومیہ کے اسباب۔ انبیاء سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے۔ مگر ان چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی عقلوں نے ان باتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور اسی اصول کی بنیاد پر جب لوگوں نے آنحضرتؐ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب پوچھا تو خدا نے اس کے جواب سے اعراض کیا اور اس کے بجائے مہینوں کا فایده بیان کر دیا چنانچہ فرمایا **و یسئلونک عن الالہة قل ہی مواقیب للناس** دالجم۔ اکثر لوگوں کا مذاق ان فنون (یعنی ریاضیات وغیرہ) کے اشتغال کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیاء کے کلام کو خدا کی حقیقت محل پر محمول کرتے ہیں۔ مترجم

قطب کے ارتقاع کا اندازہ قائم کیا گیا۔ ان دونوں مقامات کے درمیانی فاصلہ کی جب پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ دو لاکھ ہاشمی گز ہے۔ اس حساب سے گویا کل زمین کا درجہ چوبیس ہزار انگریزی میل ہوا جو صحت سے بہت زیادہ دور نہیں۔ چونکہ زمین کی کر دیت اس قسم کی ایک ہی پیمائش سے قطعی طور پر متنبہ نہ ہو سکتی تھی لہذا خلیفہ نے حکم دیا کہ ایک درجہ کی پیمائش کو فہ کے قریب کی جائے۔ شاہی مہندس دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک نقطہ سے متخالف سمتوں میں روانہ ہو کر ایک جماعت نے بجانب شمال اور دوسری نے بجانب جنوب ایک درجہ ارضی کے قوس کی پیمائش کی۔ اس پیمائش کا نتیجہ گزوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر یہ گز وہی ہیں جو ہاشمی یا شاہی گز کے نام سے مشہور ہیں تو ایک درجہ کے طول کی صحیح مقدار میں اور اس مقدار میں جو انہیں معلوم ہوئی صرف ۱۱ میل کا فرق ہے۔ ان پیمائشوں سے خلیفہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا کردی شکل ہونا مسلم ہے۔

ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کا وحشیانہ تعصب کیوں کر اس قدر جلد تحصیل علوم و فنون کی زبردست خواہش کی شکل میں بدل گیا۔ اوّل اوّل قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاج تھا۔ آنحضرتؐ نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کر کے اس کی پرمٹھ نصاحت و بلاغت کو اپنی مامورین اللہی کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ لیکن ادن کی وفات کے بعد بیس سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ وہ تجربہ جو مسلمانوں کو شام ایران ایشیائے کوچک اور مصر میں حاصل ہوا اپنا رنگ لایا اور یہ واقعہ مسلم ہے کہ حضرت علیؑ نے جو اس وقت سریر آراءے خلافت تھے ہر طرح کے علمی مشاغل کا لوگوں کو خود شوق دلایا۔ امیر معاویہ نے

لے کیا ڈاکٹر ڈریسپر علی زعم آریہ کریمہ ”قل رب نہ دینی علما“ ہم کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام انھیں اکتساب علم و حکمت تھا؟ کیا وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تلوار سنے مشرق و مغرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو اس تحدی کا زور جو ”وان کنتہ فی ساریب عائلنا علی عبدنا فاتوبسورۃ من مثله داد عوشہدا علم ان کنتہ صادقین (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

جوبانی خاندان بنوامیہ مین سلسلہء مین برسر اقتدار ہوتے ہی آئین حکومت مین انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلے حکومت انتخابی تھی اب موروثی ہو گئی۔ اونہون نے مدینہ کے بجائے دمشق کو جس کا موقع زیادہ مرکزی تھا دار الخلافہ بنایا اور عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی اختیار کی۔ اونہون نے اسشتاد و قصب کے سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور علوم و فنون کی سرپرستی شروع کی۔ یہ حیرت انگیز انقلاب تیس سال کے اندر اندر پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ مین ایک ایرانی گورنر جب دربار خلافت مین آداب بجالانے کو حاضر ہوا تو اس نے امیر المومنین کو مسجد نبویؐ کی سیڑھیوں پر فقیروں کے ساتھ سوتے ہوئے پایا لیکن چٹھے خلیفہ امیر معاویہ کے دربار مین دول غیر کے جو سفیر باریاب ہوئے وہ خلیفہ کے روبرو ایک عالیشان محل مین پیش کیے گئے جو نقش و نگار سے مزین اور چمنوں اور فواروں سے آراستہ تھا۔

آن حضرتؓ کی رحلت کے بعد پوری ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ مشاہیر حکماء یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان مین ہو گیا اور ”ایسط“ اور ”آڈیسی“ جیسی نظموں کو جو بوجہ اپنی بت پرستانہ تعلیمات کے موجب گمراہی تصور کی جاتی تھیں علم و دست اور ہنر پر در لوگوں کے شوق نے شامی زبان کا لباس پہنا دیا۔ المنصور نے اپنے عہد خلافت (۱۱۱۸ء) مین حکومت کا مرکز دمشق سے بغداد مین منتقل کیا اور نئے دار الخلافہ کو عروس البلاد بنا دیا۔

(بقیہ مضمون مغلذشتہ) وان لم تفعلوا ولن تفعلوا تقوا الناس التي وقد هان الناس والجدّة اعدت للکافرین کے حزن حزن مین ساری و دایر تھا کم ہو گیا تھا؟ کیا ڈاکٹر ڈریسیر حضرت علیؓ کی مادی کا دم بھی سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ باوجودیکہ قرآن ادب و انشا اور حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا پھر بھی اونہون نے لوگوں کو ہر طرح کے علمی مشاغل کا شوق بطور خود دلایا؟ کیا ڈاکٹر ڈریسیر کے ہم خیال قریباً ساڑھے تیرہ سو سال کے گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی کتاب دکھا سکتے ہیں جو فصاحت و بلاغت مین قرآن کی ٹھکر کی ہو؟ مترجم

اوس کا بہت سادقت علم ہیئت کے مطالعہ اور اس فن شریف کے ترقی دینے میں صرف ہوتا تھا اس کے علاوہ اوس نے سلطنت میں جا بجا طب اور قانون کے مدارس قائم کیے۔ اوس کا پوتا ہارون الرشید (۸۰۶ء) بھی اسی کے نقش قدم پر چلا چنانچہ اوس کے حکم سے دولت عباسیہ کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ لیکن علم و حکمت کا سب سے زیادہ روشن زمانہ بوالشیا کے لیے سربراہ صد افتخار و نازش ہے المامون کا عہد خلافت ہے (۸۱۳-۸۳۲ء)۔ اوس نے بغداد کو سائنس کا مرکز بنا دیا۔ عظیم الشان کتب خانے قائم کیے اور اپنے دربار کو علما و فضلا کی مجلس بنا دیا۔

یہ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اوس دقت تک بھی بدستور قائم رہا جب کہ اندرونی تنازعات و فسادات کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بنی عباس ایشیا میں بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اندلس میں ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تو تھے ہی لیکن علم و حکمت اور ادب و انشا کی سرپرستی میں بھی ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لے جائے۔

شعرو سخن میں عربوں نے ہر دلچسپ و نتیجہ خیز مضمون پر کتا بین لکھیں۔ ادن کو اس امر پر ناز تھا کہ ایک اکیلے عرب نے جس قدر شاعر پیدا کئے ہیں وہ تعداد میں دنیا بھر کے شاعروں سے زیادہ ہیں۔ سائنس میں اون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اکتساب میں ادنیٰ نہوں نے یورپ کے یونانیوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ اسکندریہ کے یونانیوں کی روش کا اتباع کیا۔ ادن کی عقل سلیم نے ادنیٰ یہ بات سمجھا دی تھی کہ سائنس کی ترقی محض تخیل ہی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس ترقی کا صحیح اور یقینی ذریعہ صحیفہ فطرت کا عینی مطالعہ ہے۔ وہ حکمت نظری پر حکمت عملی کو ترجیح دیتے تھے یعنی ادن کے علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر تھی۔ فن ہندسہ و ریاضیات کو وہ استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ فن جبر ثقیل۔ توازن ابیات۔ فن مناظر و مرایا پر جو کثیر التعداد کتا بین ادنیٰ نے لکھی ہیں ادن میں یہ دلچسپ

خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر مسئلہ کسی تجربہ یا کسی آلہ مشاہدہ کے ذریعہ سے حل کیا گیا ہے۔
 یہی خصوصیت تھی جس نے او کو فنِ کیمیا کا موجد بنا دیا جس نے اون سے تقطیر (عرق کھینچنے)
 تسمید (بخار اڑا کر منجمد کرنے) تسبیج (پگھلانے) اور تردیق (پچھاننے) کے آلات ایجاد کرائے۔
 جس نے فنِ ہیئت میں اون کو آلات منقسمہ مثلاً لبنہ و اصطرلاب سے کام لینے کی ترغیب دلائی۔
 جس نے فنِ کیمیا میں اون سے ترازو کا استعمال کرایا جس کے اصول سے وہ بخوبی واقف تھے۔
 جس نے اون سے بغداد اندلس اور سمرقند میں اجسام کے اوزان کی میزائین اور ہیئت کو نقشے
 تیار کرائے۔ جس نے اون کو علم ہندسہ - علم مثلث - علم جبر و مقابلہ اور ہندی طریقہ اعداد نویسی
 میں نئے نئے نکتے پیدا کرنے کے قابل بنایا۔ یہ وہ نتائج ہیں جو ارسطو کے عملی و استقرائی
 طریقہ کو افلاطون کی خیالی آرائی پر ترجیح دینے کی بدولت اون کی کوششوں نے پیدا کیو۔
 کتب خانجات عامہ کے قیام و توسیع کے لیے کتابوں کے جمع کرنے میں نہایت
 اہتمام کیا جاتا تھا۔ خلیفہ مامون عباسی کی نسبت روایت ہے کہ اوس کی کوششوں سے صد ہا
 اونٹ جو قلمی کتابوں کے پشتارون سے لدے ہوئے تھے بغداد میں داخل ہوئے۔ جو معاہدہ
 اوس نے یونانی فرمانروا میکائیل ثالث کے ساتھ کیا تھا اوس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ
 کا ایک کتب خانہ اوس کے حوالے کر دیا جائے۔ جو قلی خزانے اس طرح المامون کے ہاتھ
 آئے اون میں بطلیموس کی اوس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ بھی تھا جو اوس نے سیار و ثوابت کی
 مہندسانہ ساخت پر لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ خلیفہ کے حکم سے فوراً عربی زبان میں کیا گیا اور ترجمہ
 کا نام المحسطی رکھا گیا۔ جو کتابیں اس طور پر جمع کی گئیں اون کی کثرت تعداد کا اندازہ اس سے
 ہو سکتا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ فاطمیہ میں ایک لاکھ نسخے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور
 جلدیں نہایت خوشنما تھیں موجود تھے۔ ان میں سے چھ ہزار پانچ سو نسخے فقط ہیئت اور طب
 پر تھے۔ اس کتب خانہ کے قواعد کے بموجب اون طالب العلون کو جو قاہرہ میں سکونت پذیر
 تھے کتابیں مستعار مل سکتی تھیں۔ کتب خانہ میں زمین کے دو کمرے بھی تھے۔ ایک تو ٹھوس

چاندی کا تھا۔ دوسرا پتیل کا تھا۔ پتیل کے کرسے کی نسبت مشہور تھا کہ اسے بطلینوس نے بنایا تھا۔ چاندی کے کرسے پر تین ہزار دینار لاگت آئی تھی۔ خلفائے اندلس کے عظیم الشان کتب خانہ کو نسخوں کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہو گئی۔ اس کی فہرست ہی چوالیس کتابوں پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانہ خاص کے علاوہ اندلس میں شتر سرکاری کتب خانہ ایسے تھے جن میں ہر شخص جا کر اپنی معلومات بڑھا سکتا تھا۔ خاص خاص اشخاص کے پاس بعض دفعہ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ایک طبیب کی نسبت روایت مشہور ہے کہ جب سلطان بخارا نے اوسے بلا بھیجا تو اوس نے وہاں جانے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اوس کی کتابوں کی باربرداری کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت تھی۔

ہر بڑے کتب خانہ میں ایک سررشتہ نقل اور ترجمہ کا ہوتا تھا۔ تراجم بھی بسا اوقات بعض اشخاص اپنے ذاتی اہتمام سے مرتب کراتے تھے۔ چنانچہ ایک نستوری طبیب حنین نامی نے اس قسم کا ایک دفتر بغداد میں قائم کر رکھا تھا (شہ ۶۰۰)۔ یہ شخص ارسطو افلاطون بقراط جالینوس اور دوسرے مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شائع کرتا تھا۔ تراجم کے علاوہ جدید تصانیف کا بازار بھی ہر طرف گرم تھا۔ تصنیف کا طریقہ یہ تھا کہ دارالعلوم کے حکام اساتذہ کو مقررہ موضوع پر کتابیں لکھنے کے لیے مامور کرتے تھے۔ ہر خلیفہ کے دربار کا وقایع نویس علیحدہ ہوتا تھا۔ قصص و حکایات کے متعلق الف لیلہ جیسی کتابوں کا وجود عربوں کی قوت تخیل کا پتہ دیتا ہے۔ تصون اور افانوں کے علاوہ انواع و اقسام کے دوسرے مضامین پر بھی کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں مثلاً تاریخ۔ اصول فقہ۔ سیاست۔ فلسفہ و تیسرے۔ سوانح عمریان نہ صرف جلیل القدر اشخاص بلکہ مشہور گھوڑوں اور اونٹوں تک کی لکھی جاتی تھیں۔ کتابوں کی اشاعت میں کسی قسم کی مزاحمت یا ممانعت من جانب حکومت نہ ہوتی تھی اور نہ اون کے مضامین میں مصلحت عامہ کے بہانے سے کسی قسم کی حک و اصلاح کی جاتی تھی۔ البتہ اخیر اخیر میں دینیات کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مصنفوں کو سرکاری اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ واقفیت

عامہ کے متعلق علمی حوالجات کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔ جغرافیہ۔ شمار و اعداد۔ طب۔ تاریخ۔ غرض ہر مضمون کی ایک جامع لغات موجود ہو گئی یہاں تک کہ اون کے لمحضات بھی تیار کر دیے گئے۔ چنانچہ محمد ابو عبد اللہ کی تصنیف ”دایرة المعارف“ اس صنعت کی ایک ممتاز مثال ہے۔ کتابوں میں جو کاغذ لگایا جاتا تھا اوس کی صفائی اور سفیدی کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ رنگارنگ روشنائیوں کی تیاری میں بہت کچھ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور کتابوں کے عنوان کو مطلقاً مذہب کرنے اور اودن کو طرح طرح کے نقش و نگار سے زینت دینے میں نہایت دیدہ ریزی ہنر آفرینی اور کمال خوش سلیقگی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔

غرض دنیا سے اسلام میں علوم و فنون کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منگولیا۔ تاتاری۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ شمالی افریقہ۔ مراکش۔ فیض اور اندلس میں کثرت سے مدرسے اور درسگاہیں موجود تھیں۔ دولت روم کا رقبہ با آن ہمہ عظمت و جبروت اتنا نہ تھا جتنا اس عربی سلطنت کا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے ایک کنارہ پر تو سمرقند کا مشہور مدرسہ اور رصد گاہ تھی اور دوسرے کنارے پر اندلس کا مشہور آفاق مینارہ ترصد آسمان سے ہم کلام تھا۔ مسلمانوں کی اس سرپرستی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے: ”صوبوں کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدارات برتتے تھے۔ اور اودن کی رقبہ نہ سابق نے مذاق علمی کی تردید میں غیر معمولی حصہ لے کر سائنس کے نور کو سمرقند و بخارا سے نئے کر فیض اور قرطبہ تک پھیلا دیا۔ ایک سلطان کے وزیر نے ایک دفعہ ایک لاکھ اشرفیان اس غرض سے وقف کر دیں کہ اس سرمایہ سے بغداد میں ایک کالج قائم کیا جائے اور اس کالج کے مصارف کے لیے پندرہ ہزار دینار سالانہ کا دوامی عطیہ مقرر کر دیا۔ تعلیم کے فیضان سے عوام و خواص کو یکساں بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ وزیر کا بیٹا اور ایک ادنیٰ درجہ کے موچی کا بیٹا پہلو بہ پہلو بیٹھ کر استاد سے سبق لیتے تھے۔ طالب علموں کی تعداد ایک ایک دارالعلم میں چھ چھ ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔ جنکی جماعتوں کو باوقات

مختلف تعلیم دی جاتی تھی۔ نادار طلبہ کے لیے معقول وظائف مقرر تھے اور اساتذہ کو بیش قرار
 تنخواہیں ملتی تھیں۔ ہر شہر میں عربی زبان کی نادر تصنیفات کے نقل اور جمع کرنے کے لئے
 طالبان علم کا شوق اور اہل دہل کا نمود ہر وقت سرگرمی و مصروف تھا۔ ان مدارس و کتاب خانوں کی نگرانی
 فراخ حوصلگی کے اقتضا سے بعض دفعہ مسطور یون اور بعض دفعہ یہودیون کے سپرد کی جاتی تھی۔
 کسی شخص کو کسی خدمت جلیلہ پر سرفراز کرتے وقت حکومت کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قوم
 سے تعلق رکھتا ہے یا اس کے مذہبی عقاید کیا ہیں بلکہ محض اس کی علمی قابلیت کا لحاظ کیا
 جاتا تھا۔ ”خیر الناس من ینفع الناس“ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر خلیفہ اعظم
 الاممون نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ”اہل علم و فضل خدا کے برگزیدہ اور بہترین بندے
 ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اپنے قوائے عقلی و ادراکی کی ترقی کے لیے وقف رکھی ہے۔
 وہ اپنے ابنائے جنس کو حکمت و دانش کے نیکے سکھاتے ہیں اس لیے وہ نظام دنیا کے
 شیرازہ بند محفل کون و فساد کی شمع ہیں۔ اگر اودن کی ہدایت چراغ راہ نہ ہو تو اہل دنیا
 پر اوس جہالت اور وحشیانہ پن کی ظلمت پھر چھایا جائے جو پہلے چھائی ہوئی تھی۔“

مدرسہ طیبہ قاہرہ کے طرز عمل کی تقلید نے دوسرے طبی مدارس میں بھی یہ قاعدہ
 جاری کر دیا کہ زمانہ تعلیم کے اختتام پر طلبہ کا نہایت سختی کے ساتھ امتحان لیا جائے۔ اور
 کامیاب ہونے پر انہیں مطب کرنے کی سند دی جائے۔ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ وہ
 تھا جسے عربوں نے اٹلی کے شہر سکرنو میں قائم کیا اور پہلی رصد گاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی
 وہ تھی جو اموی خلفا کی سرپرستی میں بمقام اشبیلیہ (اسپین) قائم ہوئی۔

اگر ہم اس مہتمم بالشان علمی تحریک کی جزئیات سے بحث کریں تو اس کتاب کا حجم حد سے
 زیادہ بڑھ جائیگا۔ لہذا ہم صرف اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے قدیم علوم و
 فنون میں مثبت کچھ اضافے کیے اور نئے نئے علوم ایجاد کیے۔ انہوں نے حساب کے
 ہندی طریقہ کو رواج دیا جس میں تمام رقوم نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس اعداد کے

ذریعہ سے اس طرح ظاہر کی جاتی ہیں کہ ہر عدد کی اول تو ایک قیمت مطلق مقرر کر دی گئی ہے اور اوس کے بعد ایک قیمت اعتباری ہے جو بلحاظ موقع یا مرتبہ پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ہر طرح کے اندازے کے لیے سہل اور سادہ قاعدے بنائے گئے ہیں۔ جبر و مقابلہ یا بالفاظ دیگر ہمہ گیر ریاضی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے مقادیر غیر معینہ کی تعیین یعنی اول تعلقات کی دریافت ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی مقادیر کے درمیان قائم ہوں خواہ ان مقادیر کا تعلق علم حساب سے ہو خواہ علم ہندسہ سے۔ اس طریقہ کا مہوم سا خیال ڈائیونٹس کو پیدا ہوا تھا جسے عربوں نے ترقی دے کر اس حد کمال تک پہنچایا۔ جبر و مقابلہ میں محمد بن موسیٰ فی مساوات درجہ چہارم اور عمر بن ابراہیم نے مساوات درجہ سوم کے حل کرنے کا عمل دریافت کیا۔ عربوں ہی کی ساعی سے علم مثلث نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ ادنیہوں نے حبیب مستوی کے بجائے جس کا اول استعمال ہوتا تھا اوتار کو اس فن میں داخل کیا۔ اور اسے ترقی دے کر ایک متقل فن کی حیثیت عطا کی۔ موسیٰ نے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں علم مثلث کر دی پر ایک رسالہ لکھا اور البنادی کا ایک رسالہ ساحت پر موجود ہے جس میں اس فن کے متعلق یہاں تک داد نکتہ سنجی دی گئی ہے کہ بعض لوگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اس موضوع پر اقلیدس کا جو مقالہ گم ہو گیا تھا البنادی کا رسالہ اوس کی نقل ہے۔

لے ایک یونانی الاصل ریاضی دان تھا جو چوتھی صدی عیسوی کے خاتمہ پر اسکندریہ میں پیدا ہوا۔ جبر و مقابلہ کے بعض ابتدائی مسائل کی دریافت اوس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اوس کی قبر کی لوح پر چند اشعار بزرگان یونانی کند تھے جو ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس کی ۳۳ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اوس کا بیٹا شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہو کر ۲۴ سال کی عمر میں اوس سے چار سال پہلے مر گیا اور اس حساب سے اوس کی عمر ۸ سال ہوئی۔ یہ اطلاع جبر و مقابلہ کی ایک شکل میں قلمبند کی گئی ہے۔ اسماطین (علم حساب) پر اوس نے ایک کتاب تیرہ مقالوں میں لکھی تھی جس میں سے صرف چھ مقالے اس وقت موجود ہیں۔ مترجم

علم ہیئت میں ادھونہوں نے نہ صرف ستاروں کی فہرستیں تیار کیں بلکہ اوس حصہ آسمان کے نقشہ بھی تیار کئے جو ادن کے پیش نظر تھا۔ بڑے بڑے ستاروں کے ادھونہوں نے عربی نام بھی رکھے اور آج کے دن تک یہ ستارے انہیں ناموں سے مشہور ہیں۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے ادھونہوں نے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش کر کے اس کی جسامت دریافت کی۔ طریق الشمس کا اعوجاج معلوم کیا۔ آفتاب و ماہتاب کی معجم میزانین شائع کیں۔ سال کی مدت مقرر کی۔ استقبال اعتدالین کی توثیق و تصدیق کی پیلیمین سے البتانی کے رسالہ علم کو اکسب کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے اور حاکم بامر اللہ خلیفہ مصر (سنہ ۶) کے دربار کے مشہور ہیئت دان ابن یونس کی ایک عالمانہ تصنیف کے بعض بچے بجائے اجزا کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں المنصور عباسی کے زمانہ سے لے کر اوس وقت تک کے مختلف مشاہدات فلکی مثلاً کسوف و خسوف۔ نقاط اعتدال لیل و نہار۔ نقاط انقلاب صیفی و شتویٰ قرآن سیارگان و احتجاج کو اکسب کے نتایج مندرج ہیں۔ ان صدی نتایج نے نظام عالم کے بڑے بڑے تغیرات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ہیئت دانان عرب نے آلات ہیئت کی ترکیب و تکمیل پر بہت سادقت صرف کیا۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لیے مختلف قسم کی پانی اور دھوپ کی گھڑیاں ایجاد کیں۔ اور سب سے پہلے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ”پنڈلم“ یعنی رقاص ساعت ادھنین نے ایجاد کیا۔

عملی علوم میں جن کا دار و مدار تجربہ پر ہے علم کیا کی ایجاد کا سہرا ادھنین کے سر ہے۔ ادھونہوں نے اس فن کے بعض نہایت ہی اہم معیار دریافت کیے مثلاً گندھک کا تیزاب۔ شورے کا تیزاب اور الکحل۔ اس فن سے ادھونہوں نے مطلب میں بھی کام لیا اور سب سوادل ادویات مفردہ و مرکبہ کی قرا با و مینین شائع کیں۔ اور ان میں معدنی نسخہ جات بھی شامل کیے۔ علم جبر ثقیل میں ادھونہوں نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کیے۔ قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نا بلد نہ تھے۔ جبر ثقیل کی قوتوں کے مسئلہ کا ادھنین اچھی طرح

علم تھا۔ علم تو اذن مایعات میں جو ترقی ادھنوں نے کی اوس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اجسام کے اوزان مخصوص کی میزانیں مرتب کر کے پانی میں اجسام کے ڈوبنے اور تیرنے کے مالہ و ما علیہ پورا ادھنوں نے بسوٹا بحثیں لکھیں فن مناظر و مایا میں ادھنوں نے یونانیوں کی اس غلط فہمی کو درست کیا کہ شعاع نور آنکھ سے نکل کر شئی مرئی پر پڑتی ہے۔ اس کے بجائے ادھنوں نے اس مسئلہ کو رواج دیا کہ شعاع شے سے چل کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ واقعہ انعکاس و انعطاف ضیائی ماہیت کا ادھنیں پورا علم تھا۔ ابن حزم سے یہ مشہور تحقیقات منسوب ہے کہ شعاع نور کرہ ہوا کو ہر شکل قوس قطع کرتی ہے اور اس سے اس نے یہ ثابت کیا کہ ہم آفتاب و ماہتاب کو قبل طلوع و غروب دیکھتے ہیں۔

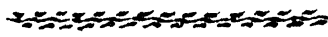
اس علمی مستندی کا اثر اس ترقی میں صاف نظر آتا ہے جو صنعت و حرفت کے متعدد فنون میں جلد جلد ہونی شروع ہوئی۔ فن فلاح میں آبپاشی کے طریقے پہلے سے بہتر ہو گئے۔ کھاد کا استعمال ہزار طریقہ کے ساتھ کیا جانے لگا۔ چوپایوں کی افزائش نسل کے متعلق قیمتی نکتے معلوم ہو گئے۔ وہی قوانین کا ضابطہ کاشتکاروں اور مزارعین کے حقوق کے لحاظ سے بہت زیادہ کامل و مکمل ہو گیا۔ جن کھیتوں میں پہلے دہان کی کاشت نہ ہوتی تھی وہاں اب اس کی لہلہاتی فصلیں نظر آئے لگیں۔ جہاں ایکھ اور قہود کا نام و نشان نہ تھا وہاں اب ان کی پیداوار بھی ہونے لگی۔ سلطنت میں جا بجا ریشم روئی اور اُون کے کپڑوں کو کارخانے قائم ہو گئے۔ قریبہ اور مراکو میں چرم سازی و کاغذ سازی کا کام شروع ہو گیا۔ معدنوں پر کام ہونے لگا۔ مختلف وصاتین ڈھلنے لگیں۔ ٹالیڈ وین ایسے ایسے فولادی خنجر اور تلواریں تیار ہونے لگیں کہ لیک دنیا اولیٰ کالو ہا مان گئی۔

شاعری اور موسیقی پر عرب فریفتہ تھے۔ ادن کا جو وقت فکر معاش سے بچتا تھا ان فنون لطیفہ کی نذر ہوتا تھا۔ شطرنج کا کھیل یورپ نے عربوں سے سیکھا اور قصص و حکایات اور خیالی مضامین کا شوق بھی جو اہل یورپ میں اس قدر پایا جاتا ہے عربوں ہی کا پیدا کیا ہوا ہے

فن ادب کی اون شاخوں میں جو محض تفریح اور دل بستگی ہی کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شانِ ثقافت و متانت لیے ہوئے ہیں اون کی فکر سلیم و دانشمندانہ آفرینی دیتی تھی۔ دنیا کی ناپایداری۔ لاندہی کے نتائج۔ قسمت کی گردش۔ عالم کی ابتدا۔ اس کی میعاد اور اس کا خاتمہ وہ مضامین ہیں جن پر ادبوں نے لطیف اور نتیجہ خیز کتابیں لکھی ہیں۔ بعض دفعہ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے نگاہ ایسے خیالات پر جا پڑتی ہے جن کی نسبت ازراہِ لفظ خرم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان خیالات کے سوجدہ ہونے کا شرف ہمیں کو حاصل ہے۔ مثلاً ایک مسئلہ ارتقا ہی کو لیجے جسے ہم اکتشافِ جدید سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تعلیم اون کے مدارس میں دی جاتی تھی۔ اور ہم تو خیر پھر بھی اس کے محدود معنی لیتے ہیں۔ وہ ہم سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور غیر عضوی اجسام یعنی جمادات تک کو اس کے حیرت انگیز عمل میں داخل سمجھتے تھے۔ رساینِ بینی کیمیا سازی کا اصلی راز فلزاتی اجسام کے ارتقا و فطری میں مرکوز تھا۔ انگریز بینی جس نے بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا ہے اکتھا ہے: "جب عوام الناس فلاسفہ طبعیین کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ سونا ایک جسم ہے جو درجہ کمال کو پہنچ گیا ہو تو ادب نہیں کامل یقین ہو جاتا ہے کہ سونا ایک ایسی چیز ہے جو اور دھاتوں کی شکل سے بعد دیگرے اختیار کرتا ہوا ایک زمانہ واز کے بعد اس حالت کمال کو پہنچا ہے یعنی ابتدا میں یہ سیسہ تھا پھر رانگ ہو گیا اور اس کے بعد پتیل ہوا پھر چاندی ہوا اور چاندی سے ترقی کر کے سونا بن گیا۔ ان جہلا کو یہ معلوم نہیں کہ فلاسفہ طبعیین کا یہ قول کہ سونا ایک ترقی یافتہ جسم ہے قریب قریب اون کے اس قول کو ہم معنی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے قدرت کی قوتوں کے اعتدال کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اون کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی پہلے بیل تھا۔ پھر گدھے کی شکل میں تبدیل ہوا۔ پھر گھوڑا بن گیا اس کے بعد بندر کے قالب میں ظاہر ہوا اور سب سے آخر میں انسان بن گیا۔"

پانچواں باب

نزاع مذہب سائنس و بارہ ماہیت روح مسئلہ انفصال و انجذاب



روح کی ماہیت کے متعلق قدیم اہل یورپ کے خیالات۔ یعنی روح جسم کے مشابہ ہے۔ اہل شرق و فلسفیانہ خیالات۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب مسئلہ انفصال و انجذاب کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی مذہب ارسطو کا بھی ہے جس کی تقلید پیروان فلسفہ اسکندریہ اور بعد میں یہودی اور عرب کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ اریجینا کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق مسئلہ بقا و متبہ سب قوت کے ساتھ جسم اور روح کے آغاز و انجام کی باہمی مانگت۔ روح انسانی کا قیاس روح حیوانی پر۔ فلسفہ ابن رشد جو انہیں واقعات پر مبنی ہے اسپین اور سسلی ہوتا ہوا سیمی دنیا میں منہ پھرتا ہے۔

فلسفہ ابن رشد کے استیعال کی تاریخ۔ اسلام کا اس سے ابا کرنا۔ یہودیوں کے مذہبی طبقہ کی مخالفت۔ پاپائیروما کا اس فلسفہ کو مٹا دینے پر کمر باندھنا۔ ”انکوینیشن“ (محکمہ احتساب مذہبی) کا اسپین میں قائم ہونا۔ اس محکمہ کے وحشیانہ مظالم اور اُن کے نتائج۔ یہودیوں اور عربوں کا اخراج۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی پامالی ”ڈیمیکن کونسل“ کا فیصلہ۔

بت پرست یونانیوں اور رومیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اوس کی جسمانی صورت

کے سنا ہے۔ جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اوس کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور گھٹتا ہے تو گھٹ جاتی ہے۔ غرض تنیذاتِ جسمانی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اون مشاہیر عصر کو جنہیں مرنے کے بعد ہیڈ ریز کے طبقہ سا فل میں داخل ہونے کی کار پر د ازان دنیا تھمائی کی طرف سے اجازت ملتی تھی اپنے پُرانے رفیقوں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ پیش آتی تھی۔ نہ صرف ان باشندگانِ عالمِ عقبی کی جسمانی صورت ہی بدستور قائم رہتی تھی بلکہ اوس لباس تک میں جسے وہ اس دنیا میں پہنا کرتے تھے کسی قسم کی تبدیلی نہ واقع ہوتی تھی۔

قدیم سیمینوں نے جن کے خیالات حیاتِ اخروی اور بہشت و دوزخ یعنی نیکو کاروں اور گناہ گاروں کے اماکن کے متعلق اپنے بت پرست پیش رو دن کے تصورات کے مقابلہ میں بہت زیادہ واضح و نمایان تھے انہیں قدیم تصورات کو تسلیم کر کے اون پر اپنی طرف سے بہت کچھ حاشیے چڑھا دیے۔ اون کو ذرا شک نہ تھا کہ آنے والی دنیا میں وہ اپنے احباب و اقارب سے اسی طرح مل کر باتیں کریں گے جس طرح اس دنیا میں کرتے ہیں۔ اور اون کی یہ اُمید فطرتِ انسانی کے مقتضیات کے لحاظ سے چندان بجا نہ تھی اس لئے کہ جب کوئی عزیز دوست ہمیشہ کے لیے جدائی کا جانکاہ داغ دے جاتا ہے تو اس خیال سے کہ دوسری زندگی میں اوس سے ہماری ملاقات ہو ہی جائے گی ہمارے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد روزِ جزا تک کس حالت میں اور کہاں رہتی ہے صحیح صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ روح قبر کے گرد و پیش مٹھ لایا کرتی ہے۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ مرنے کے بعد روح بحالتِ سرِاسیمگی و پریشانی فضا کے بیسٹ میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے۔ اور اوس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہے دروازہ میں گھسنے دے اور جس کو چاہے رد کر دے۔ وہ ان انون کی روحوں کو اپنی مرضی سے بہشت میں داخل کرتا ہے یا دہان سے نکال دیتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اوس کے

ان اقتدارات کے منکرتے جس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ جب روزِ جزا سے پہلے ہی سینٹ پیٹر نے روح کو بہشت میں داخل کر دیا یا دہان سے نکال دیا تو پھر روزِ جزا کی کیا ضرورت باقی رہی؟ پاپائز مگر گجوری کے زمانہ کے بعد یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا کہ قیدِ عنقریب سے آزاد ہو کر دھن ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جہاں ادون کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی بدو کو اپنی بدی کی تلافی کا موقع دیا جاتا ہے۔

مردوں کی روح کا وقتاً فوقتاً زندون سے اکر ملنا اور اپنے دیرینہ مسکن میں بود و باش اختیار کرنا ایک ایسا خیال ہے جسے یورپ کے تمام ممالک میں ہر زمانہ کے نہ صرف جہلا بلکہ عقلا بھی تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ جاٹے کے موسم میں غروبِ آفتاب کے بعد دیکھتے ہوئے تابان کے سامنے بیٹھ کر جب بھوت پریت سایہ کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں تو سنسنے والوں پر ایک دل کو بھلا معلوم ہونے والا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اہلِ روماتین قسم کی ارواح کے قایل تھے۔ یعنی نیکن کی روحیں بدو کی روحیں اور ادون لوگوں کی روحیں جن کے اعمال مشکوک تھے۔ اگر اس بارہ میں انسانی شہادت کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ قدیم الایام سے اس قسم کی ہمد ہار وایتیں جنکے راوی نہایت ثقہ اور معتبر سمجھے گئے ہیں اس مضمون کی ہم تک پہنچی ہیں کہ مُردوں کی روحیں یا تو قبرستانوں میں جمع ہوتی ہیں یا دیوانِ ملکوں کے تنگ و تاریک حجر دہان میں اقامت پذیر ہوتی ہیں۔ یا چاندنی رات میں تنہا خاموشی کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ادھر یورپ میں تو اس قسم کے خیالات مقبول خاص و عام ہوئے لیکن ایشیا میں اس کو برعکس دوسرے قسم کے خیالات جو تخیل کے طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے عام طور پر پھیل گئے۔ پیشوایانِ مذہب نے سولہویں صدی میں ان کو اگرچہ دبا دیا لیکن ادون کا استیصال کلی گہی نہ ہو سکا۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ان کی اشاعت ایک نہایت وسیع پیمانہ پر یورپ بھر میں اس خاموشی کے ساتھ ہوتی رہی کہ پاپائز دہان کے مناسب سمجھا کہ ادون کی صاف صاف

تلقی کہول دی جائے۔ چنانچہ پاپا کا دینی فرمان جب ”وٹیکن کونسل“ میں پڑھا گیا تو کونسل نے بالاتفاق ان خیالات کو موجب فصالت و مگر اہی قرار دے کر ایک فتویٰ جاری کیا جس میں اوں سب لوگوں کو ملعون ٹھہرایا گیا جو ان کو صحیح سمجھتے ہوں۔ اس فتوے کا ایک فقرہ یہ ہے:-
 ”لعنت ہو اوس پر جو یہ کہتا ہے کہ روحانی اشیا کا انفصال یا خروج ذات باری سے ہوا ہے یا یہ کہ ذات باری اپنے مظاہر کے ذریعہ سے یا نشو و نما پانے کے بعد تمام چیزوں کی تشکیل قبول کر لیتی ہے۔“ چونکہ روم کی مذہبی کونسل نے ان عقاید کی تکفیر میں اپنے اقتدارات کا پورا زور صرف کیا ہے لہذا ضرور ہوا کہ ان کے مالہ و مالم علیہ پر تاریخی پہلو سے منظر ڈالی جائے۔

ماہیت ذات باری کے تصورات سے ماہیت روح کے تصورات کا اثر پذیر ہونا لازمی ہے۔ ذات باری کے تصور سے مشرقی ایشیائیوں نے شخصیت کا خیال خارج کر دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روح کو متعلق اوں کے ہاں مسئلہ انفصال و انجذاب رواج پا گیا۔ ویدانت میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ایک روح تمام کائنات میں ساری دوائر میں ہے۔ اس روح کل یا خدا کی ماہیت وہی ہے جو روح انسانی کی ہے۔ نہ صرف ویدوں میں بلکہ سنو کی سمرتیوں میں بھی یہ دعویٰ موجود ہے کہ روح شعلہ عقل کل کی ایک چمکا رہی ہے جو اس سے جدا ہو گئی ہے اور ایک زمانہ موقت کے بعد اس میں پھر مل جائے والی ہے۔ اسی کا نام اصول انفصال یعنی جدائی و انجذاب یعنی ملاپ ہے۔ ویدوں اور سمرتیوں میں روح کی کوئی شکل نہیں مانی گئی۔ مظاہر قدرت کو جبکی رعنائیاں اور رنگینیاں آنکھ اور دل کو بھاتی ہیں خدا کا محض ایک سایہ تصور کیا گیا ہو۔

ویدوں کے مذہب نے ترقی کرتے کرتے بک مذہب کی شکل اختیار کر لی جو بی نوع انسان کے جزو غالب کا ایمان ہے۔ اس مذہب کو ایک طاقت مالیہ کے وجود کا تو اعتراف ہے لیکن کسی ہستی عالیہ کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ بدھوں کا عقیدہ یہ ہے

کہ قوت کا وجود اصلی و حقیقی مادہ کو اپنا مظہر بنا کر عالم شہود میں لاتا ہے۔ وہ مسئلہ انفصال و انجذاب کے قایل ہیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع اون کے نزدیک گویا انسان کی صورت ہے جس میں مادہ مجسم ہو کر قوت کے عمل ارتقا کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہم اون سے سوال کریں کہ روح کا کیا مشر ہو گا تو وہ ہم کو یہ الزامی جواب دیتے ہیں کہ جب شعلہ بجھا دیا گیا تو اوس کا کیا مشر ہوا اور جب مشعل جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا۔ کیا وہ اوس وقت معدوم تھا اور اب فنا ہو گیا ہے ؟ بدھ مذہب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ذات یعنی انانیت کا خیال جس نے ہمیں عمر بھر دھوکے میں ڈالے رکھا ہے شاید مرتے کے ساتھ ہی تو زایل نہ ہو لیکن رفتہ رفتہ ضرور جاتا رہتا ہے۔ اسی عقیدہ پر مسئلہ تناسخ مبنی ہے شخصیت یا انانیت کے بتدریج ٹٹنے کے بعد واقعہ انجذاب یعنی عقل کل کے ساتھ روح کا اتحاد ظہور میں آتا ہے۔ اس حالت میں جس کو حالت نردان کہتے ہیں روح پر محویت یا خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا عالم ہے جس میں مادہ فضا اور زمانہ کے اعتبارات کا کہیں نشان نہیں ہوتا جس میں بھی ہوئی مشعل کا شعلہ چلا گیا ہے اور جس میں انسان پیدا ہونے کے قبل موجود تھا۔ یہی وہ انجام ہے جس کی انسان کو اُمید رکھنی چاہیے۔ یعنی یہ وہ حالت ہے جس میں روح قوت کل کی لذت وصال سے بہرہ اندوز ہو کر سرمایہ سرور بے پایاں و راحت جاویدان حاصل کرتی ہے۔

مشرقی یورپ میں ان خیالات کی ترویج کا پہلا ذریعہ ارسطو ہوا اور آگے چل کر وہ ان کا بانی مبنی سمجھا جانے لگا۔ کتب خانہ اسکندریہ نے اپنے دور آخر میں جو حکما پیدا کیے اون پر ان خیالات کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ قلو نامی ایک یہودی شہنشاہ کیلکیولا کے زمانہ میں رہتا تھا۔ اوس کے تمام فلسفہ کا دار و مدار ہی مسئلہ انفصال پر ہے۔ پلائینس نے نہ صرف اس مسئلہ سے حقیقت روح انسانی کا معاملہ کرنا چاہا بلکہ اقا نیم ثلثہ کی گتھی کو بھی اسی کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اوس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح نور کی ایک شعاع آفتاب

نکلتی ہے اور جس طرح شعاع کے اجسام مادی پر پڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح باپ سے بیٹا اور بیٹے سے روح القدس نکل سکتی ہے۔ ان خیالات کی بنیاد قائم کر کرکے پلاٹینس نے اس پر ایک مکمل مذہبی عمارت تعمیر کی اور ارباب زہد و ریاضت کو عالمِ قال سے عالمِ حال میں آنے کے طریقوں کی تعلیم دے کر یہ بتانا شروع کیا کہ عالمِ حال وصالِ عقل کل یا ذاتِ باری کی پہلی منزل ہے۔ اور اس عالم میں روح پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فروریوس نے بھی انجذاب یا وصالِ باری کو معاد کے انتہائی مقصد سے تعبیر کیا۔ فروریوس متاثرین پیدا ہوا تھا۔ روم میں اس نے حلقہ درس قائم کیا اور میسائیت کے رومین بہت سی کتابیں لکھیں۔ یون تو یوسیبس اور سینٹ جردم نے بھی ان کتابوں کے جواب میں رسائل تصنیف کیے لیکن سب سے بڑی محبت قاطع شہنشاہ تھیوڈوسیوس کے جواب میں مضمون تھی جس نے فروریوس کی تصانیف کے تمام نسخے ہی جلوا دئے۔ فروریوس اپنی ناقابلیت پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے عالمِ حال میں خدا کے قرب سے چھبیس سال کی عمر میں صرف ایک دفعہ مشرف ہونے کا موقع ملا حالانکہ میرے استاد پلاٹینس نے کل ساٹھ برس کی عمر پائی اور اس عرصہ میں چھ مرتبہ وصالِ باری تعالیٰ کی نعمت سے شرف اندوز ہوا۔ پر اکلےس نے بھی مسئلہ انفصال و انجذاب کی بنا پر ایک مکمل ضابطہ دینیات مرتب کر کے طریقہ انجذاب سے بہت کچھ بحث کی ہے یعنی آیا روحِ قالب سے نکلتے ہی فنا فی اللہ ہو جاتی ہے یا کچھ عرصہ تک اپنی ذات کے ادراک میں مقید رہ کر بتدریج وصالِ کامل حاصل کرتی ہے۔

فتح اسکندریہ کے بعد یہی خیالات مسلمانین میں پھیل گئے اور اونہون نے بہت جلد خدا اور روحِ انسانی کے متعلق اپنے تجزیہ عقاید کو ادانی و اقاصی کے لیے چھوڑ دیا۔ جب عربی فلسفہ نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت اختیار کی تو مسئلہ انجذاب و انفصال اس کے معرکتہ الآراء مباحث میں شریک ہو گیا۔ اون عقاید کے ترک کر دینے میں جو مسلمان

مملکت جہلا میں مقبول عام تھے حکمائے اسلام نے ایک بڑی حد تک یہودیوں کا تتبع کیا۔۔۔ یہودیوں نے اپنے آباؤ اجداد کی تجسیمیت کو ترک کر دیا تھا اور اس معبود کے بجائے جو سابقین میں معبود کے اندر نقاب اسرار اوڑھے رہا کرتا تھا ایک ایسے خدا کی پرستش شروع کر دی تھی جو عقل مطلق اور طاقت غیر محدود ہونے کے لحاظ سے کائنات کے ہر رنگ و دیش میں پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ بات اون کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کیوں کر ایک ایسی شے جو دفعۃً عدم سے وجود میں آئی ہو غیر فانی ہو سکتی ہے لہذا وہ اس عقیدہ پر راسخ ہو گئے کہ روح انسانی کا تعلق ایک طرف تو اس ازل سے ہے جس کی کوئی ابتدا نہ تھی اور دوسری طرف اس ابدی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

عربوں کی دماغی ترقی کی ہر منزل میں عرب اور یہودی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ اون کی پولیٹیکل تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تب بھی یہودی اور مسلمان دوش بدوش نظر آئیں گے۔ شام مصر اسپین جس ملک میں دیکھو دو نون ایک ساتھ نظر آتے ہیں مغربی یورپ نے ان دونوں سے اپنے فلسفیانہ خیالات اخذ کیے۔ اور ان خیالات کو امتداد روزگار ملے مسلک ابن رشد کی شکل میں بدل دیا۔ اسلام کو اگر فلسفیانہ رنگ میں دیکھنا چاہو تو ابن رشد کے مذہب کا مطالعہ کرو۔ اہل یورپ عام طور سے ابن رشد ہی کو ان ضلالت آفرین عقاید کا بانی خیال کرتے تھے اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے اسی اعتبار سے اس کو مورد مطاعن و ملامت قرار دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خیالات کا محض جامع اور شایع تھا اور بس۔ اس کی تصنیفات نے عیسائی دنیا پر دو طرف سے حملے کئے۔ یعنی ایک طرف تو اسپین سے براہِ جنوبی فرانس انہوں نے اٹلی کے شمال میں پہنچ کر رستہ میں بہت سے عقاید کو بدل ڈالا۔ اور دوسری طرف تسلی سے روانہ ہو کر شہنشاہ فریڈرک ثانی کی حمایت میں وہ نیپلز ہوتی ہوئی اٹلی میں جا پہنچیں۔

لیکن اس زبردست عقلی حملہ سے مدتوں پہلے یورپ میں بعض مستشرقین بطور خود مشرقی

خیالات کی اشاعت میں حصہ لے چکے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ایک برہما نوئی حکیم جان اریجینا (سنہ ۱۷۰۴ء) کے خیالات درج ذیل کرتے ہیں۔ اریجینا مشائی المذہب تھا اور ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ ازراہ ارادت یونان کے اس نامور فلسفی کے مولد کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ اوس کی یہ آرزو تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں اون سیسی پادریوں کے طریقہ مجوزہ کے موافق اتحاد پیدا کیا جائے جو اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے۔

انٹیسٹیس نے ایک چٹھی میں جو اوس نے شاہ چارلس الملکب بہ ائیلے کر نام لکھی ہے اریجینا کو تحری علی اور فکر دقیقہ سنج کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا تحریر ظاہر کیا ہے :-
 ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا وحشی جو دنیا کے دوسرے کنارے سے آیا ہے اور دانشمند و فرزادہ اشخاص کی صحبت سے بے بہرہ ہے کیوں کر بڑے بڑے ادق علمی مسائل کے سمجھنے اور ادھن میں اس خوبی کے ساتھ ایک غیر زبان میں ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔“ اریجینا کی تصانیف کا عام مقصد جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں یہ تھا کہ فلسفہ اور مذہب میں اتحاد پیدا کرے لیکن اس موضوع پر قلم اٹھانا تھا کہ پادریوں نے اوس پر لے دے شروع کر دی اور اوس کی اکثر تصانیف جلا دی گئیں۔ اوس کی سب سے زیادہ مشہور کتاب کا نام ”تقسیم قدرت“ ہے۔

اریجینا کا فلسفہ مشاہد اور تجربہ کے اس نچوڑ پر مبنی ہے کہ ہر ایک زندہ شے کسی ایسی شے سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے زندہ تھی۔ عالم مرئی چونکہ دنیا سے حیات ہے لہذا لازمی طور پر اس کا انفصال یا خردج کسی وجود اولین سے عمل میں آیا ہے اور وہ وجود خدا ہے جو ہم سب کا پیدا کرنے والا اور محافظ ہے۔ ہر وہ شے جو ہمیں نظر آتی ہے اپنے وجود کو بحیثیت ایک شے مرئی کے اوس قوت کے ذریعہ سے قائم رکھتی ہے جو خدا سے ماخوذ ہے اور اگر یہ قوت ہٹالی جائے تو ضرور رہے کہ شے معدوم ہو جائے۔ اس طور پر خدا کے متعلق اریجینا کا یہ خیال ہے کہ وہ قدرت کے ہر عمل میں علی التوالی والتواتر حصہ لیتا ہے یعنی وہ قدرت کا

سچانے والا۔ قائم رکھنے والا اور سنبھالنے والا ہے۔ اور اس لحاظ سے گویا یونانیوں کی ہمہ گیر روح یا عقل فعال کے مشابہ ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ افراد کی زندگی وجود عام یعنی روح عالم کا ایک جزو ہے۔

اگر وہ قوت جس پر تمام اشیا کے وجود کا مدار ہے ہٹالی جائے تو ان اشیا کا رجوع اپنے مبدا اصلی کی طرف لازمی ہے یعنی ضرور ہے کہ وہ ذات باری کی طرف راجع ہو کر اس میں ضم یا جذب ہو جائیں۔ اس طور پر کل مظاہر کائنات کا انجام کار عقل فعال میں پیوست ہو جانا لازمی ہے۔ اریجینا کا قول ہے کہ ”جسمانی موت جسم کی حالت اصلی یا ہیئت قدیمی کی طرف عود کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مثال بعینہ اسی ہے جیسے کہ اصوات فنا ہو کر ہوا میں جا ملتی ہیں جو اول کا مبدا و منشا اور مدار علیہ ہے اور پھر سنائی نہیں دیتیں۔ کسی شخص کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اون کا کیا حشر ہوا۔ اس آخری اور انتہائی انجذاب کی حالت میں جو ایک میعاد موقت کے بعد لازمی طور پر ظہور پذیر ہونے والی ہے حضرت خدای کی ذات موجود ہوگی۔ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا۔“ ایک اور مقام پر بحث ذات باری میں وہ لکھتا ہے :- ”میں اس سے کل کائنات کا مبدا و اول اور علت العلل سمجھتا ہوں۔ تمام وہ اشیا جو ہیں اور نیز تمام ایسی اشیا جو نہیں ہیں مگر ایک زمانہ میں تھیں اسی سے پیدا ہوئیں اسی نے پیدا کیں اور اسی میں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ میں اس کو کل کائنات کی انتہا اور ساعت موقت خیال کرتا ہوں جس کا ملنا ممکن نہیں۔ کائنات کے تصور کی چار شکلیں ہیں۔ ان میں سے دو اشکال یعنی آغاز و انجام کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے اور دو کا تعلق بطور سبب و مسبب یا علت و معلول موجودات ترکیبی یا طبیعی سے۔ باقی اور غیر فانی بجز خدا کے اور کوئی نہیں۔“

عقل کل کی طرف روح کی اس رجعت کو اریجینا نے جس لفظ سے تعبیر کیا ہے وہ فنا فی اللہ کا مترادف ہے۔ مقام فنا میں داخل ہو کر روح کو اپنے سابقہ تجربے مطلقاً فراموش

ہو جاتی ہیں اور اوس کی وہی حالت ہو جاتی ہے جو جسم میں داخل ہونے سے پہلے تھی۔
ظاہر ہے کہ ایسے عقاید کو اہل مذہب کس طرح استحسان کی نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ارجینا
پر کلیسا کا عتاب نازل ہوا اور پادری اوس کے درپے آزار ہو گئے۔

سب سے اول جس قوم کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ قوت غیر فانی اور ابدی ہے وہ ہندوؤں
کی قوم تھی۔ اس حقیقت کا مفہوم اوس اصول سے ملتا جلتا ہے جسے علمی اصطلاح میں ”ہم تناسب
وہیات قوت“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نظام عالم کا قیام و ثبات بھی اس اصول کی حقیقت کا موید
ہے اس لیے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر کائنات کی مجموعی مقدار قوت میں کچھ بھی کمی یا
بیشی ہو جائے تو نظام عالم کا شیرازہ بکھر جائے۔ پس یہ واقعہ کہ کائنات میں توانائی یا قوت
کی ایک معین اور غیر متغیر مقدار موجود ہے ایک علمی حقیقت ہے جس کے تسلیم کیے بغیر چارہ
نہیں۔ جو تغیرات ہمیں اس دنیا میں نظر آتے ہیں ادن کی وجہ محض اس قوت کی
تقسیم ہے۔

لیکن چونکہ روح ایک قوت فعال ہے لہذا ایک بالکل نئی روح کا دم سے وجود میں
آنا اس کا مستلزم ہوگا کہ جو قوت کائنات میں پہلے سے موجود تھی اوس میں کچھ اضافہ کیا جائے
اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آج تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں ہر ایک کی پیدائش کے
وقت دنیا کی قوت میں بقدر ہر انسان کی روح کے اضافہ ہوتا رہا اور آئندہ بھی جتنے انسان
پیدا ہونے والے ہیں ادن میں سے ہر ایک کے متعلق اسی عمل کا اعادہ ہوتا رہے گا تو اس کے
یہ معنی ہونے کے قوت کی مجموعی مقدار ہر وقت بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ اکثر زاہد و متاوض لوگ اس خیال پر کراہت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے
کہ قادر مطلق اپنے بندوں کے تلوں اور شہوائے نفسانی کا مایع ہے کہ نطفہ کے استقرار کی
کچھ مدت کے بعد اوسے جنین کے لیے ایک نئی روح پیدا کرنی پڑتی ہے۔

چونکہ انسان کی شخصیت روح و جسم و اجزاء سے مرکب ہے لہذا ایک کی تعلقات

دوسرے کے پوشیدہ اور غیر معلوم تعلقات پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ اجزا جن سے جسم نے ترکیب پائی ہے اس عام مادہ سے ماخوذ ہیں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہے اور مرنے کے بعد اسی مادہ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اس مشاہدے سے یہ بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صانع قدرت نے شخصیت انسانی کے مادی حصے کے آغاز و انقلاب و انجام کی شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا عقدہ تو پیش نہیں کیا جس کے حل کرنے سے ہمیں جسم کے رفیق یعنی روح کے آغاز و انجام کا علم حاصل ہو سکے ؟

اُردو دیکھیں ایک بہت بڑے زبردست مسلمان فلسفی امام غزالیؒ (سنہ ۶) کا قول اس بارہ میں کیا ہے :-

”خدا نے انسان کی روح کو اپنے نور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے نکلا تھا آخر کو اسی میں جا کر مل جائے۔ اپنے نفس کو اس خیال لایعنی سے دھو کا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جائے گی۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ چونکہ تمہارا جسم ہلاک ہو گیا ہے لہذا روح بھی ہلاک ہو جائے۔ تمہاری روح اس دنیا میں ایک تازہ وارد مسافر کے طور پر آئی ہے اور چند دن کے لئے گویا ایک سرائے میں مقیم ہے۔ اس زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں سے ہماری پناہ خدا کے ہاں ہے۔ سکون جادو دانی ہم کو اویسی وقت حاصل ہوگا جب ہم وصال جناب باری کی نعمت سے مستفیض ہوں گے۔ اور یہ حالت مطمئنہ جب حاصل ہو جائے گی تو ہم کو وہ راحت ملے گی جس میں رنج کی آمیزش نہیں۔ وہ طاقت نصیب ہوگی جو کمزوری سے مبرا ہے۔ وہ علم حصہ میں آئے گا جو شک سے پاک ہو۔ اور حیات و نور کے اس سرچشمہ ابدی کا دیدار میسر ہوگا جو ہمارا مبدار و منشا ہے۔“

پتھر میں چونکہ مادہ کے ذرات متحرک ہو کر بحالت اعتدال قائم ہیں لہذا وہ ہمیشہ تک برقرار رہ سکتا ہے لیکن حیوان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادہ کی ایک نہر کے

سلسل بہاؤ کی ایک خاص شکل ہے۔ اس کو ادھر غذا ملتی ہے اور دھر فضلہ خارج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جو ان ایک آبشار یا ندی یا شعلہ کے مشابہ ہے۔ یعنی آبشار یا ندی یا شعلہ کی طرح ادن ذرات کو جس سے یہ مرکب ہے مطلق قرار نہیں کیونکہ یہ ذرات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے تسلسل یا حیات کا دار و مدار خارجی اجزاء کے شمول پر ہے۔ اس کی عمر طبیعی کی ایک سیعاد مقرر ہے اور ایک نہ ٹپنے والی ساعت ایسی آتی ہے جب اسے چاروں ناچار مرنا پڑتا ہے۔

ایک ہی واقعہ کو پیش نظر رکھنے سے فلسفہ روح کا عقد مشکل حل ہونا دشوار ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جس قدر واقعات سے مدد لے سکیں لین۔ روح انسانی کی گتھی اور اس وقت تک پوری طرح سے نہیں سلجھ سکتی جب تک روح حیوانی کی حقیقت پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور نہ کیا جائے۔ ہمیں ڈیکارٹ کے طریقہ سے کام لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا انون کی رو میں حیوانون کی روحوں سے کوئی قرابت رکھتی ہیں اور آیا نشوونما کے لحاظ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس کا حصہ فوقانی روح انسان ہے اور حصہ تحتانی روح حیوان۔ حیوانی کی فہم و فراست سے جو نیا جہم افذ کرین ادن پر بھی ہمیں ایسا ہی غور کرنا چاہیے جیسا انسان کی عقل و بصیرت کے کرشموں پر۔ اعضاء ان کی تشریح کا علم آج اس درجہ کمال کو پہنچا ہوا نہ ہوتا اگر اس پر علم تشریح اعضاء حیوانات کی روشنی نہ پڑتی۔

بروڈی نے واقعات پر نظر فرما کر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ روح انسانی

لے فرانس کا سب سے زیادہ مشہور فلسفی ہے جس کے تخیل نے مابعد الطبیعیات پر ایک غیر ممکن الحول نقش چھوڑا ہے۔

عقلیات میں ادس کا اصل اصول یہ نکتہ ہے کہ میرے وجود پر میری قوت غور و فکر گواہ ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کی تائید کو وہ موجودات کی حقیقت کی تصدیق کے لیے ضروری نہیں خیال کرتا بلکہ ذہنیات ہی کو حق مطلق کے

اکتشاف کا ذریعہ اولیٰ سمجھتا ہے۔ ڈیکارٹ کا سن ولادت ۱۵۹۶ء اور سن وفات ۱۶۵۰ء ہے۔ مترجم

سے مترجم کا لن بروڈی انگلستان کا ایک مشہور طبیب ہے جسے فن جراحی سے (بقیہ مضمون بر صفحہ آئندہ)

دور روح جوانی کی ماہیت ایک ہے۔ جو شخص کتے کی عادات و خصایل سے ابھی طرح واقف ہے اوسے یہ بات ماننی پڑے گی کہ کتا نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور جب کوئی خطا کرتا ہے تو جانتا ہے کہ اوس سے یہ خطا ہوئی۔ بہت سے پالو جانور دن میں قوت استدلال موجود ہوتی ہے اور وہ حصول مقاصد کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ کون ہے جس نے ہاتھی اور بندر کے ارادی افعال و حرکات کی بے تعداد مثالیں نہیں سنیں۔ اور ان جانوروں کے یہ عقائد و افعال کچھ تقلید جامد یا انسان سے میل جول رکھنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کی فطری سرشت کا لازمہ ہیں اس لیے کہ جنگلی جانور بھی جنہیں انسان کی محبت کا اتفاق نہیں ہوا اسی قسم کے اوصاف سے متصف پائے گئے ہیں۔ مختلف انواع کے حیدرون میں ذہنی قابلیت اور عادات و خصایل کے لحاظ سے بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً کتا نہ صرف بلی کی نسبت زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے بلکہ اوس میں وہ عمرانی و اخلاقی صفات بھی پائی جاتی ہیں جو بلی میں موجود نہیں ہیں۔ کتے کو اپنے آقا سے محبت ہوتی ہے اور بلی کو اپنے گھر سے۔

ڈوبو اریمان کا یہ قول ہمیں نہیں بھولنا: ”کارگا ہستی کے عجائبات پر ایک ہمہ گیر اور گہری نظر ڈالو۔ اور ننھی سی چیونٹی کے اوس دماغ کو دیکھو جو مقدار میں جزو لای تجزی سر کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ مادہ کے اس عصبی ذرہ میں اوس روح کو کرشمہ سنج دیکھ کر تم پر رعب اور حیرت طاری ہو جائے گی جس میں محنت و استقلال۔ اختراع و ایجاد۔ ترتیب و تناسب۔ و فائشی و جان سپاری اور شجاعت و دلادری کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر ہیں۔ غور تو کرو کہ چیونٹی کو یہ ترقی کتنے زمانہ میں جا کر نصیب ہوئی ہے۔ بے تعداد انسانوں نے شبانہ روز محنت کی ہو تب کہیں جا کر خدا کی یہ ننھی سی مخلوق اس درجہ کمال کو پہنچی ہے۔“

(بقیہ مضامین صفحہ گذشتہ) دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۸ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے دربار کا سرجن مقرر ہوا۔ اوس کی تاریخ انتقال ۱۸۴۱ء کو ۲۵ برس ۱۱ ماہ ۱۱ دن کا تھا۔ علم الامراض۔ علم الاحیاء اور علم النفس پر اوس کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ مترجم

ہیو بر جس نے چیونٹی کے حالات پر ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز رسالہ لکھا ہے بیان کرتا ہے کہ ”اگر تم کسی چیونٹی کے طرز عمل کو اوس وقت جبکہ وہ کام کر رہی ہو بغور دیکھو تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں چیونٹیوں کو ایک گروہ کو اپنا گھر بناتے دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک داروغہ نے اگر عمارت کا معائنہ کیا لیکن جب اوسے معلوم ہوا کہ ستریوں نے دیوار کی بلندی جتنی رکھنی چاہیے تھی نہیں رکھی اور چھت ڈالنی شروع کر دی ہے تو اوس نے فوراً چھت اُدھڑا ڈالی اور دیوار دن کو کافی بلند کر کے پرانی چھت کے سالے سے نئی چھت از سر نو ڈلوائی۔“ کیا اس بیان کے بعد بھی شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کیڑے محض کلین ہیں جن سے تمام افعال بر سبیل اضطرار سرزد ہوتی ہیں۔ مشیت۔ ارادہ اختیار کون سی ایسی صفت ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی ؟ چیونٹیاں جب اپنی پرانی سہیلیوں کو کئی مہینوں کے بعد دیکھتی ہیں تو ادھنیں فوراً پہچان لیتی ہیں اور اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا منہ سے منہ ملا کر باتیں کرنا دیکھو۔ اس طریقہ سے یہ بہت سے خیالات ظاہر کر سکتی ہیں۔ یہ طریقہ اظہار خیالات ان کے گھر کے لیے جس کے اندر چاروں طرف اندھیرا گھپ چھایا ہوا ہے ہر طرح سے موزون ہے۔

اکیلے رہنے والے کیڑوں کی اتنی عمر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں لیکن اکٹھے مل کر رہنے والے کیڑوں کی زندگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں اخلاقی خواہشیں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش خاص اہتمام سے کرتے ہیں۔ یہ بیج میرز جاندار جو محنت و استقلال کی زندگی تصویریں ہیں سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹی روزانہ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو دماغی محنت ایک وقت میں

لے فرمائے ہوں (التوفی ۱۹۸۴ء) سوسٹریلینڈ کا ایک مشہور ماہر علم خواص الاشیاء ہے۔ اگرچہ آخر آخر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا لیکن اپنی بی بی اور ایک وفادار ملازم کی مدد سے اوس ذہن کی کہیوں اور چیونٹیوں کے حالات کے متعلق نہایت قیمتی مواد فراہم کیا اور اپنی معلومات کو ۱۹۹۶ء میں بصورت کتاب شائع کیا۔ مترجم

سلسل چار پانچ گھنٹے سے زیادہ کر سکیں۔

نتیجہ کی یکسانی اسباب کی یکسانی پر دلالت کرتی ہے اور افعال کی مشابہت اعضا کی مشابہت کو مستلزم ہے۔ ہمارے وہ ناظرین جو جانوروں کی عادات و خصائل سے عموماً اور چیونٹی کے تمدن سے خصوصاً پوری واقفیت رکھتے ہیں اگر ہماری کتاب ”یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ“ کا انیسواں باب ملاحظہ فرمائیں گے تو انہیں ملک پیرد واقع امریکا کی وحشی قوم انکا کے تمدن کی کیفیت معلوم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ چیونٹی ایک ذرہ ناپ چیز ہے اور انسان اشرف المخلوقات لیکن چیونٹی کے تمدن اور قوم انکا کے تمدن کا موازنہ کرنے کے بعد اور ان خصوصیات رسم و رواج و عادات و خصائل کو میزان تقابل میں تو لے کر کے بعد جان و دون میں پائی جاتی ہیں ناظرین کو شاید ہم سے اس رائے میں اتفاق ہوگا کہ شہد کی مکینوں اور بھڑدن اور چیونٹیوں اور پرندوں اور ان تمام چھوٹے درجے کے حیوانات سے جنہیں انسان خمارت کی نظر سے دیکھتا ہے اسے ایک دن یہ سبق سکھنا ہے کہ خود اس کی حقیقت اور ہستی کیا ہے۔

ڈیکارٹ تمام کیڑوں کو خود بخود چلنے والی کلین تصور کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال بہت کچھ ترمیم کا محتاج ہے۔ کیڑے محض اس اضطراری حرکت کے لحاظ سے تو متحرک بالذات کلین سمجھے جاسکتے ہیں جو ان کے خیط البطن اور سلعتہ الراس کے اس حصہ سے سرزد ہوتی ہے جس کو ایک ہی دقت میں مختلف احساسات سے اثر پذیر ہونے سے تعلق ہے ورنہ باقی ہر اعتبار سے وہ متحرک بالارادہ اور فاعل مختار ہیں۔

جس مادہ سے اعصاب منقوط مرکب ہیں اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جو نقوش اشیاء خارجی کے اس پر مرتسم ہوں ان کے آثار و باقیات کو محفوظ رکھے۔ اس لحاظ سے سلعتہ الاعصاب کو جو اسی مادہ سے بنا ہے گویا نظام تصور کا محکمہ اندراج نقوش سمجھنا چاہیے۔ نظام عصبی کے عمل میں اس کی وجہ سے زمانہ کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے یعنی وہ نقش جو سلعتہ الاعصاب کے موجود نہ ہونے کی حالت میں فوراً منجمد ہو رہا ہو۔

کچھ دیر تک حالت اصلی پر قائم رہتا ہے اور اس قیام کی وجہ سے وہ تمام اہم نتائج مترتب ہوتے ہیں جنہیں بہت سے قدیم وجدید نقوش کے باہمی تعامل نے پیدا کیا ہے۔

کوئی خیال خود بخود نہیں پیدا ہو سکتا۔ ہر عقلی فعل کسی فعل سابق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ کوئی شے جو پہلے گزر چکی ہے اس کے وجود میں آنے کا باعث نہ ہو چکی ہو۔ دو دماغ جن کی ساخت میں سرسوفرق نہیں اگر یکساں حوالی میں ہوں گے تو اودن سے ایک ہی سا خیال پیدا ہوگا۔ اس مشابہت عمل یا یکسانی خیال کو تیز مشترک کا نام دینا چاہیے جس سے مراد فہم و شعور کی وہ عام قابلیت ہے جو دماغ میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ خیال کے پیدا ہونے کی دو جداگانہ حالتیں ہوتی ہیں یعنی ایک تو دماغ کی وہ حالت جو نقوش یا تصورات مابین پر منحصر ہے اور دوسری وہ حالت جس کا دار و مدار موجودہ طبعی حالات پر ہے۔

کیٹرون کے سلعتہ الراس میں اون نقوش کے آثار کا خزانہ جمع رہتا ہے جو معمولی اعضاء بیرونی پر مرتسم ہوتے ہیں اور باصرہ و سامعہ کے ذریعہ سے جو احساسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں وہ ان اعصاب میں رکھی رہتی ہیں۔ دونوں کا تعامل اضطرابی حرکات کو مبدل بہ افعال اختیاری کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کیٹرون کو خود بخود حرکت کرنے والی کلون پر جن میں انتقاش فورہ، رد عمل کا مستلزم ہے فوقیت حاصل ہو۔

ہر مرکز عصبی کا فعل عام اس سے کہ وہ مرکز ترقی کے درجہ اعلیٰ میں ہو یا ادنیٰ میں ایک اصولی حالت کیمیاوی کے تابع ہوتا ہے جسے اکاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود انسان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ خون جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ایک لمحہ کے لیے روک دیا جائے تو نظام عصبی کی طاقت ذایل ہو جاتی ہے اور اگر کم کر دیا جائے تو مقدار کم شدہ کی مناسبت سے کم ہو جاتی ہے لیکن اگر بڑھا دیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ کچھ سے ملی ہوئی تاثیر جن شخص کے ذریعہ سے پیچیدہ ترین میں پہنچائی جائے تو اعصاب کی عملی قوت

اوسى نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدل مایہ تھل کی ضرورت واقع ہوتی ہے اور
نکاح اور بیداری کے بعد آرام کرنا اور سونا لازمی ہے۔

اشیائے خارجی کے ہر ادراک کے ساتھ دو اصولی خیالات لازمی طور پر وابستہ ہیں۔
یعنی زمان و مکان۔ ان دونوں تصورات کے لیے نظام عصبی میں ابتدا ہی سے جبکہ وہ
ناقص و غیر مکمل ہوتا ہے گنجائش رکھ دی جاتی ہے۔ آنکھ سے مکان کا احساس ہوتا ہے
اور کان سے زمان کا اور ان دونوں اعضا کی مکمل ساخت نے ادراک زمان و مکان کو
اس قدر صحیح کر دیا ہے کہ اگر صرف قوت لامسہ ہی سے کام لیا جاتا تو ہرگز اتنا صحیح ادراک
نہ ہو سکتا۔

سلعۃ الاعصاب کی لوح پر اقسام نقوش کی کیفیت چند سادہ تجربوں سے واضح ہو سکتی
ہے۔ اگر کسی سرد مجلا و آبدار دھات مثلاً ایک نئے استری کے پھل پر کوئی شے مثلاً
ایک قرص رکھ دیا جائے اور سانس کی بھاپ دے کر نمی کے خشک ہو جانے کے بعد
قرص کو اٹھایا جائے تو اگرچہ نہایت غور سے دیکھنے پر بھی استری کی آبدار سطح پر کوئی شکل
نظر نہ آئے گی لیکن اگر منہ سے پھر بھاپ دی جائے گی تو قرص کا دھندلا سا سایہ نمودار ہو جائے گا
اور یہ عمل ایک دفعہ نہیں بلکہ مکرر کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر استری کو بحفاظت تمام بند کر کے
ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس کے پھل کی آب و تاب میں فرق نہ آئے پائے تو کوئی جھینے
کے بعد جب پھر اس کو منہ سے بھاپ دی جائے گی تو قرص کا سایہ موہوم پہلے کی طرح
نظر آنے لگے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناچیز سے ناچیز نقش اس طور پر قائم ہو کر محفوظ رہ سکتا
ہے۔ پس جب ایک ایسی جمادی و غیر عضوی سطح پر ایک اسٹ نقش نمودار ہو سکتا ہے تو اس
لوح اعصابی پر تو اسے بدرجہ اولیٰ ترسم ہونا چاہیے جسے صانع قدرت نے تیار ہی اسی
مقصد سے کیا ہے۔ کوئی سایہ بھی دیوار پر ایسا نہیں پڑتا جو اپنا مستقل نشان وہاں نہ چھوڑ

جاتا ہوا اور اگر مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں تو یہ نشان ظاہر ہو سکتا ہے۔ عکسی تصاویر کا عمل اس دعوے کا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب و اقارب کی تصویریں اور مناظر قدرے نقشے آئینہ عکسی کی ذکی المحس سطح پر گواہیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے لیکن جب مناسب اددیہ کا استعمال کیا جاسے تو وہ جھٹ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک پری ہی جو ہمارے عمل سے مشیشہ میں اتر آتی ہے اور وہ پیکر جمالی جو پہلے جلبابِ خفا اوڑھے ہوئے تھا چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے۔ ہمارے مخفی سے مخفی خلوت کدے میں جہان ہم یہ سمجھیں کہ ہین کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کسی نامحرم کی منظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہمارے تمام افعال و اعمال کے نشانات و آثار موجود ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کی ایک دھندلی سی تصویر سیاہ سیاہ کی شکل میں نقش دیوار بنی ہوئی پائی جائے گی۔

اگر کچھ دیر تک پلکین بند رکھنے کے بعد مثلاً صبح کو جاگتے وقت ہم یکایک ٹٹکی باندھ کر کسی روشن چیز کی طرف دیکھتے رہیں اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں تو جس غیر محدود تاریکی کا میدان ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہوگا اس میں اس چیز کا سایہ ہمیں نظر آئے گا۔ یہ سایہ کوئی خیالی شے نہ ہوگا بلکہ فی الحقیقت موجود ہوگا اس لئے کہ اصل شے کی جن باریکیوں پر چشم زدن میں ہمیں غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا وہ ہمیں اس سایہ میں نظر آ سکتی ہیں۔ مثلاً جاگتے وقت جس چیز پر اول اول ہماری نظر پڑی وہ اگر جالی کا پردہ تھا جس میں پھولدار لیس مکی ہوئی تھی یا درخت کی شاخیں تھیں جو ہماری خواہگاہ کے درجہ کے برابر آگاہ ہوا تھا تو پلکین بند کرنے کے بعد پردے یا شاخ درخت کی پوری تصویر بلا کم و کاست ہماری آنکھوں میں پھر جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ تصویر دھندلی ہوتی جاتی ہے اور ایک دو منٹ میں بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر سوج خلا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہم آنکھ کی پتلی کو حرکت دے کر اس صورت طلسمی کا پیچھا کرنا چاہتے ہیں تو وہ یکایک نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔

مشبکہ یعنی آنکھ کے پہلے پردے پر نقوش کے اس امتداد سے ثابت ہوتا ہے کہ اعصاب منقوط پر خارجی اثرات کا عارضی و آئی ہونا کچھ ضروری و لازمی نہیں ہے۔ آنکھ کے ان نقوش اور عکسی تصاویر کے نقوش میں امتداد انجلاؤ انطفا کے لحاظ سے پوری مطابقت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم نے میک میک کے مناظر دامکن کی ایسی عکسی تصویریں دیکھی ہیں جنکی نسبت عکسوں کا بیان ہے کہ شیشہ عکسی پر مہینوں بعد تیار کر کے بین سے اودیر کا عمل کیا گیا اور جب اس سفر طویل اور مدت مدید کے بعد تصویریں شیشہ پر ابھر کر کاغذ پر اتریں تو خط و خال اور نوک پلک کے لحاظ سے اصل اور نقل میں سرمو نہ رہا تھا۔ گویا شیشہ عکسی نے اپنی ودیعت کو پوری طرح سے ادا کر دیا۔ ہمیشہ قائم رہنے والا سرمو پلک پہاڑوں کا ڈیل ڈول اور ڈاکوؤں کے کسی گردہ کے الاؤ کا کچھ دیر میں غائب ہو جانے والا دھواں کوئی تفصیل ایسی نہ تھی جو تصویر میں رہ گئی ہو۔

ان واقعات کے مشاہدے کے بعد یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آلات حس و ذہن جن نقوش کو خارجی اشیاء سے فراہم کیا ہے آیا ان کے آثار جس طرح مشبکہ میں عارضی طور پر قائم رہتے ہیں دماغ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے ہیں؟ کیا قوت حافظہ کے معنی یہی ہیں کہ روح حوادث گذشتہ و واقعات ماضیہ کی اون تصاویر کو جو اس کے سپرد دی گئی ہیں مستحضر رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے؟ کیا اس کے نگار خانہ میں جہاں خاموشی کا عالم طاری ہے زندوں اور مردوں کی ننھی ننھی تصویریں اور دیکھے ہوئے مناظر اور آزمائے ہوئے واقعات کے نقشے لٹکے ہوئے ہیں؟ کیا یہ مستقل اور دیر پا نقوش کسی کتاب کے حروف کی طرح محض وہ علامتیں ہیں جو دماغ میں خیال پیدا کرتی ہیں یا اشیائے خارجی کی ایک نہایت ہی چھوٹے پیمانہ پر حقیقی شبیہ ہیں جن کو خرد بین کی مدد سے دیکھ کر ہیں اتنی سی جگہ میں جو سوئی کے سوراخ سے زیادہ نہیں پوری کعبہ کا مرقع ایک نگاہ میں نظر آ جاتا ہے؟

مشبکہ پر جو خیالی تصاویر نقش ہوتی ہیں وہ دون کی روشنی میں نظر نہیں آسکتیں۔ اسی طرح وہ تصاویر جو پردہ جس مشترک پرائٹری ہوئی ہیں اوس وقت تک ہماری توجہ کو اپنی طرف ایل نہیں کرتیں جب تک کہ آلات حس اپنے کام میں جستی اور استعدادی سے مصروف رہ کر نئے نئے نقش جس مشترک کے لیے جمع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ آلات تھک کر سست پڑ جاتے ہیں یا جب ہمیں سخت فکر دامنگیر ہوتی ہے یا جھٹ پٹے کے وقت ہم بیٹھے ہوئے کسی سوچ میں محو ہوتے ہیں یا جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو یہ مخفی صورتیں اپنے نہانہ خانہ سے نکل آتی ہیں اور چونکہ اس وقت ان کا امتیاز بوجہ تقابل و تضاد نمایاں ہو جاتا ہے اس لیے یہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بخار کی حالت میں جب ہم پر ہذیان طاری ہوتا ہے یا موت کے وقت جب ہم عالم سکرات میں ہوتے ہیں تو یہ چھپی چھپائی تصویریں ہمارے سامنے اکھڑی ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کا ایک تنہائی حصہ نیند میں گذرتا ہے اور اس زمانہ میں ہم پر عالم خارجی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سامعہ باصرہ اور دوسرے تو امطل ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی نہ آنکھ جھپکنے والی اور ہر وقت فکر میں ڈوبی رہنے والی نقاب پوش ساحرہ یعنی روح اپنے گنج تنہائی سے اوں تصویروں پر نظر ڈالتی رہتی ہے جو اوس نے جمع کی ہیں۔ یہ تصویریں نہ مٹ سکتی ہیں اور نہ ان کا نور گہنا سکتا ہے اور ان کو طرح طرح سے ترکیب دے دے کر وہ اوس دلکش اور حیرت انگیز مرقع کی تیاری کا سامان کرتی ہے جسے خواب کہتے ہیں۔

اس طور پر قدرت نے ان کی جسمانی ساخت کا ڈھنگ بھی کچھ ایسا ڈالا ہے کہ بقائے روح اور حیات اخروی کے تصورات بے اختیار اوس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ غیر جذب دشتی کو بھی جس کی روح پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے عالم ردیاء میں وہ سہانی جنگل اور دلغریب مرغزار نظر آتے ہیں جو اوس کی یاد کا سب سے زیادہ خوشگوار حصہ ہیں۔ ان غیر حقیقی اور موہوم تصاویر سے وہ بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ سایہ ہیں

اوس دلکش حقیقت کا جو اوسے ایک آنے والی زندگی میں نظر آئے گی۔ کبھی کبھی خواب میں اوسے اون گزرے ہوئے لوگوں کی صورتیں بھی نظر آجاتی ہیں جن میں سے زندگی کی حالت میں کوئی اوس کا دوست رہ چکا ہے اور کوئی دشمن۔ ظاہر ہے کہ عالم خواب کے ان مظاہر کو وہ روح کے وجود و بقا کی محبت قاطع سمجھتا ہے۔ خود ہم بھی جیسی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر ہے اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نتائج ہمارے غیر مذہب آباد اجداد نے ان سے اخذ کیے تھے وہی ہم بھی نکالتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ درجہ کی تہذیب و شایستگی جس طرح ہمیں کمزوریوں اور بیماریوں سے نہیں بچا سکتی اسی طرح معقنات فطرت کی قید سے بھی آزاد نہیں کر سکتی۔ ان اعتبارات سے روئے زمین کے کل انسان مادی الحیثیت ہیں۔ ہم خواہ وحشی ہوں خواہ تہذیب یافتہ لیکن اس سہم کو کسی طرح سفر نہیں کہ ہماری فطرت فنا اور بقا کی اون حقیقتوں کو جن سے زیادہ ہتم بالشان اور قلب کو مرعوب کرنے والی حقیقت اور کوئی نہیں ہو سکتی ایک نہ ایک وقت ہمارے سامنے پیش کر کے رستی ہے۔ ان حقیقتوں کے انکشاف کے لئے فطرت انسانی کسی سوز و ن موقع کی منتظر رہتی ہے۔ اور یہ موقع اوس وقت آتا ہے جب ہم ان فراغ یا بیماری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہماری فطرت اپنا پورا عمل کرتی ہے اور ہم بھی اس وقت اس کی حقایق آموزیوں سے متنبہ ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔ اس فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک غریب امیر جاہل عالم سب برابر ہیں۔ مغرور سے مغرور اور متکبر سے متکبر۔ شخص اس کی سرزنش اور نصیحت سے نہیں بچ سکتا اور سکین سے سکین اور عاجز سے عاجز شخص کو بھی حقیقت عقلی کی معرفت کی تسکین سے یہ محروم نہیں رکھتی۔ اس پر کسی کی سازش یا خود فرضی کا جادو نہیں چلتا۔ انسانی کوشش کی خارجی تائید کی اس کے نہ ٹلنے والے اثر کو پروا نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ کہیں بھی کیوں نہ جائے یہ برابر سایہ کی طرح لگی رستی ہے۔ گزشتہ تصورات کے آثار و باقیات سے حیرت انگیز معنائی کے ساتھ عالم

عقبی کی آنے والی حقیقتوں کی ناممکن التردد شہادتوں کا استخراج اس کا کام ہے۔ یہ اوس سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جو ظاہر میں نگاہوں کو خشک نظر آتا ہے۔ اور اوس دہمی و خیالی شبیہوں سے جو ظاہر ہوتے ہی غایب ہو جاتی ہیں ہمارے صورتگدہ ایقان کے لیے اوس لعبتوں کو تیار کرتی ہے جو فنا و زوال کی رہیں منت نہیں ہیں۔

کیڑے اور کل میں یہ بڑا فرق ہے کہ ایک متحرک بالذات ہے اور ایک متحرک بالارادہ۔ بالفاظ دیگر کل میں خارجی تحریک کے پہنچتے ہی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور کیڑے پر اوس تحریکات کا بھی اثر ہوتا ہے جن کا داخلہ دماغ میں موجود سے یعنی جو پہلے سے دماغ پر نقش ہو چکی ہیں۔ حیوانات کے طبقہ اعلیٰ میں اس تسجیل نقوش کا عمل زیادہ کامل و مکمل ہوتا ہے اور قوت حافظہ زیادہ کمال کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خارجی شکل میں اور اوس کے اوس نقش میں نوح السلسلہ پر رسم ہو کوئی مشابہت پائی جائے اس لیے کہ اوس پیغام تار برقی کے الفاظ میں جو تار گھر میں داخل کیا جاتا ہے اور اوس علامات میں بھی تو کوئی مشابہت نہیں ہوتی جن کے ذریعہ سے یہ پیغام ایک مقام سے دوسرے مقام در دروازہ تک پہنچایا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کسی چھپی ہوئی کتاب کے حروف اور اوس افعال یا مناظر میں بھی کوئی تطابن شبہی نہیں پایا جاتا جن کا اظہار بذریعہ حروف کیا گیا ہے۔ البتہ حروف سے واقعات و مناظر کی تصویر پڑھنے والے کے پردہ ذہن پر صفائی سے اتر آتی ہے۔

آلات حفاظت نقوش سے جو حیوان محروم ہو اوس کی حقیقت متحرک بالذات کل سے زیادہ نہیں۔ اوس میں قوت حافظہ نہیں ہو سکتی۔ ان آلات کا ابتدائی مواد نہایت ہی بے حقیقت و غیر متیقن ہوتا ہے لیکن اسی مواد سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے یہ آلات درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ترقی کی بڑھتی رفتار کے ساتھ فہم شعور اور ادراک کی قابلیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے آلات تحفظ و تسجیل نقوش منتہائے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

اوس کے گزشتہ موجودہ نقوش اوس کے لیے دستور العمل کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ تجربہ کو اپنا رہ نما قرار دیتا ہے اور اوس کے افعال عقل کی ہدایت سے صادر ہوتے ہیں۔

جب کسی حیوان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اون نقوش کا علم جن کا ذخیرہ اوس کی مراکز عصبی میں جمع ہے اوسی نوع کے دوسرے حیوان پر منتقل کر سکتا ہے تو ترقی کی ایک بہت بڑی منزل طے ہو جاتی ہے۔ یہ ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ انفرادی زندگی نے اجتماعی یا عمرانی زندگی کی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ کیفیات ذہنی کے انتقال کی قابلیت یعنی تعلیم دینیت کے لیے لازمی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے کٹرے اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے پر سرسج الحسن لاسہ رونگٹوں کے تماس سے کرتے ہیں اور انسان کا ذریعہ اظہار معلومات تکلم ہے۔ بنی نوع انسان اپنے ابتدائی دور یعنی زمانہ جاہلیت میں اپنی معلومات کا اظہار اپنی زبان سے جس پر صرت باہمی گفتگو کے ذریعہ سے کر سکتے تھے۔ اس طور پر ایک نسل کے افعال اور خیالات دوسری نسل کو ترک میں پہنچتے تھے اور اوس کے افعال و خیالات پر اپنا اثر ڈالتے تھے۔

لیکن زبانی روایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قوت گویائی کی بدولت انسان مل جل کر رہنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تمدنی ترقی نہیں کر سکتا۔

قوت گویائی کو سلسلہ ارتقا کا مشاہدہ غالی از دلچسپی نہیں۔ فن تحریر کی ایجاد و نقوش کے اندراج و تسجیل کو شان و سعت و دوام عطا کی۔ جو نقوش اب تک صرف ایک انسان کے دماغ میں جمع تھے ان سے تمام نوع انسانی ہر زمانہ میں مستفید ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس قابلیت نے تمدن کو ممکن کر دیا اس لیے کہ تحریر یا کسی ایسے ذریعہ کے بغیر جس سے واقعات کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہ سکیں تمدن کا وجود ممکن نہیں۔

اس فلسفیانہ پہلو سے اگر غور کریں تو ہمیں چھاپے کی ایجاد کی اصلی قدر و منزلت معلوم ہوگی۔ چھاپہ تحریر کے ارتقا کا وہ درجہ ہے جو خیالات کو روز بہ سرعت کے ساتھ شایع کرنے اور ادھین ہمیشہ کے لیے قائم و برقرار رکھنے سے بنی نوع انسان کی ترقی

تہذیب اور اتحاد و ارتباط باہمی کا باعث ہوتا ہے۔

ذرات عصبی کی لوح پر نقوش کے ارتسام اور ادون کی تسجیل اور ادون کے تیاج کے متعلق جو کچھ مین نے گذشتہ فقرہ میں بیان کیا ہے وہ دراصل ادون خیالات کا خلاصہ ہے جو میری کتاب ”ہیومن فزیالوجی“ (ترکیب اعصاب انسان) میں بوضاحت درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جن ناظرین کو تفصیل مطلوب ہو وہ اس کتاب کی وہ فصل ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ”بصارت منقلب یاد ماغی بینائی“ ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ اول کی فصل چہارم اور مقالہ دوم کی فصل ہشتم کا مطالعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

روح انسانی کی صحیح ماہیت کا اگر سراغ لگ سکتا ہے تو اس کی شکل یہی ہے کہ اس کا مقابلہ روح حیوانی سے کیا جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ دقت طلب ہے اور بہت کچھ دقت اور محنت اس پر خرچ کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے نتیجے کی صحت میں بھی کلام نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر کیا ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ مادہ کی طرح روح کا بھی ایک عظیم الشان وجود کائنات کی رگ و پے میں ساری و دایر ہے اور یہ روح ایک بہت بڑے جرم فلسفی کے قول کے مطابق ”پتھر دن میں سوتی ہے جانور دن کے قالب میں اگر خواب دیکھتی ہے اور انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہی جاگ اٹھتی ہے“؟ کیا جسم کی طرح جو مادہ سے بنتا ہے روح بھی روحانی وجود سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد اپنے اپنے مخارج کو لوٹ جاتے ہیں یعنی جسم مادہ میں جاتا ہے اور روح روح میں جاتا ہے؟ اگر حقیقت حال یہی ہے تو پھر ہم وجود انسانی کی تاویل کر سکتے ہیں اور یہ تاویل حقایق علمی کے ساتھ تطابق رکھ سکتی ہے یعنی ہمارا یہ خیال کہ نظام کائنات دائم و قائم اور غیر تغیر پذیر ہے اس تاویل سے باطل نہیں ہونے پاتا۔

عربوں نے دوسری مشرقی اقوام کی تقلید کر کے اس ہمہ گیر روحانی وجود کا نام ”عقل فعال“

رکھا۔ اون کا خیال یہ تھا کہ جس طرح مینہ کا قطرہ سمندر سے نکل کر کچھ دیر بعد پھر اسی میں جا ملتا ہے اسی طرح انسان کی روح عقل فعال یعنی خدا سے صادر ہو کر ایک مدت میں بعد اسی کے ساتھ واصل ہو جاتی ہے۔ اس طور پر سلاٹون میں مسئلہ انفصال و انجذاب کا ظہور ہوا۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہندوستان میں ساکی منی نے اس مسئلہ کو ایک صورت میں مسلم الثبوت قابلیت کے ساتھ رواج دیکر مذہب بدھ کا مدار علیہ بنایا۔ اسی مسئلہ کو دوسری شکل میں ابن رشد نے عربوں میں رائج کیا۔ لیکن ساکی منی کا طریقہ تعلیم ابن رشد کے مقابلہ میں زیادہ استادانہ تھا۔

لیکن یہ رائے شاید زیادہ تر قرین صواب ہوگی کہ اہل یورپ ابن رشد ہی کو اس مسئلہ کا بانی قرار دیتے ہیں اس لیے کہ اون کی نظروں سے وہ سلسلہ اسناد جو ابن رشد کو مسئلہ مذکور کے موجدوں سے ملاتا ہے پوشیدہ تھا۔ یورپ والے چاہر ابن رشد کو کیسی ہی وقعت کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں لیکن مسلمانوں نے تقدم کا سہرا اوس کے سر نہیں رھنے دیا۔ وہ اون کے نزدیک مفسر شراح ارسطو تھا اور اوس کی حیثیت اون کے نزدیک اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ سہرا سکندریہ اور اپنے زمانہ تک کے دوسرے فلسفیانہ مسالک کا ناقل تھا۔ ذیل کا اقتباس موسیورینان کے اوس تاریخی مضمون سے ہے جو اوس نے فلسفہ ابن رشد پر لکھا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا خیال اوس کے فلسفہ کی نسبت وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا۔

اس مذہب (فلسفہ ابن رشد) کے پیروں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص متاثر ہو تو اوس کا جو ہر عقلی یعنی روح جداگانہ طور پر قائم نہیں رہتی بلکہ اوس عالمگیر روح یا عقل فعال یا روح کائنات یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اوس میں جذب ہو جاتی ہے جس سے ابتداءً اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔

عقل کل یا عقل فعال یا عقل موجود فی الخارج نہ مخلوق ہے نہ اوس میں کسی شے کا نفوذ ممکن ہے۔ نہ وہ فاسد پذیر ہے۔ نہ اوس کی ابتدا و انتہا ہے اور نہ اوس میں انفرادی ارواح کی تعداد کی زیادتی سے زیادتی واقع ہوتی ہے۔ وہ مادہ سے بالکل منزہ ہے۔ وہ گویا نظام کائنات کا جوہر یا طاقت ہے۔ عقل فعال کا یہ توحید ابن رشد کے فلسفہ کا اصل اصول ہے اور اسلام کے اصولی و انتہائی عقیدے یعنی وحدت واجب الوجود کے ساتھ توافق و تطابق رکھتا ہے۔

عقل منفرد یا عقل الفعالی یا عقل موجود فی الذہن عقل کل سے صادر ہوئی ہے اور انسان کی روح پر مشتمل ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عقل فانی ہے اور اس کا خاتمہ جسم کے ساتھ ہو جاتا ہے مگر دوسرے اعتبار سے یہ غیر فانی بھی ہے اس لیے کہ موت کے بعد اس کی رجعت عقل کل کی طرف ہوتی ہے جس میں یہ ضم یا جذب ہو جاتی ہے اور اس طور پر تمام ارواح انسانی کے ہمہ گیر روح میں ملنے سے آخرین صرف ایک روح یعنی یہی ہمہ گیر روح باقی رہ جاتی ہے جو سب کا مجموعہ ہے۔ زندگی کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ اس کی مالک قدرت ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد انتہائی یہی ہے کہ عقل فعال کے ساتھ اوس کا اتحاد شان اکیلیت لیے ہوئے ہو۔ یہی اتحاد یا انضمام یا وصال روح کے لیے مایہ سرور جادو دانی ہے۔ کاتب تقدیر نے ہماری لوح مقدر کا عنوان سکون و طمانیت قرار دیا ہے اور اسی کے حصول کے لیے ہم کو کوشش کرنی چاہیے۔ ابن رشد کا خیال یہ تھا کہ روح کی جسم سے جدا ہوتے ہی عقل منفرد عقل کل میں جذب ہو جاتی ہے لیکن بد مذہب والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فنا کے کامل یعنی نردوان کے مقام تک پہنچنے میں روح کو کچھ مدت لگتی ہے اور اس اثنا میں انسان کی شخصیت برقرار رہتی ہے لیکن اوس میں انحطاط و زوال شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے بالکل فنا ہو جاتی ہے۔

فلسفہ نے نظام کائنات کی توجیہ کے ہمیشہ دو پہلو اختیار کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک

شخصی خدا ہے جس کا وجود سب سے علیحدہ ہے اور اس کا ضمیمہ ایک انسانی روح ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے اور جو حادث کے بعد غیر فانی ہو جاتی ہے۔ ددم یہ کہ ایک غیر شخصی عقل یا غیر معین خدا ہے جس میں سے روح نکلتی ہے اور ایک مدت مقررہ کے بعد اوس میں جا کر مل جاتی ہے۔ موجودات کی تشکیل کے متعلق بھی دو متضاد خیالات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عدم سے وجود میں لائی گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ اشکال و صورت سابقہ سے نشوونما پا کر موجودہ حالت میں پہنچی۔ مسئلہ پیدائش نظریہ اول سے متعلق ہے اور مسئلہ ارتقاء نظریہ ثانی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس طور پر عرب فلسفہ کی اسی شاہ راہ پر چلے جس پر اہل چین و اہل ہند غرض شرق کی تمام قومیں چلی تھیں۔ اس فلسفہ کے معرکہ الآثار اس ایل کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر تھا کہ مادہ اور قوت کو فنا نہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ قدرت میں جو بے پایاں ذخیرہ مادہ کا موجود ہے اس سے انسان کا جسم ترکیب پاتا ہے اور فنا ہونے پر اسی میں جا کر مل جاتا ہے تو لامحالہ اسے یہ نتیجہ نکالنا پڑا کہ انسان کی روح بھی عقل کل یا ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتی ہے اور بالآخر اس میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ انفصال و انجذاب کی فلسفیانہ خصوصیات پر کافی وضاحت کے ساتھ نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یورپ میں اس مسئلہ نے اندلسی عربوں کی بدولت رواج پایا۔ اسپین وہ مرکز تھا جہاں سے اس کی شعاعیں نکل نکل کر یورپ کے علمی و عقلی حلقوں میں پھیلیں اور اسپین ہی میں اس کا حسرت ناک خاتمہ ہوا۔

خلفائے اندلس نے مشرقی عیش و عشرت کے کل لوازم فراہم کر رکھے تھے۔ اون کے قصہ دیوان شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ اون کے دلفریب باغوں کی فضا میں دیکھ کر آنکھوں میں طلسمات کا نقشہ پھر جاتا تھا۔ اون کی حرم سراؤں میں ایسی ایسی نازنینیں موجود تھیں جن کا حسن چاند اور سورج کو شرماتا تھا۔ یورپ کی تہذیب آج کے دن

بھی اوس سلیقہ اوس قرینہ اور اوس لطافت مذاق سے معرا ہے جو اندلسی عربوں کی پایہ تخت
 میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ اون کے شہر دن میں کوئی شڑک ایسی نظر نہ آتی تھی جس پر کھنکھے کٹے
 ہوئے نہ ہوں اور جورات کے وقت قندیلوں سے نہ جگمگاتی ہو۔ اون کے مکانات نقش
 و نگار سے مزین اور قالینوں کے پر تکلف فرش سے آراستہ ہوتے تھے۔ جاڑوں میں
 اونہیں دہکتے ہوئے تابدان گرم رکھتے تھے اور گرمیوں میں معطر اور مغنبر ہوا جو پھولوں کی
 کیاریوں سے چل کر زمین و وزنون میں سے ہوتی ہوئی آتی تھی اونہیں خوش گوار ٹھنڈک
 پہنچاتی تھی۔ نفیس حمام۔ شاندار کتب خانے۔ کھانا کھانے کے فرحت افزا کمرے۔ پانی
 اور سیلاب کے دلربا فوارے اون کے تمدن کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ ہر شہر اور
 ہر قریہ میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ بانسری اور چنگ کی تال پر جا بجا محفل رقص
 و نشاط گرم نظر آتی تھی۔ لیکن ان پر لطف صحبتوں میں اوس بدستی و بد تمیزی کا رنگ نظر نہ آتا تھا
 جو مسلمانوں کے پھوٹے اور گنوار شمالی ہسپانوں کے جلسوں میں عام طور سے پایا جاتا تھا۔
 مسلمانوں کے ہاں شراب قطعاً ممنوع تھی۔ اندلس کی دلفریب چاندنی راتوں کا لطف
 مسلمان امر اطرح طرح سے اڑاتے تھے۔ کوئی چین میں بیٹھا ہوا داستان گویوں کے افسانوں
 جی بہلاتا تھا۔ کوئی باغ کی روشن میں دوست احباب کے ساتھ ٹہلتا ہوا فلسفیانہ مباحث
 میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ غرض اون کا وقت نہایت لطف سے کٹتا تھا اور اگر کبھی اونہیں
 اس زندگی کی تلخیوں اور نا کامیوں کا خیال آتا تھا تو یہ سوچ کر اون کو تسکین ہو جاتی تھی کہ
 نیکی کا اجر اسی دنیا میں مل جائے تو عالم عقلی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی مصیبتوں اور
 پریشانیوں سے کبھی نہ نگہبر اتے تھے بلکہ اس خیال سے دل کو تشفی دے لیتے تھے کہ گو اس
 دو دن کی زندگی میں ہم محنت اور تکلیف اٹھا رہے ہیں لیکن موت کے بعد جب ہم دوسری
 زندگی کی سر زمین میں قدم رکھیں گے تو وہ آرام ہمارے حصہ میں آئے گا جس کے بعد
 کوئی محنت نہیں۔

دسویں صدی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوس عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی مسلمان اور یہودی بے روک ٹوک آپس میں ملتے تھے اور ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی جس کا شیرازہ مساوات سلوک نے باندھ رکھا تھا۔ اس زمانہ کے جن شاہیر کے نام ہم تک پہنچے اون میں جربرٹ کا نام بھی شریک ہے جو آگے چل کر پاپائے اعظم ہو گیا۔ پیٹر الملقب بہ مقدس اور دوسرے بہت سے عیسائی پیشوایان مذہب بھی اسی عہد کے خرمین فضل و کمال کے خوشہ چین تھے۔ پیٹر کا بیان ہے کہ میں نے ایسے علما کو یہاں دیکھا جو فن ہیئت کی تحصیل کے لیے برطانیہ سے چل کر آئے تھے۔ ارباب فضل و کمال کا عام اس سے کہ وہ کہیں کو ہوں یا کیسے ہی مذہبی عقاید کیوں نہ رکھتے ہوں نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ خود خلیفہ کے محل میں کتابوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ موجود تھا جس میں کتابوں جلد سازوں اور نقاشوں کی ایک جماعت کثیر ملازم تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے ہر بڑے شہر میں خلیفہ کے گماشتے مقرر تھے جن کا یہی کام تھا کہ جو نادر کتاب ملے فوراً خرید لیں۔ اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں جن کے منقش اوراق اور پر تکلف جلدیں بصارت کے لیے سرمہ کا حکم رکھتی تھیں۔

لیکن ایشیا کے تمام اسلامی ممالک اور نیز افریقہ و اسپین کے ادنیٰ طبقہ کے مسلمان علم کے جانی دشمن تھے۔ جن کا زہد و التقاؤ زیادہ بڑھا ہوا تھا اور جنہیں پابندی شرع کا دعویٰ شد و مد کے ساتھ تھا اور انہیں تو خلیفہ المامون تک کی نجات میں شک تھا۔ چنانچہ اون کا یہ قول تھا کہ اس شریر خلیفہ نے ارسطو اور دوسرے یونانی کفار کی تصانیف کو رواج دے کر نہ صرف خلق خدا میں ایک بل چل ڈال دی ہے بلکہ ہشت اور دوزخ کے وجود کو بھی یہ کہہ کر زمین گول ہے اور ناپی جاسکتی ہے وہی و خیالی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی لہذا وہ انتظام سلطنت میں بھی خیل ہو گئے تھے۔ المنصور نے جو حاکم کے بیٹے کو بے دخل کر کے خلافت خود غصب کر بیٹھا تھا خیال کیا

کہ اگر مین مذہبی جماعت کا ساتھ دون کا تو میرے قدم جم جائیں گے۔ لہذا اس نے حکم دیا کہ حاکم کے کتب خانہ میں جتنی علمی یا فلسفیانہ کتابیں پائی جائیں سب ضائع کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزار ہا کتابیں شارع عام پر جلادی گئیں یا محل کے حوضوں میں ڈبو دی گئیں اور اس طور پر علم و حکمت کا وہ نادر ذخیرہ جو حاکم ثانی کے مذاق سلیم نے سالہا سال کی محنت اور لاکھوں روپیہ کے خرچ سے جمع کیا تھا منہدم کی خود غرضی اور جہلا کے تعصب کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ اسی طرح کے ایک درباری انقلاب کے باعث ابن رشد (المتوفی ۱۱۹۸ء) بڑے بے چین اسپین سے ملک بدر کیا گیا۔ مذہبی جماعت نے فلسفی جماعت پر فتح پائی اور ابن رشد دشمن مذہب قرار دیا گیا۔ تمام اسلامی دنیا میں فلسفہ کی مخالفت کی جانے لگی۔ ایک بھی فلسفی اس زمانہ میں ایسا نہ تھا جسے سزا ملے ہو۔ بعض سزایاب ہوئے بعض جان سے مار ڈالے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے اسلام ریاکاروں سے بھر گئی۔

۱۔ جرنی اور انگلستان میں ابن رشد کا فلسفہ چکے پکے پہنچ گیا تھا۔ فرانسیسی فریق کے پادریوں نے اس فلسفہ کو خاص وقت کی نظر سے دیکھا اور پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔ بہت سے لوگوں نے جنہیں مبداء فیاض سے جوہر فکر سلیم عطا ہوا تھا اسے تسلیم کر لیا اور اس کا حلقہ اثر وسیع ہو چکا۔ لیکن آخر کار فرقہ ڈالینک نے جو فرقہ فرانسیسیں کا قریب تھا اس کی مخالفت شروع کی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ابن رشد کا فلسفہ ذات اور شخصیت کے تصور کو متا دیتا ہے جبر یہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے اور عقول منفردہ کے اختلافات مدارج اور ترقی کی کوئی توجیہ نہیں پیش کر سکتا۔ یہ دعویٰ کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے غلط محض ہے اس لیے کہ اس سے اولیا کی کرامت اور تصرفات روحانی کی نفی ہو جاتی ہے اور انسانوں کے مدارج میں کوئی فرق قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ سمجھ میں آنے کی بلست ہے کہ پیٹر کی مقدس اور یہود کی ملعون روح میں کوئی فرق نہ ہو بلکہ دونوں کا درجہ برابر ہو؟ ابن رشد کا یہ مہد انہ مسلک پیدائش۔ تائید ایزدی۔ الہام۔ اقامت ثلاثہ۔ استجابہ دعا۔ ثواب

خیرات اور قبولیت استغفار کا منکر ہے۔ خشر جسام اور بقا سے روح کو باطل قرار دیتا ہے اور محض حظ نفس کو موجب سعادت دارین خیال کرتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں میں بھی جو اس زمانہ میں صدر نشینان بزم ادراک متصور ہوئے تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا۔ مشہور یہودی فیلسوف موسیٰ بن مہیون نے اس فلسفہ کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کے شاگرد اسے دنیا کے ہر حصہ میں پھیلاتے جاتے تھے۔ لیکن دفعۃً یہودیوں کے اوس طبقہ نے جس کا میلان مذہب کی طرف تھا اس فلسفہ کی مخالفت بڑے زور و شور سے شروع کی مہیون کو پہلے وہ ازراہ فخر "راس العلماء" فرزانہ دوران۔ مایہ نازش سرزمین مغرب۔ آفتاب ارض مشرق" کا لقب دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ انسانوں میں اوس کا درجہ اگر کسی سے کم ہے تو صرف حضرت موسیٰ سے۔ لیکن اب انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مہیون دین ابراہیم چھوڑ بیٹھا ہے۔ پیدائش کے امکان سے منکر ہے۔ دنیا کی ابدیت کا منکر ہے۔ دہریت کے عقاید کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے۔ خدا کو اوس کی صفات سے محروم کیے دیتا ہے۔ اور خدا کو غلام یا جوت قرار دے کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ نہ دعا کو سن سکتا ہے اور نہ اوسے انتظام عالم میں دخل ہے۔ مانٹ پلیر بارسلونا اور ٹالیڈو میں یہودیوں کی جو دینی جلسیں قائم تھیں انہوں نے مہیون کی تصانیف کو آگ میں جلا دیا۔ اور اس طور پر فلسفہ ابن رشد کو ایک اور بہت بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔

فرڈیننڈ اوراسیلا کی فتوحات نے عربوں کی حکومت اندلس کا خاتمہ کیا ہی تھا کہ پاپا نے ان فلسفیانہ عقاید کے استیصال کی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں کیونکہ پیشوایان مذہب عیسوی کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ عقاید یورپ میں مسیحیت کی جڑہ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

پاپا ٹرانوسنٹ چہارم (۱۲۳۴ء) کے عہد تک متحدہ دون کی سزا دی کے لیے اساتذہ کی دینی عدالتوں کے علاوہ کوئی خاص محکمہ موجود نہ تھا۔ لیکن جب مذہبی قوت ایک مرکز پر

اگئی تو ایک محکمہ احتساب عقاید بنام ”انکویزیشن“ قائم کیا گیا۔ اس محکمہ نے جسے پاپائی صدر عدالت فوجداری کہنا چاہیو قدیم مقامی عدالتوں کو مٹا کر خود اداون کی جگہ لے لی۔ چونکہ اس محکمہ نے اس وقت کو اقتدارات سلب کر لیے تھے لہذا اونہوں نے اسے نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مگر پاپائی طاقت کے مقابلہ میں اداون کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی بے اثر محض تھی۔ اس نئی عدالت کے مرکز آٹلی۔ اسپین۔ جرمنی اور فرانس کے جنوبی صوبوں میں قائم کیے گئے۔

دینیو فرمانرواؤں نے ”انکویزیشن“ کو اپنی ملکی اغراض کی تکمیل کا آلہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات دینی فرمانرواؤں یعنی پاپاؤں کو سخت ناگوار گذری اور ہر پاپا نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھانا رکھا۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ طاقت پادریوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ فرانس کے جنوبی صوبوں میں ”انکویزیشن“ کا قیام استیصال الحاد و زندہ کے لیے نہایت موثر ثابت ہوا تھا۔ ایرلینڈ کے صوبہ میں بھی یہ عدالت قائم کی جا چکی تھی۔ اب یہودیوں کا قلعہ و قلع کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوئی۔

قدیم زمانہ میں جب قوم وزلیگا تھ کے فرمانرواؤں کا دور دوں تھا یہودی بہت خوشحال تھے لیکن جب وزلیگا تھوں نے ایریسس کا وہ موجدانہ مسلک جس کی تلقین یہودیوں نے کی تھی چھوڑ کر خالص تہذیب پرستی اختیار کی تو یہودیوں کے ساتھ بجائے ترقی کے نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا اور اداون کے بسے ہوئے گھرانے ابرٹنے لگے۔ یہودیوں کے لیے نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ قوانین وضع کئے گئے۔ چنانچہ ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا گیا کہ ہر ایک یہودی غلام سمجھا جائے گا اور اسے آزادی کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ جب عربوں نے اسپین پر حملہ کیا تو یہودیوں نے دل و جان سے حملہ آوروں کی مدد کی۔ عربوں کی طرح وہ بھی مشرقی نسل سے تھے۔ دونوں کا نسب حضرت ابراہیم سے جو ان کے مورث اعلیٰ تھے ملتا تھا۔ دونوں خدا کی وحدانیت کو معتقد تھے۔ اور اسی سلسلہ کی حمایت اداون کو وزلیگا تھ آقاؤں کو اداون کا دشمن بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کے عہد میں یہودیوں کے ساتھ منہایت ہی ملوث برتاؤ کیا گیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی دولت اور علم کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ادا میں سے اکثر ارسطو کے مقلد تھے۔ انہوں نے بہت سے در سے اور کالج قائم کیے۔ چونکہ ادا کے تجارتی تعلقات ہر ملک کے ساتھ تھے لہذا دنیا کے ہر حصہ میں ادا کو سفر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ علم طب کی تحصیل کا ادنیٰ خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔ ارمینہ وسطیٰ میں یورپ کے طبیب اور مہاجن ہر جگہ یہودی ہی تھے۔ معاملات انسانی کو فلسفیانہ انتقاد کی نظر سے جانچنے کا شرف صرف ادنیٰ کو حاصل تھا۔ طب اور فلسفہ کے علاوہ وہ ریاضی اور ہیئت میں بھی دست گاہ دانی رکھتے تھے۔ الفانسو کی زیچین ادنیٰ کی مرتب کی ہوئی ہیں اور ڈی گاما کو سفر روئے زمین کا خیال ادنیٰ نے دلایا فن ادب میں بھی ادنیٰ کمال حاصل تھا۔ دسویں سے لے کر پندرہویں صدی تک وہ انشا پردازی میں یورپ کے استاد سمجھے جاتے رہے۔ سلاطین کے دربار دن میں وہ طبیب کی حیثیت سے باریاب ہوتے تھے اور سرکاری خزانوں کے انتظام کے لیے بطور صدر محاسب یا انسر اعلیٰ مامور ہوتے تھے۔

مملکت یونان کے کٹر بادریوں نے عوام الناس کو یہودیوں کے برخلاف بہت کچھ بھڑکا یا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے ان بچاروں کی ایذا دہی پر کمر باندھ لی۔ ان مظالم سے بچنے کے لئے بہت سے تو بظاہر عیسائی ہو گئے لیکن عیسویت قبول کرنے کے بعد پھر اپنے آبائی مذہب کی طرف عود کر آئے۔ پاپا کے سفیر متعینہ دربار کیسٹیل نے محکمہ ”انکویریشن“

لے الفانسو دوم شاہ لیان کیسٹیل سے مراد ہے جو شہداء میں تخت پر بیٹھا۔ فن ہیئت سے اسے ایک خاص لگاؤ تھا۔ چالیس ہزار اشرفیوں کی لاگت سے اس نے ہیئت کی وہ شہرہ آفاق زیچین تیار کرائیں جہاں حوالہ متن میں دیا گیا ہے۔ ان زیچین کو میڈرڈ کی اکادمی نے نظر ثانی کرکے شہداء میں از سر نو مرتب کیا۔ مترجم

عہ زمانہ سابق میں ایک مستقل بادشاہت تھی۔ آج کل اسپین کا ایک صوبہ ہے جس کی شمالی سرحد فرانس ہے۔ اس کا رقبہ کوئی چار ہزار چوبیس میل ہوگا۔ مترجم

کے قایم کیے جانے پر بہت کچھ زور دیا۔ غریب اور غیر مستطیع یہودیوں پر تو یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ عید الفصح^۱ کی تقریب پر واقعہ تصلیب کی تضحیک کے لیے عیسائی بچوں کی قربانی دیتے ہیں اور دو لقمہ یہودیوں سے یہ جرم منسوب کیا جاتا تھا کہ وہ ابن رشد کے پیرو ہیں۔ ڈائمنیکن فرقہ کا ایک راہب ٹارکوی میڈانامی ملکہ اسامیلا کا پادری تھا۔ اس کی ترغیب سے ملکہ نے پاپا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ احتساب عقاید کا مقدس محکمہ دولت اسپین میں قایم کرنے کی اجازت اسے عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۸۰۸ء میں پاپا کا فرمان صادر ہوا کہ کفر و زندہ کی سراغ برآری اور استیصال کی غرض سے ”انکویزیشن“ کی مقدس عدالت قایم کی جائے۔ اس عدالت کی پہلے سال یعنی ۱۸۰۸ء کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار اشخاص آندلس میں زندہ جلائے گئے اور ان کے علاوہ کئی ہزار مردے قبروں سے نکال کر جلائے گئے اور سترہ ہزار اشخاص کو جرمانہ یا جبس دوام کی سزا دی گئی مظلوم یہودیوں میں جس سے بن پڑا جان سلامت لے کر بھاگ گیا باقی تختہ مشق ستم بنا کر گئے۔ ٹارکوی میڈا نے جواب کیسٹیل اور لیان کا صدر محاسب مقرر ہوا ادا احتساب وحشیانہ خونخواری سے دی۔ گناہ شکایات کی بنا پر ملزم کو پکڑ لایا جاتا تھا۔ اس کے مواجہ میں کوئی شہادت نہیں لی جاتی تھی۔ اسے گواہوں پر جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اقبال جرم کے لیے ملزم کو شکنجہ میں دے دیا جاتا تھا۔ اور شکنجہ کا جانفزا عذاب زمین و آسمان میں پہنچایا جاتا تھا جہاں سے بچا رہے ستم رسیدن کی چیخ پکار کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ رحم کا منہ اس طرح چڑایا جاتا تھا کہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ مجرم کو شکنجہ میں دوسری مرتبہ نہک جائے۔ فیاضی کی نقل اس طرح اتاری جاتی تھی کہ ملزم سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تمہاری ہڈیوں کا چوراہا اچھی طرح نہیں ہوا اس لیے کل تک کے لیے شکنجہ کی سزا ملے گی جاتی ہے۔ بد نصیب مجرموں کے

۱۔ بنی اسرائیل کے فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی خوشی میں جوتیو ہار یہودی ہر سال مناترین اس کا

نام عید الفصح ہے۔ مترجم

تباہ و شبن خانہ الاذن کی مصیبت کا اندازہ کرتے ہوئے، ماغ لڑتا ہے۔ لارنٹ نے ”انکویریشن“ کا سو رخ ہے۔ اندازہ لگایا ہے کہ ٹارکوئی میڈا اور اوس کے شرکائے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دوسو بیس اشخاص کو زندہ جلا یا چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی سورتین بنا کر بائین اور ستانوس ہزار تین سو اکیس اشخاص کو دوسرے طریقہ سے مختلف منزلیں دیں۔ اس مجموعہ الحواس پادری نے انجیل کے عبرانی نسخے جہاں کہیں ملے ضایع کرادئے اور سیلیسٹکائین علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابیں یہ کہہ کر آگ میں چھونک دیں کہ ان میں یہودی مذہب کی تعلیم مندرج ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ سنتے ہیں کہ پاپائی حکومت دو ہند یہودیوں سے روپیہ لے کر ”انکویریشن“ کے اعداد سے مستثنیٰ کر دیتی تھی اور ہند کرات الفظران کی فروخت سے بہت کچھ روپیہ پیدا کرتی تھی تو ہماری نفرت اور حقارت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

لیکن اس خوفناک ظلم اور وحشیانہ جبر کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بہت کم یہودی ایسے تھے جنہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب عیسوی قبول کیا۔ لہذا ٹارکوئی میڈا نے اس بات پر زور دیا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ یہودی فوراً ملک بدر کیا جائے۔ حکومت سے اس لئے یہ بات بھی منوا کر چھوڑی۔ بتایا کہ ۳ مارچ ۱۹۴۲ء عیسویوں کے اخراج کے فرمان پر دستخط ہو گئے۔ تمام یہودیوں کو جو اصطباغ یافتہ نہ تھے بلالیا طاعمر یا جنس یا سالت حکم دیا گیا کہ آئندہ جولائی کی آخری تاریخ تک ملک سے نکل جائیں۔ اور اگر واپس آئیں گے تو سزائے موت پائیں گے۔ اس فرمانِ قہر تو امان کی رو سے اگرچہ وہ اس کے مجاز کے لئے تھے کہ اپنا مال اور املاک فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے ساتھ لیتے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ یہ قیمت نقدی کی شکل میں نہ ہو بلکہ یا تو سامان تجارت یا ہنڈی کی شکل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے مال یا جائیداد کی بازار میں کیا قیمت اٹھ سکی تھی جن کے سر پر قضا سے بہم کی طرح یہ حکم سوار تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر ملک سے نکل جائیں اور ملک بھی وہ ملک جو اون کا زاد بوم تھا جہاں وہ پلے اور بڑھے تھے جس میں ان کے آباؤ اجداد صد ہا سال سے

بستے چلے آئے تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اوس مال کو جو لائی کے جینے کے بعد کوڑیوں کے
 دواہوں بلکہ مفت ملنے والا تحار و پیہ دے کر خریدتا۔ جب بیکس اور مظلوم یہودیوں کی جلاوطنی
 کی دردناک گھڑی قریب آئی تو ایک طرف تو گلی کوچوں میں اون کے نالہ و بکا کی جگر خراش
 آوازیں امید اور انصاف کی مرثیہ خوانی کرتی ہوئی ہوا میں رہ رہ کر گونجتی تھیں دوسری طرف
 ناخدا ترس پادری سڑکوں اور گلی کوچوں میں کھڑے ہوئے اپنی جوش فصاحت کو اس نصیب
 قوم کی سیہ کاریاں اور بد اعمالیاں گنانے میں مصروف کرتے ہوئے نظر آتے تھے یہی تماشائی
 تک اس دردناک اور زہرہ گداز نظارہ کو دیکھ کر روتے تھے لیکن کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لئے
 کہ ہمار کوئی میڈا کی قسوت قلبی اس فرمان کی تعمیل کر اگر رسمی کہ یہودیوں کو کوئی شخص کسی طرح
 کی مدد نہ دے۔

جو یہودی اس طور پر جلا وطن ہوئے اون میں سے کچھ تو افریقہ اور کچھ اٹلی چلے گئے۔
 جو جماعت اٹلی گئی تھی وہ اپنے ساتھ جہازی بخار کی و بالیتی گئی جس نے نیپلز کے بیس ہزار باشندوں
 کو صفحہ ہستی سے محنت غلط کی طرح مٹا کر اس جزیرہ نما کو ویران کر دیا۔ کچھ یہودی ترکی کو
 بھی ہجرت کر گئے اور علیٰ ہذا القیاس اون کی ایک جماعت نے انگلستان میں جابود و باش
 اختیار کی۔ سفر کی گونا گون مصیبتوں کی تاب نہ لا کر ہزاروں رستہ میں مر گئے جن میں زیادہ تر فریغ
 بچے اور اون کی مائیں۔ کم سن بچے اور سن رسیدہ ضعیف اشخاص تھے۔ بہت سے ایسے
 تھے جنہوں نے پانی کے دیس نہ آنے سے تشنہ لہی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔

یہودیوں کی اس بیخ کنی کے بعد مسلمانوں کی باری آئی۔ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک
 فرمان بمقام اشبیلیہ صادر ہوا جس میں اس تمہید کے بعد کہ دشمنان خدا کو ملک سے
 نکال دینا ہر سچی کا مقدس فرض ہے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر غیر اصطباغ یافتہ عرب جس کی عمر سن
 شیر خوارگی سے تجاوز ہو مملکت کسٹیل ولیان سے اور اخرا د اپریل تک ملک سے نکال دیا
 جائے۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مال و متاع فروخت کرنے کی اگرچہ اجازت تھی

لیکن جائیداد فروخت شدہ کی قیمت سونے چاندی کی شکل میں ہمراہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممانعت کی گئی کہ کوئی مسلمان اسلامی مالک کو ہجرت نہ کرے اور یہ جتلا دیا گیا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی حالت یہودیوں سے بھی بدتر تھی۔ کیونکہ یہودیوں کو تو پھر بھی یہ اجازت دی گئی تھی کہ جہان اودن کے سینک ساٹھ چلے جائیں لیکن مسلمان اس حق سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ ہسپانوی مسیحیوں کی شیطنت آمیز سفار کی اسی حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ یہ تک کہتے ہوئے خدا سے نہ ڈرتے تھے کہ مسلمانوں کی بے غیرتانیہ دینی کی پاداش میں اگر حکومت اودن سب کی گردن مار دے تو کچھ بے جا نہ ہو۔

افسوس مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ جس رواداری اور مسالمت کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ ناسپاس اور حق ناشناس عیسائیوں نے اودن کو دیا تو یہ دیا! اہل مظلوم مسلمانوں کے ساتھ سخت بدعہدی اور بے ایمانی روا رکھی گئی۔ غوثا طہ کی اسلامی حکومت نے جب ہتھیار ڈالے تھے تو عیسائیوں سے یہ اقرار حاصل لے لیا تھا کہ اودن کو تمہاری اور مذہبی حقوق میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی جائے گی۔ لیکن پادری زمین پر کے اغوا پر یہ وعدہ توڑ دیا گیا اور آٹھ سو سال تک آباد رہنے کے بعد مسلمان اس ملک سے نکال دیئے گئے۔

انڈس میں تین مذاہب یعنی عیسائیت موسویت اور اسلام کے پہلو پہ پہلو موجود ہونے سے فلسفہ ابن رشد کو نشوونما پانے کا موقع ملا تھا۔ یہ گویا اوسى واقعہ کا اعادہ تھا جو کئی صدی پیشتر رومین اوس وقت پیش آیا تھا جبکہ مالک مہتوہ کے تمام دیوتا اور دیویاں پایہ تخت قیصر میں لاکر جمع کر دی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی طرف سے عام بد اعتقاد پھیل گئی تھی۔ خود ابن رشد پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اول مسلمان تھا پھر عیسائی ہوا پھر یہودی بنا اور انجام کار دہریہ ہو گیا۔

از مسند وسطی میں دو تصانیف اپنے محدانہ مضامین کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھیں۔ ایک کا نام ”دوسری یورلا سٹنگ گاسپل“ (انجیل لازوال) تھا اور دوسری کا ”ڈی ٹرانس امپاسٹاریمس“ (جماعت کا ذہن)۔ ثانی الذکر کتاب کے مصنف کے متعلق مختلف اقوال تھے۔ بعض لوگ اس تصنیف کو پاپائی جبرٹ سے منسوب کرتے تھے بعض فریڈرک ثانی سے اور بعض ابن رشد سے۔ چونکہ ڈامینیک فرقة کے پادریوں کو ابن رشد سے قلبی عداوت تھی لہذا اس زمانہ کے ہر محدانہ عقیدہ کو وہ بلا تامل اس کے سر تصحوپ دیتے تھے۔ چنانچہ مسئلہ عثمانی ربانی کی تحقیر و تضحیک کا ذکر اس کے حلقوں میں جب آتا تھا تو ابن رشد کے نام پر سینکڑوں گالیوں پڑ جاتی تھیں۔ ابن رشد کی تصانیف کا علم مسیحی یورپ کو اول اول تیرھویں صدی کے شروع میں میکائیل اسکاٹ کے تراجم کی وساطت سے ہوا لیکن ایشیا کی طرح یورپ میں بھی اس قسم کے خیالات مدتوں پہلے سے شائع ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اریجینا کا فلسفہ انہیں کس شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ عربوں پر مذاق فلسفہ سے آشنا ہوتے ہی ان خیالات کا اثر پڑنے لگا تھا۔ اور تینوں خلفائوں کے دارالعلوم میں یہی فلسفہ رائج تھا۔ اگر ان خیالات پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالی جائے کہ عقلی نشو و نما کے ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد ہر انسان کا ان سے خود بخود متاثر ہو جانا یقینی ہے بلکہ ارسطو کو ان کا مبداء و منشا قرار دیا جائے تو تاریخ شہادت دے دے رسی ہے کہ ہر اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ان خیالات کی بھلک ہمیں رابرٹ گراسٹ۔ راجر میکن اور اسپانور کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ ابن رشد ان خیالات کا موجد نہ تھا بلکہ محض شارح اور مفسر تھا۔ تیرھویں صدی کے یہودیوں کو اساد کی سند پر صرن شاگرد بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ ارسطو کی جگہ فلسفہ مشائے کے شارح اعظم ابن رشد نے لے لی تھی۔ مسئلہ انفصال و انجذاب کے مسیحی ماننے والوں کی تعداد یورپ میں اس قدر بڑھ گئی کہ پاپائی گزٹڈر رابع (۱۵۵۷ء) کو مجبوراً داخلت کرنی پڑی۔ چنانچہ اس کے حکم سے آلبرٹس میگلس نے ایک کتاب مسئلہ وحدت عقل کل کے رد میں لکھی۔ اصلیت و مابہیت

روح پر بحث کرتے ہوئے اوس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ”یہ مسئلہ کہ ایک عقل
 محمدا اپنے نور سے افراد انسانی کو اودن کے پیدا ہونے سے پہلے منور کرتی ہے اور اودن کے
 فنا ہونے کے بعد قائم رستی ہے ایک قابل نفیر غلطی سے آلودہ ہے۔“ لیکن ارسطو کے
 زندہ جاوید مشایخ کا سب سے بڑا مخالف سینٹ ٹاماس ایکویناس تھا جس نے وحدت
 عقل کل - انکار توفیق ایزدی - عدم امکان پیدائش اور اسی قسم کے دوسرے عقاید کی جو محمدانہ
 بحکمے جاتے تھے شد و مد کے ساتھ تردید کی اور اپنے ہم صیغہ دن یعنی ڈائمنیکن فرقہ کی پادریوں
 کی رائے میں گویا ان الحادات کا قلع و قمع کر ڈالا۔ سینٹ ٹاماس نے جب اپنے سچی بھائی
 بند دن کو ابن رشد کے عقاید اختیار کرتے ہوئے دیکھا جو اوس کی نظر میں مسلمانوں سے بھی
 بہتر تھا تو اوس کے فیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور ڈائمنیکن پادریوں کے قول کو مطابق
 اس ”فرشتہ خصال عالم حید“ نے اپنے مخالف پردہ نمایان قلی فتوحات حاصل کیں جن کی یادگار
 فلاسفس اور پاپا کے نقاشوں نے پردہ تصویر پر چھوڑی ہیں۔ ڈائمنیکن پادریوں کے
 سند طیش پر یہ خیال تازیا نہ باری کرتا تھا کہ فرانسسکن فرقہ کے پادری جن سے انہیں رقابت
 تھی ابن رشد کے عقاید رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈیٹیلی نے جو فرقہ ڈائمنیکن کا طرف دار تھا ابن رشد
 کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک نہایت خطرناک مذہب کا بانی ہے۔ غرض ابن رشد پر تینوں بڑی مذہب
 کی طرف سے متفقہ تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا اور یہ خطرناک قول اوس سے منسوب کیا گیا کہ ”تمام
 مذاہب اگرچہ غالباً مفید ہیں لیکن اودن کے باطل ہونے میں شک نہیں۔“ وین کی کونسل میں
 بالاتفاق یہ قرار پایا کہ اوس کی تعصیفات کی اشاعت مطلقاً روک دی جائے اور تمام عیسائیوں کو
 اودن کے مطالعہ کی ممانعت کی جائے۔ ڈائمنیکن فرقہ کے پادریوں کو ”انکویریشن“ کا سامہیب آئے
 ہاتھ آگیا تھا اور اودن کے سفاکانہ جبر و تشدد سے تمام یورپ کانپ رہا تھا۔ اس زمانہ میں جو
 بے دینی پھیلی ہوئی تھی اوس کا ذمہ دار یہ فرقہ ابن رشد ہی کے فلسفہ کو قرار دیتا تھا لیکن مخالفوں
 کے مقابلہ میں اوس کے طرفداروں کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ نہ صرف پیرس بلکہ شمالی اٹلی

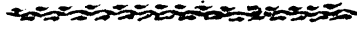
کے تمام شہروں میں فرانسسکن فرقہ کے عیسائی اوس کے پیرو تھے اور کل عیسوی دنیا میں ان مناقشوں کی وجہ سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔

ڈائینیکن فرقہ کے پادریوں کی زبانی ابن رشد کے کافرانہ و لحدانہ کارناموں کا ذکر سنتے سنتے اٹلی کے نقاشوں اور مصوروں کی نظروں میں وہ بیدینی کی مجسم علامت بن گیا تھا۔ اٹلی کے اکثر شہروں اور قریوں میں روز قیامت اور دوزخ کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ان میں ابن رشد کہیں نہ کہیں فرو نظر آتا ہے۔ چنانچہ پائیس کے ایک اسی طرح کے مرقع میں جہان حضرت محمد اور ایریس اور دجال کی تصاویر ہیں وہاں ابن رشد بھی موجود ہے۔ ایک اور مرقع میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ابن رشد زمین پر گرا ہوا ہے اور سینٹ ٹاماس اوس کی چھاتی پر سوار ہے سینٹ ٹاماس کی فوج اور ابن رشد کی مشکت لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ اٹلی کے مصوروں کی مذہبی تصاویر سوہوین صدی تک ابن رشد کے بغیر مکمل نہ بھی جاتی تھیں۔ اور اوس کے فلسفیانہ عقاید پیٹروا کی یونیورسٹی میں سترہویں صدی تک بدستور قائم رہے۔

فلسفہ ابن رشد کے اسپین سے اٹھ کر یورپ پر حملہ آور ہونے کی داستان ہم بالاجمال سنا چکے۔ اب صرف اتنا بیان کرنا باقی رہتا ہے کہ فریڈرک ثانی کی سرپرستی میں اس فلسفہ نے تسلی میں بھی سر اٹھایا لیکن اس طرف سے اس کی پیش قدمی زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ فریڈرک ثانی نے اسے پوری طرح سے تسلیم کر لیا تھا۔ اپنی کتاب ”سیلین کوئٹینس“ میں اس نے اوس نے ابدیت عالم اور ماہیت روح پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان مسائل کے متعلق اوس کے تمام شکوک ابن سبین کے جوابات سے رفع ہو گئے جو ابن رشد کا پیرو تھا۔ لیکن فریڈرک ثانی کی یہ آزاد خیالی چند روزہ ثابت ہوئی۔ وہ پاپائی عظیم کی مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور اوس کے مغلوب ہونے پر ان فلسفیانہ خیالات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اٹلی کے شمالی حصہ میں فلسفہ ابن رشد مدتوں قائم رہا۔ ونیس کے طبقہ اعلیٰ میں اس کا اثر یہاں تک تھا کہ ہر ذیع و شریف اس کے اتباع پر مجبور تھا۔ آخر کار کلیسا نے اس کی قسمت

کا فیصلہ کر دیا۔ یعنی لیٹرن کونسل نے ۱۵۶۲ء میں یہ قنونی صادر کیا کہ جو شخص ان قابل نفرت عقاید کی حمایت کرے گا وہ ملحد و بے دین سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آ کر ہیں دیکھیں کونسل نے بھی اپنے گزشتہ اجلاس میں ان عقاید کو مورد سب و شتم ٹھہرایا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام مطامع و ملامت کے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ خیالات بنی نوع انسان کے ایک جزو غالب کے نزدیک صحیح ہیں۔



چھٹا باب

نزاع مذہب و سائنس دربارہ ماہیت عالم

ماہیت عالم کی نسبت مذہبی خیال یعنی زمین بیٹی ہے۔ بہشت اور دوزخ۔ اہل سائنس کا خیال یعنی زمین گول ہے۔ زمین کی جسامت کی دریافت۔ نظام شمسی میں اس کا درجہ اور نظام سی کے دوسرے اعضا کے ساتھ اس کے تعلقات۔ کوپرنیکس۔ ڈی گاما اور میگلین کے تین بڑے بحری سفر۔ سیاحت گرد زمین۔ ایک درجہ کی پیمائش اور رقاص ساعت کے ذریعہ سے کر دیت زمین کی تعیین۔ کوپرنیکس کے اکتشافات۔ دوربین کی ایجاد۔ گلیلیو ”انکوپریشن“ کے اجلاس میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اوس کی مزایابی۔ سائنس کی فتح کلیسا پر۔ جسامت نظام شمسی کی تحقیق کی کوشش۔ سیارہ زہرہ کے مرد منطقه البروج کی بنا پر آفتاب کے زاویہ اختلاف منظر کی تعیین۔ کرہ زمین اور الفسان کی بیچ میرزی۔

خیالات دربارہ جسامت کائنات۔ زوایاے اختلاف مناظر کو اکب۔ برد و نیم دعویٰ کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیا میں موجود ہیں۔ محکمہ ”انکوپریشن“ اوسے گرفتار کر کے قتل کر دیتا ہے۔

اب ہم اون مباحث کو چیز تحریر میں لانا چاہتے ہیں جو فلسفہ کے تیسرے اہم بانسان مسئلہ یعنی ماہیت عالم کے متعلق پیدا ہوئے۔

اگر ہم صحیفہ قدرت کا مطالعہ بنظر انتقاد نہ کریں۔ تو ہمیں بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ زمین ایک وسیع چٹائی سطح ہے جو قبة آسمان کو سہارے ہوئے ہے۔ اور یہ قبة نیلگون فوقانی و تحتانی دریاؤں کے مابین حد فاصل ہے۔ اجرام فلکی یعنی آفتاب ماہتاب اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ ان کے قامت کی کہتری اور غیر متحرک زمین کے گرد اون کا حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا درجہ زمین سے بڑا تب حقیر اور بہدارج کلم ہے۔ جو حیوانات روئے زمین پر پیدا ہیں ان میں علم مشاہد کے لحاظ سے ایک بھی انسان کا مد مقابل نہیں اور اس لیے اس کا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آفتاب اس قدر سے پیدا کیا گیا ہے کہ دن کے وقت اس سے روشنی پہنچاؤ۔ چاند اس قدر سے بنا۔ ئے گئے ہیں کہ اندھیری راتوں میں اون کا اجالا اس کی رہبری کرے۔

مختلف ادیان و مذاہب کی روایات کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے نہ عقل و ادراک میں قدم رکھتے وقت مظاہر فطرت کے فلسفہ ہی تصورات قائم کیے ہیں۔ تمدن کے دور اول میں انسان نے زمین کو اکبر و اعلیٰ موجودات سمجھ کر مرکز کائنات خیال کیا ہے اور انسان کو افضل و اشرف مخلوقات مان کر زمین کی مرکزی ہستی سمجھا ہے۔ ریاضیاتی حساب سے دنیا کو کچھ دور سے دیکھ کر بلا غور و تعمق ہی قائم نہیں کیا بلکہ مختلف زمانہ میں صحابہ کرام نے آفاق و انبساط کے بین من حیث المتفلسف اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان الہامی حقائق سے انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ آسمان کے بلورین گنبد کے اوپر نور لا زوال اور کمال خلاق کا ایک عالم ہے جسے بہشت کہتے ہیں۔ اس عالم میں خدائے تعالیٰ اور ملائکہ رہتے ہیں اور ممکن ہے کہ مرنے کے بعد ان کو بھی یہی جگہ رہنے کو ملے۔ زمین کے نیچے ایسی تاریکی اور عذاب کا مستقر ہے جہاں بدوئل کو رکھا جائے گا۔ اس طرح عالم مرئی کے پردہ میں گویا عالم غیر مرئی کی تصویر دکھادی گئی ہے۔

ترکیب عالم کے اس تصور کی بنا پر بڑے بڑے مذاہب کی عمارتیں قائم کی گئی ہیں اور چونکہ اس کے قیام کے ساتھ بہت سی زبردست مادی اغراض وابستہ تھیں لہذا اس کے استحکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جو کوششیں پیروان سائنس کی طرف سے اس کی سلسلہ غلطیوں کی تصحیح کے لیے عمل میں لائی گئیں ان کی مخالفت بعض دفعہ یہاں تک ہوئی ہے کہ خوریزی تک نوبت پہنچتی ہے۔ اور یہ مخالفت محض اس خیال سے کی گئی ہے کہ اگر مخالفین کو کامیابی ہوئی تو بہشت و دوزخ کے مواقع کی تسخیر کا ستون مرکز ثقل سے ہٹ جائے گا اور اس افضلیت و اکملیت کو جو کائنات کے موضوع اعظم ہونے کے لحاظ سے انسان سے منسوب کی جاتی ہے بہت بڑا صدمہ پہنچے گا۔

لیکن اس قسم کی کوششوں کا عمل میں آنا ایک یقینی اور لازمی امر تھا۔ جب انسان اس مسئلہ پر غور و غوض کرنے کے قابل ہو گیا تو اس نے جو اسے دعوے کے تسلیم کرنے میں تامل ہونی لگا کہ زمین ایک سطح غیر محدوده ہے۔ کسی شخص کو اس امر میں کلام نہیں ہو سکتا کہ آفتاب آج ہماری دیکھنے میں آیا ہے یہ وہی آفتاب ہے جسے ہم نے کل دیکھا تھا۔ اس کے نورانی قرص کا ہر صبح از سر نو نمودار ہونا یہ خیال پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ زمین کے نیچے سے گزرا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہو تو وہ دوسرا مفروضہ کہ زمین کے نیچے ہمیشہ تاریکی چھائی رہتی ہے باطل ہوا جاتا ہے۔ غرض آفتاب کا زمین کے نیچے سے ہو کر گذرنا منطقی زمین کی گردیت کا خیال کم و بیش وضاحت کے ساتھ ضرور پیدا کرتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ زمین کا پھیلاؤ سمت تحتانی میں غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آفتاب کا نفوذ اس کے جرم میں ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی ایسا سورج یا منفذ زمین میں موجود ہو جس کی راہ سے آفتاب نکل آتا ہو اس لیے کہ سال کے مختلف موسموں میں اس کے طلوع و غروب کے مقامات مختلف ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ستارے بھی زیر زمین مختلف اطراف میں حرکت کرتے ہیں پس ضرور ہے کہ زمین کے نیچے ایک صاف رستہ موجود ہو۔

آیات الہامی کو اس جدید استقرار کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے اس قسم کی توجیہات ضرورتاً فوقتاً کام لیا گیا جن کی مثال کاساس انڈیکا پلیوسٹینز کی کتاب ”کرسچین ٹاپو گرافی“ (جغرافیہ سیسی) میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو یاد ہو گا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ زمین ایک چپٹی سطح ہے جس کے شمالی حصوں میں ایک بہت بڑا پہاڑ واقع ہے۔ آفتاب جب اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔

ایک نہایت دور دراز تاریخی زمانہ میں انسان کو کسوف و خسوف کی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ چاند گہن کے مشاہدے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ زمین کا سایہ ہمیشہ مدور ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے یہ بدیہی نتیجہ نکلا کہ زمین کی شکل بھی گول ہوگی اس لیے کہ جو جسم ہر حالت میں گول سایہ ڈالتا ہو وہ خود بھی گول ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ دوسرے قرائین و دلائل سے بھی جن کو آج کل بچہ بچہ جانتا ہے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی کہ زمین کرودی شکل ہے۔

لیکن شکل زمین کی تعیین اسے اس سند عظمت سے ہٹانہ سکی جس پر ظاہر ہیں انھوں نے اسے بٹھا رکھا تھا۔ چونکہ وہ بظاہر تمام دوسری اشیاء کے مقابلہ میں بمراتب بڑی نظر آتی تھی اور کسی محسوس ہو سکنے والی شے کی اس کے سامنے کوئی ہستی نہ تھی لہذا ظاہر میں ان ذہن منور اسے مرکز عالم بلکہ خود عالم تصور کیا۔

اگرچہ ادون تیا ج نے جو زمین کو کرودی شکل ماننے سے پیدا ہوئے مردجہ مذہبی عقاید پر نہایت گہرا اثر ڈالا لیکن جو تیا ج جسامت زمین کی تعیین سے مترتب ہوئے وہ کمین زیادہ اہم تھے۔ علم ہندو کا ہندی بھی اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ زمین کی جسامت کا صحیح حال سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے غالباً نہایت قدیم زمانہ میں متعدد کوششیں ملائے گئے ہست کی طرف سے ہوئیں جن کو تیا ج ضائع

ہو گئے ہیں۔ لیکن اتنا ہموک تحقیق کے ساتھ معلوم ہے کہ ایرانا سٹھینر نے مصر میں سکندریہ اور سین کے درمیان یہ سمجھ کر کہ سین ٹھیک خط سرطان کے نیچے واقع ہے ایک درباری ارضی کی پیمائش کی کوشش کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دونوں مقامات نصف النہار کے ایک ہی خط پر واقع نہ تھے لہذا ان کے باہمی فاصلہ کا صرف اندازہ لگا لیا گیا۔ پیمائش ہین کی گئی۔ اس کے دو صدی بعد پاسیڈنیس نے اسکندریہ اور آڈس کے درمیان اس قسم کی دوسری کوشش کی۔ سہیل نامی روشن ستارہ مقام ثانی الذکر پر افق کو مس کرتا تھا اور اسکندریہ میں افق سے ساڑھے سات درجہ اونچا تھا لیکن اس مرتبہ بھی ان دونوں مقامات کے درمیان سمندر کا حامل ہونا پیمائش کو مانع آیا اور فاصلہ کا صرف تخمینہ قائم کر لیا گیا۔ بالآخر جبکہ ہم سابق میں بیان کر آئے ہیں خلیفہ المامون نے درجہ ارضی کی دو پیمائشیں کرائیں۔ ایک ساحل بحر قلزم پر دوسری عراق عرب میں شہر کوفہ کے قریب ان مختلف تجربوں کا عام نتیجہ یہ نکلا کہ زمین کا قطرات اور آٹھ ہزار میل کے درمیان ہے جسامت زمین کے اس تخمینہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عظمت و جبروت کے اُس درجہ پر جس پر وہ ابھی تک خوش عقیدہ لوگوں کے نزدیک فائز تھی گر گئی اور دینیات میں اس کی وجہ سے ایک ہل چل پڑ گئی۔ اس ہل چل میں ارسٹارکس متوطن سیماں کی تحقیقات نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ارسٹارکس مدرسہ اسکندریہ کا متبحر ہیئت دان تھا جس نے نہایت کازمانہ پایا ہے۔ شمس و قمر کی مقدیر و الہاد پر اس نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں وہ اُس قابل تعریف مگر ناقص طریقہ کو بوضاحت بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اس مسئلہ کے حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے بھی کئی قرن پیشتر فیثاغورث کے ذریعہ سے ایک نیا خیال ہندوستان سے یورپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس خیال کے مطابق آفتاب مرکز کائنات تھا۔ آفتاب کے گرد اگر عطارد۔ زہرا۔ زمین۔ مریخ۔ مشتری اور زحل اپنے اپنے محوروں پر گھومتے ہوئے درجہ بدرجہ گردش کرتے تھے۔ بقول سیسرو

نائیٹاس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو گردش فلک کی ناقابل خیال سرعت کی وجہ سے جو مشکل پیش آتی ہو وہ رفع ہو جاتی ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ آرسٹارکس کی تصانیف جو کتب خانہ اسکندریہ میں موجود تھیں جو لکسین کی آتش زنی میں جل گئی ہوں۔ اُسکی صرف ایک تصنیف ”مقادیر و ابجد خمس و قمر“ جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے دستبرد روزگار سے بچی بچائی ہم کسب پہنچی ہے۔

آرسٹارکس نے نظام فیثاغورث کو ایک حقیقت نفس الامری سمجھ کر تسلیم کر لیا۔ آفتاب کا حیرت انگیز فاصلہ اور اس لحاظ سے اُسکا عظیم الشان جرم اس اعتراف کا دار علیہ تھا۔ نظام فیثاغورث نے آفتاب کو مرکز کائنات قرار دی کہ زمین کا درجہ بہت ہی گھٹا دیا اور اسے ان چھ نواب کے زمرہ میں شریک کر دیا جن کا کام یہ ہے کہ آفتاب کے گرد گردش کیا کریں لیکن آرسٹارکس نے فن ہیئت کی ایک ہی خدمت نہیں کی یہ دیکھ کر کہ زمین کی حرکت سے کو اکب کے ظاہری یا اعتباری مقامات و مواقع پر کوئی نمایان اثر نہیں پڑتا۔ اُس نے یہ استدلال کیا کہ اُن کا اور زمین کا باہمی فاصلہ سورج اور زمین کے باہمی فاصلہ سے بھی بدچرا زیادہ ہے۔ لپٹیس کا قول ہے کہ کائنات کے جلال و عظمت کا صحیح خیال جیسا آرسٹارکس کو تھا ویسا مہندسین زمانہ قدیم میں سے اور کسی کو نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فاصلہ فوابت کو مد نظر رکھنے کے بعد زمین کی ضیعت ایک ذرہ ناچیز سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے اوپر بجز فضا کے بسیط اور کو اکب کے اور کچھ نہیں ہے لیکن اجسام فلکی کے مقامات حقیقی و اعتباری کے متعلق آرسٹارکس کے خیالات کو ندانے تسلیم نہیں کیا بلکہ نظام بطلمیوسی جس حیثیت سے کہ اُس کی تصریح المجسطی میں کی گئی ہے عام طور پر رائج ہو گیا۔ اُس زمانہ کا فلسفہ طبیعی نہایت ناقص و غیر مکمل تھا۔ مثلاً نظام فیثاغورث پر بطلمیوس کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر زمین متحرک ہو تو ہوا اور دوسرے

لطیف اجسام کو پیچھے چھوڑا جائے۔ اسی لیے اُس نے زمین کو مرکز کائنات قرار دے کر یہ ظاہر کیا کہ قمر - عطارد - زہرہ - شمس - مریخ - مشتری اور زحل درجہ بدرجہ اُس کے گرد گھومتی ہیں اور زحل کے مدار کے بعد منطقۃ النواہت ہے۔ ایک خیال اُس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ دو ٹھوس بلورین کرے ہیں جن میں سے ایک مشرق سے مغرب کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن یہ محض ایک فرضی خیال تھا جو یوڈاکس کا پیدا کیا ہوا تھا اور اُس کا بطلمیوس حوالہ تک نہیں دیتا۔

اس لحاظ سے نظام بطلمیوسی گویا فرضی مرکز ہے اس نے زمین کا تفوق قائم رکھا اور اس لیے مسیحی یا اسلامی عقاید کو برا فروختہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بانی کی مسئلہ شہرت اور اُس غیر معمولی قابلیت نے جو اسکی تصنیف متعلقہ ساخت آسمانی پر صرت کی گئی ہے۔ نظام بطلمیوس کو چودہ سو سال یعنی دوسری سے لیکر سولہویں صدی تک پایہ اعتبار سے ساقط نہ ہونے دیا۔

مسیحی دنیا میں اس زمانہ دراز کا زیادہ تر حصہ ماریت ذات باری کے مباحث اور مذہبی اقتادات کے حصول کی غرض سے باوریوں کی رقیبانہ کشمکش میں گملا۔ مسیحی زندگان دین کے اجتہاد نے اس عام عقیدہ کے ساتھ شامل ہو کر کہ انجیل جلد علوم و فنون کی مخزن ہے مشابہ و تجربہ اور علمی اکتشافات کا راستہ دکھایا اگر ہنیت کے کسی مسئلہ کی تحقیق کا شوق اتفاق سے کسی کو کچھ دیر کے لیے پیدا ہو بھی گیا تو نواہت و سار کے مہندسانہ مشاہدہ کے بجائے اگٹائن یا لکٹنٹشئس کے سے بزرگوار دن کی تصانیف کی درق گردانی سے سائل کی تشغی کر دی گئی۔ روایت کو روایت پر یہاں تک ترجیح دی گئی کہ عیسائیت نے باوصفیکہ اُسے وجود میں آئے جو سے پندرہ صدیان گزر چکی تھیں ایک بھی ہنیت دان پیدا نہ کیا۔

لیکن اسلام کی حالت اس بارے میں مسیحیت سے بہت بہتر ہے۔ مسلمانوں کے اکتساب

علوم و فنون کا دور فتح اسکندریہ کی تاریخ یعنی ۳۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جناب رسالت آتب کو رحلت فرمائے ہوئے صرف چھ سال کی مدت منقضی ہوئی تھی۔ دو صدیوں کے اندر اندر مسلمان نہ صرف یونان کے حکماء طبعیین کی تصانیف سے واقف ہو گئے بلکہ ہر علمی مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر نظر انتقاد ڈالنے کے قابل ہو گئے جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں اس معاہدہ کی رو سے جو میکائیل ثالث شہنشاہ یونان اور المامون عباسی مین ہوا اتفاق المامون نے بطلمیوس کی تصنیف ”سنکسس“ کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس کا ترجمہ لاطینی کے نام سے عربی مین کرایا تھا یہ کتاب ہیئت و امان عرب کے لیے مستشار اعظم بن گئی۔ اور اس کو اپنی علم کی بنا قرار دے کر انہوں نے سامنس کے بعض بنایت ہی اہم مسائل حل کئے انہوں نے زمین کی جسامت دریافت کی۔ اُن تمام ستاروں کی فہرستیں تیار کیں جو اس حصہ آسمان پر نظر آئے جہاں کے مقابل تھا اور بڑے بڑے ستاروں کے نام رکھے جو آج تک تبدیل نہیں ہوئے۔ انہوں نے سال کی صحیح مدت کا اندازہ لگایا۔ انعطاف صیائے کو کبھی کے اصول کی تحقیق کی۔ ”پنڈلم“ (رقاص) والی گھڑی ایجاد کی جن آلات سے ستاروں کی روشنی کا اندازہ کیا جاتا ہے اُن کو بہت کچھ ترقی دی۔ یہ اصول دریافت کیا کہ شعاع نور ہوا میں شکل قوس گزرتی ہے۔ چاند اور سورج کے اتق پر نظر آنے کی توجہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اجرام قبل از طلوع و بعد از غروب کیوں نظر آتے ہیں۔ کرہ ہوا کی لمبندی کو ناپا اور یہ لمبندی اٹھاننا میں قرار دی بھٹ پٹے کی اصلی کیفیت اور ستاروں کو کھجلا لانے کی صحیح وجہ بیان کی۔ یورپ مین اول اول جو رصد گاہ قائم ہوئی وہ مسلمانوں ہی کی بنائی ہوئی تھی۔ اجرام فلکی کے نقل حرکت کے متعلق اُن کی باریک بینی و دقیقہ سمجھی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے قابل سے قابل مہندسوں نے اُن کے رصدی نکلج سے استناد کیا ہے۔ مثلاً لیبلیس اپنی کتاب ”نظام عالم“ مین آبتانی کے مشاہدات کی سند اس امر کے قطعی ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ مرکز آفتاب اور مرکز مدار ارض کا درمیانی

فائدہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مسئلہ اعوجاج طریق الشمس اور مشرقی درجہ کی عدم مساوات اسے اکبر کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ابن یونس کے مترتبہ نتائج کو بددلیتا ہے۔

عقدہ اہمیت عالم کے حل کرنے میں ہیئت دانان اسلام نے جو نمایان خدمات انجام دی ہیں ہم نے ان کا غنیمت شیر بھی بیان نہیں کیا۔

بہر حال اس زمانہ میں سائنس کو کچھ ترقی حاصل ہوئی مسلمانوں کی بدولت ہوئی عیسائی دنیا پر جہل و ادھم کی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جیوین کو علمی مسائل کی ہوا ناک نہ لگی تھی۔ وہ مجسمہ پرستی۔ گوہر پرستی۔ عشاے ربانی۔ کرات اولیا۔ معجزات تصور کرتا اراج اور خوش عقیدگی کے اسی طرح کے دوسرے گروہ و ہندوؤں میں چھتے ہوئے تھے اس خواب غفلت سے عیسوی دنیا پندرھویں صدی کے خاتمہ تک بیدار نہ ہوئی۔

اس وقت بھی شوق علم اس کے جاگنے کا باعث نہ ہوا۔ بلکہ اسباب ترقیب کچھ اور ہی تھے یعنی اقوام یورپ میں تجارتی رقابت پیدا ہو گئی۔ اور کولبس ڈی نکا اور فرڈیننڈ میکیلن کی جہاز رانی مسئلہ شکل زمین کے نصفیہ کا خیر باعث ہوئی۔

مشرقی ایشیا کی تجارت نے ان مغربی اقوام کو جو اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی، میں ہمیشہ مالا مال کیا ہے۔ ازمنہ وسطی میں اس تجارت کا مرکز اٹلی کا شمالی حصہ تھا یہ تجارت شمال و جنوب دو طرف سے ہوتی تھی اور اس کے مرکز علی الترتیب جنوا اور وینس تھے۔ جنوا سے مال تجارت جہازوں میں بھر کر براہ بحیرہ اسود و بحیرہ خزر ایران کے شمالی ساحلوں پر اتارا جاتا تھا اور وہاں سے اونٹوں پر بار کر کے آگے بھیجا جاتا تھا۔ جنوبی صدر مستقام یعنی وینس سے جو مال روانہ ہوتا تھا وہ یا قوشای اور مصر ہی ہندو گاہوں پر اُسار کر براہ خشکی اندرون ملک میں بھیج دیا جاتا تھا یا بحیرہ فلزم اور بحر عرب کی راہ سے مشرقی ممالک کی طرف روانہ کر دیا جاتا تھا۔ جن سودا گروں کا قصہ

مقام دینس تھا اٹھاون نے دوران حروب صلیبیہ میں ذرائع ماریجیناری کی بھرپوری سے بہت بڑی دولت کمائی تھی۔

اہل دینس کی زمانہ اشتہاسی نے ان کے تعلقات کو چونکہ شام اور مصر کی اسلامی دولتوں کے ساتھ بڑھنے لگا تھا لہذا ان کو اسکندریہ اور دمشق میں اپنے سفارت خانے قائم رکھنے کی اجازت تھی۔ اور باوجودیکہ ان خانہ میں جدال و قتال کے ہنگامے آئے دن پیاہوتے رہتے تھے پھر بھی دینس کی تجارت ترقی پر تھی۔ لیکن مغربی شاخ تجارت جس کا صدر مقام جنوا تھا کچھ تو تاتاریوں اور ترکوں کی حملہ آوری اور کچھ ادن کالک کے اندرونی فسادات کی وجہ سے جن میں سے اس کے مال کو گزنا پڑنا تھا دیران ہو چلی تھی۔ اور وہ وقت قریب آگیا تھا کہ یہ تجارت بالکل ہی مٹ جائے۔

افنی طاہری کی مدد شکل۔ سمند میں اس کا ڈوبا ہوا نظر آنا۔ جہاز دن کا کھلے سمندر میں تبدیل بیچ نمودار ہونا اور رفتہ رفتہ غائب ہو جانا یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کے مشاہدہ سے وہ جہاز دان جن کو مبداء فیاض سے جوہر فکر سلیم عطا ہوا ہے اس نتیجہ کی طرف مائل ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے کہ زمین کروی شکل ہے مسلمان مہندسین و فلاسفہ کی تصنیفات نے اس خیال کو مغربی یورپ میں عام طور سے شائع کر دیا تھا لیکن دین مسیحی کے پیشواؤں نے اسے کبھی استحسان کی نظر سے نہ دیکھا اور ان سے بجز اس کے توقع بھی اور کیا ہو سکتی تھی جب جنوا کی تجارت تباہی کے قریب پہنچ گئی تو یہاں کے بعض جہاز دانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر زمین حقیقت میں گول ہو تو ممکن ہے کہ جنوا کا آفتاب تجارت جوب بام ہے پھر نصف النہا پر چمکتا ہوا نظر آئے۔ اس لیے کہ جو جہلا آبنائے جبل الطارق میں سے ہوتا ہوا بحر اوقیانوس کے بیچون بیچ سمت مغرب ناک کی سیدہ چلا جائے وہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اس میں یہ بھی تھا کہ مل تجارت جہاز دن کے ذریعہ سے خشکی کے سفر کی منت شاقہ اور مصارت کثیر کے بغیر

منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

جنوا کے جن ناخداؤں کو یہ خیال پیدا ہوا ان میں کرسٹوفر کولبس بھی شریک تھا جس کے مقدر میں ایک عظیم الشان حقیقت کا عملی انکشاف لکھا تھا۔

کولبس بیان کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی طرف اس کی توجہ ابن رشد کی تحریکات نے منعطف کی اسکے علاوہ اس کا ایک دوست ٹاسنلی نامی فلاسف کا بہتے والا تھا جس کو فنِ ہیئت کے مطالعہ کا بدرجہ غایت شوق تھا۔ ٹاسنلی مسئلہ کر دیت شکل زمین کا بہت بڑا حامی تھا اور کولبس کے خیالات پر اس کی تعلیم کا بھی قوی اثر پڑا۔ لیکن جنوا میں کولبس کی حوصلہ افزائی بہت کم ہوئی۔ کئی سال تک وہ مختلف ممالک کے فرمانرواؤں اور امر کو اپنے مجوزہ ارادہ کی تکمیل کی سرپرستی پر آمادہ کرتا رہا لیکن اس کی کوششیں رایگانہ لگین۔ اسپین کو پادریوں کو اس کے ارادہ میں کفر اور زندہ کی ڈراوئی صورت نظر آئی۔ اسپین کے کبھی کوئل نے اس پر بدعت سیّد کا فتویٰ لگایا۔ چاروں طرف سے پادریوں کی یہ آوازیں آنے لگیں کہ جو شخص زمین کو گول مان کر اس کے گردگرد سفر کرنے کی محاذ کوشش کرتا ہے وہ عہدِ عتیق۔ عہدِ جدید۔ زبور۔ رسولوں کی پیشین گوئیوں۔ اور سینٹ کریسٹم سینٹ اگسٹائن سینٹ جروم۔ سینٹ گرگوری۔ سینٹ ہیل اور سینٹ ایمرز کے فحش تجاوت و فحش کلمات کو جھٹلاتا ہے۔

لیکن اس کی مساعی جلیلہ آخر کار بار آور ہو کر رہیں۔ اسپین کی بلکہ آسٹریا نے اس کی بہت بڑا لی اور ناخدا یاں پیلاس کے ایک دولتمند خاندان مینتران نامی نے روپیہ سے اس کی مدد کی۔ اس خاندان کے کچھ لوگ اس کے ساتھ چلنے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے۔ شاہ فرڈیننڈ نے اسے تاتار کے خان اعظم کے نام ایک چٹھی اپنے خاص دستخط سے لکھ کر دی۔ اور ایک بھری نقشہ جو ٹاسنلی کے مرتبہ نقشہ کی بنا پر تیار کیا گیا تھا اپنی رہنمائی کے لیے اسے ساتھ لیا۔ غرض کیل کانٹے سے پوری طرح لبس ہو کر اس نے ۱۴۹۲ء کو تین

چھوٹے جہازوں کے بیڑے کے ساتھ لنگر اٹھانیا۔ سوا دو ہفتے کے مسلسل سفر کے بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو آدھی رات سے ذرا دیر پہلے اُس نے اپنے جہاز کے سکوڑے سے کچھ فاصلہ پر ایک متحرک روشنی دیکھی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسرے جہاز توپ کے دھنکے کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اہل جہاز نے خشکی کو دیکھ پایا ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو جہاز ساحل پر پہنچ گئے اور کولمبس نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

جب زدیورپ واپس آیا تو سب نے یہی خیال کیا کہ جس ساحل پر وہ لنگر انداز ہوا وہ ایشیا کا مشرقی حصہ تھا اور اس لحاظ سے اس کا سفر علی سبیل النظر کامیاب رہا۔ خود کولمبس کو مرتے دم تک اسی بات کا یقین رہا۔ لیکن متعدد بحری سفر جو بعد میں کئے گئے اُن سے ساحل امریکہ کی عام حدود بہت جلد معلوم ہو گئیں۔ اور جب بلہوائے بحر اعظم جنوبی کو دریافت کیا تو اصل حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا اٹھا دیا گیا اور وہ غلطی رفع گئی جس میں تاسنلی اور کولمبس دونوں کو دونوں مبتلا تھے یعنی مغربی بحری سفر میں یورپ اور ایشیا کا درمیانی فاصلہ اُس فاصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا جو اٹلی سے خلیج گنی تک جانے میں ملے کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر کولمبس نے برا کیا تھا۔

کولمبس نے اپنے پہلے سفر میں ۱۴ ستمبر ۱۴۹۲ء کو رات کے وقت جبکہ وہ مجمع البحرین کے ارد گرد کے ایک جزیرہ کو روڈ سے ۲۰ درجہ مشرق کی جانب تھا یہ بات مشاہدہ کی کہ جہازوں نے جہاز کے ایک حصہ میں ایک مرتفع مقام کا نام جہان سے نا خدا کو مد نظر تک سب کچھ دکھائی دے سکتا ہے ۱۲ ستمبر لے جہاز تینوں شمالی میں پرنگال سے کوئی آٹھ سو میل جانب مغرب واقع ہے۔ اس مجمع البحرین میں کل نو جزیرے ہیں مجموعی رقبہ ایک ہزار میل اور آبادی کوئی تین لاکھ نفوس ہوگی۔ دارالحکومت کا نام انگرا ہے جو جزیرہ تیسرا میں واقع ہے۔ ان جزائر میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے آؤن اٹلات جان ہوتا رہتا ہے۔

آب و ہوا نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے چنانچہ جو لوگ امراض صدر میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بغرض تبدیل د آب و ہوا تکمیل صحت پہنچ جاتے ہیں۔ انگور، نارنگیان اور نیبو میوؤں میں اور گیہوں اور کی انارج میں یہاں کی پائیں

کی کمپاس کی سوئیوں کا رخ سب معمول میل بہ شمال و مشرق نہیں ہے بلکہ میل بہ مغرب ہے۔ جون جون جہاز آگے بڑھتے گئے یہ انحراف بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اگرچہ کو لمبیس ہی پہلا وہ شخص نہیں ہے جس کی نظر اس انحراف پر پڑی لیکن اس میں شک نہیں کہ خط عدم انحراف کو سب سے اول اسی نے دریافت کیا۔ اس سفر سے واپس آتے وقت اس کی برعکس حالت پائی گئی یعنی کمپاس کی سوئی کا مغربی میلان کم ہوتا گیا۔ تا آنکہ اس خط نصف النہار پر پہنچ کر جہاں انحراف باقی نہیں رہتا سوئی کا رخ پھر شمال کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد جون جون یورپ کا ساحل قریب آتا گیا سوئی کا مشرقی میلان بڑھتا گیا۔ اس سے کو لمبیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ خط نفی میلان یا عدم انحراف ایک مقررہ جغرافیائی خط ہے جو نصف کرہ مشرقی و نصف کرہ مغربی کے درمیان بمنزلہ حد فاصل ہے۔ حسب اسپین اور پرتگال میں مقبوضات خارجہ کے متعلق جھگڑا ہوا تو پاپاے انگلنڈ رسایا نے اس نزاع کے تسلیہ کی غرض سے ایک فرمان ۱۵۹۳ء میں جاری کیا۔ جس میں یہ خط ان دو دنوں اقوام کے مقبوضات کی دوا می حد فاصل قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خط بتدریج مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۵۹۳ء میں لندن کے خط نصف النہار پر منطبق ہو گیا۔

پاپا کے فرمان کی رو سے پرتگال کے مقبوضات کی حدود خط عدم انحراف کا مشرقی حصہ قرار دی گئی تھیں۔ بعض مصری یہودیوں کی زبانی دولت پرتگال کو معلوم ہوا کہ بوا عظم افریقہ کے گرد اگر وہ جہاز پر سفر کرنا آسانی ممکن ہے۔ اس لیے کہ بوا عظم مذکور کے انتہائے جنوب میں ایک راس ہے جس کا عبور آسانی سے ہو سکتا ہے۔

نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۲۲۔ پیداوار ہے۔ اہل کدھج کو ان جزائر کا علم ہو چکا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے کدھج کے سکے برآمد ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا قیاس مسلمان جہاز راہوں کے یہاں آنے کی بھی کثرت شہادت بہم پہنچ سکتی ہے۔ مترجم ۱۲

اس اطلاع کی نہا پر تین جہازوں کا ایک منقرسا پیرا مبر کر دگی واسکو ڈی گاما ۹ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے روانہ ہوا اور بتاریخ ۲۰ نومبر ۱۴۹۷ء امید کو پہنچ گئے۔ بعد ۱۹ مئی ۱۴۹۸ء کو کاتی کٹ بہن لنگر انداز ہوا جو ہندوستان کے ساحل پر واقع ہے۔ پاپا کے اُس فرمان کی رو سے جسکا حوالہ دیا جا چکا ہے مشرقی کے اس سفر کی بدولت اہل پرتگال کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

اس امید کا چکر کاٹنے سے پہلے واسکو ڈی گاما کے جہازوں کا رخ عموماً جنوبی سمت میں تھا۔ بہت جلد یہ بات اہل جہاز کے دیکھنے میں آئی کہ سطح اقیانوس سے تھب تارے کا ارتفاع کم ہو رہا ہے اور خط استوا پر پہنچنے کے بعد تو یہ ستارہ نظر سے بالکل ہی غائب ہو گیا مگر اور ستارے جن میں سے بعض شاندار بروج کی شکل میں تھے نظر آنے شروع ہو گئے۔ یہ وہی ستارے تھے جن کا تعلق نصف کرۂ جنوبی کے آسمان سے ہے۔ تمام واقعات سے اُن نظری قیاسات کی تائید ہوئی تھی جو شکل زمین کی کریت کے متعلق قائم کئے گئے تھے۔

ان جدید اکتشافات کے سیاسی نتائج نے پاپا کے روم کو گرواب تشویر و تذبذب میں ڈال دیا۔ جن مذہبی روایات اور ملکی مصالح پر پاپا کی حکومت کا انحصار تھا وہ کسی طرح اس کے مقتضی نہ تھے کہ زمین کی کوئی اور شکل بجز شکل سطح کے جسکا ذکر کتب الہامی میں تھا تسلیم کی جائے۔ اخفائے واقعات ممکن نہ تھا اور سوفسطائیہ ناویلمین بیکار تھیں۔ زمین اور جزو اکی تجارت کا جزو غفل ہو گیا۔ یورپ کی شکل تبدیل ہو گئی۔ بحری طاقت اُن ممالک سے جو بحر روم کے ساحل پر واقع تھے رخصت ہو گئی۔ اور وہ ملک جو بحر ادقیانوس کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے جہاز رانی کے مرکز بن گئے لیکن دوست اسپین نے اپنے تجارتی رقیب کی اس کامیابی کے آگے ہاتھ پاؤں مارے بغیر سرتپیم خرم کرنا گوارا نہ کیا۔ فرنانڈ میگیلن نامی ایک اولوالعزم نافرمان

ارکین دولت سے یہ عرض کیا کہ اگر اُس نئی دنیا میں جواب براعظم امریکہ کے نام سے موسوم ہے کسی نئی آہنا سے کا پتہ معلوم ہو جائے تو مغربی سمندرون کو قطع کرنے کے بعد ہندوستان اور اسپائس آئس لینڈس اور انڈیا کے درمیان تک پہنچ جانا ممکن ہے اور اگر یہ مہم طے ہو جائے تو پاپا کے فرمان کی رو سے اسپین کو بھی ہندوستان کی تجارت میں اُسی قدر حصہ مل سکتا ہے جس قدر پرتگال کو سیگیلن کی ان باتوں کو حکومت اسپین نے دل کو کاٹون سے سدا اور پانچ جہازوں کی ایک مہم جس کے ساتھ دوسو سبتیس آدمی تھے اُس کی سرکردگی میں ۱۰ اگست ۱۵۸۲ء کو اسٹینڈیل سے روانہ کی گئی۔

سیگیلن نے سیدہ جنوبی امریکہ کے ساحل کا رخ کیا اور تین ہفتہ بعد اس امید پر بڑا چالاکیا کہ اُسے کوئی قدرتی آبی منفذ براعظم میں مل جائے گا جس کے ذریعہ سے وہ بحر اعظم جنوبی میں داخل ہو سکے گا۔ خطہ عدم انحراف پر پہنچ کر ہوا چلتی بند ہو گئی اور کمال دو ہفتے میں دن تک بند رہی۔ جہاز کے ملاحون کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ ایسے منطقہ میں نہ چلے آئے ہوں جہاں ہوا کبھی چلتی ہی نہ ہو۔ اور اونکا بڑا اس خوفناک سمندر کی ساکن وغیرہ متحرک موجوں سے کبھی پار ہی نہ ہو سکے۔ یہ خوف بغاوت سے تبدیل ہو گیا۔ اور جب خدا خدا کر کے ہوا کے جھونکون نے سمندر کے طہم خموشی کو توڑا تو جھکڑ چلنے لگا۔ اور ایسا طوفان اُٹھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن سمندر کا سکون۔ طوفان کا جوش۔ ملاحون کی بغاوت۔ اہل جہاز کی بیوفائی اُسکی جبین استقلال پر بل تک نہ ڈال سکی ایک سال سے زیادہ کی بھرپور دی کے بعد اُس نے وہ آہنا سے دریافت کی جواب اُسکے نام سے منسوب ہے۔ اسمبلی کا ایک باشندہ چگافٹی جو اُسکے ہمراہ تھا بیان کرتا ہے کہ جب سیگیلن کی نظر بحر جنوبی یعنی بحر الکاہل کی عظیم الشان پہنائی پر پڑی تو فرط مسرت سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اور اُسکے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اُس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے اس محیط اعظم کے نامعلوم خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آخر

یہاں تک پہنچا دیا۔

نقطہ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ روٹی کے بجائے اُسے چمڑے کے وہ ٹکڑے چبانے پڑے جن کی چھٹے ہوئے باد باؤن مین گرہین لگی ہوئی تھیں۔ پانی اُسے ایسا پینا پڑا جس میں کیڑے پڑ گئے تھے اور بو آنے لگی تھی۔ اُس کے جہاز کے مالچ بھوک سے جان بنب اور مرض احراق خون میں مبتلا تھے مگر یہ کوہِ دقار شخص جسے زمین کے کردی شکل ہونے کا کامل یقین تھا ان جان فرسا مصائب سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے جہاز کو برابر سمت شمال و مغرب میں بڑھا کر چلا گیا اور چار مہینے تک کسی آبادی پر اُسکی نظر نہ پڑی۔ اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ بحر الکحل کی سطح پر اُسے بارہ ہزار میل سے کم مسافت نہ طے کی ہوگی۔ خط استوا سے گزرنے کے بعد اُسے قطب ستارہ پھر دکھائی دیا اور آخر کار جزائر لیڈرونس کے ساحل پر اُس نے لنگر ڈالا یہاں اُسکی ملاقات سمائرا کے بعض باشندوں سے ہوئی جو قسمت آزمائی کے لیے وطن سے نکلے تھے لیکن اُنوں اُسکے مقدر میں یہ نہ لکھا تھا کہ اس عظیم الشان بحری مہم کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچائے۔ انہیں جزائر میں یا تو یہاں کے دشمنوں نے یا خود اُس کے ہمراہیوں نے اُسے مار ڈالا۔ اُس کے بعد اُس کے مددگار سبائٹن ڈکلاؤ نے جہاز کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور اس امید کا رُخ کیا۔ رستے میں جو صعبتیں اُسے جھیلنی پڑیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے اس اُسید آئی جس سے گزر کر اُس نے جو تھکی مرتبہ خط استوا کو عبور کیا۔ ۶ ستمبر ۱۵۲۲ء کو تین سال سے زیادہ کے بحری سفر کے بعد اُس کا جہاز سین وٹوریانا نامی سینٹ لوکر کے بندرگاہ میں۔ جو ایشیلیہ کے متصل واقع ہے لنگر انداز ہوا۔ اس جہاز کا سفر بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس لئے کہ زمین کے گرد اگر سفر کرنے کا پہلا شرف اسی کو حاصل ہوا۔

سین وٹوریانا مغرب کی سمت میں سفر کرتے رہنے کے بعد اُسکی نقطہ پر پہنچ گیا

نخا جہان سے چلا تھا۔ اس سے زیادہ نامکن التروید ثبوت زمین کے گول ہونے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب مسیحیت کو یہ مجال نہ رہی کہ یہ دعوے کرے کہ زمین پیٹی ہے۔ لقنور انسطح ارض انسانی دماغ سے ہمیشہ کے لیے مٹو ہو گیا۔

میگیلن کے بحری سفر کی تکمیل کے پانچ سال بعد مسیحی دنیا نے تحقیق جسامت ارض کے متعلق پہلی کوشش کی جو ایک فرانسیسی طبیب فرنل کے حصہ میں آئی۔ فرنل نے اول حساب لگایا کہ پیرس میں ارتفاع قطب کس قدر ہے۔ اس کے بعد وہ شمال کی طرف روانہ ہوا تا آنکہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پیرس کے مقابلہ میں ارتفاع قطب ایک درجہ زیادہ تھا ان دونوں مقامات کے درمیان جس قدر فاصلہ تھا اسکی پیمائش اُس نے اپنی گاڑی کے ایک پہیے کے چکروں کے ذریعہ سے کی جس کے ساتھ اُس نے ایک مقیاس المسافت لگا دیا تھا۔ جب ایک درجہ کا فاصلہ اس طریقہ پر معلوم ہو گیا تو اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین کا دور حسب پیمانہ اٹلی بقدر چوبیس ہزار چار سو اسی میل کے ہے۔

اس کے بعد مختلف ممالک میں باحتیاط تمام پیمائش کی گئی۔ اسٹینل نے ایک درجہ ارضی کی پیمائش ہالینڈ میں کی۔ ناروڈ نے لندن اور یارک کے درمیان انگلستان میں پکارڈ نے ”فرینچ اکاڈمی آف سائنسز“ (مجلس ترقی علوم دنون) کی سرپرستی سے فرانس میں۔ پکارڈ کی ترکیب یہ تھی کہ مشنوں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ سے دو نقطوں کو باہم ملا کر دائرہ نصف النہار کے اُس قوس کو جو ان نقطوں میں حایل ہونا چاہیے اور اس کا مقابلہ عرض البلد کے اوپر اختلاف کے ساتھ کیا جائے جو مشاہدات فلکی سے حاصل ہو۔ اتصال نقاط کے لیے جو مقامات اس طور پر تجویز کیے گئے وہ بلواکزن اور سردون تھے۔ اول الذکر نواح پیرس میں واقع ہے۔ اور ثانی الذکر آرمینس کو قریب اختلاف عرض البلد کی تعیین بُرج ذات الکوس کے بعد سمت الراس کے مشاہدہ سحر کی گئی۔ پکارڈ کے طرز عمل میں دو امور خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں۔ اول تو

اس طریقہ کے عمل میں لاتے وقت جو آلات استعمال کئے گئے ادن میں دور بین بھی شامل تھی۔ ثانیاً اس سے جو نتائج مستنبط ہوئے انہوں نے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا نیوٹن کے لیے اصول کشش ثقل کی ہمہ گیری کا ثبوت بہم پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصول علم الحركات خصوصاً ان اصول نے جو نیوٹن کے دریافت کیے ہوئے تھے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ چونکہ زمین ایک جرم دوار ہے لہذا اس کی شکل کامل کر دکی نہیں ہو سکتی بلکہ شیل کر دی یا سطح الطریفین ہونی چاہیے یعنی صذر درست کہ وہ قطبین پر پھٹی ہو۔ اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ خط طول خط استوا کے اطراف وجوانب کے مقابلہ میں قطبین کے قریب زیادہ ہونا چاہیے۔

”فرنیچ کا ڈمی“ نے فیصلہ کر لیا کہ پکارڈ کے عمل کو وسعت دی جائے اور پیمائش کا سلسلہ ہر حرفت قائم کر کے فرانس کا ایک ایسا نقشہ تیار کیا جائے جو نسبتاً زیادہ صحیح ہو۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل حیزر التوامین پڑی رہی اور کہیں شاعریں جا کر فرانس کی شمالی حد یعنی ڈکارک سے لیکر جنوبی حد تک کی پیمائشیں ختم ہوئیں۔ ان پیمائشوں کی تاویل اختلاف آرا کا باعث ہوئی۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان پیمائشوں سے کرہ زمین کا مستطیل الطریفین ہونا پایا جاتا ہے لیکن بعض کی رائے اس کے خلاف تھی وہ ان پیمائشوں کو زمین کے سطح الطریفین ہونے کا ثبوت سمجھتے تھے شکل اول کو عام طور پر نیوٹن سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور شکل ثانی کو نارنگی سے اس اختلاف کا تصفیہ کرنے کے لیے حکومت فرانس نے ”اکاڈمی“ کی مدد سے دو علمی لفایض دائرہ نصف النہار کے ایک ایک درجہ کی پیمائش کے لیے خط استوا اور شمال کی طرف روانہ کیے۔ پہلا لفیضہ پیررنگ گیا اور دوسرا سوئیڈن ولیپ لینڈ کی طرف دونوں جماعتوں کو بہت کچھ دقیقین اور زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن شمالی جماعت نے جو ولیپ لینڈ کو گئی تھی اپن کام پیرر والی جماعت سے جو نو سال تک اپنے فرائض مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف

رہی بہت پہلے ختم کر لیا۔ بہر حال دو دنوں جاعنون کے نتائج کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ کرہ زمین سطح اطرفین یعنی قطبین پر چپٹا ہے۔ اُس وقت سے لیکر اب تک اس پیمائش کا نہایت وسیع اور صحیح بیانہ پر بار بار اعادہ ہوتا رہا ہے۔ انگریزوں نے انگلستان اور ہندوستان میں پیمائش کی اور فرانسیسیوں نے اوزان و پیمائش کے طریقہ مطہر کو جاری کرتے وقت جو پیمائش کی وہ اپنی دقیقہ سنجی اور موشت گمانی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس پیمائش کو ڈی لا مبر اور مشائن نے ڈنکرک سے شروع کر کے بارسلونا تک پہنچایا اور وہاں سے بائٹ اور آراگونے اس کے ساتھ کو جزیرہ فارمنیئر تک دست دی جو منارکا کے قریب واقع ہے۔ اس پیمائش کا طویل ساڑھے بارہ درجہ تھا۔

پیمائش کے اس بلاد اسطہ طریقہ کے علاوہ زمین کی شکل مختلف عروض البلد میں ایک سینہ لول کے رفاص ساعت کے اتہزازات کی اختلاف تعداد سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ان اتہزازات سے اگرچہ نتائج سابقہ کی تصدیق و توثیق ضرور ہوتی ہے لیکن پیمائش درجات کے مقابلہ میں ان کے ذریعہ سے زمین کی سطح پر زیادہ بڑھ ہی ہوئی قرار پاتی ہے۔ چون چون خط استوا قریب آتا جاتا ہے رفاص کو اتہزاز یا ارتعاش میں آہستگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس کا فاصلہ زمین کے مرکز سے قطبین کے مقابلہ میں خط استوا پر زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ معتبر دو ثقیں پیمائش کی بنا پر زمین کی جسامت حسب ذیل اعداد

۱۔ فرانسیسی اندازہ یہ تھا کہ ایک قطر قطب سے خط استوا تک کے درمیانی فاصلہ کا ایک لاکھون حصہ ہو۔ یہ اندازہ تو عند التذقیق غیر صحیح ثابت ہوا لیکن پھر بھی دوسرے اندازوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح جانے کے باعث عام طور سے فاصلہ کا یہی بیانہ علمی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ایک سطر ۷۰۷۰۰۰۰ ۳۹۹ انچ کے مساوی ہے۔ مترجم

میں ظاہر کی جاسکتی ہے -

قطر اکبر یا قطر استوائی ۷۹۲۵ میل

قطر اصغر یا قطر قطبی ۷۸۹۹ میل

دونوں کا فرق یعنی انضناط قطبین ۲۶ میل

یہ دو نتائج ہیں جو اس بحث سے پیدا ہوئے کہ زمین کی شکل کیسی ہے اور جسامت کس قدر ہے ابھی یہ بحث ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک اور بحث جس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ اہم نتائج وابستہ تھے پیدا ہو گئی - یہ بحث اس سلسلہ کے متعلق تھی کہ آفتاب اور دوسرے سیاروں کے مقابلہ میں زمین کا درجہ اور حیثیت کیا ہے -

پروٹیشیا کے ایک مہندس کو پرنکس نے سلسلہء عربین ایک کتاب ”ادوار اجرام فلکیہ“ کے عنوان سے لکھی تھی - جو انی کے زمانے میں اُس نے آئلی کا مفسر کیا تھا اور فن ہئیت کی تکنیک کے بعد رومان میں ریاضیات کا درس بھی ایک عرصہ تک دیا تھا - نظام بطلیموس و نظام فیثاغورث کا بہ امعان نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ نظام ثانی الذکر صحیح ہے اور اُس کی تصنیف کا مقصد اسی کی تائید و توثیق تھا - چونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے خیالات حقایق الہامی کی نفی و مطلق کرنے کے لحاظ سے اُسے مورد عتاب کیسے عدوی بنائیں گے - لہذا اُس نے اپنی کتاب کا مقدمہ جبکاروے خطاب پایا ہے پال ثالث کی طرف سے حزم و احتیاط کی راہ سے معذرت کے پیرایہ میں اس طرح شروع کیا ہے ”میں نے صرف بطور تجربہ اس بات کے تحقیق کرنے کی جرات کی ہے کہ اگر زمین کو متحرک فرض کر لیا جائے تو آیا یہ ممکن ہے کہ اجرام سماوی کی گردش کی جو توجیہات قدمائے کی ہیں اُن سے کوئی زیادہ تر معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آجائے - قیاسات کے قائم کرنے کا حق ایک ایسا حق ہے جو دوسروں کو بھی اس سے پہلے عطا کیا جا چکا ہے - اور میں نے بھی

اس کتاب کی تصنیف میں اسی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس ڈر کے مارے کہ خدا جانے کتاب کے شائع ہوتے ہی کیا آفت اُس پر
 ٹوٹ پڑے اُس نے چھتیس سال تک اس اشاعت نہ کی اور اسی شش دینچ میں رہا کہ
 ممکن ہے کہ مصلحت اسی میں ہو کہ جس طرح فیتا عورث اور دوسرے حکما اپنے معلومات
 کو سینہ بسینہ منتقل کرتے پہلے آئے ہیں اور اُن کے عقاید بجز اُن کے خاص خاص اجزاء
 کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوئے اسی طرح میں بھی اپنے اصول کی تلقین کا حلقہ اپنے دوستوں
 تک ہی محدود رکھوں اور آئندہ نسلیوں تک اُنہیں بذریعہ روایت ہی پہنچاؤں لیکن آخر کار
 اپنے دوست پادری شو مبرگ کے بجد اصرار پر اُس نے اسے مسئلہ عام میں شائع کیا۔
 جب مطبع سے اس کا ایک نسخہ چھپ کر اُس کے پاس پہنچا تو وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ
 رہا تھا۔ کتاب کا حشر وہی ہوا جس کا اُسے ڈر تھا۔ ”انکو یزیشن“ نے اسے لمعانہ قرار دیا
 اور اُس حکم امتناعی میں جس کی رو سے اس کتاب کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا نظام کو پرنکس
 کی نسبت یون در انشائی کی گئی۔ یہ وہ باطل فیتا عورثی مذہب ہے جو کتب مقدسہ کی ضد
 ہدیت والوں کا یہ قول بالکل درست ہے کہ کو پرنکس کی کتاب نے علم ہیئت کی شکل
 ہی بدل ڈالی۔ اس نے نظریہ شمسی المرکز کے حق میں قول فیصل بن کر آفتاب کو نظام اجرام کا
 مرکز قرار دیا اس نے ثابت کر دیا کہ ثوابت کا فاصلہ زمین سے اس قدر ہے کہ ہزار دہم دگمان
 بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا اور زمین فضا سے غیر متناہی میں بمنزلہ ایک جھوٹے سے نقطہ
 کے ہے۔ نیوٹن پر کو پرنکس کو یہ تقدم حاصل ہے کہ اُس نے آفتاب کو اور دوسرے
 اجرام سماوی میں کشش ثقل کا موجود ہونا تسلیم کیا۔ اگرچہ اس بات کے فرض کرنے سے
 وہ غلطی میں پڑ گیا کہ اجرام سماوی کی حرکت بشکل دائرہ ہونی چاہیے۔ یہ خیال کو پرنکس کو
 دور مریخ کے مشاہدہ سے یہ دیکھ کر کہ مختلف ادقات میں اُس کے قطر کا طول مختلف ہوتا ہوا
 پیدا ہوا تھا۔

نظام کو پرنیکس پر اس الزام کے لگانے میں کہ وہ کتب مقدسہ کے الہامی حقائق کی نفی کرتا ہے پیشوایان دین نے غالباً منطقیانہ استدلال سے کام لیا۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر زمین کو جواب تک مرکز مدار کائنات سمجھی جاتی تھی عظمت و جلال کی اس مسند سے نیچے اُتار دیا جائیگا اور ایسے کثیر التعداد اجرام فلکی کا وجود تسلیم کر لیا جائے گا جن میں سے بیشتر اُسکے ہم درجہ اور اکثر اُس پر فوقیت رکھتے ہیں تو اس کے گویا یہ معنی ہونگے کہ زمین عنایات ایزدی کی مورد خاص نہیں ہے۔ بیشمار ثوابت میں سے اگر ہر ایک بمنزلہ آفتاب ہو اور اُس کے گرد سیارے گھومتے ہوں جن میں ہمارے جیسی مکلف اور ذمہ دار ہستیوں آباد ہوں تو اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ ہمارے وجود پر خدا کے بیٹے کی قیمتی قربانی کے کفارہ کے ذریعہ سے نجات مل گئی لیکن اُن بیچاروں کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ کیا اُن میں کوئی ایسی قوم نہیں جو ہماری طرح گناہ میں مبتلا ہوئی ہو یا ہو سکتی ہو؟ اور اگر ہے تو اُس کے لیے نجات دہندہ کہاں سے آئے گا؟

سائنس دانوں کے ایک باشندے پیرشی نامی نے دریافت کیا کہ اگر بلور کے دو ٹکڑوں کو ایک خاص طریقہ پر باہم ملایا جائے اور اُن میں سے دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر بہت صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی ایجاد کا نام دور بین ہے۔ دو سو سال فلائرس کے ایک باشندے گلیلیو کو جس نے ریاضیات اور علوم طبیعیہ پر کتابیں لکھ کر بہت بڑا نام پیدا کیا تھا۔ یہ واقعہ معلوم ہوا۔ پیرشی کے ایجاد کیے ہوئے آلہ کی ترکیب کا اگرچہ اُسکو مطلق علم نہ تھا لیکن اُس نے اپنے لیے اُسی قسم کا ایک نیا آلہ اپنی ترکیب سے ایجاد کیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی ایجاد کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں جو دور بین اُس نے بنائی اُس میں اشیا تیس حصے بڑی ہو کر نظر آتی تھیں۔ جب اس کے ذریعہ سے اُس نے چاند کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ سطح قمر پر زمین کی

طرح دادیاں اور پہاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کا سایہ بھی اُسے نظر آیا۔ زمانہ سابق میں یہ کہا جاتا تھا کہ عقد ثریا میں پہلے سات ستارے تھے۔ لیکن ایک ستارہ نامعلوم طور پر غائب ہو گیا۔ دور بین لگا کر جب گلیلیو نے اس بُرج کو دیکھا تو بجائے سات کو چالیس ستارے نظر آئے۔ غرض جس طرف اُس کی نظر پڑتی تھی نئے ستارے جو مجرہ انگھ کو نظر آ سکتے تھے دکھائی دیتے تھے۔

۷ جنوری ۱۶۱۰ء کی رات کو اُس نے تین چھوٹے چھوٹے ستارے ایک خط مستقیم میں سارہ مشتری کے نزدیک دیکھے اور کچھ دن بعد ایک چوتھا ستارہ اور دیکھا۔ ان ستاروں کو اُس نے مشتری کے گرد گردش کرتے ہوئے پایا۔ اور جب اُس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر نظام کو پرنیکس کا نمونہ پیش کرتے ہیں تو اُس کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔

ان عجائبات کا مشہر ہونا تھا کہ تمام دنیا ادھر جھک پڑی۔ پادریوں کے گھر میں بھی ان اکتشافات نے ہل چلی ڈال دی۔ وہ ابھی طرح جانتے تھے کہ اُن کے اس مذہبی صوبہ کا اب خدا ہی حافظ ہے کہ کائنات محض انسان کے فائدہ کی غرض سے پیدا کی گئی ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہ بے شمار ثوابت جو اب تک نظر سے مخفی تھے انسان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا کریں کہ ان کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد یہی نہیں ہے کہ انسان کو شب کے وقت روشنی پہنچائی جائے بلکہ اور ہی کچھ ہے۔

نظام کو پرنیکس پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اگر عطارد اور زہرہ آفتاب کے گرد دور زمین کے اندر گردش کرتے ہوں تو ضرور ہے کہ اُن میں قمر کی طرح تبدلات نظر آئیں اور زہرہ میں قمر کی روشنی اور چمک دمک اس درجہ نمایاں ہے یہ تبدیلیاں اور بھی بہتر ہونی چاہئیں۔ خود کو پرنیکس نے اس اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کیا تھا اور اُس اس کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تھا۔ گلیلیو نے جب دور بین لگا کر زہرہ کو دیکھا تو اُسے

معلوم ہوا کہ تبدلات مترقبہ حقیقت میں موجود ہیں یعنی ایک وقت میں سیارہ ہلال تھا پھر اونیم ماہ ہوا اس کے بعد محذب النور ہوا یعنی اس کا تین چوتھائی حصہ روشن ہو گیا۔ اور بالآخر بدر کامل بن گیا۔ کوپرنیکس کے زمانہ سے پہلے یہ خیال تھا کہ سیارے بذات خود روشن ہیں لیکن زہرہ اور مریخ کے تبدلات یعنی مدارِ تنویر نے ثابت کر دیا کہ وہ مستنیر ہیں یعنی اُن کی تابانی آفتاب کی روشنی کا عکس ہے۔ ارسطو اور اُس کے پیروں کے اس عقیدے کو کہ اجسام سماوی اجسام ارضی کی طرح فساد پذیر نہیں ہیں گلیلیو کے ان اکتشافات نے سخت صدمہ پہنچایا کہ زمین کی طرح جاندار بھی مہیا اور وادیاں ہیں اور آفتاب عجیب نہیں ہے بلکہ اُس کا چہرہ داغدار ہے اور بجائے اس کہ کہ دو شان و دقار کے ساتھ ایک جگہ قرار پذیر ہوا اپنے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ نئے ستاروں کے منظر نے بھی اس عقیدہ کو بہت کچھ متزلزل کر دیا تھا۔

ان نظریہ دور بینی اکتشافات نے اور بہت سی تحقیقاتوں کے ساتھ ملکر نظام کوپرنیکس کی صحت کو پایہ ثبوت پر پہنچا دیا اور کلیسا نے عیسوی کی تشویش و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی ادنیٰ درجہ کے جاہل پادری ان اکتشافات کو مکرو زور اور فریب القباس سے تعبیر کرتے تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ دور بین پر اجسام ارضی کے متعلق تو اعتبار کیا گیا جاسکتا ہے لیکن اجرام سماوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان اجرام کا جو علم ہمیں بذریعہ دور بین ہوتا ہے وہ محض فریب نظر ہے۔ ایک گروہ ایسے بزرگ عالم کا بھی تھا جو یہ ارشاد فرماتے تھے کہ دور بین کی ایجاد ارسطو کے اس قول کی دوسری شکل ہے کہ ستارے روز روشن میں ایک گہرے کنوئین کی تہ سے نظر آسکتے ہیں۔

گلیلیو پر اس مقدس برادری نے القباس بدعت الحاد اور زندقہ کا الزام لگایا۔ ہنری علی سبیل ابراہام نے ایک خط پادری کیستیلی کے نام لکھا جس میں یلپا ہر کیا کہ کتب مقدسہ کی مندرجہ کا منشا یہ نہیں ہے کہ علمی مسائل میں اُن سے استناد کیا جائے

بلکہ اُن کا مقصد انسان کی اخلاقی رہبری ہے۔ مخالفت کی جو آگ پہلے ہی بھڑک رہی تھی اُس پر اس خط نے اور تیل ڈال دیا۔ مقدس محکمہ احتساب عقاید یعنی "انکوئزیشن" نے وارنٹ گرفتاری جاری کر کے گلیلیو کو پکڑ بلوایا۔ اس حکم نامہ میں اُس پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ اس اصول کی تعلیم دیتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ کتب مقدسہ کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے جب وہ اس دینی عدالت کے اجلاس میں حاضر ہوا تو اُس سے کہا گیا کہ اپنے ملحدانہ عقیدہ سے توبہ کرے ورنہ قید کر دیا جائیگا۔ اُس کو یہ حکم دیا گیا کہ کوپرنیکس کے اصول کی تائید اور تلقین سے باز آجائے اور آئندہ کے لیے عہد کرے کہ ان اصول کی حمایت و اشاعت میں حصہ نہ لے گا۔ چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ سچائی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے اور اُسے شہدائی ضرورت نہیں جو اپنی جان اُس پر قربان کر دینا اُس نے "انکوئزیشن" کے حابراۓ احکام کی تعمیل کا اقرار کر لیا۔ اور وعدہ کیا کہ جو کچھ اُسکو ہدایت کی گئی ہے اُس پر عمل کرے گا۔

اس کے بعد سولہ سال تک کلیسا کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ لیکن ۱۶۳۲ء میں جب گلیلیو سے نہ رہا گیا تو اُس نے اپنی کتاب موسوم بہ نظام عالم شایع کر دی۔ اس کتاب کا مقصد کوپرنیکس کے اصول کی تصدیق و توثیق تھا۔ اس کتاب کا شایع ہونا تھا کہ "انکوئزیشن" کے پیادے پھر دوڑے اور اس الزام میں کہ اُس نے آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا دعویٰ کیا ہے وہ مکر "انکوئزیشن" کے اجلاس میں حاضر کیا گیا۔ اور اس مقدس عدالت کے صدر نشین نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم نے جرم الحاد و زندہ کے ارتکاب سے اپنے آپکو اُن تعزیرات کا مستوجب قرار دیا ہے جو اس جرم کے ساتھ واجب تہ ہیں۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر اصول حرکت زمین کے قائل ہونے سے توبہ کرے اور اُس پر لعنت بھیجی۔ اقدس اکبر! کس درجہ عبرت ناک نظارہ ہے کہ ایک واجب التعظیم بزرگ کو جو علم و فضل میں اپنے اقران و امثال کا سر تاج ہے

سوت کی دہکی دیکر اُن واقعات کے انکار پر مجبور کیا جا رہا ہے جنہیں وہ خود تو صحیح سمجھتا ہے مگر طرہ یہ ہے کہ خود اُس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تک درست خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد گلیلیو قید میں ڈال دیا گیا جہاں اپنی زندگی کے باقی دن سال اُس نے طرح طرح کی عذوبتوں اور سختیوں کے ساتھ کاٹے اور جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس کی لاشیں تک کو سیسی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔ اس واقعہ کی یاد سے ہماری آنکھوں میں خون اتر اتر آتا ہے۔ اُس عقیدے کے باطل ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے جسے اپنی تائید کے لیے اس قدر دُور فریب اس درجہ سفاکی اور وحشیانہ بین سے کام لینا پڑے۔ وہ عقاید جن کی حمایت ”انکوئزیشن“ نے اس مشدد مد کے ساتھ کی تھی آج کل دن تمام مہذب دنیا میں استحقار و استہزاء کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

زمانہ حال کے ایک بہت بڑے مہندس نے اس واقعہ پر نظر اتقاد ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ امر باب الشراخ اس بحث میں ایسا محتاج جس کے ساتھ انسان کو حد درجہ کی دلچسپی ہے۔ اس لیے کہ اس امر کے تصفیہ پر اُس گروہ کے مرتبہ اور حیثیت کا انحصار ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ اگر زمین کائنات کے وسط میں ایک جسم غیر متحرک و قائم ہو تو انسان کو یہ حق ہر طرح سے حاصل ہے کہ اپنے آپ کو صانع قدرت کی توجہ کا محض اکبران لے لیکن اگر زمین کی حقیقت اس سے زیادہ نہ ہو کہ وہ محض ایک سیارہ ہے جو آفتاب کے گرد گھومتا ہے اور نظام شمسی کے ارکان میں بھی اُس کا درجہ کچھ بہت زیادہ قابلِ قوت نہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ افلاک کی اُس غیر محدود عظمت میں جہاں یہ نظام شمسی بھی باہر ہر درختاوی و پہنائی بمنزلہ ایک نقطہ غیر محسوس کے ہے بالکل ہی غائب ہو جائے گی۔

نظام کو پینگیس کی مسئلہ کامیابی کا دور تاریخ ایجاد و دور بین سے شروع ہوتا ہے۔ اس ایجاد کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرے پائانتا کو یورپ کے ہر ہیئت دان نے اس نظریہ کو

بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لیا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور زمین اس کے گرد گردش کرنے کے علاوہ اپنی محور پر بھی گھومتی ہے۔ آفتاب کے گرد زمین کے گردش کرنے کے وقت کی تصدیق کے لیے اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ بریڈلی کے عظیم الشان الکشافات احتمال ثوابت سے بہم پہنچ گیا۔ ثوابت کے اس احتمال کا انحصار کچھ تو حرکت نور کے تدریج یا تسلسل پر ہوتا ہے اور کچھ زمین کی گردش پر۔ بریڈلی کا الکشاف بلحاظ اہمیت استقبال اعتدالین کی دریافت سے کم نہ تھا۔ تدریج حرکت نور کی تحقیقات جو ریکٹر کی وقت نظر کا نتیجہ ہے اگرچہ اول اول غلط سمجھی گئی۔ چنانچہ ٹائیٹل نے اس کے فریب نظر سے تعبیر کیا اور کیشینی جیسے شخص نے اسے تسلیم نہ کیا لیکن رفتہ رفتہ تمام دنیا نے اس کی صداقت و حقیقت کے آگے سر جھکا دیا۔

اس کے بعد ہیئت والون کو البعاد نظام شمسی کے متعلق صحیح حالات دریافت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ بلکہ اس مسئلہ کو اگر محدود شکل میں پیش کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ زمین سے آفتاب کا فاصلہ کس قدر ہے۔

کوپرنیکس کے زمانہ میں مہندسین کا یہ خیال تھا کہ آفتاب کا فاصلہ پچاس لاکھ میل سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض کی رائے میں تو یہ اندازہ بھی بہت کچھ مبالغہ آمیز تھا۔ لیکن ٹائیٹیکو بریہی کو ارضیادات پر نظر ثانی کرتے ہوئے کپلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اندازہ بہت کچھ اضافہ کا محتاج ہے۔ اور آفتاب کا فاصلہ ایک کروڑ تیس لاکھ میل سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ ۱۶۸۷ء میں کیشینی نے ظاہر کیا کہ یہ اندازہ بھی اصل سے بالکل متعارف نہیں رکھتے۔ اصلی فاصلہ آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ غلامی ہیئت یہ پیشین گوئی کر چکے تھے کہ ۳ جون ۱۷۰۹ء کو سیارہ زہرہ کا مرور دوسرے آفتاب پر ہوگا اور پھر شمس

۱۷۱۱ء کا ایک مشہور ہیئت دان جسے لونی چہاد ہم شاہ فرانس نے رصد گاہ پیرس کو مستم مقرر کیا تھا۔ مترجم ۲

کے اس اصولی مسئلہ کے حل کرنے میں مرور زہرہ سے جو دو طے والی تھی اُس سے بھی وہ ناواقف نہ تھے۔ یورپ کی مختلف سلطنتوں نے قابل تحسین مستندی سے کام لے کر اس عظیم الشان واقعہ فلکی کے ارتقادیں سرکاری طور پر مدد دی۔ چنانچہ یورپ میں پچاس ایشیا میں چھ اور امریکہ میں سترہ مقامات رصدہ بینی کے لیے تجویز کیے گئے۔ انگریزی حکومت نے کپتان لگ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے نامور کیا اور اُس نے وہ پہلا بحری سفر انشید کیا جس کی شہرت کبھی نہ مٹے گی۔ کپتان لگ کی منزل مقصود اوٹاویٹ تھی جہاں پہنچ کر اُس نے رصدہ کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ اُس کا سفر بوہی طرح سے کامیاب ثابت ہوا اس لیے کہ آفتاب جب طلوع ہوا تو مطلع بالکل صاف تھا اور دن بھر صاف رہا۔ مرور کا وقت صبح کے ساڑھے نو بجے سے شروع ہو کر سہ پہر کے ساڑھے تین بجے ختم ہوا۔ اور لگ نے اپنی رصدگاہ سے تمام ارتقادات قابل اطمینان پر انجام دئے۔

لیکن مختلف مقامات کے رصدہ نتائج کا جب مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تطابقتی جہاں سب میں موجود ہونا چاہیے تھا مفقود یعنی کم سے کم فاصلہ ۸ کروڑ اسی لاکھ اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ دس کروڑ نو لاکھ میل قرار پاتا ہے۔ اس تفاوت کی تنقید کے لیے مشہور و معروف مہندس انگ نے ۱۸۳۳ء - ۱۸۳۴ء میں ان مختلف ارتقادات پر نظر ثانی کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ آفتاب کا زاویہ اختلاف منظر افقی یعنی اُس مثلث کا زاویہ الراس جس کا قاعدہ نصف قطر ارض ہے اور دونوں ساقیں آفتاب پر جا کر ملتی ہیں بقدر $1.3''$ ۸ ثانیہ کے ہے اور اس لیے زمین سے آفتاب کا فاصلہ نو کروڑ باون لاکھ چوہتر ہزار میل ہے۔ اس کے بعد انہیں ارتقادات کا تبصرہ ہٹس نے کیا اور نتیجہ نو کروڑ سولہ لاکھ اسی لاکھ ہزار میل نکالا۔ ہٹس کے بعد یوریر نے اپنے پیشرو کے نتیجہ پر ایک لاکھ میل کا اضافہ کیا۔ آیلری اور اسٹون ایک دوسرے طریقہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ البتہ اسٹون نے ارتقادات سابقہ کی نتیجہ سے ہر اسے قیام کی

کہ حقیقی فاصلہ نو کروڑ سترہ لاکھ تیس ہزار میل ہے۔ سب سے آخر میں قو کا اور نیرو نے طبعی تجربات سے جو سرعت رفتار نور کے اندازہ پر مبنی تھے اور اس لیے بجا فاصلہ طبعی ان مشاہدات سے بالکل مختلف تھے جن کا اعصار مرد زہرہ پر تھا یہ نتیجہ نکالا کہ فاصلہ آفتاب نو کروڑ چودہ لاکھ میل ہے۔ تاؤ فیکہ سال آئندہ (۱۹۰۳ء) کے مرد کے نتائج معلوم نہ ہوں یہی تسلیم کرنا چاہیے۔ کہ آفتاب سے زمین کا فاصلہ نو کروڑ بیس لاکھ میل سے کسی قدر کم ہے اس فاصلہ کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام شمسی کے ابعاد و مقادیر کا اندازہ آسانی اور صحت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے۔ مرنٹ اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ پنچو ن جو نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ معلوم ہے آفتاب سے بمقابلہ زمین تیس گنا زیادہ دور ہے۔

ان اعداد کی مدد سے ہم اس مسئلہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کی قابلیت پیدا کر سکتے ہیں کہ کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ آفتاب پر سے اگر دیکھا جائے تو زمین ایک نقطہ سوہوم رہ جاتی ہے گویا خاک کا ایک ذرہ بے مقدار ہے جو اس کی شعاعوں میں مقبوس کر رہا ہے۔ اگر ناظرین اس بارہ میں زیادہ تر صحیح اندازہ قائم کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کتاب کو نگاہ سے گزبھر کے فاصلہ پر رکھ کر اس کی عبارت کے کسی نقطہ کو دیکھیں یہ نقطہ زمین کی اُس سطح سے جو دیکھنے والے کو آفتاب پر سے نظر آئے گی۔ مقدار میں کئی سو حصہ بڑا ہے۔

پس کیا حقیقت ہو سکتی ہے ایک ایسے جزد و بقرططیسی ایک ایسے ذرہ بے مقدار کی اُس ان گنت دنیاؤں کی غیر محدود کائنات میں جس کی پہنائی کا اندازہ کرتے ہوئے دماغ دیوانہ ہوا جاتا ہے؟ اگر یہ ذرہ ناچیز اپنی جگہ سے ہٹا بھی دیا جائے بلکہ معدوم بھی ہو جائے تاہم کوئی فرق موجودہ حالت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا ہستی ہے اُن انسانی اجزائے

۱۰ تازہ ترین اکتشافات نے اس اندازہ میں کسی قدر ترمیم کی ہے اور اس وقت کہ ۱۹۰۳ء میں ہندسین عالم کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورج کا فاصلہ زمین سے نو کروڑ اسی لاکھ میل ہے۔

لای تجزی کی جو دس ارب سے بھی زیادہ کی تعداد میں اس قریب قریب نہ نظر آنے والی ذرہ خاک پر آباد ہیں اور جن میں سے لاکھوں صفحہ روزگار سے ایسے مٹیں گے کہ گویا انکا کبھی نام و نشان ہی نہ تھا یا کیا حقیقت ہے انسان کی یا اُس کے رنج و راحت کی؟

جب نظام کو پرنیکس کے اصول کی عام طور سے اشاعت ہوئی تو موافقین و مخالفین سبھی نے اس پر طرح طرح کے اعتراض کیے۔ چنانچہ ایک اعتراض ہالینڈ کے مشہور ہیئت دان ٹانگو ہیری نے بھی کیا جو دراصل اسٹارکس نے نینٹا عورت کے مذہب پر کیا تھا یعنی اگر زمین حقیقت میں سورج کے گرد گھومتی ہو تو مناظر ثوابت کی سمت میں تغیر پیدا ہونا چاہیے ایک وقت خاص میں ہر کو بقدر دور زمین کے قطر کی مسافت کے افلاک کے ایک مقام معینہ سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے پس نسبت اُس قرب کے جوہر میں چھ مہینے پہلے حاصل تھا لہذا ثوابت کی ہیئت اعتباری پر اس قرب و بعد کا اثر پڑنا چاہیے اور اُن کے مناظر میں تغیر واقع ہونا چاہیے یعنی جون جون ہم اُنکے قریب آتے جائیں وہ جدا جدا نظر آنے چاہئیں اور جون جون ہم اُن سے دور ہوتے جائیں وہ آپس میں ملے ہوئے نظر آنے چاہئیں یا باصطلاح ہیئت ان ستاروں کا سالانہ زاویہ اختلاف منظر ہونا چاہیے کسی ستارہ کا زاویہ اختلاف منظر وہ زاویہ ہے جو اُن دو خطوط کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے جو اس سے علی الترتیب سورج اور زمین کی طرف کھینچے جائیں۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں زمین سے سورج کا فاصلہ بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ اگر اُس وقت یہ معلوم ہوتا جیسا کہ اب معلوم ہے کہ یہ فاصلہ نو کروڑ میل سے بھی زیادہ ہو یعنی دور زمین کا قطر اٹھارہ کروڑ میل سے اوپر ہے۔ تو اعتراض متذکرہ بالابلا شبہ نہایت قوی سمجھا جاتا۔

اس اعتراض کا جواب ٹانگو کو یہ دیا گیا کہ چونکہ اجرام سماوی کا زاویہ اختلاف منظر اسی نسبت سے گھٹتا جاتا ہے جس نسبت سے کہ ان کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے لہذا ممکن ہے

کہ کوئی ستارہ اس قدر دور و دراز فاصلہ پر ہو کہ اس کا زاویہ اختلاف منظر محسوس و معلوم ہی نہ ہو سکے۔ یہ جواب آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ نواب کے زوایاے اختلاف منظر کا معلوم ہونا آلات پیمائش زوایا کی ترقی پر منحصر تھا اور جب اس قسم کے آلات ایجاد ہو گئے تو ان زاویوں کی پیمائش آسان ہو گئی۔

ستارہ آلفا بطورس جو نواب میں سب سے زیادہ نزدیک خیال کیا جاتا ہے نصف کرہ جنوبی کا ایک روشن و ہرستارہ ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو بقدر $\frac{1}{10}$ ثانیہ کے ہے سب سے پہلے ہندرسن اور مکلیئر نے بمقام راس امید $۱۸۳۳-۳۴$ ع میں دریافت کیا تھا اس حساب سے گویا یہ ستارہ ہم سے آفتاب کی بہ نسبت دو لاکھ تین ہزار گنا زیادہ دور ہے اس کی سطح سے اگر آفتاب کو دیکھا جائے تو خواہ قرص آفتاب دور زمین کے مساوی ہی کیون نہ ہو یعنی اس کا قطر خواہ اٹھارہ کروڑ میل ہی کیون نہ ہو پھر بھی وہ محض ایک نقطہ دکھائی دے گا یہ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز نقل کے گرد ایک سو سال میں گھومتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا متفقہ جرم آفتاب کے جرم سے کم ہے۔

ستارہ ۶۱ سگنی کا تعلق نواب طبقہ سادس سے ہے یہ ستارہ بھی دہرا ہے۔ اس کا زاویہ اختلاف منظر جو بیسل نے ۱۸۳۵ ع میں دریافت کیا تھا $\frac{1}{10}$ ثانیہ کے قریب ہے۔ اس حساب سے اس کا فاصلہ سطح زمین سے آفتاب کے فاصلہ کی بہ نسبت پانچ لاکھ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ستارہ اور اس کا ہمزا اپنے مشترک مرکز نقل کے گرد پانچ سو

سال دور میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نواب مضاعف ہیں۔ اس کی وجہ اول اول اس طرح کی گئی تھی کہ ممکن ہے کہ دو نواب تقریباً اسی خط مستقیم پر واقع ہوں جس پر زمین واقع ہے اور اس لیے بغیر دُہرے نظر آتے ہوں مگر مسلسل الرصادات سے یہ بات پایہ تحقیق کیے پہنچ گئی ہے کہ یہ دہرے نواب آپس میں اسی طرح مربوط و منوط ہوتے ہیں جس طرح ارض و قمر اور ایک کوکب دوسرے کوکب کے گرد جو اس کا ہمزا ہے ایک دقت مبینہ گھومتا ہے۔ مترجم

بیش سال میں گھومتا ہے۔ ان دونوں کا متفقہ وزن تقریباً وزن آفتاب کے ایک تہائی کے سادی ہے۔

ستارہ سیریس جو اپنی چمک دمک کے لحاظ سے آسمان میں سب ثوابت سے زیادہ نمایاں ہے اتفاقاً قطرورس سے بھی چھ حصہ زیادہ دور ہے اس کا قطر غالباً ایک کروڑ بیس لاکھ میل ہے اور جونور کی شعاعیں اس کے جرم سے نکلتی ہیں وہ تابانی و درخشانی میں سورج کی روشنی سے دو سو حصہ زیادہ ہیں لیکن دور بین میں سے دیکھنے پر بھی اس کا قطر ناپا ہنیں جا سکتا بلکہ وہ ایک نہایت چمکتی ہوئی چنگاری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پس ثوابت نہ صرف بلحاظ ظاہری عظمت کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ باعتبار جسامت اصلی بھی ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آگ اسپیکٹر و سکوپ (مقیاس) الوان نور منشور سے معلوم ہوتا ہے ترکیب کیمیاء و طبیعی کے لحاظ سے بھی ان میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ آگ ان تغیرات کے ظاہر کرنے سے جو ثوابت کی شعاع نور کی قابلیت انکسار و انحراف میں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے دوران عمر کی کیفیت پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قریب ترین ستارہ ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کے فاصلہ کی پیمائش کرنا قریباً محال ہے لیکن ہمارے تئیس کی یہ ابھی پہلی منزل ہے کائنات فلکی میں ایسے ثوابت بھی ہیں جن کی روشنی کی شعاعوں کو ہماری زمین تک پہنچنے میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں سال کی مدت صرف ہوئی ہے۔ جب خود ہمارے ہی نظام شمسی کی حدود ہماری بڑی سے بڑی دور بین کی رسائی سے باہر ہیں تو ان نظامات کا تو ذکر ہی کیا جو ان حدود سے پرے واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خاک کے ذرہ کی طرح فضا کے میدان نامتناہی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۷ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار ہر سال لاکھ چھ سو ہزار میل فی ثانیہ ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان ثنوں کا فاصلہ زمین سے کس قدر ہوگا۔ مترجم

کیا یہ عظیم الشان اجرام جن میں سے ہزاروں لاکھوں کا فاصلہ ہم سے اس قدر دور ہے کہ مجھ و نگاہ دور بین کی مدد کے بغیر ان کو دیکھ تک نہیں سکتی اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ ہم ان کی روشنی سے مستفید ہوں؟ اور جیسا کہ ہمارے پیشوایان دین ارشاد فرماتے ہیں کیا ان روشن داناں کو کواکب کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ انسان کو روشنی پہنچائیں؟ کیا ان کے جرم کی عظمت اور جسامت کی پہنائی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس طرح ان میں سے ہر ایک قوت کا مرکز ہے اسی طرح اسے حرکت کا بھی مرکز ہونا چاہیئے؟ یہ الفاظ دیگر کیا ان کا وجود اس امر پر دال نہیں ہے کہ وہ شمس ہین جن میں سے ہر ایک ایک جدا گانہ نظام عالم کا مبداء تکوین ہے؟

۱۰ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ”الکلام“ میں ایک مقام پر یورپ کے تمدن کے مہات اصول پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوق ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لیے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔ یہ لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی ”اور ان آیات کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرماتے ہیں۔

(۱) ، لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ -

(۲۰) ، وَسَخَّرْنَا لَكُمَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا -

ہمیں ڈھ ہے کہ ڈیپیر اور اُس کے ہم خیال مولانا کے اس دعوے کو بلا ترمیم تسلیم کرنے میں مثال ہوں گے۔ کائنات سے اگر مولانا کی مراد کہہ ارض سے ہے تو یقیناً انسان اس خیال میں حق بجانب ہے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لیے ہے کہ انسان اس سے متبع اٹھائے۔ لیکن اگر کائنات کے مفہوم میں وہ ان کو درون روشن داناں کو بھی داخل کرتے ہیں جن کے وجود پر غائب باری کی غفلت و حکمت بے پایان گواہ ہے اور جن کا ثبوت انسان باوجود اپنی برصغرتی کے دینے پر قادر ہو گیا ہے تو ڈیپیر کے اس سوال کا معقول جواب شاید پیش نہ کیا جاسکے گا کہ کیا ان دنیاؤں

ابھی ان اوقات کا علم بہت ہی ناقص تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس علم کا وجود سر پر وہ شخصیل سے باہر نہ نکلا تھا کہ انکی کتاب باشندے کا رڈینو برونو نامی نے جو کو پرنیکس کی وفات کے سات سال بعد پیدا ہوا ایک کتاب کائنات اور دنیاؤں کے عظیم الہیات ہونے پر لکھی چند کتابیں اور بھی اُسکی تصنیف سے ہیں۔ مثلاً "ایوننگ کا نور سیشن آن ایش وڈنڈے"

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۵۔ کا جو ہم سے اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ بحر دیکھا بلامد دور ہیں اور نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ بجز اس کے اور کوئی مشابہتیں کہ ہم ان سے متعلق اٹھائیں۔ اور ان کے نور سے مستیز ہوں؟

قرآن مجید میں جو صرت کرہ ارض کے باشندوں کی اخلاقی رہبری کے لیے نازل کیا گیا ہے اور جس کا رد سے سنون صرت ان عقیل و فہیم ہستیوں کی طرف ہے جو نظام شمسی کے اس تیسرے رکن پر آباد ہیں یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا کہ کائنات فلکی کا مشابہ انسان کو فائدہ پہنچانے کے اور کچھ نہیں فوایت و سیار کی تخلیق سے اور جو مقاصد خباب باری کے پیش نظر ہوں گے وہ تو بجز اس کے اور کون جان سکتا ہے لیکن اگر ان میں سے بعض کا ذیلی و منمنی مقصد یہ بھی ہو کہ کرہ ارض کے کہیں ان کے نور سے مستیز ہوں تو اس سے دوسرے مقاصد کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس عام فہم پیرایہ میں جو جناب باری انسان کے دل میں اس جذبہ احسان مندی و شکر گزاری کے براگینتہ کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے جو عبد کو معبود کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اس نے کہیں تو یہ کہا ہے کہ چاند سورج اور ستارے تمہیں روشنی دیتے ہیں کہیں یہ کہا ہے کہ خدا نے کائنات سادی کو تہراتا تاج کر دیا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی حکمت آفرین جاسیت پھر بھی اس قابل اعتراف دعویٰ کی گرد سے اپنے دامن کو کمال دقیقہ رسی کی راہ سے بچا گئی ہے کہ کائنات فلکی کا مشابہ بجز انسان کے فائدہ کے اور کچھ نہیں۔ و سبھی لکم مافی السموات سے یہی مراد نہیں ہے کہ وہ تمام اجرام روشن و تاریک جو فضا سے بیٹھ مین پھیلے ہوئے ہیں بلکہ اسود مندی انسان کے تلخ کردئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ کا مرجع مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو وہ عقل و دقیقہ سنخ عطا فرمائی ہے جس کی بدولت اسے اس کائنات کے پوشیدہ اسرار معلوم ہو گئے جہاں وہ جسم کے ساتھ نہ پہنچ سکتا تھا تب سبب جستانی ہی نہیں ہوتی بلکہ عقلی مذہبی بھی ہوتی ہے اور یہی اس کا درجہ کمال ہے۔ کیا دور بین کے ذریعہ

(اسرار اربعہ الرماہ) جس میں نظام کو پرنیکس کی حمایت کی گئی تھی۔ اور دوسری دن سول کا ژانف تھنگز " (وحدت علت العلل) ان تصانیف پر ایک اور رسالہ کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے جو اوس نے علی سبیل التمثیل لکھا اور ۱۵۵۸ء میں شائع کیا۔ اس رسالہ کا نام "دسی اسکسپیشن آف دسی ٹرایکٹ بیٹ" (فتح مقدوسی کا اخراج) تھا۔ اس کے علاوہ ہیئت والون کی آئندہ نسلوں کے لیے اُس نے ایک جدید تارے کے متعلق اپنے مشاہدات فلکی کو سپرہ "علم کیا۔ یہ ستارہ ۱۵۵۸ء میں دفعۃً برج ذات الکرسی میں نمودار ہوا اور اُس کی تابانی درخشان فی روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ باقی تمام کو اکب اُس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہ ستارہ روز روشن میں بھی صاف نظر آتا تھا۔ اسے نومبر کو اُس کی چمک زہرہ کی منہما سے درخشندگی کو برابر ہو گئی۔ مارچ ۱۵۵۹ء میں اُس کا شمار ثوابت طبقہ اولین میں ہونے لگا۔ چند مہینے تک اُس نے مختلف رنگ بدلے اور مارچ ۱۵۶۰ء میں غائب ہو گیا۔

کیلبر کے زائد (۱۵۵۹ء) میں جو ستارہ دفعۃً برج ثعبان میں نمودار ہوا تھا ابتداً زہرہ سے بھی زیادہ درخشان تھا۔ اس نے ایک سال سے زیادہ عمر پائی اور پھر ارخوانی زردی سے مختلف رنگ بدلتا ہوا فنا ہو گیا۔

ابتداءً بروز کا یہ قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر دے چنانچہ ڈومینیکن فرقہ کے راہبوں میں وہ داخل بھی ہو گیا تھا لیکن مسئلہ عشاے ربانی اور مسئلہ جبل بلادنس یعنی امکان استقرار محل بجاہت دوشیزگی پر غور کرنے سے اُس کا ایمان مبدل بہ شکوک ہو گیا۔ چونکہ اُس نے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا اُسے بہت جلد پیشوا بایان دین کا مورد عتاب ہونا پڑا اور اُن کے پیچھے عقوبت سے بچنے کے

بعیتہ نوٹ صفحہ ۲۴۴۔ سے الفا قنطوس کا اکتشاف کچھ کم تسخیر آسمان ہے جو ہم کو یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں ازغہ بس کی روشنی ہماری مجرور نگاہ کو مشکل نظر آتی ہے اس غرض سے ہمارا تامل کیا گیا ہے کہ ہم کو روشنی پہنچائے۔ نا اعتبار دایا اولی الابصار۔ مترجم۔

لیے اول سوئٹزر لینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینے پڑی۔ لیکن انکو برلن کے خوشنوار تازی کہتے جن کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی برابر اُسکے پیچھے لگے رہے۔ اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اُسکا کھوج لگا کر ہے۔ ویس میں وہ گرفتار کیا گیا اور پیاپی کے جیل خانہ میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اُسے لکھنے کے لئے قلم و دوات کا غلہ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لیے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اُس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اس قید تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لیے اُس سے ملے اور اس کا غم غلط کرے۔

برونو نے زمانہ قیام انگلستان میں نقد و عوالم پر لکچر دئے تھے اور اپنی سب سے زیادہ مشہور کتاب بین زبان اطالوی تصنیف کی تھیں۔ پادری یہ دیکھ دیکھ کر اور بھی کھیسے ہوتے تھے کہ وہ جہاں جاتا تھا اُن کی ریاکاری اور بد باطنی کی پردہ دری کرتا تھا اور غلے رُو س الاشہاد یہ کہتا پھرتا تھا کہ اہل مذہب کے تشلک پر مہانت اور منافقت کا ملمع چڑا ہوا ہے اُن کے ظاہر اور باطن میں بُعد المشرقیں ہے اور اُن کے عقاید زور و العباس اور نفاق دیا کی اُس متزلزل بنا پر قایم ہیں جسے اخلاق حسنا یا ایمان بالغیب جیو بھی نہیں گیا ہے۔

اُسما را ربحا الرما د ”میں اُس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ متزلزل کا مقصد سائنس کی تعلیم ہرگز نہیں ہے بلکہ اُس سے محض اخلاق کی ہدایت مقصود ہے۔ انا جیل مقدسہ ہنیت یا طبیعات کے مسائل کے متعلق ذریعہ استناد نہیں ہو سکتیں خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی غلط اور ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قایم ہے اور آسمان ایک قبة جامدہ ہے جو فردوس کا معن ہے۔ برونو کو کتاب ہے کہ ان پاور جوتا دیلات کو پس پشت ڈال کر سپن تسلیم کرنا چاہیے کہ کائنات غیر محمد و دولا متناہی ہے جو منیر و غیر شفات دنیاؤں سے معمور ہے اور ان دنیاؤں میں سے اکثر آباد ہیں۔ ان میایل پر غور کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ابن رشد کے خیالات حقیقت سے دور نہیں ہیں ضرور ہے کہ ایک ایسی عقل کل موجود ہو جس نے اس تمام کائنات میں جان ڈال رکھی ہے۔

اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک شہ یا منظر ہے۔ اس عقل کی قوت اس کائنات ظاہری کی
 سکون و قیام کا باعث ہے اور اگر یہ قوت ہٹ جائے تو تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اسی عنصر
 و ناظر اور ساری دواثر عقل کل کا نام خدا ہے جو تمام چیزوں میں خواہ وہ زندہ نظر نہ بھی آتی
 ہوں موجود ہے اور ہر شے میں ترکیب پذیر ہونے اور زندگی قبول کرنے کی صلاحیت
 ہر وقت پائی جاتی ہے۔ پس خدا تمام موجودات کی علت واحد اور اُس کا مدار علیہ ہے۔

اس لحاظ سے فلاسفہ میں برونہ کا درجہ ابن رشد اور اسپائیزا کے دین ہیں ہے
 اسپائیزا کا یہ مذہب تھا کہ خدا اور کائنات ایک ہی وجود کے دو مختلف نام ہیں۔ ہر واقعہ
 قدرت کے ایک غیر تغیر پذیر قانون کے اقتضا سے مجبوراً پیش آتا ہے۔ اور خدا بذاتِ کل کائنات
 موجود فی الاصل غیر متغیر اور غیر ممکن الاندفاع توانائی کے اقتضا سے لازمی حرکات یا افعال کا
 ایک سلسلہ پیدا کرنے میں ہر وقت مصروف ہے۔

پیشوایان مذہب کے مطالبہ پر برونہ و تیس سے روم کو منقل کیا گیا اور اس الزام کی باج
 میں کہ وہ محمد ہی نہیں بلکہ اس الملاحہ ہے "انکوئزیشن" کے مجس میں قید کیا گیا سب سے
 بڑا الزام اس پر یہ تھا کہ وہ تعدادِ عوالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتب مقدسہ کے سیاق
 اور آیات الہامی خصوصاً ان آیات سے متناقض کلی رکھتا ہے جنہیں انسان کی سبیل نجات سے
 تعلق ہے۔ دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضر عدالت کیا گیا اور حکام عدالت نے اُس پر
 فردِ قرارِ داجرم لگا کر اُسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس
 حکم کی تعمیل سے اُس نے ازراہ غایت شرافت نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے
 تو کارفرمایانِ قضا و قدر یعنی حکام "انکوئزیشن" نے اس سفارش کے ساتھ اُسے دنیوی حکام کو
 سپرد کر دیا کہ "اُسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اُس کے خون کا
 ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔" عدالت "انکوئزیشن" کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقوف
 پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے

دشمن اگرچہ اُس کے جسم کو فنا کر سکتی ہیں۔ لیکن اُس کے خیالات کی اشاعت کو نہیں روک
 سکتے۔ لہذا اُس نے اپنے ججون سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے اس فیصلہ کو سن کر میرے قلب
 پر اُس خوف کا عشر عشر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دل میں اس کے صادر کرتے
 وقت پیدا ہوا ہو گا۔ اس فیصلہ کی تعمیل ۱۶ فروری سنہ ۱۹۴۷ء کو ہوئی اور بروز زندہ جلادیا گیا۔
 اُن بے شمار شہداء کے مصائب و نوائب کی یاد ہمارے دلوں میں رحم و ہمدردی پیدا
 کیے بغیر نہیں رہ سکتی جنہیں محض اپنے مذہبی عقاید کی وجہ سے فریق مخالف کے تعصب کے
 ہاتھوں آگ میں جلنا پڑا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو آخری وقت میں جبکہ اُسکی روح
 بعد در و درکرب جسم سے علیحدہ ہو رہی تھی ایک بہت بڑی زبردست طاقت کا سہارا تھا۔
 اُن کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس دنیا میں گو اُن کی زندگی مصیبت سے کٹی اور عقبی کی دہلیز
 پر قدم رکھتے وقت بھی اُنہیں گرفتار عذاب الیم ہونا پڑا لیکن دوسری دنیا میں پہنچتے ہی
 اُن کا رنج مبدل بہ راحت ہو جائے گا اور اُن کی تکلیف لذت اسے جاویدانی سے تبدیل
 ہو جائے گی۔ موت کی بھیانک اور اندہر سیری و اوس میں سے گزرتے وقت شہید کو کم از کم
 یہ اطمینان قلب تو میسر ہوتا ہو گا کہ ایک جسم و شفیق نظر دن سے پوشیدہ ہستی اُس کی رہنما
 بن کر اُسے ابدی زندگی کی روشن اور پرغضا منزل میں صحیح و سلامت لے جاوے گی۔ لیکن
 بروز اس سہارے سے بھی محروم تھا۔ وہ فلسفیانہ عقاید جن کی خاطر اُس نے اپنی جان ہی
 اُس کے لیے کسی طرح موجب تسکین و شفی نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے ضرور تھا کہ مرتے
 دم تک اُس کو اپنی قوت بازو ہی پر بھروسہ ہو اور وہ کسی کی تائید سے سروکار نہ رکھے۔ کیا
 اس بے یار و مددگار شخص کی استقامت عزم کو دیکھ کر جو تنہا ایک تاریک مکان میں
 اپنے عزیز اور بے مدد و ججون کے سامنے محض اُس اصول کی تائید کے لیے بڑھ چکا
 کھڑا ہوا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ہارا جی بے اختیار اُس کی ترویج کرنی کو نہیں چاہتا۔
 لے اگر ہو یقین ہو کہ خدا کی ہستی کا منکر تھا تو ہم ہرگز اُس کے معرفت نہیں ہو سکتے۔ انسان ضعیف البیان کا

ڈراؤنے کرے میں نہ کوئی الزام لگانے والا موجود ہے نہ گواہ حاضر ہے نہ وکیل نظر آتا ہے۔
 بلکہ محکمہ مقدس کے صرف کارندے ہیں جو سیاہ لباس پہنے دیے پاؤں موت کے سایہ کی
 طرح نقل و حرکت کرتے ہوئے دکھائی دینے میں سبچے کے زمین دوز حجرون میں مشغول
 رکھا ہوا ہے اور بھرموں کو انواع و اقسام کے عذاب دینے کے شیطانی آلات اور ان آلات
 کے سفاک استعمال کرنے والے پاس ہی موجود ہیں۔ مگر ہم سے صرف اس قدر کہا جاتا ہے
 کہ اس کی نسبت لمحدانہ عقاید رکھنے کا قوی شہرہ ہے۔ پس کیا وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ
 اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے لیکن جن عقاید کو وہ صحیح سمجھتا ہے ان
 سے وہ نڈا با کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے بلکہ پہلے کی طرح اپنے اباؤ ہندون سے کہتا ہے کہ
 دل میں تم بھی انہیں باتوں کے قابل ہو جن کو صحیح سمجھنے کی پادہش میں اس وقت تم بگھے
 سزا دے رہے ہو۔ ایک تو تصویر کا یہ رُخ ہے جس میں شرافت نفس بہت مروانہ۔ استقامت
 غیر متزلزل اور انحصارِ الحق کے خط و خال صاف صاف نظر آ رہے ہیں تصویر کا اگر دو سرا
 رخ دیکھنا منظور ہو تو تاریخِ عالم کی پندرہ صدی پہلے کا ایک ورق لوٹو۔ سردار کاہن کیا نفس
 کے مکان کا ایک کمرہ ہے۔ انگلیشی میں آگ دکھ رہی ہے مریخ صبح اذان دے رہا ہے۔
 لے نوٹ صفحہ ۲۵۔ جس کی حقیقت اس عالمِ مقنا ہی کی بے پایانی میں ایک جزوِ لایعجزی سے زیادہ نہیں
 ہے عقل غیر محدود پر جس کے کرشمے ہر وقت اس کی نظر کے سامنے ہیں بھروسہ نہ کر کے اپنی عقل محدود پر تکیہ کیے
 رکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ باطنی اور سرکش ہے اور لغات اور سرکشی سے کسی کو بھی ہمدردی نہیں ہو سکتی یہاں
 برونو جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے زہریہ نہ تھا۔ وہ خدا کی ہستی کا قابل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خدا کو
 بشکلِ اقانیم مثلاً نہ اٹا ہو لیکن وہ اس کا تو قائل تھا کہ ایک ایسی عقل کل ضرور موجود ہے جس نے اس تمام کائنات
 میں جان ڈال رکھی ہے اور جس کا یہ عالم ظاہری محض ایک رشتہ یا منظر ہے وہ اسی عقل کو تمام موجودات کی علت
 واحد و مانا تھا۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ خدا کا منکر نہیں سمجھا سکتا اور اس لیے ہم بغیر اسے من قائل لالہ
 الا اللہ نہ دخل الجنہ اس کی نجات میں شک نہیں۔ مترجم۔

اور خداوند خدا حسرت بھری نگاہوں سے پلٹ کر پطرس کی طرف دیکھ رہے تھے، ”لو قاف باب برت
دودم آیت ۶۱) خدا کی شان ہے کہ کلیسا کو برونو کے ساتھ اس طرح کے سلوک کرنے کا حق جس کا
برولت حاصل ہوا وہ خود پطرس کی ذات ہو!!

لیکن شاید وہ دن قریب آ رہا ہے جبکہ آئندہ نسلیں پاؤریوں کے اس گناہ عظیم کا کفارہ ادا
کریں گی۔ اور برونو کا مجسمہ کلیسا سے سینٹ پیٹر واقع روما میں نصب ہو کر بے نقاب کیا جائے گا۔

لے یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواری پطرس نے جو بھی دنیا میں سینٹ پیٹر کے لقب
سے لقب ہے کمال کو رہنمائی دینا ان ناشناسی کی ماہ سے اپنے آقا سے اعراض کیا تھا۔ پطرس کو آپ کی وفاداری
کا بڑا دھوی تھا اور جب آپ نے ایک دفعہ اُس سے کہا کہ تو میرا منکر ہو گا اور اُس نے اس پر اپنی خیر خواہی
بتائی چاہی تو آپ نے کہا کہ ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ چنانچہ ہ قول سچ ہو کر رہا۔ جب حضرت مسیح
یہودیوں کے معاندانہ اغراض سے مدعی حالت کے سامنے لائے گئے اور پطرس نے جو بدگواہ حاضر قادیان
کیا گیا کہ تو اس شخص کو مانتا ہے تو ان حضرت نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ لقب ہے کہ باوجود اس کے
نفسانیہ میں پطرس کا اتنا بڑا مرتبہ کیوں ہے۔ مترجم۔

ساتوان باب

نزاع در بارہ سہ زمین

بائبل کی رو سے زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہوتا اور اس کا ایک ہفتہ کی مدت میں بنایا جانا۔ پادریوں کے علم التاریخ کا انبیاء و سلف کی عمروں پر مبنی ہونا۔ بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف تخمینوں کی وجہ سے تناقض۔
 قلعہ طوفان نوح۔ رو سے زمین کا از سر نو آباد ہونا۔ مینارہ بابل۔ اخلاط السنہ
 انسان کی قدیمی زبان۔

کیتھینی کا یہ الکشاف کہ سیارہ مشتری سطح الطریفین ہے۔ نیوٹن کا یہ الکشاف کہ کرۂ ارض سطح الطریفین ہے۔ اس الکشاف سے اس نتیجہ کا استخراج کہ زمین نے حرکات و چین کے سانچے میں ڈبل کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ احباب آبی کی طبیعت اور منی تحقیقات سے اس نتیجہ کی تصدیق آغار اجسام ذوی الاعصاب سے اس نتیجہ کی مزید توثیق۔ زمین کی عمر کا اندازہ کرنے میں مدت ہائے مدید کے تسلیم کرنے کی ضرورت۔ مسئلہ پیدائش کی جگہ مسئلہ ارتقاء کے لیتا ہے الکشافات
 دوبارہ تداومت انسان۔

کائنات کے پیمانہ زمان و مکان کا غیر محدود ہونا۔ زمین کی عمر کی بحث میں افراط و تفریط سے احتراز۔

کائنات میں جو درجہ کرۂ ارض کو حاصل ہے اسکی حقیقت کا اعتراف ایک مول و طویل کشمکش کے بغیر نہ ہو سکا۔ کلیسا نے اس کی مخالفت میں ناخون نمک کا زور لگایا اور اپنے

عقاید کے برقرار رکھنے کی کوشش میں لوگوں کو سزا سے موت تک دی۔ لیکن اُس کی تمام کوششیں بالکل ناکام گئیں۔ نظام کو پرنیکس لگی تاسید میں ناممکن التردد شہادتوں کا انبار لگ گیا۔ آخر کار تمام دنیا نے بالاتفاق اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ آفتاب اُس نظام کا جس کو انسان سے تعلق ہے مرکزی جرم ہے اور زمین کا شمار اُن سیاروں میں ہے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اور ان میں بھی زمین سب سے بڑی نہیں ہے۔

چونکہ اس بحث کا سبق کلیسا کو نہ بھولا تھا لہذا جب مسئلہ عمر عالم کی جدید بحث پیش ہوئی تو پادریوں نے اُس شدید مخالفت کا اظہار نہ کیا جو پہلی بحث کے وقت اُن کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں تک نہیں کہ کلیسا کی روایات کے ایوان میں اس نئی بحث نے پھر آنر ل ڈیل ایسکین پمبو ابان دین کی رائے میں یہ حملہ سختی میں پہلے حملہ کی بہ نسبت بمراتب کم تھا۔ چنانچہ حامیان مذہب اس موقع پر یہ کہنے ہوئے پائے گئے کہ زمین کو اس کمرخت عظمت و جلال سے نیچے اُتار دینا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ حقایق الہامی کی بنیاد میں سرنگ لگا دی جائے البتہ تاریخ تکوین عالم پر بحث کرنے کی اجازت خاص حدود کے اندر دی جاسکتی ہے۔ لیکن اہل مناظران حدود سے بہت جلد تجاوز کر گئے اور اس لیے یہ جدید بحث بھی ویسی خطرناک ہو گئی جیسی پہلی بحث ثابت ہوئی تھی۔

تکوین عالم کے مسئلہ کے متعلق فلاطون نے اپنی کتاب ”ٹائمیس“ میں فریق مقابل کو حسب ذیل مشورہ دیا تھا۔

”و مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور آپ جو آخر انسان ہیں اس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ روایات مذہبی کے احتمالات میں مزید تفحص سے احتراز کرنا ہی اولیٰ ہے“

لیکن اُن زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس مشورہ پر کاربند ہونا ممکن نہ تھا۔ سینٹ اگسٹائن کے زمانہ سے فلسفہ کے ہر مسئلہ کی مذکب مقدسہ میں ڈھونڈی جانے لگی تھی اور اہل مذہب نے آیات انجیل سے تاریخ اور جغرافیہ کے ایسے ایسے خیالی نکات کا استخراج کیا

تھا جنھوں نے حقیقی علم کی چلتی گاڑی میں رھڑے اگھا دئے تھے۔

ہم اس مقام پر پادری صاحبوں کی ان تاریخی و جغرافیائی معلومات کا جن کا دار و مدار آیات انجیل پر ہے صرف سرسری سا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جن کے پہچاننے کے لیے زیادہ تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ انجیل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دنیا چھ دن میں بنائی گئی اور ساتویں دن جو یوم السبت ہر خدا نے آرام لیا اور ایک دن خدا کے نزدیک بمنزلہ ہزار سال کے ہے لہذا مقدس سورخون نے یہ استدلال کیا کہ دنیا کی عمر کل سات ہزار سال کی ہوگی جس میں سے چھ ہزار سال تو مصیبت میں کیٹیں گے اور ایک ہزار سال کا زمانہ عیش و راحت اور سکون و اطمینان میں بسر ہوگا۔ عام طور سے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت دنیا کی عمر چار ہزار سال تھی لیکن یورپ سنین عالم کے مطالعہ کی طرف سے اس درجہ غافل اور بے پروا تھا کہ مسیح سے پہلے اسے سن عیسوی کے قایم کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اس زمانہ میں روم کے ایک پادری ڈائیونیسس اکیگوس کو یہ فروگزاشت محسوس ہوئی اور اُس نے بجائے عام بت پرستانہ سن کے موجودہ عیسوی سن کو رواج دیا۔

قدیم ترین واقعات عالم کے سنین کا اندازہ لگانے میں ان تخمینوں سے کام لیا گیا جو زیادہ تر انبیاء سے سلف کی عمر دن پر مبنی تھے اور اس طور پر اعداد میں جو لوا قضا پیدا ہوئے ان کی تطبیق میں بے حد دقیقین پیش آئیں۔ فن امتقاد سے تو اُس زمانہ کو اصحاب جس سے ہمین بحث ہے مطلقاً ہیگانہ تھے اور اسی لئے حضرت موسیٰ کو ان صحائف کا حامل تسلیم کر لیا گیا جو ان سے منسوب ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت موسیٰ ان صحائف کے مصنف تھے تو اس اجتماع صندین کی کیا تاویل ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے کتب و اکتفا کے راہی ہیں جن میں سے اکثر ان کی ولادت سے دو ہزار سال قبل پیش آپچکے تھے تو رات کا ہر حصہ بادی النظر میں الہامی نہ سمجھا جاسکتا تھا اس لئے کہ اس کو تحریر سے بچانے

کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تھی۔ مختلف نسخوں میں جو زمانہ کی دست برد سے بچے بچائے باقی چلے آتے تھے بہت کچھ اختلاف تھا۔ مثلاً سامری نسخہ میں پیدائش یعنی آفرینش عالم سے طوفان تک کا زمانہ ایک ہزار تین سو سات سال درج تھا عبرانی نسخہ میں یہ مدت ایک ہزار چھ سو چھپن سال تھی۔ حالانکہ نسخہ سبعینیہ میں یہی مدت دو ہزار و دو سو تریسٹھ سال مذکور تھی۔ نسخہ سبعینیہ میں پیدائش سے حضرت ابراہیمؑ تک کا زمانہ عبرانی نسخہ کے مقابلہ میں ڈیڑھ ہزار سال زیادہ تھا۔ لیکن اس اندازہ میں ان سب کا اتفاق تھا کہ واقعہ طوفان پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال بعد پیش آیا اور اس پر جب اور دو ہزار سال گزر گئے تو حضرت مسیحؑ تولد ہوئے۔ جن لوگوں نے اس مضمون کی اچھی طرح سے چھان بین کی تھی ان کا یہ قول تھا کہ حضرت مسیحؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں ایک شوبس مختلف اقوال موجود ہیں اور ایسی حالت میں کتب مقدسہ کے شمار و اعداد پر پورا بھروسہ کرنا قرین مصاحبت نہیں ہے اس لیے مختلف نسخوں کے اختلافات ظاہر کر رہے ہیں کہ خدا نے خود صحیح نسخہ کی حفاظت نہیں کی نہ کوئی ایسا نشان یا علامت موجود ہے جس سے انسان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں نسخہ صحیح اور غیر محرت ہے۔ وہ نسخہ بھی جنہیں خاص وقت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ایسی ایسی غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں جن کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً نسخہ سبعینیہ میں درج ہے کہ میتھیلا طوفان کے بعد بھی بقید حیات موجود تھا جو ایک صریح غلطی ہے۔

یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا تھا کہ دنیا سے قبل طوفان میں سال تین سو ساٹھ دن کا ہوتا تھا اور دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کرنے کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ لیکن جب اس کے مقابلہ میں قرآن مجید کو دیکھو جس کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ ایک ایک سطر کسی تعریف ترسیم یا تغیر کے بغیر وہی ہے جس کا اتفاق حضور در کائنات پر ہوا تھا اور جس کو دست برد روزگار سے بچانے کا وعدہ خداوند جل و علا نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔ "وَأَنفَاكُمَا فَنُحْيِيكُمَا" مترجم۔

طوفان آیا تو آفتاب کی حرکت میں تغیر واقع ہو گیا اور سال کی مدت بقدر پانچ دن اور چھ گھنٹے کے بڑھ گئی۔ بعض پیشوایان دین کی یہ رائے تھی کہ دنیا کا یہ عظیم الشان واقعہ ۱۶۵۶ء میں واقع ہوا۔
 عالم میں نومبر کی دوسری تاریخ کو پیش آیا۔ ڈاکٹر ولسٹن جن کی وقت نظری اور دقیقہ سنجی کو اس تاریخ میں غلطی محسوس ہوئی۔ ازراہ غایت تدقیق و حکیم فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی اصلی تاریخ ۲ نومبر نہیں بلکہ ۲۸ نومبر ہے۔ بعض بزرگواروں کا یہ خیال تھا کہ طوفان سے پہلے توس قزح دیکھنے میں نہیں آئی تھی بلکہ طوفان کے فہرہ و ہونے کے بعد اول اول بطور ایک آسمانی نشان کے ظاہر کی گئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کشتی نوح سے باہر ہونے کے بعد آدمیوں کو گوشت کھانے کی اجازت ملی۔ اور طوفان سے پہلے انسان نباتات خوار تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ طوفان کی وجہ سے روے زمین پر کوئی نہایان جبرائیل کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی ان معلومات کے بھروسے پر جو انھیں قبل طوفان حاصل تھیں زمین کو اپنے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا یعنی یورپ یافث کو دیا۔ ایشیا سام کو اور افریقہ ہام کو۔ چونکہ انہیں امریکا کے وجود کا علم نہ تھا اس لیے اُس کے ازمیر نو آباد کرنے کی کوئی گنجائش نہ نکالی۔ حضرت نوحؑ کے ان معادمتد فرزندوں نے اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل بسر و چشم کی اور دل میں مطلق یہ ہراس لائے بغیر کہ جن خوفناک ویرانوں میں ہم جا رہے ہیں وہاں ہو کا عالم چھایا ہوا ہے اور طوفان کی وجہ سے جو لہریں پیدا ہو گئی ہیں وہ خشک بھی نہیں ہونے پائیں اپنے اپنے مفوضہ مقبوضات میں نو آبادیان قائم کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

نثر سال میں ایشیائی خاندان کے بال بچوں کی تعداد بڑھ کر کئی سو ہو گئی یہ سب کے سب دشت نوردی دبا دیہ گردی کرتے ہوئے مسو پوٹیا میں جا پھنسنے لگے۔ جہاں انہوں نے کسی مصلحت سے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ ایک مینارہ تعمیر کرنا شروع کیا جس کی مصلحت ظاہر ہے کہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ آئندہ جب طوفان آئے تو کشتی کی مرمت نہ پڑے بلکہ

چوٹی کو وہ آسمان تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یوسیبس رقم طراز ہے کہ اس مینارہ کی تعمیر کا نام چالیس سال تک جاری رہا اس وقت خدا نے رفعتاً اُن کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور وہ محبوباً و ایتارے کا کام چھوڑ کر رونے زمین پر منتشر ہو گئے۔ سینٹ امبروز ارشاد فرماتے ہیں کہ اس اختلاف السنہ کا باعث انسانی طاقت نہ تھی۔ اور آریجن کا قول ہے کہ فرشتے بھی اس اختلاف کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ خود خدا نے اس قوم کی زبانوں کو بدل ڈالا۔

اختلاف السنہ کی بنا پر علماء مذہب نے انسان کی ابتدائی زبان کے متعلق عجیب و غریب تیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔ ایک گروہ ایسے علماء کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ حضرت آدمؑ کی زبان مطلقاً اسما پر مشتمل تھی اور یہ اسما واحد الہی تھے۔ جب اسماے کثیر الہی کی اشاعت و ترویج ہوئی تو زبان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگواروں نے یہ رائے قائم کرتے وقت اُن متعدد مکالمات کو نظر انداز کر دیا جن کا ذکر کتاب پیدائش میں موجود ہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت آدمؑ اور سانپ نے حضرت حواؑ سے جو گفتگو کی اُس کی رواد و تورات میں تمام و کمال مندرج ہے۔ اس گفتگو میں کلمہ کی سبھی اقسام و اصناف پائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ امر متفق علیہ تھا کہ انسان کی ابتدائی زبان عبرانی تھی۔ اور جن اصول پر پادریوں کے علوم و فنون کا احضار تھا اُن کی رو سے یہی مناسب بھی تھا۔

کلیساے یونان کے پادریوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب اختلاف زبان کی وجہ سے اقوام میں تفرقہ پڑا تو بابل کی آبادی بہتر قوموں میں منقسم ہو گئی اور اس اندازہ سے سینٹ اگسٹائن کو بھی اتفاق ہے۔ لیکن عقل سلیم کو اس تخمینہ کے صحیح تسلیم کرنے میں جن دقتوں کا سامنا تھا وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر شگفر نے اپنی

ہفتیم نوٹ صفحہ ۲۵۴۔ یہ لوگ مینارے کی چھت پر جا پناہ لینے۔ مترجم

قابل قدر کتاب میں جو "عالم کی توارخ پاک و نجس کا مقابلہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے
مذکورہ بالا تمام مباحث پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان بہتر اقوام میں سے
ہر ایک کی آبادی مرد و عورت بچے سب ملا کر اکیس بائیس نفوس سے زیادہ کسی حالت میں نہ
ہو سکتی تھی۔

شہور و عوام کے اس تاریخی تخمینہ میں جو انبیاء و اولیاء سے سلف کی عمروں پر مبنی تھا
سب سے زیادہ قابل غور بات ان بزرگوں کی عمروں کی غیر معمولی اور فوق العادت طوالت
تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ طوفان نوح سے پہلے مزاج کائنات میں دائمی اعتدال پایا جاتا
تھا باغ عالم میں ہر وقت بہار جلوہ گر رہتی تھی اور قدرت کے انظاریات و تخیلات مفقود
تھے۔ لیکن طوفان کے بعد پانچ سو سال بعد رعد و برق کے خالی ہو گیا۔ اور مصائب زبور کے زمانہ
میں انسان کی عمر کا اوسط اور بھی گھٹ کر ستر سال تک پہنچ گیا جو آج کے دن تک قائم
ہے۔ چونکہ طوفان کے وقت زمین کا محور اپنی جگہ سے ٹل گیا لہذا موسموں میں سختی پیدا
ہو گئی اور صیغ و شتا در شکل کے اشتداد کو طوفان کے واقعہ ہائے کی اُن ہمہ گیر ملاحون
نے اور زیادہ بڑا دیا جن کی وجہ سے سطح زمین ایک وسیع دلدل بن گئی اور خون میں احتراق
اور اعصاب میں استرخاپید ہو گیا۔

انبیاء سے سلف اور قرون اولیٰ کے شیوخ قبائل کے عمروں کی حیرت انگیز طوالت
سے جو مشکلات استقرار کو پیش آتی تھیں اُن سے بچنے کے لیے بعض علماء و دین نے
تاویل کا یہ پہلو اختیار کیا کہ کتب مقدسہ میں جن سنیں کا ذکر کیا گیا ہے وہ شمسی سال تھے
بلکہ قمری سال تھے اس تاویل نے اُن بزرگوں کی عمر کو اگرچہ آج کل کی مدت حیات
کے برابر کر دیا۔ اور ایک مشکل نفع ہو گئی لیکن ایک دوسری بہت بڑی مشکل یہ آن پڑی
کہ پانچ چھ سال ہی کی عمر میں وہ سن بلوغ کو پہنچ کر صاحب اولاد بھی ہو گئے۔

پیشوایان کلیسا نے مقدس سائنس کو جن معارف و حقائق کا منبع قرار دیا ہے اُن کا

التمنا ذیل کے مہات مسائل کی شکل میں کیا جاسکتا ہے :-

(۱) تاریخ پیدائش یعنی تکوین عالم کو کچھ بہت زیادہ عرصہ پہلین ہوا یعنی ظہور مسیح علیہ السلام سے یہی کوئی چار یا پنج ہزار برس پہلے (۲) عالم کو پیدا کرنے میں چھ معمولی دنوں کی مدت صرف ہوئی۔ (۳) طوفان عالم گیر تھا اور جو حیوانات اسکی تباہی سے بچے وہ ایک کشتی کے ذریعہ سے محفوظ رہے (۴) حضرت آدم پیدائش کے وقت اخلاق اور عقل میں کامل تھے لیکن اس پانہ عقل اخلاق سے انہیں گناہ نے گرا دیا۔ اور ان کی اولاد اوصاف کو ان کی مصیبت و سہو ط میں شریک ہونا پڑا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض مسائل ایسے پیش کیے جاسکتے ہیں جو کلیسا کی فہرست عقائد میں شامل ہیں۔ ان میں سے دو مسائل ایسے تھے جن کی حقیقت پر پیشوایان دین عیسوی کو اصرار کیے بغیر مفر نہ تھا۔ اول یہ کہ آفرینش عالم کو کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گرا۔ مسیحیت کی بقا کے لیے یہ عقیدہ لازمی تھا اس لیے کہ آفرینش کا زمانہ جس قدر بعید ہوگا اسی قدر خدا کے عدل و انصاف کو ثابت کرنے کے لیے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت عاید ہوگی جس نے بنی نوع کے ہر حصہ کثیر کو اس کی قسمت کے حوالہ کر کر نجات کی نعمت صرف انہیں چند نفوس کو بخشی جو ظہور مسیح کے بعد یعنی عالم کے دور آخر میں پیدا ہوئے مسیحیت کا دوسرا رکن اعظم یہ تھا کہ حضرت آدم پیدائش کے وقت انسان کامل تھے یہ عقیدہ سہو ط و مسئلہ نجات کی تائید کے لیے نہایت ہی ضروری تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ علمائے دین عیسوی ہر انس کو شش کی مخالفت پر مجبور تھے جو اس بات کے ثابت کرنے کے لیے عمل میں لائی جائے کہ زمین کی ابتدا ایک ایسے دور و دراز زمانہ میں ہوئی جبکہ بعد بونی کثرت تعین نہیں ہے اور مسلمانوں کے اس قیاس کو وہ کسی طرح نظر استحسان نہ دیکھ سکتے تھے کہ انسان طبقہ سافل کی اشکال حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے یعنی قریباً ہزار سال تک بشیر پرج نشوونما پا کر موجودہ درجہ کو پہنچا ہے۔

عبارت مذکورہ صدر جن مہلات و لثمیات و اضداد سے معمور ہے ان سے اس مقدس

سائنس کی حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ اور عجب نہیں کہ ہمیں بھی وہی راستے ظاہر کرنی پڑے جو بیچارے ڈاکٹر کفرڈ نے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اس علم پاک کے ذائقہ میں شانِ توانی و معقولیت پیدا کرنے کی بے سود کوششوں کے بعد مجبوراً ان الفاظ میں ظاہر کی ہے گلیسا کے پیشوایانِ قرونِ اولیٰ کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نیکو کاری میں شک نہیں لیکن ان کی معلوماتِ تبحر سے عاری تھیں۔ روایاتِ مقدسہ کی رو سے خدا زمین کی ترکیب و تنظیم کی بلا واسطہ خلقت ہے۔ روایاتِ مذکورہ کو آفرینشِ عالم میں عللِ ثانیہ کی داخلیت سے انکار ہے۔

علمِ ترکیبِ کائنات کا زمانہ کیسے مہینے کے اس دورِ مہینی اکتشاف سے شروع ہوتا ہے کہ سیارہ منجری کرہ نہیں ہے بلکہ ایک سطحِ القطبین جرمِ بنیوی ہے۔ علمِ الحركات والجمیل نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کی شکل ایک مادہ قابلِ الجیل کی گردش کا لازمی نتیجہ ہے اور گردش جس قدر زیادہ تیز ہوگی اسی قدر جرمِ دوار کے قطبین زیادہ سطح ہوں گے بالفاظِ دیگر اُس کے استوائی حصے باہر کو زیادہ نکلے ہوئے ہوں گے۔

علمِ الحركات ہی کے اصول کی بنا پر نیوٹن نے حکم لگایا تھا کہ کسی قدر تریم کے ساتھ زمین کی بھی اسی طرح کی شکل ہونی چاہیے۔ منطقہ استوائیہ کا اندازِ اندلاع یعنی چمک کر باہر کو نکلا ہوا ہونا استقبالِ اعتدالین کا باعث ہے جس کے دور کی تکمیل پچیس ہزار آٹھ سو اڑسٹھ سال میں ہوتی ہے اور اسی اندلاع سے محورِ زمین کا اتہزاز پیدا ہوتا ہے جسے بریڈلی نے دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک مقام پر ہم لکھ چکے ہیں کہ زمین کا قطر استوائی قطر قطبی سے بقدر چھبیس میل کے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر کفرڈ کے اس خیال کو خان بہادر مولانا اکبر حسین صاحب الد آبادی نے ازراہ سسٹمِ ظرفی ذرا زیادہ تقسیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے:-

یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں
مترجم

کچھ شک نہیں کہ حضرت داغظین خوش شخص

زمین کی تسطیح قطبین سے دو واقعات منکشف ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ زمانہ سابق میں جاہل دلتین یعنی بصورت خمیر رہ چکی ہے۔ دوم یہ کہ وہ حرکت کے سلسلے میں ڈھلی ہے اور اس لحاظ سے گویا اسکی ترکیب میں کسی علت ثانیہ نے حصہ دیا ہے۔

تو انین حرکات و حیل کا یہ اثر کرہ زمین کی ترکیب خارجی و ظاہری ہی میں نمایان نہیں ہے یعنی اس اثر نے اُس کے قطبین کی تسطیح اُس کی بیضویت اور اُسکی حرکت دوری ہی میں حصہ نہیں لیا بلکہ اگر اُن اجزاء کا معائنہ کیا جائے گا جن سے زمین مرکب ہے تو یہی اثر اُن میں بھی نظر آئے گا۔

اگر ہم اجزاء آبی کے طبقہ کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ اُس کا دل کئی میل کا ہے لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان چٹانوں کے التمام و انطباق کا عمل بہت آہستہ آہستہ ہوا ہے جس مادہ سے یہ چٹانیں مرکب ہیں وہ قرنہا قرن پہلے کے اجزاء سے ارضی کی تحلیل و تشعیت سے حاصل ہوا ہے جنہیں نالون اور ندیوں کے بہاؤ نے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے از سر نو تہ بہ تہ جمادیا۔ اس قسم کا عمل تحلیل و انطباق ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن تھاکہ قشک دست اسے مدید متفقین نہ ہو جائیں کوئی نمایان اثر اس سے مترتب نہیں ہو سکتا۔ پانی کی روانی کے عمل سے مٹی کے اجزاء تحلیل شدہ کی جوتہ کسی دریا کے دہانہ پر جم جاتی ہے اُس کی موٹائی ایک صدی میں چند انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پس اسی قسم کی جس تہ کی موٹائی کئی ہزار گز ہو اُسکے انطباق میں کس قدر زمانہ صرف ہوا ہوگا؟

مصر کے ساحل کی ہیئت ترکیب کا علم انسان کو دو ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے ہے۔ اس زمانہ میں اُن اجزاء سے ارضی کے جھین دریا سے نیل کی موجیں اپنے ساتھ بہا لاتی رہی ہیں اس ساحل میں ابک نمایان اضا فہ کر کے بحر روم کو کچھ دور پیچھے ہٹا دیا ہے لیکن مصر کا تمام شمالی حصہ اسی طرح سمندر کو پاٹ پاٹ کر بنا ہے۔ دریا سے سیسپی کے دہانے کے

قریب خلیج کمبیکو کا ساحل تین سو سال سے ماہرین فن طبقات الارض کے پیش نظر ہے لیکن مدت میں خط ساحل نے کوئی نمایاں پیش قدمی نہیں کی حالانکہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ اس دریا کا وہاں سینٹ لویس کے قریب موجودہ مقام سے سات سو میل کے فاصلہ پر تھا۔ مصر و امریکا ہی پر کچھ موقوف نہیں۔ تمام ممالک میں دریا کچھ نہ کچھ خشکی کو ترسیل میں بڑھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان کی آہستگی عمل اور اس عمل کے عظیم نشان انداز سے ہم وفاق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس عمل تراکم اجرات و انطباق طبقات کے لیے اودار مدیدہ و قرون البیدہ کا انقضا لازمی ہے۔

یہی نتیجہ ہیکو اُس وقت بھی نکالنا پڑتا ہے جب ہم حبیلون کے پائے جلنے پانی کے قطران سے اجزائے کلسیہ یعنی چوڑے اور کھار کے استخراج ہونے۔ بارش کے عمل سے کہ سارون کے حل ہو کر بہنے۔ سمندرون کی موجوں کے تحسیر طون سے ساحل کے کٹنے سنگلاخ ٹیکرون کی بنیادوں میں پانی کے سرنگ لگانے اور باد و باران کے اثر سے چٹانوں کے فرسودہ ہونے پر غور کرتے ہیں۔

تراکم اجرات سے اجدادی کے جوہر تیلے اور جوہر گنے ان کے انطباق کی سطح ضرور ہے کہ ابتدا میں تقریباً افقی السمیت ہو۔ لیکن کثیر التعداد طبقات یا تو کسی ایسے بطن شدید کی وجہ سے جس کا ظہور باوقات مختلف ہوا اور یا تدریجی حرکت کے باعث زیادہ مختلف اعلیٰ و سفلی بناتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان عظیم نشان احوال و اجابت و انحرافات کی اصلی وجہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ ان طبقات کے ترکیب پذیر ہونے کے لئے اس قدر مدت مدید کا گزرنہ لازمی ہے۔ جس کے ادراک سے فہم قاصر ہے۔

ویکر کے ان طبقات ارضی کا علق جن سے پتھر کا کوئلہ برآمد ہوتا ہے بتدریج تغیر میں آتا غرق ہوتے ہوئے بارہ ہزار فٹ ہو گیا ہے اور نوا سکویشیا میں ان طبقات کا دل چودہ ہزار پانچ سو ستر فٹ ہے۔ دہنسنے کا یہ عمل اس آہستگی اور موافقت سے ہوا کہ ہر طبقہ کے درخت

تے اوپر جون کے تون کھڑے ہوئے ہیں۔ اور چار ہزار پانچ سو پندرہ فٹ کی موٹائی میں سترہ طبقے اس قسم کے گنے جاسکتے ہیں۔ درختوں کی عمر کا اندازہ اُن کی جسامت سے ہو سکتا ہے چنانچہ بعض کے تنہ کا قطر چار فٹ ہے۔ دہشتی چوٹی زمین کے ساتھ ساتھ جب درخت بھی آہستہ آہستہ زمین میں جلتے گئے تو اُن کے گردہ پودے اُگتے گئے جنہیں اصطلاح فن طبقات الارض میں "کیلیمائٹ" (ذنب الفرس) کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پودے غرق شدہ درختوں کی طرح درجہ بدرجہ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ سڈنی کے طبقہ زخاں میں اسٹمب دے ہوئے جنگل تے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔

بحری گہوگنوں کی سیپیون کوبرا غطون کے اندرونی حصہ کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیکھ کر علماء مذہب اپنی تصانیف میں یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ان سیپیون سے طوفان نوح کی بہ گیری کی محبت قاطع ہیم پہنچتی ہے۔ لیکن جب علم طبقات الارض کے مسائل صحت کے ساتھ معلوم ہونے لگے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ زمین کے خول بیرونی میں وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں اُن طبقات کے ساتھ جنہیں آب شور نے بنایا ہے علی التوالی والتسلسل کسی کتاب کے اوراق کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی طوفان ان مختلف مظاہر کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی قطعہ زمین اپنی سطح کے تدریجی تغیرات اور اپنے جغرافیائی حوالی کی تبدیلیوں سے کبھی تو بالکل خشک تھا کبھی آب شیریں کے نلے ڈوب گیا اور کبھی آب شور کے نیچے آگیا اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ ان تغیرات و انقلابات کی تکمیل کے لیے ہزاروں لاکھوں سال کی مدت مطلوب ہے۔

قدامت ارض کی اس شہادت پر جو اس کے طبقات کی سمت۔ عمق اور تنوع سے

ماخوذ تھی اُن زبردست شہادتوں کا اضافہ ہو گیا جو اس کے آثار متجربہ پر مبنی تھیں زمین کے ہر طبقہ کی عمر جب متحقق ہو گئی تو اس بات کا ثبوت دینا آسان ہو گیا کہ نباتی و حیوانی ہر

طرح کے اجسام ذوی الاعضا لے قدیم ترین اشکال سے لے کر جدید ترین اشکال تک بتدریج ترقی کی ہے اور وہ نباتات و حیوانات جو ہمارے زمانہ میں سطح زمین کی آبادی کا باعث ہیں ان کثیر التعداد اشکال نباتی و حیوانی کا محض ایک جزو حقیر ہیں جو یہ زمانہ سابق عالم ہستی میں آچکی ہیں۔ یعنی اگر ایک نوع اس وقت زندہ ہے تو ہزار ہا انواع فنا ہو چکی ہیں۔ اگرچہ طبقات ارض سے متحجرات کے جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں سے حیوانات کی بعض انواع اپنی خصوصیات مخصوصہ کے لحاظ سے اس درجہ نمایاں ہیں کہ ہماری زبان پر دور حیوانات مفصلیہ (بے برہہ کی ہڈی کے جاندار) دور ہوام الارض (زمین پر رہنے والے وہ جاندار جو برہہ کی ہڈی رکھتے ہیں) دور ذوات الثدی (دودھ پلانے والے جاندار) کی اصطلاحیں چرلہ گئی ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہر نئی نوع ایک بیک نمودار ہو گئی تھی۔ ہر نوع کا ظہور بتدریج دور سابق میں ہوا اور اپنے دور میں جو اس کے نام سے منسوب و مخصوص ہے منہا ہے نشوونما پر پہنچ کر وہ بتدریج دور آئندہ میں معدوم ہو گئی۔ فوری پیدائش یعنی کسی شے کا ایک بیک کامل و مکمل صورت میں نمودار ہو جانا خارج از امکان ہے۔ ہر وجود کمال آہستگی سے اپنا چولابدلت ہے اور ایک سابقہ شکل سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک بہت بڑے طویل و مدید زمانہ کا انقضا لازمی ہے۔ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے یعنی جس زمانہ سے تاریخ کی روشنی انسان کے تمدن پر پڑی ہے۔ اس قسم کے انبدال یا استحالہ یا نشوونما کی کوئی بین مثال ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ علیٰ ہذا القیاس انعدام نوع کی کوئی تاریخی مثال دیکھ کر ہمارے بھی ہم کچھ بہت زیادہ و فوق ظاہر نہیں کر سکتے لیکن ان قرون و ادوار میں جنہیں حقایق طبقات الارض سے تعلق ہے وہ ہزار ہا کون و فساد اور ارتقا و انعدام پیش آچکے ہیں۔

چونکہ انسان کا تجربہ تبدیل بنیت یا ارتقا کی کسی مثال پر حاوی نہیں ہے لہذا بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس قسم کا تبدل یا ترقی خارج از امکان ہے۔ اور

حیوانات و نباتات کی مختلف نوعیں علیحدہ علیحدہ پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن ان اصحاب کو یہ تو سوچنا چاہیے کہ ہر نوع کا ایک نوع سابقہ سے بہ تبدیل و ترمیم اعضا ترقی پا کر درجہ کمال پر غائر ہونا اس کے مقابلہ میں زیادہ قریں دانش ہے کہ وہ نوع یک بیک عدم سے وجود میں آجائے۔ یہ قول بھی کچھ بہت زیادہ وقت نہیں رکھتا کہ کسی انسان نے کسی نوع کے کسی فرد کو ارتقا کا چولہا بدلتے ہوئے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا شاید وہ لوگ جن سے اس ادعا کا نسبت ہے اس امر کی طرف سے خالی اندھ ہیں کہ آج تک کسی شخص نے اپنی آنکھ سے یہ بھی نہ نہیں دیکھا کہ کوئی جسم ذوی الاعضاء بغیر کسی صورت کے خود بخود اور یک بیک پیدا ہو گیا ہو۔

آفرینش کے اُن افعال سے جو بغیر مادی مواد ہوں اور جن میں متغائر لقانون ہونے کے علاوہ کوئی ربط نہ پایا جاتا ہو۔ گو قدرت ایزدی ظاہر ہوتی ہو لیکن اجسام ذوی الاعضاء کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو طبقات قدیمہ تکثانیہ کے متحجرات سے لے کر طبقات جدیدہ نو تانیہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا ہر ایک حلقہ ایک حلقہ سابق سے معلق اور ایک حلقہ ابید کا سہارا ہے اس بات کا ثبوت اسے رہا ہے کہ جاندار ہستیوں کا وجود میں آنا ایک مقدر ضابطہ کے تابع ہے اور یہ وہ ضابطہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قانون ہزاروں لاکھوں سال سے اپنا عمل کر رہا ہے۔ لیکن آج تک اس میں کوئی تغیر اور کوئی رکاوٹ نہیں واقع ہوئی۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے اُس شہادت کے ایک حصہ کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے جس سے مسئلہ عمر و زمین پر بحث کرنے وقت ہمیں سابقہ پڑنا ضرور ہے۔ علمائے فن طبقات الارض لے حقیقت یہ ہے کہ خدا کی صفت و حکمت کا جو ثبوت اس ضابطہ بغیر ممکن التعمیر سے ملتا ہے وہ کسی ایسے فعل سے ہرگز نہیں بہم پہنچ سکتا جس میں لون آمیز جبروت کی شان پائی جاتی ہو۔ دنیا کے ترقی یافتہ مسک دینی اسلام نے اسی خیال کو بار بار ان الفاظ میں ظاہر کر کے حقیقت قدرت ایزدی کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے۔ لا تبدل للخلق اللہ۔ لن تجد لسنة اللہ تبدلًا۔

کی مستقل و مسلسل کوششوں نے اس شہادت کا اتنا بڑا انبار جمع کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں مطلوب ہیں۔ یہ شہادت اُن تمام احجار کے اجزائے ترکیبی و ہئیت کدائی کا حاصل ہے جن میں سے بعض تو آبی ہیں یعنی پانی کے عمل سے بنے ہیں۔ بعض آتشی ہیں یعنی جوت زمین کے کھولے ہوئے خارج شدہ مادے سے مرکب ہیں اور بعض سخیلہ یعنی حرارت اور دباؤ کے متفقہ عمل سے ترکیب پذیر ہوئے ہیں۔ طبقات احجار آبی کے متعلق یہ تحقیقات کی گئی ہے کہ اس کی موٹائی کس قدر ہے۔ اسکے مختلف پرتوں کا میلان کس سمت میں ہے۔ ہر ایک پرت دوسرے پرت پر بے ڈھنگے پن سے کس شکل میں قائم ہے۔ وہ طبقات جو آب شیریں کے عمل سے بنے ہیں اُن طبقات کے ساتھ جن میں آب شور کا اثر پایا جاتا ہے کس طرح ملے ہوئے ہیں۔ تقریباً و تحلیل کے بطور الہل اسباب نے مادہ ارضی کے کوہ پیکر انباروں کو کیوں کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے وسیع و عریض جغرافیائی رقبوں کی شکل تبدیل کر دی ہے۔ براعظموں کی سطوح میں ابھرنے اور دہننے کی وجہ سے کس طریقہ پر نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے یعنی اُن کے سواحل کو نکریا تو سمندر میں غرق ہو گئے ہیں اور یا خشکی میں بہت دور اندر تک چلے گئے ہیں۔ حیوانات و نباتات کے حال سے بھی علم طبقات الارض کی شہادتوں کو بحث ہے یعنی اس مسئلہ پر نظر ڈالی گئی ہے کہ ہر دور میں کون کون سی حیوانی اور نباتی شکلیں موجود تھیں اور کیونکر نہایت ترتیب و تسلسل کے ساتھ اجسام ذوی الانصاف یعنی نباتات و حیوانات کا سلسلہ عالم ابداع کے سہم و موہوم نقطہ آغاز سے ہمہ کے زمانہ تک پہنچا ہے۔ حشیش متحجر سے جس کی اصل بر صورت میں نباتات ذابل ہے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف زمین کے کرہ جو ابھی میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں بلکہ موسم میں بھی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ بعض دوسرے واقعات متعلقہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ روئے زمین کی حرارت میں بھی مدد جز ہوتا رہا ہے۔ یعنی بعض زمانوں میں حرارت کا اوسط بہت بڑھ گیا ہے اور

بعض مین قطبین کی برف و یخ کے تودے موجودہ براعظموں کے ایک بہت بڑے حصہ پر چھا گئے ہیں۔ چنانچہ ان ادوار کو ازمنہ زمہر پر یہ کہتے ہیں۔

ماہرین فن طبقات الارض کا ایک گروہ جس کی دلائل کا مدار علیہ نہایت زبردست شہادت ہے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ کل جہم ارض انہ امین ایک جسم گداختہ یا سیال تھا بلکہ شاید فطر حرارت سے بحالت دھان تھا۔ لاکھوں ذرفوں کے گزرنے کے بعد تبخیر کے ذریعہ سے اس کی حرارت کا استمداد کم ہوتا گیا تا آنکہ اس کے مزاج میں موجودہ اعتدال پیدا ہوا۔ علم ہیئت کے مشاہدات مخصوصاً نظام شمسی کے اجرام سیار کے حالات اس تاویل کی تائید و توثیق کرتے ہیں بعض دوسرے واقعات سے بھی اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مثلاً اوسط کثافت ارض کی کمی۔ زیادتی عمق قعر زمین کی نسبت سے حرارت کا ازدیاد کیسے ہوسکے مادہ کا آتش افشان پہاڑوں اور دراڑوں کی راہ سے اخراج۔ احجار آتشی و مستحیلہ کا وجود۔ ان طبعی تغیرات کی تکمیل کے لیے جو علمائے طبقات الارض کی اس جماعت کے پیش نظر ہیں بے انتہا صدیان مطلوب ہیں۔

لیکن نظام کو پرنیکس کے حقیاق کا اعتراف اس ضرورت کا مستلزم ہے کہ زمین کی ابتدا و سرگزشت کے واقعہ پر انفرادی حیثیت سے نظر نہ ڈالی جائے۔ ضرور ہے کہ اس وقیم پر بحث کرتے وقت اُس نظام یا خاندان کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے جس کا کرہ زمین ایک رکن ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی بحث کو نظام شمسی تک بھی محدود نہیں کر سکتے اس بحث میں ہمیں ثوابت کی دنیاؤں کو بھی شریک کرنا چاہیے۔ اور چونکہ اُس بہتر از قیاس فاصلہ کی غرابت سے ہمارا دلغاب مانوس ہو چکا ہے جو ان ثوابت کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے لہذا ہم انکی تکوین کے زمانہ میں بھی بعد کہ اُس عنصر کے اعتراف کے لیے آمادہ ہیں جس کی پیمائش محالات سے ہے۔ کائنات میں ایسے ایسے کو اکب بھی موجود ہیں جو ہم سے اس قدر دور ہیں کہ باوجودیکہ روشنی اس تیزی سے حرکت کرتی ہے پھر

بھی اُن کی شعاع نور کو ہم تک پہنچتا تو میں کئی ہزار سال کا زمانہ صرف ہوا ہے جس سے یہ بھی
نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کو وجود میں آئے ہوئے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کئی ہزار سال کی مدت
توضیح در منقضى ہوئی ہوگی۔

علمائے طبقات الارض جب بالاتفاق تسلیم کر چکے کہ تاریخ تکوین ارض بہت زیادہ وسیع
کی محتاج ہے تو یہ کوششیں ہونے لگیں کہ اس تاریخ کو معین کیا جائے۔ ان کوششوں
میں سے بعض اصول ہیئت پر مبنی تھیں اور بعض اصول طبیعیات پر۔ مثلاً سب سے آخری
دور زمہریہ سے اس وقت تک کی مدت کے دریافت کرنے کی غرض سے جو تخمینہ مرکز الارض
ارض و مرکز آفتاب کے درمیانی فاصلہ کی معلومہ تبدیلی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اُس کا حاصل
دو لاکھ چالیس ہزار سال ہے۔ اگرچہ اس عام اصول کے صحیح ہو۔ مگر میں شک نہیں کہ
ازمنہ طبقات الارض کی مدت عمیر الاحصاء ہے لیکن اس قسم کے تخمینے ایسے غیر یقینی قیاسات
پر مبنی ہیں کہ وہ کسی طرح موثق و معتبر نہیں ٹھہر سکتے۔

تاہم اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر علمی پہلو سے نظر ڈالنے کے بعد اس میں تو مطلق
شک نہیں رہتا کہ علمائے مذہب نے صحیفہ موسیٰ سے جن واقعات کا استقصا کیا ہے وہ
مقابل تسلیم ہیں۔ اگرچہ اکتشافات جدیدہ و واقعات متفقہ کے ساتھ واقعات الہامی کو یقیناً
دینے کی متواتر کوشش کی گئی ہے لیکن وہ لا حاصل ثابت ہوئی ہے۔ نورات کا زمانہ
حد سے زیادہ قلیل ہے۔ ترتیب ظہور مخلوقات بالکل خلاف واقعہ ہے اور خدا کی طرف سے
جو مداخلت ہوئی ہے اُس میں شان انسانی معمول سے زیادہ اپنی جھلک دکھا رہی ہے
اور اگرچہ مسائل زیر بحث اُن خیالات سے توافق و تطابق رکھتے ہیں جو انسان کے دماغ
میں اُس وقت پیدا ہوئے تھے جب اُس کو اول اول صحیفہ فطرت کی ورق گردانی سے اپنی
معلومات میں اضافہ کرنے کا شوق پیدا ہوا لیکن اُن کو زمین کی پہچ میری اور کائنات
کی عظمت و شان کے موجودہ تصورات سے مطلق ربط نہیں۔

حال کے طبقات الارضی اکتشافات میں سے ایک اکتشاف خصوصیت کے ساتھ ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ یعنی اُن طبقات میں جن کو اگرچہ طبقات الارضی اعتبار سے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری لیکن تاریخی اعتبار سے ایک عرصہ دراز منقضي ہو چکا ہے۔ انسانی جسم کے ڈھانچ اور انسانی صنعت کے آثار پائے گئے ہیں۔

انسان کے آثار متحجر یعنی اُس کے جسم کے ڈھانچ اور کھردرے یا ترشے ہوئے محاجر پتھر اور ٹیلے ناس دکائی دے کر اوزار پیرپ میں غاروں میں تو سنگریزوں کے تودوں اور حشیش متحجر کے طبقوں میں پائے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اُس زمانہ میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اور جنگل کے جانوروں اور مچھلیوں کے شکار سمیت قوت بسر کرتا تھا۔ جو تحقیقات حال میں کی گئی ہیں اُس سے اس واقعہ کی صریح شہادت ہم پہنچتی ہے کہ انسان دورِ نالٹہ میں بھی موجود تھا۔ اور جنوبی ہاتھی پستلی تھوٹنی والے گینڈے اور عظیم الجثہ دریائی گھوڑے کا عصر تھا۔ بلکہ شاید دورِ نالٹہ الوسطی کے مشہور داروہوں میں تھن رکھنے والے فیل نما حیوان ”مسودان“ کا بھی معاشرہ تھا۔ اور یہ وہ حیوان ہیں جن کی نسلیں معدوم ہو چکی ہیں۔

دورِ نالٹہ کے اختتام پر بوجہ اُن اسباب کے جو ابھی تک متحقق نہیں ہوئے زمین کو نصف کرہ شمالی کی حرارت میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی۔ یعنی منطقہ حارہ سے وہ منطقہ بارہ ہو گیا اور تابستان کی جگہ برفستان نے لے لی۔ ایک مدتِ مُتد کے بعد حرارت پھر بڑھ گئی اور برف کے وہ پہاڑ جو سطح زمین پر دور دور چھا گئے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد پھر حرارت میں کمی ہو گئی اور تودہ ہا سے برف آگے بڑھ آئی۔ لیکن اس مرتبہ اُنہوں نے زیادہ پیش قدمی نہ کی۔ اب دورِ رابعہ کا آغاز ہوا اور موسم بتدریج بدلتا ہوا موجودہ حالت پر پہنچ گیا۔ تراکم اجزات کے عمل کو جو پانی کی مدد سے برابر جاتا تھا طبقاتِ آبی کے انطباق کے لیے ہزار ہا صدیوں کی ضرورت تھی قرونِ رابعہ کے ادایل میں خرس کہنی۔ آسہ کہنی۔

قرس البحر ذو عنصرین۔ گرگدن مشبک المناخر اور فیل شعرانی (میسٹھ) کی نسلیں زندہ تھیں۔ ان کو ہیکل ہاتھیوں کے کثیر التعداد غول جگلوں میں آباد تھے۔ اور ان کے پیچھے کو لیے نصف کرہ شمالی کا موسم نہایت موزون تھا۔ رفتہ رفتہ برقانی بارہ سینگوں گھوڑوں میلون اور ارٹے بھینسوں کی نسلیں ترقی کر گئیں۔ اور قدرت کو جس کا دسترخوان پہلے صرف ایک اکیلے فیل شعرانی کے لیے وقف تھا اب اتنے بہت سے مہانوں کی تواضع کرنی پڑی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ روز افزون حرارت کے باعث فیل شعرانی معدوم ہو گیا۔ وسط یورپ سے برقانی بارہ سینگا رخصت ہو کر اقطاع شمالی کی طرف جہاں زیادہ سردی تھی چلا گیا۔ اُسکا نقل مکان قرونِ رابع کے خاتمہ کی علامت ہے۔

پس رو سے زمین پر انسان کے ظاہر ہونے کی تاریخ سے لے کر اب تک بہت سے قرن گزرے ہیں جن کی میعاد بیرون از قیاس اور برتر از احصا ہے۔ ان قرونِ مستندہ میں انسانی آب دہوا اور تغیرات انواع حیوانات اُن بطنی الاثر اسباب سے ہوئی ہے جو آج کے دن بھی اپنا عمل برابر کر رہے ہیں۔ شمار و اعداد سے ہم ان مدت ہائے دراز و ازمنہ بعیدہ کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ امر بایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کی ایک نسل جو قوم باسک سے مشابہت

لے اسپین کا وہ وسیع علاقہ جو کوہستان پریمیز کے جنوب و مغرب میں واقع ہے صوبہ باسک کہلاتا ہے جس کا رقبہ تین ہزار مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہوگی۔ اس صوبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک قدیم نسل کے لوگ جو باسک کے نام سے موسوم ہے آباد ہیں۔ ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ اسپین میں قوم کھٹ کے آکر آباد ہونے سے قبل پورے جزیرہ نما میں ایک قوم بستی تھی جس کا نام آئیری تھا جنانچہ اسپین کو آئیریہ اسی لیے کہتے ہیں باسک انہیں آئیریوں کی نسل سے ہیں۔ اس نسل کا تعلق اقوام کے اُس خاندانہ سے تھا جو آریہ اقوام کے ظہور سے پہلے یورپ میں آباد تھیں۔ باسک قوم کی زبان جو آریہ زبانوں کی عنصر کی آمیزش سے باطل پاک ہے غالباً تورانی الاصل ہے۔ تمدن جدید کا اثر اس قوم پر کچھ کچھ اب پڑنے لگا ہے۔ درجہ

رکھتی ہے زمانہ حجرہ جدید میں رو سے زمین پر آباد تھی۔ اس زمانہ میں جزائر برطانیہ کی سطح اسی طرح زیر انقلاب تھی جس طرح فی زمانہ جزیرہ نما اسکندینیویا متغیر ہو رہا ہے۔ اسکاٹلینڈ ابھر رہا تھا اور انگلستان دھنس رہا تھا۔ طبقہ ثانیہ الثالثہ جدید کے زمانہ میں وسطیورپ شکار یون اور ماہی گیروں کی ایک وحشی نسل سے آباد تھا جو اسکیما نسل سے ملتی جلتی ہے۔

نوٹ صفحہ ۲۴۱۔ پچاس سال اُدھر تک ان کی زندگی نیم وحشیانہ تھی۔ مترجم لے اسکیمائس وحشی نسل کا نام ہے جو شمالی امریکہ کے منطقہ بارہ مین گرین لینڈ اور لبریا کے ساحلوں اور دوسرے برشتائی علاقوں میں آباد ہے۔ اگرچہ اس ساحلی علاقہ کا طول پانچ ہزار میل سے کم نہ ہوگا۔ لیکن اس کی کیا دی اپنی شکل صورت۔ عادات و اطوار۔ رسم و رواج۔ بول چال اور روایات و خیالات کے اعتبار سے آپس میں بہت کچھ مشابہ ہے اور دنیا میں دوسری کوئی قوم نہ ہوگی جس کا خون اس درجہ خالص اور بلا آمیزش ہو اور جس کی قومی خصوصیات میں بیرونی اثرات نے اتنا کم تغیر پیدا کیا ہو۔ یہ لوگ ہزار ہا سال سے ایک ہی طرح رہتے بہتے چلے آئے ہیں۔

ان کی زندگی کا دار و مدار دریائی بچھڑوں اور دوسرے دودھ پلانے والے بھری جانوروں اور مچھلیوں پر ہے۔ ان جانوروں کی چربی ان کی عام غذا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سردی کی سختی ٹھیل سکتے ہیں۔ اور ان کا لباس بھی انہیں جانوروں کے چمڑے کا ہوتا ہے۔ دریائی بچھڑوں اور مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کے خندار میں انہیں ایسی مہارت ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لباس اور غذا کے علاوہ وہ اپنی زندگی کی باقی تمام ضرورتوں کو بھی انہیں جانوروں کے ذریعہ سے پورا کرتے ہیں ان کی ہڈیوں سے شکار کے لیے ہتھیار بناتے ہیں۔ ان کی سنوں سے تاگے اور ڈوری کا کام لیتے ہیں۔ ان کی بے پہیتے کی رت پر چلنے والی گاڑیاں بھی جن کے آگے کتے جوتے جاتے ہیں ہڈیوں ہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ دس دس بارہ کنیوں کے جرگے ایک جگہ آباد ہوتے ہیں۔ جاڑوں کے موسم میں جہاں یہ جرگے رہتے ہیں وہی ان کا اصلی گھر ہے۔ کیونکہ گرمی کے موسم میں وہ خانہ بدوش بن جاتے ہیں اور ادھر ادھر چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اس زمانہ میں علاوہ دریائی بچھڑے مچھلی وغیرہ کے شکار کے

ریت مٹی اور خس و خاشاک کے اُن انباروں میں جو اسکا ٹمپند کو دور ز مہر پر یہ جدید سے
 ترک زمین پہنچ رہی ہیں انسان اور ہستی کے نتجرات پاسے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کا ذکر
 بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷۲۔ وہ بر فانی بار سینکے کا بھی شکا کر کے ہیں اور خود ہی بہت تجارت بھی کرتے ہیں جو تباد
 انجاس کے اصول پر چینی ہوتی ہے۔ جاڑے کی آمد کے ساتھ وہ اپنے قشلاق کو لوٹ جاتے ہیں۔
 اگرچہ گوشت وہ کچا بھی کھاتے ہیں لیکن عام دستور یہ ہے کہ گوشت ایک پتھر کی ہنڈیا میں جو ایک چراغ کو
 اوپر لٹکا دی جاتی ہے ابل لیا جاتا ہے اس چراغ میں تیل دریا کی بکھڑوں اور دہل مچلیوں کی چربی کا ہوتا ہے
 اور جی کائی کی ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم وہ زمیں میں بسر کرتے ہیں جو کھادوں کو کسی کرتیا رکھ لے جاتے ہیں
 اور ہارڈ ویں گھردن کے اندر رہتے ہیں جن کی راحت حالات ستائی کا پتہ دیتی ہے یعنی بالو پتھر اور گھاس
 پھوس کے ہوتے ہیں یا پتھر اور ڈیون باہر کر آئی ہوئی لکڑیوں کے یا سچ کی اینٹوں کے جوتے اوپر اس
 ترکیب سے بن دی جاتی ہیں کہ ایک گنبد نما جھونپڑا بن جاتا ہے۔ اسکا نوم کا مذہب بت پرستی کی ایک شکل ہے۔
 وہ ایک بہت بڑی ہستی عالیہ پر ایمان رکھتے ہیں جس کا نام اُن کی زبان میں فورندک ہے اس کے علاوہ وہ کسی
 محافظ دیوتاؤں کے قبال ہیں جن کا نام اسکیائی اصطلاح میں تورات ہے اُن کے اس سلسلہ ابادت میں
 تیسرا درجہ بعض انسانوں کو حاصل ہے جو انکا کوٹ کہلاتے ہیں اور فوق القدر عقل و قوت سے۔ نصف ہیں
 اُن کا عالم عقلی پر بھی ایمان ہے یہ عالم اُن کے عقیدہ کی رو سے دو طبقوں میں منقسم ہے۔ فوقانی و تحتانی
 طبقہ فوقانی گنہگار اور بدقسمت روحوں کا ٹھکانا ہے جو ہمیشہ سردی سے ٹھٹھرتی رہتی ہیں اور بھین کھانے کو کچھ
 نہیں ملتا۔ طبقہ تحتانی کا موسم گرم ہے اور اُس میں غذا با فرط میسر آتی ہے۔ یہ طبقہ خوش نصیب روحوں کا مکان
 ہے۔ ساکیماتو ضعیف خوش اخلاق لمن سار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اور اُن کی خاندانی زندگی نہایت اچھی طرح سے
 بسر ہوتی ہے۔ مساوات جہاد کا اصول عام طور سے اُن میں رائج ہے اور ایک جگہ جو مساش پیدا کرتا ہے اس میں
 سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ موجود تمدن نے اُن کے حال پر اتنی غنایت کی ہے کہ شراب اور دوسرے
 خواہش کی معر فی اُن سے نہیں کرائی اور یہی وجہ ہے کہ اب تک یہ قوم بہ طور قایم ہے در نہ امریکہ اور آسٹریلیا
 کی قدیم نسلوں کی طرح ان کا بھی کبھی کا صفایا ہو گیا ہوتا۔ منہرجم۔

ہم ادھر کر آئے ہیں یعنی جب یورپ کا بہت بڑا حصہ برسا کے اُن تودہ ہائے عظیم سے ڈھک گیا تھا جو قطب شمالی سے کھسکتے ہوئے جنوبی ممالک کی طرف بڑھ آئے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اُتر کر میدانوں میں چھا گئے تھے۔ حیوانات کی بے شمار انواع برت اور بچ کے اس طوفان میں تباہ ہو گئیں لیکن انسان بچ رہا۔

قدیم وحشیانہ حالت میں جب کہ انسان پھل پھلا رہی جنگل کی جڑی بوٹیوں اور گھوم گھوم پر زندگی بسر کرتا تھا اُسے ایک بات ایسی معلوم تھی جس کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اُس کا متمدن و مہذب ہو جانا لازمی تھا یعنی اُسے آگ جلانی آتی تھی۔ سطح زمین کے بالائی پرت کے اُن مقامات میں جہاں کھودنے پر حشیش متحجر کا لیدہن نکلتا ہے ابھی تک انسان کے آثار پائے جاتے ہیں اور اُس کے اوزاروں سے اُس کا تاریخی زمانہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ سطح زمین سے تھوڑی دور پر کالسی کے اس سے کچھ نیچے بڑی یاسینگ کے اس سے بھی نیچے ترشے ہوئے مجلاتحجر کے اور سب نیچے کھر دوسے ان گھڑتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں۔ جن طبقات میں سے یہ اوزار برآمد ہوئے ہیں اُن میں سے بعض کا زمانہ کسی طرح چالیں پچاس ہزار سال سے کم نہیں ہے۔

فرانس اور دوسرے ممالک میں ماہرین فن طبقات الارض نے جن غاروں کا معائنہ کیا ہے اُن میں سے ازمہ حجریہ کے اوزار مثلاً کھپا ڈیان - چھریان - برجھون اور تیرون کے پھل - رانپیان اور ہٹوڑے برآمد ہوئے ہیں۔ ان گھڑتھر کے زمانہ یعنی عہد حجریہ قدیم کا تبدیل ہو کر ترشے ہوئے پتھر کے زمانہ یعنی عہد حجریہ جدید میں ضم ہو جانا بہت ہی آہستگی کے ساتھ عمل میں آیا۔ یہ تبدیلی کتے کے پالے جانے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوئی گویا یہ وہ دور تھا جب انسان نے خدادادی زندگی شروع کی یہ دور بھی ہزاروں ہی صدیوں تک رہا۔ تیرون کے پھلوں سے اس امر کی شہادت ہم پہنچتی ہے کہ انسان نے کمان ایجاد کر لی تھی اور مدافعانہ طرز ماند و بود سے ترقی کر کے معارفانہ طریقہ زندگی اختیار کر لیا تھا۔ خادوار پیکانوں

سے ثابت ہوتا ہے کہ قوت ایجاد و روبہ ترقی تھی۔ ہڈی اور سینک کی نلمبلی پھالیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کے علاوہ انسان چھوٹے جانوروں بلکہ شاید پرندوں کا بھی شکار کرنے لگ گیا تھا۔ ہڈی کی سیٹیوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی ہوتے تھے یا کم از کم اُس کا کتا تو ضرور اُس کا رفیق ہوتا تھا۔ سنگ لٹا کی رانپوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لباس کے لیے چمڑے کا استعمال کرنے لگ گیا تھا اور بھدے لٹچوں اور سوئیوں سے لباس کی سلائی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ چمڑی ہوئی پیسوں سے جو چوڑیوں اور مالائوں کے لیے کام میں لائی جاتی تھیں آرایش جسمانی کے ذائق کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ آلات رنگ سازی کا وجود تلوین و توشیم بدن پر گواہ ہے۔ اور اعلیٰ مرتبہ کے ظاہر کرنے والے عصائدن کی تکوین و تنظیم کی علامات ہیں۔ ان قدیم انسانوں کی صنعت و دستکاری کا پہلا نمونہ ہمارے لیے نہایت ہی دلچسپی کا موجب ہے۔ مانتی دانت کے ٹکڑوں اور ہڈی کی تختیوں پر انہوں نے اُن جانوروں کی بھدی تصویریں کھینچی ہیں جو اُن کے زمانہ میں موجود تھے۔ اسی طرح ان جانوروں کی صورتیں بھی اُن کی سنگ تراشی اور کندہ کاری کی ابتدائی کوشش کو ظاہر کرتی ہیں۔ زمانہ قبل تاریخ کی ان تصویروں میں جو بعض صورتوں میں اصلیت سے کچھ بہت زیادہ مغیر نہیں ہیں فیلان شعرائی اور برنستانی بارہ سینگوں کی لڑائی کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں ایک آدمی پھلی کا شکار برچھے سے کر رہا ہے۔ ایک اور تصویر میں چند برہنہ آدمی دکھائے گئے ہیں جو ماتہ میں بھالے لیے شکار کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ فقط انسان ہی وہ حیوان ہے جو اشکال خارجی کے استغاش کی قابلیت رکھتا ہے اور آگ کا استعمال کر سکتا ہے۔

گھونگوں کے ٹیلوں میں جو بڈیوں اور سیپیوں سے مرکب ہیں اور جن میں سے بعض بہت بڑے بڑے اور اذمنہ خاصہ سے بھی پہلے کے ہیں اہد پتھر کے اوزاروں سے

سمورہین ہر جگہ آگ کے استعمال کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ ٹیلے اکثر تو موجودہ سول سے ملحق ہیں لیکن بعض دور تو نین سمندر کے ساحل سے چالینس چالینس پچاس پچاس میل اوہر شکی ہیں ہٹائے ہیں۔ ان کے اجزاء ترکیبی اور محل وقوع سے پایا جاتا ہے کہ ان کا زمانہ دودھ پلانے والے معدوم جاپون سے بعد لیکن بالوجہ نرون سے پہلو کا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ٹیلوں میں سے بعض کی عمر کسی طرح ایک لاکھ سال سے کم نہیں ہو سکتی۔ سوئٹزرلینڈ کے آب و ہوا کن لینی ان اور ہیر یون میں جو جھیل کے اندر لکڑی کے موٹے موٹے لٹھے گاڑ کر درختوں کی ٹہنیوں کے گونٹھنے سے بنائی جاتی تھیں کچھ اوزار پائے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہو ہیر یون ازمنہ حجرہ میں بنی شروع ہوئیں اور ازمنہ نحاسیہ تک قائم رہیں۔ ازمنہ نحاسیہ کے جو آثار موجود ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ انسان نے اس دور میں مزارعہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ علمائے طبقات الاصل نے اپنی آسانی کے لیے انسان کے زمانہ ترقی تمدن کو جن ادوار میں تقسیم کر لیا ہے ان کا آغاز و انجام بقتہ ہوا اور بنی نوع انسان کے کل افراد ہر دور کو ایک ساتھ طے کرتے گئے۔ امریکہ کی خانہ بدوش وحشی اقوام زمانہ حجرہ کی دادی سے اب باہر نکل رہی ہیں۔ بہت سے مقامات میں ابھی تک یہ لوگ ایسے تیروں سے مسلح نظر آتے ہیں جن کے پھل پتھر کے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان میں سے بعض نے گورے رنگ کی مہذب اقوام سے لوہے بدوق اور گھوڑے کا استعمال سیکھا۔

غرض جس قدر تحقیقات اب تک ہوئی ہیں اس سے یہ بات بلا امکان تردید ثابت ہوتی ہے کہ انسان آج سے کئی لاکھ سال پہلے کر زمین پر آباد تھا۔ محقق نہ رہے کہ اس تحقیقات کو کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اور جغرافیائی حدود کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ عمل بہت تنگ ہے۔ ان مقامات میں ابھی تک کوئی اکتشاف نہیں کیا گیا جن کی

نسبت عقل سلیم کو اسی دیتی ہے کہ انسان اولین کا مسکن یہیں ہوگا۔

اس طور پر ہم چھ ہزار سال کی اُس مدت سے جو باوریوں کا مبلغ تاریخ ہے ترنون اور ہیکوٹو
یہ جیسے بہت جالے ہیں۔ دور زمہریر یہ جدید یعنی یورپ کی گزشتہ تیسویں صدی کا زمانہ کسی طرح ڈالنی
لاکھ سال سے کم نہیں ٹھہر سکتا اور انسان کا اس زمانہ سے بھی پہلے دنیا میں موجود ہونا ثابت ہے
لیکن ایک نقطہ یہی عظیم الشان حقیقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ ہمارے اس واقعہ کا بھی حوالہ
نخواہی اعمرات کرنا پڑتا ہے کہ انسان سے بھی پہلے حیوانی زندگی موجود تھی اور ہر جسم ذی الحیا
نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ ارتقا پذیر ہوا۔

ایک طرف تو روایت کو اصرار ہے کہ ہمارے جد امجد باغ عدن میں جا مہ املیت زیب تن
کیے ہوئے فردوس کی لذتوں سے بہرہ اندوز تھے اور دوسری طرف روایت علی رؤس الاشہاد
انسان اولین کی بے بسی اور بے کسی اور وحشیانہ حالت کا ثبوت دے رہی ہے۔

بہین تفاوت رہ از کجا ست تابجا

روایت کے اس ادعا نے مسئلہ بہبوط آدم کو جو چرکا لگایا ہے اس سے ممکن نہیں کہ وہ جانبر
ہو سکے۔

ہم نے اس فصل کے موضوع کو پیرائے ترتیب تاریخی سے اس لیے خاری کر دیا ہے کہ مسئلہ
فہیت عالم کے متعلق جو کچھ ہمیں کہنا تھا اُس کے مالدوا علیہ سے ہمیں مختلف مقامات بحث
نہ کرنی پڑے۔ ورنہ مسئلہ عمر زمین مسئلہ معیار حق و صدق سے مدتوں بعد چھڑا یعنی ”رفاعیثین“
(اصلاح گیند) کے بعد اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ حق کی ماہیت کیا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیے
کہ یہ بحث انیسویں صدی تک چھڑی رہی۔ اس بحث میں فریقین نے غیر معمولی اعتدال
سے کام لیا چنانچہ اس پر بجائے مناقشہ کے مناظرہ کا لفظ زیادہ موزوں طور پر صادق آتا ہے
علم ہیئت کی مخالفت جس معاندانہ و منتقدانہ شان کے ساتھ کی گئی تھی علم طبقات الارض کو
اُس سے سابقہ نہیں پڑا اور اگرچہ علمائے طبقات الارض نے کرہ زمین کی بے انتہا قدت

کے تسلیم کیے جانے پر زور دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جن اعداد کے ذریعہ سے عمر زمین کا اندازہ قائم کیا گیا ہے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ جن ناظرین نے اس فصل کو توجہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اُن اعداد کے عدم تطابق کو نظر انداز نہ کیا ہوگا۔ جن کا حوالہ جابجا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اعداد دقیق و محکم جاری ہیں لیکن اس دعوے کی تائید ان سے پھر بھی بخوبی ہوتی ہے کہ زمین نہایت قدیم ہے اور اُن کی بنا پر ہم یہ نتیجہ خال سکتے ہیں کہ عالم کا پیمانہ زمان اُس کے پیمانہ مسکان کا جواب ہے۔



اٹھوان باب

نزاع در بارہ معیار حق

فلسفہ قدیم کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کے پاس احقاق حق کا کوئی ذریعہ نہیں۔
قدیم مسیحیوں میں عقاید کے اختلافات۔ کلیسائی کونسلین ان اختلافات کے مٹانے کی کوشش
کوششیں کرتی ہیں۔ حجت مبغوضہ حجت ابتلا کی ترویج۔

پاپا سے دو طریقہ اعتراف ستری کو جاری کرتا ہے اور محکمہ احتساب عقاید کو اپنا آکر اقتدار بناتا
اور اختلافات عقاید کے رفع کرنے کے لیے وحشیانہ مظالم پر اُتر آتا ہے۔

تیسرے جہشیں کے مجتہد العوامین کی دریافت اور قانون دینیہ کے نشوونما کا اثر نوعیت و
شہادت پر۔ قانون شہادت میں درایت کی شان نمودار ہونے لگتی ہے۔

اصلاح کلیسہ کی بدولت ہر انسان کو اپنی عقل اور سمجھ کے لحاظ سے رائے قائم کرنے کا حق
حاصل ہو جاتا ہے۔ کلیسائی رومن کیتھولک دعویٰ کرتا ہے کہ حق و صدق کا معیار خود کلیسہ ہے۔

فہرست کتب محرمہ کے اجراء سے وہ کتابوں کے مطالعہ کی ممانعت کرتا ہے اور حکم امتناعی کی
خلاف ورزی کرنے والوں کا قلع و قمع سینٹ بریٹھام لائبریری کے قتل عام کے سے ذرا سچ
کرتا ہے۔

پرائسٹ مذہب لوڑات کو معیار حق تسلیم کرتا ہے جو لوڑات کی موافقت پر نظر امتداد دینا
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ہے۔

سائنس کی رو سے معیار حق انکشافات فطرت ہیں پرائسٹ کے نزدیک یہ معیار کتب
مقدسہ میں موجود ہے اور رومن کیتھولک کی رائے میں پاپا سے معصوم اس کا مورد وہی ہے۔

ایک موقع پر جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے صفحہ تاریخ پر بجز جلی لکھے جانے کا استحقاق رکھتا ہے وہ اس کے ایک گورنر نے بتیاب ہو کر یہ سوال کیا کہ حق کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس اہمیت آج شخص نے جو گورنر کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور جس سے یہ استفسار کیا گیا تھا جواب میں کچھ نہ کہا۔ شاید خوشی ہی اس سوال کا بہترین جواب تھی۔

یہ سوال بارہا پہلے ہی کیا گیا تھا لیکن بے فائدہ اور آج تک اس کا احادہ رد رد کر رہا تھا مگر بے سود۔ کسی شخص سے اس کا شافی جواب آج تک بن نہیں پڑا۔

جب افق یونان پر صبح علوم و فنون کی روشنی نمودار ہوئی اور قدیم مذہب کی ظلمت کا نور ہونے لگی تو اس ملک کے متقی و پیرکار اور فطین و فہیم شخص دماغی یاس کی حالت میں رہا ہو گئے۔ انکا غورٹ غرطہ سرت و تاسف سے کہتا ہے:۔ کوئی بیز معلوم نہیں ہوئی کہ حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا۔ کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا۔ تو اسے مسیحی و دوہین تو اسے عقیدہ مکرور دین۔ حیات مستعار قلیل ہے۔ "زوفنیر کا دعویٰ ہے کہ کائنات ہے کہ ہم حق بات کو بھی یقینی تصور کریں۔ پارمینائڈ کا قول ہے کہ انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ آپٹڈ اکھیر کی رائے ہے کہ ضرور ہے کہ حق فلسفہ اور مذہب ناقابل اعتبار ہوں اس لیے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی معیار نہیں جس سے ہم ان کو جانچ سکیں۔ آئی مفرالڈس کا بیان ہے کہ حقایق بھی ہمارے ذہن میں یقین کا اقد نہیں کر سکتے۔ انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان علم مطلق کا روشناس ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا اور اگر حقیقت اسکی مٹھی میں بھی ہوتا تو اس کو اس کی موت و نیست پر یقین نہیں ہو سکتا۔ فیروہین یہ صلاح دیتا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لیے ہم ہر شے کی نسبت اظہار رائے میں تامل کرنا چاہیے۔

اس فیلسوف نے اپنے شاگردوں کو تشکک کی اس حد تک تلقین کی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ یا کہ یورس

نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا تھا کہ حق کی تکشیف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔
 ارسطو سیدیلیس کو معلومات حسیہ و عقیدہ دونوں سے انکار تھا اور اُس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ
 ابے کسی شے کا علم نہیں یہاں تک کہ اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں۔ غرض جس عام نتیجہ پر فلسفہ یونان
 پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ چونکہ جو اس کی شہادت نقطہ اتصال نقیضین ہے لہذا ہم حق و باطل میں تمیز
 نہیں کر سکتے اور عقل اس درجہ ناقص ہے کہ ہم کسی فلسفیانہ نتیجہ کی صحت کے ضامن نہیں ہو سکتے
 قیاس چاہتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک ایسا مدلل و مبرہن صحیفہ آسمانی منجانب اللہ انسان پر نازل
 ہو کہ شک و شبہ کا خاتمہ ہو جائے اور کسی شخص کو اس سے یارائے اختلاف و مقاومت نہ ہو
 یونان کے ایک فلسفی نے جس کی مایوسی اپنے ہمسفریوں کی بہ نسبت ذرا کم تھی ایک دفعہ یہ کہتے
 کی جرأت کی تھی کہ دو مختلف الاشکال مذاہب کا ایک ساتھ موجود ہونا اور ہم من الہی کا دعویٰ
 کرنا دونوں کے بطلان پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی و دمری اشیاء تک کی
 نسبت انسان ایک رائے بمشکل قائم کر سکتا ہے۔ تاؤتیکوہ ایک ہی پہلو سے ان اشیاء کو نہ دیکھو
 پھر البعد الطبیعیات کا ٹھکانا ہی کیا! حضرت مسیح کے ظہور سے تین سو سال پہلے اگر فلسفہ
 اختلاف و ارتباب کی جولان گاہ تھا تو آپ کی وفات کے تین سو سال بعد مذہب بھی اسی
 شش و پنج میں مبتلا تھا۔ بانی شیراز کا اسقف ہلاری اپنے مشہور و معروف مضمون میں جو
 اُس فرناکیسیا کی کونسل کے انعقاد کے وقت لکھا تھا ایک مقام پر کہتا ہے:-

”یہ واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے اُسی قدر خطرناک بھی ہے کہ لوگوں کی جتنی راہیں ہیں
 اتنے ہی مذاہب ہیں۔ جتنی خواہشیں ہیں اتنے ہی عقاید ہیں اور جس نسبت سے ان میں
 عیوب پائے جاتے ہیں اُسی نسبت سے اُنکے اسباب کفر و الحاد کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس کی
 وجہ یہ ہے کہ ہم من مانے عقاید قائم کر لیتے ہیں۔ اور جو بی من آتا ہے ان کی تاویل کر دیتے
 ہیں۔ ان دیکھے اور ان بوجھے اسرار و رموز کی تاویل و تفسیر کے لیے ہم آئے دن نئے مذاہب
 تراشا کرتے ہیں۔ ہم اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ پچھانے والوں کی حمایت کرتے ہیں

جن کی حمایت کرتے ہیں انہیں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسروں کے عقاید کا باوجود ان عقائد کے پیرو ہونے کے ابطال کرتے ہیں اور اپنے عقاید کو بھی باوجودیکہ دوسرے لوگ ان کے پیرو ہیں جو مقرر دینے ہیں۔ غرض اسی طرح باہم دست درگربان ہو کر ہم آپس میں ایک دوسرے کی تخریب و تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔

یہ محض لفظ ہی لفظ نہیں ہیں، بلکہ اس خود لامنتی سے بڑے حقیقت آتی ہے اور وہ شخص جو اُس زمانہ کی کلیسائی تاریخ سے واقف ہیں اس کا مفہوم پوری طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ جو دکر م اور خیر و برکت کے مسلک ہونے کے لحاظ سے جب مسیحیت کا پہلا جوش فرد ہو گیا تو نزاع و نفاق نے اپنا جھنڈا آگارا۔ قیسی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل مذہب و فلسفہ اتفاق و قنط میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات و تنازعات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا جنھوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔ ایک عرصہ دراز تک ان مجالس کے اقتدارات مشورہ دہی کی حد سے آگے نہ بڑھتے پائے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی ہو گئی اور احکام کا نفاذ بزرگ حکومت ہونے لگا۔ اس واقعہ نے کلیسا کی کایا ہی پلٹ دی۔ مجالس عمومیہ یعنی مسیحیت کی پارلیمنٹیں جن میں دنیا بھر کے گرجاؤں کے عہدہ دار بطور ارکان شریک ہوتے تھے شہنشاہ کے حکم سے منعقد ہوتی تھیں۔ وہ اصالتاً یا برائے نام ان مجالس کی خدمت عداوت انجام دیتا تھا۔ اور امور مابہ التنازع کا تصفیہ کرتا تھا گویا وہ مسیحی دنیا کا بابا ہوتا تھا۔ شیم مورخ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ قیسی عہد دن پر جالبون اور عامیون کے مامد ہونے کو کوئی چیز مانع نہ آ سکتی تھی۔ وحشی اور بے علم جماعت جو علم و فضل کو عموماً اور فلسفہ کو خصوصاً دشمن زہد و اتقا خیال کرتی تھی بڑھتی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ نائیبیا کی کونسل یعنی مجلس

عمومی میں جہالت اور بریطی خیالات کی جو شان علی الخصوص اُن بزرگواروں کی تفسیر اور دلائل میں پائی جاتی ہے۔ جنہوں نے اس کونسل کے فیصلہ کو بنظر استحسان دیکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہاں جو دس وسیع اثر کے جو اس کونسل نے مسیحی دنیا پر ڈالا ہے تبصرہ نگاران عہد قدیم کو نہ تو اس بارے میں اتفاق ہے کہ اس کونسل کا انعقاد کب اور کس مقام پر ہوا اور نہ یہی ٹھیک معلوم ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد کس قدر تھی اور صدر نشین کونسل کو سنا بطریق تھا اس کے مشہور و معروف فیصلہ جات کو سپرد قلم کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی گئی۔ یا اگر کی بھی گئی ہو تو وہ رو بہ ادا۔ بہ نسبت عہد ہم تک نہیں پہنچی۔ زمانہ حال کے مدبرین کی اصطلاح میں کلیسا نے اس زمانہ میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ریاستہائے جمہوری متحدہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کونسل کے فیصلہ کا انحصار کثرت رائے پر ہوتا تھا۔ اور اس کے لیے ہر طرح کی سازشیں اور افتراء پر ازبان اور دغا بازیان علی میں لائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ دہ بار شاہی کی خواتین کے رسوخ بلکہ ارتشابلک دھینگا مشن تک سے کام لیا جاتا تھا۔ نایب الی کونسل کو چیز اتوا میں بڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُن سب لوگوں نے جنہیں کسی کی رودر عایت مد نظر نہ تھی بالاتفاق یہی رائے قائم کی کہ مذہبی معاملات میں معیار حق و صدق قائم کرنا اس قسم کی مجلسوں کے بس کا رنگ نہیں۔ فریق مغلوب کو کوئی حق ایسا حاصل نہ تھا جس کا فریق غالب کو پاس ہو۔ بہت سے نیک نفس اور راست کردار اشخاص نے جب یہ عذر پیش کیا کہ ایسی کثرت رائے جس میں اُن وکلا کی آوا کا عنصر غالب شریک ہو جن کا حق رائے دہندگی مسلم نہ ہو کسی طرح حق مطلق کا ذریعہ تعین نہیں ہو سکتا تو اُن کے عذر کو بھارت نظر انداز کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل پر کونسل منعقد ہوئی لیکن جن کے متباہن اور متناقض فیصلوں نے مسیحی دنیا کو حیران و پریشان کر دیا۔ ایک نقطہ جو تھی ہی صدی میں تیرہ کونسلیں آئریش کے مخالف پندرہ کونسلیں اس کے موافق اور سترہ کونسلیں اُن لوگوں کی تائید میں منعقد ہوئیں جن کے عقاید آئریش سے ملتے جلتے تھے۔

گو یا کل پینتالیس کونسلوں کا انعقاد اس ایک مسئلہ کے تصفیہ کی غرض سے ہوا۔ ان کونسلوں کے اراکین کے طرز عمل پر یہ واقعہ روشنی ڈالتا ہے کہ جس قوت کا فریق غالب نے سچا استعمال کیا تھا اسی سے فریق مغلوب بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔

جس موخ کی بے تصبیانہ تحریر سے ہم نے اوپر لفظ کیا ہے اسی کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں عیسائی دہلا کی سنگین غلطیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اول یہ کہ وہ کادونا اور جھوٹ برون داخل حنات ہے بشرطیکہ اس سے کلیسا کی اغراض کو کوئی فائدہ پہنچے دوم یہ کہ اگر کافی سرزنش اور زجر و توبیخ کے بعد بھی کوئی شخص اپنی مذہبی لغزشوں پر اڑا رہے تو وہ مستوجب سزائے قانونی و عقوبت جہانی ہے۔

جب ہم اُن امور پر جنہیں عوام اُس زمانہ میں معیار حق سمجھتے تھے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں براۓ عقیدہ تعجب ہوتا ہے۔ کسی مسئلہ کی حقیقت کی سب سے بڑی دلیل اُن شہد کی تعداد ہوتی تھی جنہوں نے اسے سچ مانا ہو یا وہ معجزے یا کرامتیں اُسکی صحت پر گواہ ہوتی تھیں جو اُس کی تائید میں پیش کی جاسکیں یا ارواحِ خبیثہ یا مجاہدین یا اشخاصِ آسیب زدہ کا اقبال اُس کی سچائی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سینٹ امبروز کو جب کبھی پیروان آیرئیس سے مناظرہ کا اتفاق ہوا تو ان بزرگوار نے جھٹ سے آسیب زدہ اشخاص کو پیش فرمادیا۔ جنہوں نے بعض مسیحی شہدائے تبرکات کی صورت دیکھتے ہی یہ پکارنا شروع کیا کہ نائسیا کی کونسل کا مسئلہ اتنا نیم ثلثہ برحق ہے۔ لیکن پیروان آیرئیس بھی کچی گویاں نہ کھیلے تھے۔ انہوں نے سینٹ امبروز پر یہ الزام لگایا کہ اُس نے ان خبیث گواہوں کو بہت بڑی رشوت دکر جھوٹی شہادت دینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ عدالتیں بھی اس زمانہ میں قائم ہو چکی تھیں جن میں ابتلا کا طریقہ جاری کیا گیا تھا۔ یعنی ملزم کے خطاوار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ اُسے انواع و اقسام کی جہانی آزمائشوں میں کمال کرنا منجھ کے لحاظ سے منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ چھ صدی تک یہ عدالتیں ملزم کی گنہگاری یا بے گناہی کا ثبوت اب سرد۔ مبارزت۔ جلتی آگ اور صلیب کے گوناگون ذرائع تحقیقات سے دیتی

رہیں -

شہادت کی ماہیت اور اُس کے قوانین کے متعلق اس جہالت اور لاعلمی کی بھی کوئی حد ہے۔
 ملزم بانی کے تالاب میں پھینک دیا جاتا ہے اور وہ یا تو ڈوب جاتا ہے یا تیرنے لگتا ہے۔ اُس کے
 ہاتھ میں سرخ چلتی ہوئی لوسہ کی ایک سلاح عمادی جاتی ہے جس سے وہ یا تو جل جاتا ہے یا
 بچ رہتا ہے جس مبارک کو اُس اجرت دے کر اپنی طرف سے لڑنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ یا تو
 مغلوب ہو جاتا ہے یا غالب آتا ہے وہ اپنے بازوؤں کو صلیب کی شکل میں اُس شخص کی بہ نسبت جس نے
 اُس پر الزام لگایا ہے کم دیر تک پھیلائے ہوئے رکھ سکتا ہے یا زیادہ دیر تک۔ لیکن انہیں
 آزمائشوں کے نتائج کے لحاظ سے کسی علت منسوبہ کے منتفی اُس کی قصود واری یا بے قصوری
 مسلم قرار دیا جاتی ہے۔ کیا یہی طریقے معیار حق و راستی ہو سکتے ہیں؟

ایسی حالت میں مقام تعجب انہیں کہ یورپ میں صد سال تک جھوٹی کرامتوں کا بازار گرم رہا
 اور یہ وہ کرامات ہیں جو انسان کی نقل و تمیز کے لیے باعث ننگ و عار ہیں۔

لیکن وہ دن جو نہ ٹل سکتا تھا آخر آجپنچا۔ وہ ادا اور وہ عقاید جو اس قسم کی نامعقول شہادت پر
 مبنی تھے اُس بے اعتباری کی خاک میں مل گئے جس کا پیوند خود یہ شہادت ہو چکی تھی۔ جب
 تیرہویں صدی شروع ہوئی تو چاروں طرف تشکک اور بد اعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ اول اس
 بد اعتقادی سے یورپوں کا طبقہ متاثر ہوا اور اس کے بعد یہ ہر صنف تمام عوام الناس میں پھیل
 گئی۔ یورپوں نے اپنے تشکک کی بھڑاس ”انجیل لازوال“ کی سی کتابیں تصنیف کر کو کھالی
 اور عوام الناس ”کیتھرٹ“ ”دلڈلسیز“ اور ”پٹرورشن“ کے سے فرقوں میں متفرج
 ہو گئے۔ ان سب کو اس امر میں اتفاق تھا کہ مذہب مسلک و درجہ اغلاط و ادھام کا ایک مجموعہ
 بے ربط ہے۔ پاپا نے عیسائیوں پر جو جبری حکومت قائم رکھی ہے وہ ناجائز اور ظالمانہ ہے
 اور روماکہ یہ دعویٰ کہ پاپا سے روم دنیا کا حکم الحاکمین ہے اور کسی بادشاہ یا قیس یا دینی فیوض
 حکمران کو کوئی جائز مذہبی یا سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا۔ متحککہ وہ پاپا ہی کا عطا کیا ہوا مذہب

بالکل بے بنیاد اور حقوق انسان کے لیے بمنزلہ غاصبانہ دستبرد کے ہے۔
 ہیدینی کے اس سیلاب کی روک تھام کے لیے پاپے روما کی حکومت نے دو محکمے
 قائم کیے۔ (۱) "انکوئزیشن" یعنی محکمہ احتساب عطاہ اور (۲) محکمہ اعتراف ستریز ثانی الذکر
 "تفتیش اور سراغ برآری کا ذریعہ تھا اور اول الذکر سزا دہی کا۔

عام الفاظ میں "انکوئزیشن" کا مقصد یہ تھا کہ توفیت و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی
 اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت زندقہ کو بنیاد خوفناک سزاؤں کے تصور سے
 وابستہ کر دیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ اہل "انکوئزیشن" ہی کو بدعت زندقہ کی تعریف
 "تیسین" کا اختیار حاصل ہو۔ اس طور پر معیار حق محکمہ "انکوئزیشن" کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف
 سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ "اُن ملاحظہ و زنادقہ کی نسبت بعد سراغ برآری جو بہ مناسب مصادر
 کرے جو شہر و مکانات و خانوں جنگل و غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔"
 اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی دھیانہ مستعدی
 ظاہر کی کہ ۱۳۸۱ء سے لیکر ۱۹۰۸ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں
 دین اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً تیس ہزار نفوس زندہ جلا دئے گئے اول ادل جب
 عام خلافت کو اس کی دھیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت اور مجال نہ تھی
 تو بسا اوقات ایسا اتفاق چوتا تھا کہ امرا اہل قلم تیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزوم
 عاید ہوتے ہی بلا اس کے کہ انہیں پیل کا موقع دیا جائے اُسی دن مارڈالے جاتے تھے
 اور اب فکر و دانش کی جدہر نظریتی تھی انہیں ہیانک اور ڈروانی پر چھایان دکھائی دیتی
 تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزایابی آزادانہ اس کے اظہار پر قادر نہ تھا۔ "انکوئزیشن" کا طرز
 عمل ایسا خوفناک اور ترہیب تھا کہ بگلیا ریسائی کا یہ فقرہ ہزار ہا نفوس کی صدے باز گشت بن گیا
 تھا۔ "مکن نہیں کہ کوئی شخص سچی ہو اور اطمینان سے اپنی موت مرے"

"انکوئزیشن" نے جنوبی فرانس کے عیسائی فرقوں کا تیرہویں صدی میں خاتمہ کر دیا

تھا۔ اس کی غدارانہ سفاکی نے اٹلی اور اسپین میں پراٹسٹ مذہب کو بیج دین سے اکھاڑ پھینکا۔ مذہبی امور کے علاوہ اس نے پولیٹیکل شورش کے فرو کرنے کی خدمت بھی خود ہی انجام دینی شروع کی۔ نگوئس ایمرک جو حکومت ایریگان کلچر سوسائٹی تک صدر منتخب رہا اور جس کا انتقال ۱۹۹۹ء میں ہوا۔ اپنی کتاب "رویداد" محکمہ احتساب عقاید" میں اس محکمہ کے ہیبت انگیز اور کچکپا دینے والے مظالم کی داستان قلم بند کر گیا ہے۔

یہ محکمہ جو مسیحیت بلکہ بنی نوع انسان کے لئے موجب ننگ و عار ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف جینیٹون سے قائم تھا پاپا سے روزانے اس کے جابرانہ اور مطلق العنان اختیارات قائم رکھ کر بالآخر قدیم مسیحی محکمہ جاٹ احتساب کو موقوف کر دیا۔ اور وہ اختیارات جو ہر اسقف کو بزمانہ سابق اس بارہ میں حاصل تھے چھین کر اپنے اقتدارات میں ضم کر لیے۔ اس طرح محکمہ انکوئزیشن "براہ راست پاپا کی ماتحتی میں آ گیا اور پاپا ہی کے کارندے اور گماشتے اسکو چلانے لگے۔

جو تھمی لیٹن کونسل (۱۵۴۷ء) کے فیصلہ نے "انکوئزیشن" کے اقتدارات میں ایک خونخوار اضافہ کر دیا یعنی یہ بات ہر شخص کے ذرائع میں باضابطہ طور پر داخل کر دی گئی کہ اپنے حلقہ کے پادری کے سامنے اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف کیا کرے۔ اس کا نام طریقہ اعتراف ستری ہے۔ اس طریقہ کی بدولت جس حد تک کہ خانگی زندگی کو تعلق تھا محکمہ "انکوئزیشن" ہمہ بین وہمہ دان ہو گیا کوئی شخص اپنے آپ کو مومن و مومن نہ تصور کر سکتا تھا۔ حلقہ کے پادری کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اُس کی بی بی یا ملازمین کے خفیہ سے خفیہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ دلی راز بہ طریقہ جرح یا برسہیل جبر دریافت کرے اور اس لحاظ سے بی بی اپنے خاوند اور نوکر اپنے آقا کے گویا جاسوس بنادئے گئے تھے۔ اس خونخوار عدالت کے سامنے وہ بکڑ بکڑایا جاتا تھا اور اُس سے صرف اسی قدر کہا جاتا تھا کہ کلیسا کو تمہارے عقاید نہایت مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی الزام لگانے والے کا نام ملزم کو نہیں بتایا جاتا تھا۔

بلکہ یہ کسی انگوٹے کو بچھی کرنے والے پیچ۔ بدن کو تاشنے والے رستے۔ پاؤں کی ہڈیوں کو چوراچورا کرنے والے بوٹ۔ انگلیوں کو توڑنے والے فاشے اور دوسرے عقوبت آفرین شکنجوں سے بہت جلد پوری کر دی جاتی تھی اور خواہ وہ معصوم ہوتا تھا خواہ ظالمی ہر حالت میں اُسے جہنم کا اعتراف کرتے ہی بنتی تھی۔

لیکن باوجود ان تمام اقتدارات کے ”انکو نیشن“ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب ملاحظہ و مذاقہ اس کی تاب نہ لا سکتے تھے تو اس سے بچنے کے لیے سو سو طرح کے چیلے نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تشنگ اور بد اعتقادی کا تمام یورپ میں چکے چکے عمل دخل ہو گیا۔ لوگ ذات باری تعالیٰ بقائے روح انسانی اور اختیار ارادہ بشری کے منکر ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انسان جبر مطلق کی مدافعت نہیں کر سکتا اور اُن مقدرات سے جن کا دل بادل اُسکے چاروں طرف چھایا ہوا ہے کسی طرح گریز نہیں۔ اس قسم کے خیالات غموشی کے ساتھ اُن ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گئے جو تسمیست کے مظالم سے تنگ آکر مجبور تھے کہ اس مایوسانہ تخیل کی آڑ میں پناہ لیں۔ یہ دلدار سیر مغرب کے پیرو باوجود اُن انوار و انعام کی سختیوں کے جو ان کی بچ کنی کے لیے عمل میں لائی گئیں اس خیال کی اشاعت میں کامیاب ہو کر رہے کہ کلیساے روم اقطن طین کے عہد کی پاکیزگی اور تقدس سے کوسوں دور جا پڑا ہے۔ انہوں نے تذکرہ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور یہ ظاہر کیا کہ نفسِ بے مغفرت نے دعا روزہ اور خیرات کا تقریباً حاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مرے ہوؤں کی روحوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا ایک نفل عبث ہے اس لیے کہ وہ بہشت و دوزخ میں پہلے ہی داخل ہو چکے ہوں گے۔ اگرچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلسفہ یا سائنس سمجھت یعنی اتقائے خاص کی اغراض کے منافی ہے پھر بھی اسلامی تصانیف جو اُس زمانہ میں اندلس میں رائج تھیں ہر طبقہ کے لوگوں کے عقاید پر اپنا زبردست اثر ڈال رہی تھیں۔ یہ اثرات

ہم کو ان فرقوں میں صاف صاف نظر آتے ہیں جو اس زمانہ میں قائم ہو چکے تھے چنانچہ فرقہ
 "ابتدا و بنات حریت" کا یہ عقیدہ تھا کہ "کائنات کا خروج ذات باری تعالیٰ سے ہوا ہے اور
 بالآخر اسی ذات میں اس کا انضمام ہو جائے گا۔ نفوس مطلقہ انسانی جناب باری کے اجزا
 ہیں اور کائنات ہی بحیثیت مجموعی خدا ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو بجز ترقی یافتہ دماغوں کے
 اور کہیں نہیں سنا سکتے۔ اس فرقہ کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے اکثر خوشی خوشی
 "انکو سٹریشن" کی آگ میں جل گئے مگر زبان پر آت اور ماتھے پر بل تک نہ لائے پار یون نے
 ازراہ عناد اس فرقہ پر یہ الزام لگا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیا کہ آدھی رات کے وقت اس فرقہ کی عورتیں
 اور مرد بربہ نہ ہو کر تاریک کمرؤں میں جاتے ہیں اور دہان حفظ نفسانی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں
 اسی قسم کا الزام جیسا کہ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے روما کی رنگین مزاج سوسائٹی نے قدیم
 مسیحیوں پر بھی لگایا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ کا اثر ان فرقوں میں سے اکثر کے عقاید میں صاف نظر آتا تھا۔ سچی
 نقطہ خیال سے اس اسلامی مسلک کا لازمی نتیجہ یہ زندیقانہ عقیدہ تھا کہ ارکان مسیحیت کا حاصل
 بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ روح انسانی ذات باری تعالیٰ میں داخل ہو جائے۔ خدا اور کائنات
 کو آپس میں وہی تعلق ہے جو موع کو جسم کے ساتھ ہے۔ صرف ایک عقل واحد و منفرد کا عالم
 میں وجود ہے اور بنی نوع انسان کی روحانی و عقلی مستندی کی ذمہ دار ایک ہی روح ہے جب
 اصلاح کینیڈہ کا زمانہ قریب آیا اور "انکو سٹریشن" کے مصیطروں نے ابن رشد کے اطالوی پڑوں
 کے عقاید کی تفتیش شروع کی تو ادہنوں نے یہ ثبوت کرنا چاہا کہ فلسفیانہ اور مذہبی حقیقت میں
 ایک بون بید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک بات از روے فلسفہ برحق ہو لیکن از روے مذہب باطل
 ہو۔ یہ وہ تبریری حیلہ تھا جسے "لیٹرن کونسل" نے پاپے لیو دہم کے زمانہ میں ناجائز قرار دیا۔
 لیکن باوجود اعتراف ستری و احتساب عقاید کے یہ بدعتیانہ رجحان بدستور قائم رہے
 اس قول کی صداقت میں شک نہیں کہ اصلاح کینیڈہ کے وقت یورپ کے مختلف مقامات

مین ایسے بہت سے لوگ چھپے ہوئے تھے جنہیں مسیحیت سے قلبی عداوت تھی ان خانہ
برائے اذان مذہب میں پامپونیشیس کی طرح اکثر تو بیروان ارسطو تھے۔ باڈن ریپبلکس اور
ماتین کے مانند بہت سے فلاسفہ اور بزرگ سنچ مکہ دان تھے اور لیو دہم مجبور اور بردنوں کے
مثل بہت سے آزاد خیال اطالوی تھے۔

کرواتی شہادت گیر ہون اور بارہویں صدی میں پاپا اعتبار سے ساقط ہو چلی۔ اندکس
کے مسلمان فلاسفہ کے سماعن و مضاحک سے متاثر ہو کر بہت سے روشن خیال پادری
قابل ہو گئے کہ اس قسم کی شہادت کی حقیقت ایک خیالی ڈکوسلے سے زیادہ نہیں۔ ۱۳۰۰ء
میں ہر مقام آلفی جیٹینین کے مجلۃ القوانين کا مکمل نسخہ برآمد ہوا جس نے لوگوں کے دلوں میں
علم اصول قانون روم کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا اور قانونی یا فلسفیانہ شہادت کی نوعیت
کے متعلق لوگوں کی معلومات زیادہ وسیع ہو گئیں۔ ہیلم نے اس نسخہ کے برآمد ہونے کے
مشہور و معروف واقعہ کو کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن اس امر کا اسکو بھی اعتراف
ہے کہ فلازنس کے کتب خانہ ”لارنشین“ میں جو نسخہ مجلۃ القوانين کا موجود ہے صرف
ایک وہی ایسا نسخہ ہے جو پوری پچاسون جلدوں پر مضمون ہے۔ غرض مجلۃ القوانين کی
دریافت کے بیس سال بعد گریٹینین نامی ایک راہب نے مختلف پاپاؤن کے فراہم کونسلوں
کے فیصلہ جات بزرگان و علمائے کلیسا کے مغلظات ایک کتاب میں جس کا نام ”ڈیکریٹم“
(فتادی) ہے جمع کیے چنانچہ یہ کتاب قانون و مینہ پر سب سے زیادہ قدیم تصنیف ہے۔ اس
بعد کی صدی میں پاپاے کریگوری ہنم نے ”ڈیکریٹل“ کتاب الاوامر (پانچ حصوں میں شائع
کی اور بائیس ہجرت لے ان پر ایک حصہ کا اور اعناذہ کیا۔ اس کے بعد کریگوری سینر دہم
نے ”دیکریٹن“ کا ”سٹیٹوشنز“ (دوساٹر کلینٹ) کتاب الاوامر کی ساتویں جلد اور اسے
”بک آف اسٹیٹوٹز“ (کتاب الامین) کو ایک جگہ جمع کر کے ”کارپس جیورس کینا نیسائی“
(مجموعہ قوانین دینیہ) کے نام سے شائع کیا۔ قانون شرعی کو وصیت نامہ جات

ولایت یتامی نکاح اور طلاق پر قابو پانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ بہت بڑا انتدار حاصل ہو گیا تھا۔ کراماتی شہادت کے انکار اور اُس کے بجائے قانونی شہادت کے قیام سے اصلاح کینہ کی ساعت بہت قریب آ گئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ کٹر بری کے لاٹ پادری انسلم کا مقرر کیا ہوا یہ قاعدہ مسیحی دنیا میں نافذ تھا کہ ہم کو پہلے بے سوچے سمجھے بے دیکھے بجائے یقین کر لینا چاہیے اُسکے بعد ہمیں اعتدال سے کہ اپنے یقین کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس قاعدہ پر اس وقت عمل درآمد ہونا ممکن نہ تھا۔ کجیٹن نے تو تھر سے کہا تھا کہ تجھ کو اس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ یسوع مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی دوع انسان کے کفارہ ذنوب کے لیے کافی ہے۔ باقی جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا وہ پاپے روا کو ترکہ میں ملا تاکہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرات العفران لکھے جاسکیں۔ اگر اگلا سا زمانہ ہوتا تو تو تھر کو اس قول کی صداقت کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ مگر آجادی خیال کی ہوا چلنے لگی تھی۔ اور بزم داغ میں شمع دانش جلنے لگی تھی۔ کجیٹن کی ہرزہ سرائی کو اس دلیر جرمین راہب نے استحقار و استکراہ کی نظر سے دیکھا اور اگر کجیٹن اپنے دعوے کی تائید میں ہزار معجزے اور کرامتیں بھی پیش کرتا تب بھی وہ اُسکو تسلیم نہ کرتا۔ معصیت پر خط عفو کہنیچنے کے لیے تذکرۃ العفران کی فروخت کے ناپاک اور شرمناک طریقہ کی ابتدا اُن اساقف نے کی تھی جنہیں اپنی ادبانیوں اور عیاشیوں کے لیے جب اور کسی طریقہ سے روپیہ نہ ملتا تھا تو مسیح کے گھلکی کالی بھیر دین کے ہاتھ پروانہ مغفرت ہی نہ بیچ بیچ کر روپیہ وصول کرتے تھے جن تیسویں اور راہبوں کو اس سود مند تجارت سے ہاتھ رنگنے کی ممانعت تھی وہ تبرکات ہی کے جلوس نکال کر اپنی حبیبین بھرتے تھے یعنی جو شخص بغرض حصول ثواب ان تبرکات کو چھونا چاہتا تھا اُس سے ایک خاص رقم بطور نذرانہ رکھوا لیتے تھے۔ حضرت پاپا کالمالی تانیہ جب تنگ ہوا اور آپ نے دیکھا کہ تذکرات العفران کے بیو پارین بہت بڑا فائدہ ہے تو آپ نے اساقف کو حق تذکرہ فروشی سے محروم کر کے اس حق کا استعمال

اپنی ذات کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے گماشتے اور کارندے تذکرہ فروشی کے لیے جا بجا مقرر کر دئے۔ اس گماشتگی اور کارندگی کے لیے زیادہ تر گداہی پیشہ طبقوں کے راہبوں کا انتخاب ہوتا تھا۔ ان طبقوں میں مسابقت اور رقابت کا بازار بہت جلد گرم ہو گیا۔ ہر طبقہ فخر یہ اعلان کرتا تھا کہ چونکہ ہمارا اثر آسمانی دربار میں زیادہ ہے اور مقدس مریم عذرا اور دوسرے اولیائے کرام کی جناب میں ہمیں زیادہ تقرب حاصل ہے اس لیے ہمارے تذکرے عفو و غفران کا زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ خود کو تحریروں جس کا تعلق طبقہ اگسٹائن کے راہبوں سے تھا یہ بہتان باندھا گیا کہ جب شاہنشاہین پاپائے لیوڈیم اسی ذریعہ سے سینٹ پیٹر کے گرجا کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کر رہا تھا تو بجائے اس کے کہ بخشش کے بردانون کی فروخت کا ٹھیکہ لو تحریکی برادری کو دیا جاتا ڈائمنڈ فرم کے راہبوں کو دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لو تحری نے ناراض ہو کر کلیسا سے قطع تعلق کر لیا۔ ”اصلاح“ کے ابتدائی ایام میں خود لیو بھی اس الزام کو صحیح تصور کرتا تھا۔

اس طور پر واقعہ ”اصلاح“ کی فوری محرک فروخت تذکرات العفران ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزارنے پایا تھا کہ سبب اصلی بھی جو اس کفعمش کی مدح و درودان تھا ظاہر ہو گیا۔ حقیقی بحث جس پر اس تمام جدوجہد کا دار و مدار تھا یہ تھی کہ آیا انجیل کی حقیقت کا دار و مدار کلیسا پر ہے یا کلیسا کی حقیقت کا دار و مدار انجیل پر ہے؟ باغافادیکر معیار حق کا اخذ ہے تو کونسا؟ واقعہ اصلاح کنیہ کی مشہور و معروف جزئیات اور ان خوزیز لٹامیون کی تفصیل جواب کی وجہ سے یورپ میں ملون چٹری بہین ہم اس مقام پر سپرد قلم کرنا ضروری نہیں خیال کرتے لو تحری کا ڈیٹبرگٹ کے گرجا کے دروازے پر ۹۵ مسائل نصب کرنا اور اس جرم کی جواب دہی ۱۵ جرمی کا ایک متوسط درجہ کا شہر ہے جو دریائے اب کے دہنے کنارے واقع ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لو تحری نے اس شہر کے گرجا کے دروازے پر وہ مشہور استفتا کیلون سے جزو دیا جس کے ۹۵ مسائل نے سیمی دنیا کو رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ دوفرقتوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی۔

کے لیے رد مین طلب کیا جانا۔ اُس کا پاپا کو یہ لکھ بھیجا کہ آپ اس وٹ حقیقت حال سے خالی الذہن ہیں جب آپ کو پوری کیفیت معلوم ہوگی تو جو جرم مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ جرم نہ رہے گا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری سمجھا جائے گا۔ اُس پر بدعت اور زندقہ کا الزام لگایا جانا اور اُس کا ایک عام کونسل مین اسپیل دائر کرنا۔ مسائل مطہر۔ عشا سے ربانی۔ اعتراف سری وغفران ذنوب کی بیچ و بیچ بحثوں میں سے اصلی بحث یعنی ذاتی رائے کے اٹھارے کے استحقاق کا چھٹ کر نکل آنا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں لو تھر کا مسیحی ہونے سے خارج کیا جانا اور اس کے جواب میں اُس کا فرمان اخراج اور نیز مجموعہ قوانین دینیہ کو یہ کہہ کر کہ اس کا مقصد بجز ملکی دویوانی اقتدارات کے استیصال اور پاپا سے روم کی شکوت و سلطوت کے اعتلا کے اور کچھ نہیں جلا ڈالنا۔ اس دانشمندانہ حیلے سے اُس کا جرمنی کے متحدہ وٹریوں کو اپنا ہم خیال بنالینا۔ مجلس شاہی میں جو بمقام وٹس منعقد ہوئی اُس کا طلب کیا جانا اور اپنے عقاید سے تائب نہ ہونا۔ در تیرگ کے قلعہ میں اُس کا کچھ مدت کے لیے روپوش ہونا اور اس عرصہ میں اُس کے عقاید کا اطراف و اکنات ملک میں پھیلنا اور سوٹسٹر لینڈ میں زونگلی کی کوششوں سے اصلاح کینہ کی ایک جداگانہ تحریک کا بارور ہونا۔ تحلیل مل وٹسٹ نکل کے اُس اصول کا جو تحریک اصلاح میں مضمر تھا اہل جرمنی و سوٹسٹر لینڈ کی باہمی رقابت کا باعث قرار پانا۔ بلکہ سوٹسٹر لینڈ میں زونگلی اور کیلون کی سرکردگی سے دو مخالف گروہ پیدا کر دینا۔ ماربرگ اسپائرس اور آگسبرگ کی مجلسوں کا ان اختلافات بقیہ وٹ صفحہ ۱۶۲ء لو تھر اس گرجا میں دفن ہے۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں گرجا کے دروازے بدل دئے گئے

اور کانسی کے نئے دروازے لگائے گئے جن میں ۹۵ میل کھدے ہوئے ہیں۔ مترجم

۷۔ پاپا کا فرمان لو تھر نے وٹبرگ میں جس مقام پر تیارچ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء جلایا تھا اہل شاہ بلوٹ کا ایک سالہ زور و دھت کھڑا ہے جو اس لحاظ سے اصلاح کینہ کی پرانی یادگار سمجھا جاتا ہے۔

مستہم

وزراعات کے مٹانے کی کوشش میں ناکام رہنا۔ اور مصلحانِ جبرمنی کا بمقام آسمان کا لڈیائی اتحاد قائم کر کے اصلاح کو سیاسی رنگ میں رنگ دینا۔ پیروان بوٹرو پیروان کیلون کی باہمی نزاعات سے روما کو اپنے نقصانات کی تلافی کی امید بندھنا۔ یہ تمام واقعات ایسے ہیں جن کی جزئیات کا اعادہ اس مقام پر غیر ضروری ہے۔

لیو کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ لو تھر کی پیدا کی ہوئی تحریک فروخت تذکرات الففران کے منافع کی بابت چند شور و سر اور دنیا دار پادریوں کا جھگڑا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں بہت زیادہ اندیشہ ناک اور نتیجہ خیز اسباب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اُس نے پوری بیابانی قوت کو باغی جماعت کی سرکوبی پر صرف کرنا شروع کیا۔ پاپا سے روما کے اس جوڑ توڑ نے وہ خوفناک اور تباہ کن لڑائیاں چھڑوا دیں جنہوں نے سا لہا سال تک یورپ میں قتل و خونریزی کا ہنگامہ بپا کئے رکھا اور مسیحی اقوام میں اُن علوتوں کا بیج بودیا جن کو نہ عہد نامہ و سٹیفیل مٹا سکا اور نہ ٹرنٹ کی کونسل ہی باوجود اٹھارہ سال کے مسلسل بحث و مباحثہ اور افہام و تفہیم کے فرو کر سکی۔ واقعہ سینٹ برتھالیمو (۱۵۷۱ء) نے جس میں فرانسیسی پراٹسٹنٹوں کا قتل عام ہوا یورپ بھر کو مہوٹ و سراپیمہ کر دیا اور کیا پراٹسٹنٹ کیا رومن کیتھولک سب کے جسم پر نوٹھر کھڑے ہو گئے۔ خدا رانہ بد عہدی اور وحشیانہ خونریزی کے لحاظ سے یہ واقعہ تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔

۱۵۷۱ء یہ قتل عام جو ڈیرہ پینے تک جاری رہا اور جس میں پچاس ہزار پراٹسٹنٹ مارے گئے ۴۴ راکت شہداء کی شام کو شروع ہوا جو ایک مسیحی بزرگ سینٹ برتھالیمو کے عرس کی تاریخ ہے اس زمانہ میں چارلس نہم فرانس کا بادشاہ تھا لیکن حکومت کی باگ اصل میں اُس کی ان مکہ کیتھرائن مڈیسی کے ہاتھ میں تھی جو قصب کی پہلی اور جبر و بے ممانی کی زندہ تصویر تھی۔ کیتھولک فریق نے کیتھرائن کی شہ پارک یہ منصوبہ گانٹھا کر پراٹسٹنٹوں کے سردار دن کو جمع کر کے قتل عام کر دیا جاے اور اُس کے بعد اُن کے ساتھیوں کا قلع و قمع کیا جائے۔ اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے طے طرح کے جوڑ توڑ کیے گئے۔ کیتھرائن اپنی بیٹی کی شادی نیویئر

پاپا سے رومانے مخالفین کی بیج کنی کے لیے سبھی طرح کے جتن کیے غمانہ جنگیوں کی آگ بھڑکانے کے لیے ہیریم کشی کی۔ قتل عام کر دئے۔ اہل خلافت کو چن چن کر مروا ڈالا لیکن ان مایوسانہ کوششوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ٹرنٹ کی کونسل کی جدوجہد بھی بیکار گئی۔ اس کونسل کے انعقاد کا منشا بظاہر اگرچہ یہ تھا کہ کلیسا نے عیسوی کے عقاید کی اصلاح و توسیع و تحکیم و تعمین کرے اور احیاء و تادیب سے پیشوایان دین عیسوی کی اخلاقی اور علمی حالت کو سدھارے لیکن ارکان کونسل کے انتخاب میں یہ چالاکی کی گئی تھی کہ عنصر غالب اطالوی اور اس لحاظ سے پاپا کے زیر اثر تھا۔ اسی لئے ممکن نہ تھا کہ پراٹسٹنٹ فرقہ اس کونسل کے فیصلوں پر کاربند ہو۔ اصلاح کینہ کا لب لباب یہ مسئلہ تھا کہ بائبل برسی المذہب شخص کی ہدایت کے لیے کافی و مکفی ہے اور یہی مسئلہ تمام پراٹسٹنٹ کلیساؤں کے مسلمات میں داخل ہو گیا۔ روایت کی سبنا منہدم ہو گئی اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کو بذات خود مذہبی معاملات میں اسے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ غرض یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کا رستہ آخر انسان کے لیے کھل گیا ہے۔

کتب مقدسہ سے استہداد و استناد کرنے کا جو اصول اس طور پر قائم کیا گیا تھا اُس کا تعلق

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۴ کے فرمانروا شاہ ہنری چوہرٹسٹنٹ تھا کرنے پر منامند ہو گئی۔ اور شادی کی تقریب پر تمام بڑے بڑے پراٹسٹنٹ اور امراء اعیان کو دعوت دی گئی۔ جب یہ سب پیرس میں جمع ہو گئے تو آدھی رات کے وقت شاہی محل سے گھنٹہ بجایا اس کا مطلب یہ تھا کہ قتل عام شروع ہو۔ چنانچہ کیتھولک تلواریں لیکر اٹھے اور جس پراٹسٹنٹ کو جہان پایا ذبح کر ڈالا۔ کشت و خون کا یہ ہنگامہ پیرس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مملکت فرانس میں جہاں جہاں پراٹسٹنٹ موجود تھے گلائی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔ پاپا سے گریگوری سیزدہم اس وقت جلوہ افروز مسند قدس و عصمت تھے۔ اس قتل عام کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور گرجا میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھی اور اس مبارک واقعہ کی یادگار میں ایک تمغہ تیار کرایا جو موسنین پاک عیسیٰ پراٹسٹنٹوں کے قاتلوں کو عطا فرمایا گیا۔ مترجم

خالص مذہبی یا اخلاقی معاملات ہی سے نہ تھا بلکہ فلسفیانہ حقائق کا انکشاف اور رموز فطرت کا انکشاف بھی اسی اصول کی حامل ہیں داخل تھا۔ بہت سے لوگ تو اس بارے میں ایپیفینس کے نقش قدم پر چلے جس نے بزمانہ قدیم یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بائبل میں معدنیات کے بھی تمام اصول و فروع شامل ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اہل اصلاح کسی علم کو رواداری کی نظر سے نہ دیکھ سکتے تھے جو کتاب پیدائش کے ساتھ تطابق کلی نہ رکھتا ہو۔ ان میں سے اکثر بزرگواروں کی یہ رائے تھی کہ اعتقاد دینداروں کی علم و حکمت سے جدا ہوئے بغیر کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔

ٹرٹلین اور سیٹ اگسٹائن کا یہ قدیم ہلک اصول موضوعہ کہ بائبل ان تمام معلومات کا مجموعہ اور خلاصہ ہے جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں یا اُسے فائدہ پہنچا سکتی ہیں ابھی تک سختی کے ساتھ قائم تھا۔ لوہر اور ملنگھان نے جو اصلاح کینسہ کے بانی مابانی تھے عزم بالجبرم کر لیا تھا کہ فلسفہ کو کلیسا کی سرحد سے خارج کر دیا جائے۔ لوہر کا بیان تھا کہ ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ بے سود محض ہے۔ ارسطو پر سب دشمن کا اُس نے جو جھڑبانہ ہا ہے وہ صنعت تبرا کی ایک انوکھی صفت سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس ضمن میں یون گہر افشانی فرمائی ہے۔ "اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ملعون ابدی دشمنی ازلی یعنی ارسطو بڑا خناس ہے۔ افزا بردازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا خبیثانہ ہرزہ سرائی کے فن کا موجد ہے۔ سرگردہ شیاطین ہے فلسفہ کا ایک حوت نہیں جانتا۔ جھوٹا ہے۔ فریبی ہے۔ دغا باز ہے۔ بھٹتا ہے۔ بکرا کر نفس پرست ہے۔ عیاش ہے۔" فلاسفہ طریقہ مثالیہ لوہر کے نزدیک "مڈیاں ہیں۔" رنگینے والے کپڑے ہیں۔ مینڈک ہیں۔ جو میں ہیں۔" ان فلاسفہ کو وہ جس نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اگرچہ کیلون نے ان خیالات کا بوجھت اعادہ نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس بارے میں لوہر ہی کا ہم صغیر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے بہر پر ذرا سا بھی احسان نہیں ہے۔ سائنس کو ابھی ایک بہت کڑی منزل کا سامنا تھا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں نورات کی اُس چادر کے مطابق پہیلانے پر ابھی

تک مجبور تھا جو طول میں پروکرسٹینز کے ضرب المثل ولے فولادی پلنگ سے نہ کم تھی نہ زیادہ
 مسیحیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نامبارک وہ دن ہے جبکہ اُس نے اپنے آپ کو
 سائنس سے علیحدہ کر لیا۔ اُس نے آریجن کو جو اُس زمانہ (۳۳۵ء) میں کلیسا کی طرف سے سائنس
 کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا مجبور کیا کہ اسکندریہ چھوڑ کر قیصرہ چلا جائے۔ اس کے بعد
 پیشوایان دین عیسوی صد ہا سال تک اس کو سائنس میں مصروف رہے کہ حقیقت اشیا کی ترویج
 بذریعہ آیات انجیل کریں لیکن اس کو سائنس میں جو ناکامیاں انہیں نصیب ہوئیں ان کی پردہ
 درمی تیسری سے لیکر سولہویں صدی تک کی تاریخ عالم کر رہی ہے۔ قرون متوسطہ کی ظلمت کا
 باعث یہی مہلک طرز عمل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی مین زمین کہیں کہیں روشنی
 کی ایک جہلکی سی نظر آجاتی ہے یعنی فریڈرک ثانی اور الفانسو دہم جیسے مشاہیر کے قابل قدر
 کارناموں سے ہماری نگاہ دوچار ہوتی ہے جنہوں نے وسیع الخیالی و آزادہ روی کے بلند
 مینارہ پر کھڑے ہو کر ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ تمدن کو علم و فضل کی کس قدر محتاج ہے اور
 جنکو اُس وادی بق و ق میں بھی جہان پادریوں کی تاریک خیالی کے باعث جہالت اور تعصب
 کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس ضرورت کا احساس ہو گیا تھا کہ صرف سائنس ہی انسان کی معاشرت
 کی اصلاح کر سکتا ہے لیکن ان چند نفوس کی کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ اکیلا سورما چنا
 بھاڑ پھوڑنے سے رہا۔

پروکرسٹینز ایک یونانی ڈاکو ڈسٹینر نامی کا عرف تھا۔ پروکروڈ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی کہنچاؤ
 یا تود کے ہیں۔ پروکرسٹینز اسی سے مشتق ہے یہ نام اس ڈاکو کو اس لیے دیا گیا تھا کہ جو مسافر اُس کو رہتے
 چڑھ جاتا تھا اُسے ایک فولادی پلنگ پر لٹا دیتا تھا۔ اور بد نصیب مسافر کا قد اگر پلنگ سے چھوٹا ہوتا تھا
 تو اُس کے جسم کو ٹنگریں میں بیان تک کہنچتا تھا کہ وہ پلنگ کے برابر ہو جاتا تھا اور اگر بڑا ہوتا تھا تو اُس
 بچارے کی ٹانگیں اسی نسبت سے کاٹ ڈالا کرتا تھا۔ اسی لیے پروکرسٹینز کے پلنگ سے استعاراً
 ناجائز زیادتی یا کمی مراد لی جانے لگی۔ مترجم

احکامات راے ابھی تک ایک ایسا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی بادشاہ میں سزا سے موت دی جاتی تھی جب کیلون نے سر ویٹس کو جنوا میں زندہ جلوا دیا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جابرانہ ایذا رسانی کے سانچ کا سر ابھی نہیں کچلا گیا۔ سر ویٹس کا جرم صرف اسی قدر تھا کہ اُس کے عقاید فلسفیانہ تھے یعنی اُس کا خیال یہ تھا کہ مسیحیت کے اصلی عقاید ناسیاء کی کونسل کو انعقاد سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ روح القدس روح عالم کی طرح تمام کائنات میں ساری دوا کر ہے اور خاتمہ کائنات پر مسیح کے ساتھ وہ جوہر ذات باری میں جس سے اس کا صدور ہوا تھا ضم ہو جائے گی۔ اس عقیدے کی بادشاہ میں سر ویٹس کو دہمی آج پر کباب کی طرح بہون ڈالا گیا۔ ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ پراٹسٹنٹ فتوے اور اُس کیتھولک فتوے میں کچھ بھی فرق ہے جس کی رو سے دینی کو ۱۶۲۹ء میں حکام محکمہ احتساب عقاید نے بمقام ٹولوز اس علت میں زندہ جلوا دیا کہ اُس نے کتاب ”ڈایالاگز کنفرنگ نیچر“ (مکالمات دربارہ حقایق فطرت تصنیف کی تھی۔

چھاپے کی ایجاد اور کتابوں کی اشاعت سے وہ خطرات پیدا ہو گئے جن کے آگے ”انکوئریشن“ کے مطالعہ کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ۱۵۵۹ء میں پاپاے پال چہارم نے محکمہ ترتیب فہرست کتب محرمہ قائم کیا جس کے حالات ہم ایک مورخ کے الفاظ میں حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں؛ ”اس محکمہ کا فرض یہ ہے کہ کتب و مسودات مقصود الاشاعت کی جانچ پڑتال کر کے یہ فیصلہ کرے کہ آیا عامہ خلایق کو ان کے مطالعہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں۔ ان کتابوں میں جن میں بے شمار غلطیاں نہ ہوں بلکہ بعض مفید ذہنیہ ذخیرہ حقایق پائے جائیں ایسی اصلاح کرے جس سے وہ عقاید کلیسا کے مطابق ہو جائیں۔ ان کتابوں کو جن کے اصول ملحدانہ و زندیقانہ ہوں ممنوع الاشاعت قرار دے اور ملحدانہ تصانیف کے مطالعہ کا خاص حق خاص خاص اشخاص کو عطا کرے اس محکمہ کے ارکان مجلس انتظامی کا اجلاس بعض دفعہ ہوا جب پاپاے اعظم لیکن عموماً کر دینال کے محل میں بصدر

کر دینا لہو صوف ہو تا ہوا اس کے اختیارات محکمہ احتساب عقاید کے اقتدارات سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس لیے کہ اس کو نہ صرف انہیں کتابوں کی اشاعت میں دست اندازی کرنے کا اختیار حاصل ہے جن میں رومن کیتھولک مذہب کے مخالف عقاید مندرج ہوں بلکہ ان تصانیف کی اشاعت بھی اُس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں جن کا موضوع فرایض و وجوب اخلاق۔ انضباط تاویسات کلیسا اور صیانت مقاصد خلق اللہ ہو۔ اس محکمہ کی وجہ تسمیہ لمحہ ان تصانیف اور اُن کے مصنفین کے اسماء کی فہرست ہے جو بہ ترتیب حروف تہجی اس کے حکم سے تیار کی جاتی ہے۔

فہرست کتب محررہ میں اول اول اُن کتابوں کا نام درج تھا جن کا مطالعہ ناجائز قرار دیا گیا تھا لیکن جب اس سے کام نہ نکلا تو یہ قید لگا دی گئی کہ ہر اُس کتاب کا مطالعہ ممنوع ہے جس کے پڑھنے کی صریح اجازت نہ دی گئی ہو۔ اس بے باکانہ دشوخ چشمانہ حکم کا مقصد یہ تھا کہ بجز اُن معلومات کے جن کو اغراض کلیسا کے سامنے تطابق و توافق ہو اور کسی قسم کا علم لوگوں میں پھیلنے نہ پائے۔

اس سے واضح ہو گا کہ کلیسا سے مسیحی کی دو حریف جماعتیں یعنی پراٹسٹنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں کہ بجز اُن علوم کے جو اُن کی رائے میں کتب مقدسہ کے نقیض نہ ہوں اور کسی علم کو مسالمت اور رواداری کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ کیتھولک فرقہ کی قوت کا چونکہ ایک مرکز موجود تھا اس لیے جہاں اُس کی حکومت قائم تھی وہ اپنے فیصلہ کی تعمیل بہ جبر کرا سکتا تھا اور فہرست کتب محررہ کے نفاذ میں حکومت کے زور سے کام لے سکتا تھا لیکن پراٹسٹنٹ فرقہ کا اثر مختلف اقوام میں پھیلا ہوا تھا اور اُس کی قوت مختلف المکز تھی۔ لہذا وہ کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ اُس کا طرز عمل یہ تھا کہ مجرم کو راندہ درگاہ کلیسا قرار دیکر اُسے برادری سے خارج کر دیا جاتا اور یہ طریقہ شاید دوسرے طریقہ کی بنیاد پر کچھ کم موثر نہ تھا۔

ہم ابواب سابق میں ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں ادھیل عیسائیت ہی سے مخالفت چلا آتا تھا۔ اس مخالفت کے کرشمہ میں ہر صدی میں نظر آتے ہیں عجائب اسکندریہ کی بربادی اسی کا نتیجہ تھی۔ ایبھینا اور وکلف کی فلسفیانہ روشن خیالی میں اسی کی جھلک پائی جاتی ہے تیسری صدی کے ملاحدہ ورنادو کا تورات کے بیان پیدائش کو فرط استحقار سے خود مہمل قرار دینا اسی کا کام تھا۔ لیکن کہیں کوپرنیکس کپلر اور گلیلیو کے زمانہ میں جا کر اُس آہنی زنجیر کے حلقوں نے جو سائنس کے پاؤں میں عیسائیت نے ڈال رکھی تھی مشق گستگی شروع کی کلیسا کی سیاسی قوت ہر ملک میں بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور سربراہ اور دکان کلیسا دیکھ رہے تھے کہ وہ ربی زمین جس پر مسیحیت کے مالیشان محل کی بنیاد قائم تھی اس کو پاؤں تلے سے نکل جا رہی ہے۔ جبروتندی کے ساتھ مخالفین کی جنگی کرنے کا طریقہ جو زمانہ سابق میں بہت کچھ کارگر ثابت ہوا انتخاب بیکار و بے اثر تھا۔ اکا دکا فلاسفوں کا آگ میں جلا دیا جانا بجا ہے اس کے کہ اُس کی اغراض کے لیے مفید ثابت ہوتا اور الٹا موجب نقصان ہو رہا تھا۔ ہیئت کے دگل میں جب مذہب عیسوی خم ٹھونک کر اُترا تو اُس کا مد مقابل ایک اکیلا گلیلیو تھا لیکن اس یکہ و تنہا پہلوان نے اُسے ارٹنگے پر لا کر ایسی بیچنی دی کہ اُس کا سارا زعم باطل ہو کر خاک میں مل گیا اور جب نیوٹن کی غیر فانی تصنیف شائع ہوئی تو باوجودیکہ لائبنٹز نے یورپ بھر میں پکار کر کہہ دیا کہ نیوٹن نے خدا سے اُس کے بعض بڑے بڑے اوصاف چھین کر طبعی مذہب کی جڑ کھوکھلی کر دی ہے لیکن کلیسا ایسی ہٹی بھولا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

نیوٹن کے زمانہ سے لے کر آج کے دن تک اُس دریا کا پانی جو معتقدات کلیسا اور رسالت سائنس کے درمیان حائل ہے روز بروز زیادہ چوڑا ہوتا چلا آیا ہے۔ کلیسا نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز اور اجرام کائنات میں سب سے بڑا جسم ہے۔ اور آفتاب ماہتاب اور ستارے اس کے تابع ہیں۔ اُس کا یہ دعویٰ علم ہیئت نے باطل کر دیا۔ اُس نے نہایت

دوثق کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ رو سے زمین پر ایک عالمگیر طوفان چھا گیا تھا جس کے فرو ہونے پر صرف ہی حیرات زدہ رہے جو کشتی نوح میں موجود تھے۔ علم طبقات الارض نے اُس کے اس دقیقہ نوسی طلسم کو بھی توڑ دیا۔ اُس نے پڑے شد و د سے اس عقیدے کی نفی کی تھی کہ اول اول صرف ایک انسان موجود تھا جو کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے جسمانی و اخلاقی کمال کی حالت میں پیدا کیا گیا مگر اس پایہ اعلیٰیت سے بوجہ اپنے گناہوں کے گر گیا۔ علم الانسان نے اُس کے اس ادعا کی بھی قطعی کھوٹی اور ثابت کر دیا کہ انسان لاکھوں سال سے کرہ زمین پر آباد ہے اور اُس کی ابتدائی حالت وحشیانہ بن میں ننگل کے درندوں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ بہت سے جملے لوگوں نے جن کی نیت کے اچھے ہونے میں شک نہیں کوشش کی ہے کہ کتاب پیدائش کے بیانات کو سائنس کے اکتشافات سے تطبیق دین لیکن اُن کی کوشش سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسیحیت اور سائنس کا اختلاف اتنا بڑا کہ اُس پر مخالفت کا اعلان ہونے لگا اب بجز اسکے چارہ نہیں کہ ان حریفوں میں سے ایک کو ہار مانتی پڑے۔

جب صورت واقعات یہ ہے تو کیا ہو کہ یہ استحقاق حاصل نہیں ہے کہ اس کتاب کو جو دوسری صدی عیسوی سے حقائق علمیہ کی بارگاہ پر پیش کی جا رہی ہے بہ نظر انتقاد دیکھیں اور اس کے دعوے ملہم من الہی کو جانچیں جس کتاب کا دعویٰ ایسا بڑا اور درجہ اتنا اونچا ہو اُسے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے انسان کے ناقدانہ تبصرہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مسیحیت کے ابتدائی دور میں بہت سے سربراہ اور وہ پیشوایان کلیسا کو تورات کی پہلی پانچ کتابوں کے مصنف کی شخصیت کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دانگیر تھے قلت گنجائش عبادت نہیں دیتی کہ ہم اس مقام پر اُن واقعات و دلائل کو بہ تفصیل درج کریں جو آج تک اس بارے میں پیش کی جاتی رہی ہیں اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں اور ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے مالہ و ماعلیہ کے متعلق جمع ہو گیا ہے۔ ناظرین کو اگر اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ تقدس مآب و فضیلت آئینہ پاری پر ٹیڈ کی کتاب

”دی اولڈ اینڈ نیو ٹیسٹ کنکٹڈ“ (ربط عہو و عتیق و جدید) ملاحظہ فرمائیں جو اٹھارہویں صدی کی انٹاپروڈازی کی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ یادری کو لنز نے بھی حال میں اس معنوں پر شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ فقرات ذیل سے اس بحث کی موجودہ کیفیت پوری طرح سے واضح ہوگی:-

کہا یہ جاتا ہے کہ عبدعزیز کی پہلی بی بی کننا بن کو حضرت موسیٰ نے خدا کے الہام سے قلمبند کیا۔ پس اس کی خدمت میں نسخہ خدا کا تصدیق کیا ہوا اور لکھوایا ہوا ہے حضور ہے کہ نہ صرف سائنس سے صحیح و موافق تسلیم کرے بلکہ تمام دنیا اس کی مولوثخت کی معترف ہو۔

لیکن اس موقع پر یہ سوال ہوے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کون تھیں جتنی نے تورات کی نسبت ایسا بڑا دعویٰ کیا یا وہ کون سی ایسی بات ہے جس کی بنا پر یہ دعویٰ قابل قبول ہو سکتا تھا صاف ظاہر ہے کہ خود یہ کتاب تو اس ادعا سے عاری ہے۔ کسی مقام پر بھی اس میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ اس کا مصنف ایک شخص واحد ہے اور کہیں بھی یہ کفر آمیز نکری اس میں موجود نہیں ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے۔

بنی نوع انسان کی سرریح الاعتقاد پر یہ دست نقرت کہیں دوسری صدی عیسوی میں
جا کر دراز کیا گیا۔ اس دعوے کی ابتدا اعلیٰ طبقہ کے مسیحی فلاسفہ سے نہیں ہوئی بلکہ اُن جو شلکر
پادریوں سے ہوئی جن کی تحریرات ثابت کر رہی ہیں کہ وہ تبصر علمی سے عاری اور فتنہ نقید سے
نا آشنا تھے۔

دوسری صدی لڑا آج تک ہر زمانہ میں مسلم الثبوت قابلیت کے سبھی دیہودی علماء ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ان دعاوی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان علماء کا فیصلہ خود تو رات کی اندرونی شہادت پر مبنی ہے جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف زیادہ بہین تو دو مصنفین سے تو ضرور منسوب کی جاسکتی ہے اور ان دونوں کا نام الہزم دیہودا ہے۔ پیٹل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہودی قصہ کی عبارت سے جا بجا اس

امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ کسی اصلی نسخہ کی نقل ہے اور الوہی ہی قصہ سے بالکل جدا ہے۔ جن دو ماخذوں سے یہ قصے لیے گئے ہیں وہ کئی ایک اعتبار سے متضاد و متباہن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابیں عبرانی نسخوں یا عبرانی بائبل کے مطبوعہ نسخوں میں کہیں بھی حضرت موسیٰ سے منسوب نہیں کی گئیں اور نہ انہیں نسخہ سبعینیہ یا ترجمہ لاطینی ہی میں "صحف موسیٰ" کہا گیا ہے بلکہ یہ نام انہیں جدید تراجم ہی میں دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تورات کے منزل الہی صرف حضرت موسیٰ ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ کی وفات کا واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تورات اس واقعہ کے کئی سو سال بعد تلمیذ کی گئی اس لیے کہ اس میں ان واقعات کے حوالے موجود ہیں جو یہودیوں میں سلسلہ فرماؤں کے قیام کے بعد پیش آئے۔

وہ شخص بڑا ہی بے باک ہے جو تورات کو خدا کا الہامی کلام سمجھتا ہے اس لیے کہ اس میں ایسے ایسے اصداغ و نواقض اور امور غیر عادی و غیر ممکن بھرے پڑے ہیں جن کا خداے پاک کے کلام میں پایا جانا ممکن نہیں اور یہ وہ اصداغ و نواقض ہیں جن کی حقیقت کا انکشاف جرمنی اور انگلستان کے بہت سے متقی و راستہ دار علماء کر چکے ہیں۔ ان تنقید نگاروں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب پیدائش ایک قصہ ہے جس کا ماخذ سنی سنائی فرضی روایات ہیں۔ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ تورات کی پانچوں کتابیں بائبل اعتباراً تاریخی سے ساقط اور غیر موسوی الاصل ہیں۔ اس میں ایسے ایسے خلاف قیاس مضاد اور منقاد امور درج ہیں جو کل تورات کی تقلید و تکذیب کے لیے کافی ہیں اور ایسے لیے عیوب و اسقام پاسکے جاتے ہیں جو اگر زمانہ حال کی کسی تاریخی تصنیف میں موجود ہوں تو اس کے اعتبار کو فوراً زایل کر دیں۔

ہنگ ٹنبرگ نے ایک کتاب اس بحث میں لکھی ہے کہ تورات اصلی ہے یا محرف اس میں

لے ایک جرمن عالم جو ۱۸۷۷ء میں یونیورسٹی برلن میں الہیات کا پروفیسر تھا۔ مترجم۔

وہ ایک مقام پر لکھتا ہے: "ہر تاریخی تصنیف جس میں التباس و تدلیس سے کام لیا گیا ہو مندر ہے کہ کبھی نہ کبھی اجتماع مذہب کی الجھن میں پڑے اگر تورات اصلی نہیں ہے تو لامحالہ اس کا بھی یہی حشر ہونا چاہیے۔ اگر تورات لتبس اور محرف ہے تو جو تاریخی واقعات اور قوانین اس میں مذکور ہیں وہ ظاہر ہے کہ مختلف زمانوں میں وضع کیے گئے ہیں اور کئی صدیوں کے دوران میں مختلف اشخاص نے انہیں سپرد قلم کیا ہے۔ جس کتاب کا طرز تصنیف یہ ہو اس کا اصداد و نواقض سے معر ہونا ممکن نہیں اور کوئی شخص جو بعد میں اسے بہ تعریف شایع کرے خواہ وہ کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو ان اصداد کے نشانات پوری طرح سے ہرگز نہیں مٹا سکتا۔"

عبارت مندرجہ بالا پر اس قدر اصرار کیا جاسکتا ہے کہ عذرانے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب عزرا بنی باب دوم آیت ۱۴) کہ اس نے پانچ دوسرے اشخاص کے ساتھ مل کر تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو چالیس دن کی مدت میں لکھا دیا ہے۔ اس کے بعد کہ جب یہودی بابل میں قید تھے تو ان کی مقدس کتابیں جلادی گئی تھیں۔ اس کے بعد اُسے تورات کے قلمبند کئے جانے کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ آفرینش عالم سے لیکر اس وقت تک جتنے واقعات پیش آئے تھے ان سب کو اس نے سپرد قلم کیا۔ شاید اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کتاب عزرا منہجہ اسفار محرف ہے لیکن اس کے جواب میں یہ الزامی استفسار کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس دعوے کی مویہ ایسی براہین و دلائل ہیں جو موجودہ فن تنقید کے حلقہ کی تاب لاسکی ہیں؟ مسیحیت کے ابتدائی دور میں جب کہ قصہ ہبوط آدم مسیحیت کے ارکان میں داخل نہ تھا اور مسئلہ کفارہ متذقی و حکیم کو اس درجہ کو نہ پہنچا تھا جس پر اسے بالآخر انسلم نے پہنچا دیا پیشوایان کلیسا کو اس لہر کا عام غور سے احتراف تھا کہ بطن غالب عزرا نے تورات کی پہلی پانچ کتابوں کو حسب بیان خود حقیقتاً تصنیف کیا چنانچہ سینٹ جروم کہتا ہے: "تم خواہ یہ دعویٰ کرو کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں موسیٰ نے لکھیں خواہ یہ کہو کہ عزرا نے ان کتابوں کو اور سر تو قلمبند کیا

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں“ علیٰ ہذا القیاس کلیئس الگز نڈرنس کا قول ہے کہ جب آئینہ نصر نے یہودیوں کو تید کر رکھا تھا اور تورات کا نسخہ صنایع کر دیا گیا تھا تو عزرا بنی نے الہی طاقت سے اسے از سر نو قلبند کیا۔ آئرنس کو بھی اس قول کے ساتھ اتفاق ہے۔

کتاب پیدائش کے پہلے دس باب سائنس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں کے اعتبار سے تورات کے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔ ان ابواب میں جن واقعات کا ذکر ہے وہ مختلف مصنفین کی روایات کے ناتمام اجزائے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تدقین و تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو ان سب میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش صحراے عرب میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی تھی بلکہ دریائے فرات کے کنارے تعینف کی گئی تھی اس میں ہیث سے کلہانی محاورات اور سریانی مختصیات موبودہین مثلاً کوئی مصری بحیرہ روم کی نسبت یہ نہ لکھو گا کہ یہ سمندر مغرب کی سمت میں واقع ہے لیکن سریانی ضرور لکھے گا اس کے علاوہ اگر کتاب پیدائش کو ایک تخیل فرض کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تخیل کے پردے اور باقی سب سامان مصری الاصل نہیں ہے بلکہ سریانی مصنوعات سے ہے پیدائش کے پہلے دس ابواب میں خود داستان مندرج ہے وہ ان قصوں سے ملتی جلتی ہے جو سریانی سلاطین کی خشتی کتابوں کی شرخی الخط عبارت میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ سریانی آثار قدیمہ کے ماہرون کا بیان ہے کہ ایک روایت جو طوفان سے تعلق رکھتی ہے برآمد ہو بھی چکی ہے۔ اور عجیب نہیں کہ باقی روایات

۱۷ ساتویں صدی قبل مسیح میں آسور بنی پال اسیر یا کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کا پایہ تخت شہر نینوا تھا جس کے کندہ و متفرقین یورپ کی ان تھک کاوشوں کو ایک قدیم تمدن کی عبرت ناک داستان بنا رہے ہیں۔ آسور بنی پال کے محل میں ایک عظیم الشان خشتی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ کے حواجز ابرآمد ہوئے مین ان میں سے چند اینٹوں پر کسی قدیم سامی زبان میں ایک روایت مندرج ہے جس کے واقعات طوفان لغی سے ملتی جلتے ہیں۔ سریانی آثار کے ماہرون نے بالاتفاق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جو روایت ان اینٹوں پر لکھی ہوئی ہے

بھی اسی طرح آگے چل کر دبے دبائے کھنڈروں میں سے نکل آئیں۔

پیدائش زمین و آسمان۔ بارغ عدن۔ مادطین کے غیر سے مرد اور مرد کی ایک پسلی سے عورت کی تخلیق۔ سانپ کا اغوا۔ تسمیہ حیوانات۔ ملائکہ۔ شعلہ زن تلوار۔ طوفان اور کشتی۔ آب طوفان

نوٹ صفحہ ۳۰۵۔ وہ کسی قدیم تر تصنیف کی نقل ہے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے درہزار سال قبل یہ روایت اسبربا میں زبان زد خاص و عام تھی اس روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

”کئی ہزار سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ دو یونیا میں ایک شہر آباد تھا جس کا نام سیریک تھا۔ اس شہر میں تہی سدا نامی ایک شخص رہتا تھا ایک رات اس شخص نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ عالم خواب میں اُسے معلوم ہوا کہ عنقریب ایک بڑا طوفان آیا جاتا ہے اور اُسے اشارہ ہوا کہ فوراً ایک جہاز بنا نا شروع کرے جس میں طوفان کے نمودار ہونے کی خبر پاتے ہی وہ اپنے خاندان اور احباب و اقارب سمیت کچھ بیلو اور کچھ جنگلی جانور اور کچھ نباتات کے بیج لیکر سوار ہو جائے اور تباہی سے بچ جائے تہی سدا نے جانگے ہی اس اشارہ غیبی کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ اُسے ایک مضبوطی کا جہاز تیار کیا جس کو اندر اور باہر تیر سے لیس دیگیا۔ اس کے بعد اس جہاز کو پانی میں چلا کر دیکھ لیا گیا کہ دریا کی موجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ اور جب اطمینان ہو چکا تو ضروری سامان معاش جہاز پر بار کر دیا گیا اور لیکے ہوئے تیار و معتبر ناخدا مقرر کیا گیا۔

”آخر طوفان کی آمد آمد کی موعودہ خبر تہی سدا کو دی گئی اور وہ اپنے بال بچوں اور اعزہ و اقربا سمیت کشتی میں سوار ہو گیا۔ اُس نے احتیاط کی راہ سے کشتی کا دریچہ بند کر لیا اور تس ہیا کو بوناخدا تھا عرشہ پر چھوڑ دیا کہ جس طرح بن پڑے طوفان کا مقابلہ کرے۔ اس کے بعد باد و بلان کا طوفان شروع ہوا۔ مینہ موسلا دہار برسنے لگا۔ زمین کے چشمے پھٹ پڑے کھل پانی میں غرق ہو گیا۔ ہوا کے ٹھپڑوں سے سوجھیں بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ زمین و آسمان و ہندکار بادل سے ایک ہو گئے۔ چھ دن اور سات رات تک جھکڑ چلتا رہا اور مینہ برستا رہا۔ لیکن کشتی سلامت رہی۔ آخر ساتویں دن طوفان تھا اور تہی سدا عرشہ پر گیا۔ دیکھا تو چاندن طرف پانی ہی پانی تھا اور انسانی لاشیں اور جانوروں کی لاشیں

کا ہوا کے چلنے سے خشک ہو جانا۔ مینارد بابل کی تعمیر۔ اختلاف السنہ یہ تمام دور و ایات ہیں جو عزرا کو سریانی کتبوں اور تخریروں سے بہم پہنچی تھیں۔ کتاب پیدائش کے گیارہویں باب میں وہ دفعۃً و بعتۃً یہودیوں کی تاریخ کہنہ شروع کر دیتا ہے گویا یہاں پہنچ کر اس کی تاریخ عالم

نوٹ صفحہ ۳۰۶۔ موجود پر تیرتی پرتی تھیں۔ اپنی قوم اور ملک کی یہ تباہی دیکھ کر ہسی سدا بہت رویا۔ بہت دور تشریر کے پہاڑ نظر آئے کشتی اُن کی طرت چلائی گئی اور اس کا پیندا اوپنی زمین پر جا کر ٹک گیا۔ جب اور سات دن گزر گئے تو ہسی سدا نے ایک فاختہ چھوڑی جو کوئی اڈانہ پا کر روٹ آئی۔ اس کے بعد باپا اڑائی لگی وہ بھی خشکی کے موحہ نہ ہونے سے واپس آگئی۔ سب سے آخر میں ایک کو اچھوڑا گیا اس نے پرندے نے یہ معلوم کر لیا کہ طوفان تمام گیا ہے اور پانی پایاب ہو گیا ہے اس لیے وہ کشتی کے قریب تو آیا مگر اندر داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر ہسی سدا نے باقی کے جنگلی جانوروں کو چھوڑ دیا جو چاروں طرف منتشر ہو گئے اور وہ خود اپنے کنبہ اور دوستوں سمیت ایک پہاڑ کی چوٹی پر جو پاس ہی تھا چڑھ گیا جہاں اس نے اپنی سلامتی کے شکرانہ میں دیوتاؤں کو قربانی دی۔ ”رہسی سدا کی داستان“ از پروفیسر کپلے مندرجہ رسلان سنیتھ سنہ ۱۸۹۱ء

رہسی سدا کا یہ قصہ طوفان نوح کی روایت سے اس قدر مشابہ ہے کہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ دونوں قصے ایک ہوں۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ طوفان وادی زرات میں واقع ہوا اور حضرت نوح بھی اسی سرزمین میں مبعوث ہوئے تھے تو اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ نوح اور رہسی سدا ایک ہی شخص کے دو مختلف نام ہیں یا ممکن ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہو اور رہسی سدا کی سرگزشت نوح کو پیش آئی ہو۔ پروفیسر کپلے نے اس مضمون میں جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے دلائل قاطع ثابت کر دیا ہے کہ رہسی سدا والا طوفان مقامی تھا عالمگیر نہ تھا۔ جن حضرات کو ان دلائل سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو وہ مضمون متذکرہ کا مطالعہ فرمائیں۔ پس اگر رہسی سدا اور نوح ایک نہ ہوں تو طوفان نوح بھی جو رہسی سدا کے طوفان سے بعد میں آیا ہوگا ضرور کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف مقامی ہو۔

ان خلاف عقل قیاسات کی ذمہ دار تورات ہے کہ طوفان عالمگیر تھا جس نے روئے زمین کے حیوانات

ختم ہو جاتی ہے اور وہ صرف ایک خاندان یعنی نسلِ سام کے حالات کی تفصیل کر لئے اپنے قلم کو وقف کر دیتا ہے۔

ڈیوک آف آرگل نے اپنی کتاب ”پرائیمرل مین“ (دانشِ اولین) میں اسی تحدید پر قلم اٹھا کر

نوٹ لکھتے ہیں، ۳۰۶۔ دہانات کو تباہ کر دیا اور حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں نے زمین کو از سر نو آباد کیا۔ اصلی قصہ کی حقیقت جو عزرائیلی کو غالباً کسی سرکاری ماخذ سے ملے ہے صرف اسی قدر ہے کہ حضرت نوحؑ یا جو کچھ بھی اُن کا دور سرانجام ہوا اُس مصیبت سے پیش از پیش آگاہ ہو گئے جو اُن کی قوم میں بشکل طوفان آنے والی تھی اور ایک کنسی تیار کر کے مع اپنے قبائل و رفقائے اُس میں سوار ہو گئے اور اس طور پر تباہی سے بچ گئے۔ جب تورات میں تحریر شروع ہوئی تو اس قصہ پر محققین کی سرلیح الاعتقادی اور ادھام پرستی نے بہت کچھ لاطیال و لالینی امانے کر دیے۔

قرآن مجید میں بھی قصص و حکایات موجود ہیں لیکن باوجودیکہ اُن کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان قصوں کے پڑھنے والے ان سے محض ایک اخلاقی سبق یا پیرایہ تیشل حاصل کریں پھر بھی دور از کار اور پاور ہوا سائنس کے عصر کو ان میں سے نہایت احتیاط کے ساتھ خارج کر دیا گیا ہے جو آج کل یورپ کے محسن و تفصیک کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے تورات اہل سائنس کی نظروں میں لغویات و مزخرفات کے ایک مجموعہ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی۔

واقعہ طوفانِ نوح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید تورات کی تصدیق کرتا ہے لیکن صرف اُس حد تک جس حد تک کہ حقیقت نفس الامر کو تعلق ہے۔ وہ اس کے تحریری مقامات کا مصدق بن کر جائز نکتہ چینی کا نشانہ نہیں بنا۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ ”لقد ارسلنا نوحًا اٰلٰی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من اللہ غیوہ“ صاف بتا دیا ہے کہ حضرت نوحؑ صرف اپنی قوم یا امت کی ذریعہ کے لیے بھیجے گئے تھے کل دنیا کی رہبری کے لیے مامور نہ ہوئے تھے اور اس لیے طوفان کا عذاب اُن کو جھٹلانے کی پاداش میں عالمگیر نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی توضیح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے۔

فَلَمَّا بَوَّأْنَا جَنَّةَنا وَالَّذِیْنَ مَعَهُ فِی الْفَلَاحِ وَاعْرِضْنَا لِذِیْنَ کَذَبُوا بِآیَاتِنَا اَنَّهُمْ کَاْفُوْنَ

معانی کے بھول یوں برساے ہیں کہ دسام کے خاندان کا شجر نسب ہمارے لیے بجز اسناد
اعلام کی ایک فہرست کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ایسا شجرہ ہے جس میں منجملہ ان
کرد و نون انسانی خاندانوں کے جو اُس وقت رو سے زمین پر پہلے سے آباد تھے صرف
گنتی کے چند خاندانوں کی سلسلہ بسلسلہ نسب شماری کی گئی ہے۔ بجز اس ترتیب نسب کی
اور کچھ نہیں بتایا گیا اور اس ترتیب کا مسلسل و مکمل ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔ زمین یہ مطلق نہیں
بتایا گیا کہ اُس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے جس پر یہ چند نام کسی فانوس خیالی کے
نقوش کی طرح گزرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن مابین ہمہ یہ پردہ کچھ کچھ دیر کے
لیے اُٹھ جاتا ہے اور ہمیں اُن عظیم الشان واقعات کی تشکیل دکھائی دی جاتی ہیں جن کا
عمل مدت ممتد سے جاری ہے۔ یہ تشکیل بالکل دھندلی اور مدھم ہیں اور اُن کی صرف پرچھائیں
سی نظر آتی ہے۔ ان کی حرکت کا رخ بھی ہم کو صاف صاف محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ آوازیں
سنائی دے رہی ہیں جو کان میں بہت سی امواج آب کے شور کی طرح پڑتی ہوئی معلوم ہوتی
ہیں۔ پتھلڈ نے اس بارہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے جس کے ساتھ ہمیں پورا
اتفاق ہے: یہ تحقیقات کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں مختلف تصانیف سے تالیف کی گئی
ہیں نہ صرف عہد عتیق کے تاریخی مقامات کی تاویل یا مناسب ہوگا اگر یوں کہا جائے کہ
کل الہیات و تاریخ کی تاویل کے لیے نہایت ہی ضروری ہے بلکہ نئے انتقاد و ادب کی تاریخ
میں بھی اس سے زیادہ یقینی اور موثق تحقیقات کا ہونا ممکن نہیں۔ جو فریق کو چہ تنہید سے
نابلد ہے وہ خواہ کیسی ہی تاویلات بار دہ عذرات رکھیکہ کیوں نہ پیش کرے لیکن اس میں شک

نوٹ بقیہ صفحہ ۳۰۸ عین۔ جس سے ثابت ہے کہ مرت وہی لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے آیات ربانی
کو جو بواسطہ نوح علیہ السلام نازل کی گئی تھیں جہتلیا۔ کشتی کے بنائے جانے حضرت نوح اور اُن کے
اہل ایمان پر دونوں کے اُس پر سوار ہونے اور طوفان کو فرو کرنے پر کشتی کے ایک اونچے مقام پر جاکر ٹھہرے اور اُن
سب لوگوں کے بچ جانے کا واقعہ قرآن میں تفصیل درج ہے لیکن یہ تفصیل ایسی نہیں ہے جو تورات کی تفصیل کی طرح
مستند و متبرک ہو۔ مترجم۔

نہیں کہ جب تک امتقاد کے اصول قاہم ہیں اُس وقت تک اس تحقیقات کے مسلم الثبوت ہونے میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکتا۔ نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی کی جس بلندی پر صدیوں کی تدقیق و تحکیم کے بعد ہم آج پہنچے ہیں اُس پر چڑھ کر اگر کوئی غیر متعصب اور حقائق آشنا شخص اس تحقیقات پر نظر ڈالے گا تو ممکن نہیں کہ وہ اس کے نتائج سے متاثر نہ ہو۔

ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم ان صحیفے سے ابا کرین؟ کیا اس امر کا اعتراض کہ باغ عدن کے ہبوط کی داستان ایک فرضی روایت ہے مسیحیت کے سب سے زیادہ مقدس و متعقبات یعنی کفارہ کے مسئلہ کو نیست و نابود نہیں کر دیتا؟

بہین چاہیے کہ ٹھنڈے دل سے اس حقیقت پر غور کریں۔ مسیحیت کو قرونِ اولیٰ میں جبکہ وہ دنیا کو اپنا حلقہ گروش بنارہی تھی یا مسخر کر رہی تھی اس عقیدہ کا یا تو مطلق علم نہ تھا یا تو اس قدر تھا کہ اُس کا ہونا برابر تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ تریلین نے اپنے جواب میں جہانِ سمیت کے اور ارکانِ گناہ میں وہاں مسئلہ کفارہ کا کہیں ذکر نہیں کیا جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اگر اُسکو اس مسئلہ کا علم تھا بھی تو اُس کے نزدیک مسیحیت کے اصول میں شمار ہونے کے قابل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے مسئلہ کو اول اول فرقہ اور یہ کے اہل بدعت نے رواج دیا۔ اسکندریہ کے طبقہ متاہلین کو اس اعتراف نہ تھا۔ پیشوا یان کلیسا نے کبھی اس پر زور نہ دیا جس پادری نے کفارہ کو اس العقاید بنادیا وہ اسلم تھا۔ فلو جوڈیس لکھتا ہے کہ قصہ ہبوط محض ایک تمثیل ہے۔ آریجن کی رائے میں واقعہ ہبوط ایک رمز مجازی ہے۔ شاید بعض ٹیٹنٹ کلیساؤں پر مقبولیت کے ساتھ مسابنت و مناقضت کا الزام لگایا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ اسے ایک لحاظ سے مجازی اور ایک لحاظ سے حقیقی تصور کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم اُن کے ہم آہنگ ہو کر یہ تسلیم کر لیں کہ سانپ سے کنایتہ شیطان مراد ہے تو کیا کل قصہ ایک استعارہ میں تحلیل ہو جائے گا؟

افسوس ہے کہ کلیسا سے عیسوی نے تورات کی حمایت کی بلکہ خود ہلا کر اپنے گٹھے لگایا

ہے اور اس کی سرحدی اضداد و غلاط کی ذمہ داری برضا و رغبت خود اپنے اوپر عاید کر لی ہے۔ اس کتاب کو برحق ثابت کرنے کی کوشش بصورت امکان یہودیوں کے لیے چھوڑ دی گئی چاہیے تھی کہ ادھنیں کی یہ کتاب ہے اور انہیں سے عیسائیوں تک پہنچی ہے۔ زیادہ ترافس اس بات کا ہے کہ تورات کی پہلی پانچ کتابیں جو اپنے اسقام و نقایص کی وجہ سے زمانہ حال کے انتقادی حلقوں کی تاب نہیں لاسکتیں سائنس کے حق میں بمنزلہ قول فیصل سمجھی گئیں۔ مخفی نہ رہے کہ ان کتابوں کی قلعی کھولنے والے مخالفین و معاندین نہیں ہیں بلکہ ایسے ایسے صاحب زہر و درع علمائے مسیحی ہیں جن میں سے بعض کی جہالت قدر مسلم ہے۔

پرائٹنٹ کلیساؤں نے تو کتب مقدسہ کو معیار حق قرار دیا لیکن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس زمانہ میں بھی پاپائے روم کے معصوم ہونے کے قابل ہیں۔ شاید یہ کہا جائیگا کہ اس عصمت کا اطلاق صرف اخلاقی یا مذہبی امور پر محدود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دینی اور دنیوی امور کا خطا فاصل کس مقام پر کھینچا جائے گا؟ معرفت مطلق یعنی ہمہ دانی کا حصہ چند خاص خاص مسائل پر نہیں جو سکنا ایسی معرفت کی نوعیت ہی کل اشیاء کے حقائق کے ادراک کی متکرم ہے اور اس لحاظ سے عصمت عن الخطا ہمہ دانی کی مترادف ہے۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اطالوی مسیحیت کے اصولی عقاید کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ پاپائے روم کا غلطی ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے لیے یہ ضرور نہیں ہے کہ منطق کی اس شکل کی غیر فلسفیانہ نوعیت پر بیٹھے جو غور کیا کریں۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ اور پاپاؤن کے سوانح عمری کی تنقید اس شکل کو نسخہ کیے دیتی ہے تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ غلطیاں اور خطائیں دکھائی دیتی ہیں جن سے انسان کی سرشت مرکب ہے اور پاپا یا روم کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم کو اتفاق ہوتا ہے تو بدکاری اور بغیر حق کی داستان پڑھنے میں آتی ہے۔

ممکن نہ تھا کہ روشن خیال ادبا نے نظر کیتھولک عقیدہ عصمت پاپائی کو بلا چون و چرا

تسلیم کر لیں۔ جن لوگوں کو اس عقیدے کے تسلیم کرنے میں تاہل ہے ان کی ناراضی مندی و استغاثہ کے لحاظ سے، وہ بڑی ترقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عقیدہ فطرت انسانی سے اس درجہ مغایرت رکھے گا اُس کا یہی حشر ہوگا۔ بہت سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ عصمت اگر فی الاصل موجود ہے تو بجز مجالس عمومیہ مسیحیہ کے ان کا وجود اور کہیں نہیں۔ لیکن واضح ہے کہ خود ان مجالس کو بھی اتفاق اجتماعی کی نعمت ہمیشہ نصیب نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں ہوا کہ کونسلوں نے باپا یان روم کو معزول بھی کیا ہے اور ان کے ہفوات و خطبیا کی نسبت مخالف تجاویز بھی صادر کی ہیں۔ پراٹسٹنٹوں کا یہ سوال بے وجہ نہیں ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کلیسا عصمت کی صفت سے متصف بھی ہے؟ اس امر کی کیا شہادت ہے کہ کلیسا کے اغراض و مقاصد کی حفاظت کسی کونسل میں منصفانہ اور واجبی طور پر کی گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ حق قلت راے پر منحصر نہ ہو بلکہ کثرت راے پر مبنی ہو؟ کیا یہ بات اکثر دیکھنے میں نہیں آئی کہ ایک فرد واحد کی حقیقت شناسی صحیح راے کے قیام کا باعث ہوتی ہے اور باقی تمام لوگوں نے اُسے جھوٹا سمجھ کر اور اُس کو ایذا نین پہنچا کر آخر کار مجبوراً اُسی کی راے کو صحیح تسلیم ہے اور کیا نام بڑے بڑے اختلافات کی تاریخ یہی نہیں ہے؟

سائنس کو ان حریفوں میں مصالحت کرنے سے کچھ سر و کار نہیں۔ اُس کا یہ کام نہیں ہو کہ اس امر کا فیصلہ کرتا پھرے کہ اہل مذہب کو معیار حق بائبل کی آیات میں ڈھونڈنا چاہیے یا مجالس عمومیہ مسیحیہ کے فیصلہ جات میں باپا پائے روم کے فرامین میں۔ دومرتبہ اس حق کا مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح اُس نے دوسروں کو پناہ دیا خود قیام کرنے کی اجازت دے رکھی ہو اسی طرح اُسے بھی اپنا خاص معیار قیام کرنے دیا جائے اگر وہ غیر تارکینی روایات کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے یا اس ادھار پر کہ کثرت راے ذریعہ احقاق حق ہے مطلق اعتنا نہیں کرتا یا انسان کے دعوئے عصمت کی تنقید کو واقعات آئینہ کے سپرد کر دیتا ہے تو خود اپنے ساتھ بھی اسی سرد مہری اور غیر جنبہ داری سے پیش آتا ہے۔ اگر

اسے معلوم ہو جائے کہ مسئلہ کشش ثقل یا مسئلہ ارتعاش نوزد واقعات سے توافق نہیں رکھتا تو وہ بلا تامل ان مسائل سے قطع تعلق کر لے اُس کا حشرِ ثمہ الہام کتاب فطرت ہے جس کے اوراق ہر وقت ہر شخص کے مطالعہ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یاراں نکتہ دان کے لیے اس کی صلاح مہم ہے۔ اپنے اصول کی اشاعت کے لیے وہ نہ کسی انجمن کی حمایت کا محتاج ہے نہ کسی جماعت کی تصدیق و خوانی کا رہین منت اُس کی وسعت غیر محدود اور اس کا مرور بولم پایان ہے اور اسی لیے انسان کا استکبار و تعصب اس کے ساتھ ساز و باز نہیں کر سکا۔ زمین پر ہر شاندار اور خوبصورت چیز میں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور آسمان پر اس کی داستان شمس و یازغہ و نجوم لامعہ کے لوزانی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔



نوان باب

نزاع در بارہ انتظام عالم

انتظام عالم کے تصور کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول بذریعہ توفیق ربانی دوم بذریعہ قانون بشری اول کا تعلق پیشوایان مذہب سے۔ بشری ثانی کی ترویج کا مختصر بیان۔

پکڑدہ قوانین دریافت کرتا ہے جو نظام شمسی پر مستوی ہیں۔ پاپا سے روم اس کی تصانیف کی تکفیر کرتا ہے۔ ڈاڈنسی فلسفہ حرکات و عمل کی بنیاد لیتا ہے۔

تکلیف علم تحریر کے احکام کے اصولی قوانین دریافت کرتا ہے۔ حیوش اجمام سہادی کی حرکات کو ان قوانین کے جزو اطلاق میں لاکر ثابت کرتا ہے کہ نظام شمسی کی عنان نظم و نسق مہندسانہ جبر کے ماتحت مین ہے۔ ہر شے ثابت کرتا ہے کہ کل کائنات اسی قانون کی تابع نوان ہے۔ مسئلہ ضابطہ الفہم اس پر شاہین کے اعتراضات۔

اس امر کا ثبوت کہ ترکیب ارضی و نشو و نما سے سلسلہ نباتی و حیوانی تابع قانون ہے۔

نباتات و حیوانات کا ظہور بذریعہ پیدائش نہیں ہوا بلکہ بذریعہ ارتقاء۔

حکومت قانون کا ثبوت انسانی جماعتوں کے تاریخی حالات اور نیز افراد انسانی سے

بہم پہنچتا ہے۔

اصلاح یافتہ کلیاتوں میں سے بعض اس خیال کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔

طریقہ نظم و نسق عالم کی دو تاویلین کی جا سکتی ہیں یا تو ہر واقعہ خدا کی دست اندازی و مداخلت سے پیش آتا ہے اور یا غیر متبدل و غیر متغیر قانون کا عمل انتظام دنیا کا ذمہ دار ہے۔

قسیوں کا ہنوں اور مذہب کے پیشواؤں کا رجحان ہمیشہ پہلی تاویل کی طرف ہوگا اس لیے کہ اُن کی دلی تمنا ہی ہے کہ عبادت گزار کی دعا اور لطیفہ غیبی کے درمیان اُن کی حیثیت حاجب یا شفیع کی سمجھی جائے۔ اس تاویل کی اہمیت کو لطیفہ غیبی کی نوعیت کی تعین کا دعوے اور بھی بڑا دیتا ہے۔ چنانچہ مسیحیت سے پہلے رومانی ہیٹ پرستوں کے مذہب میں کاہنوں کا فرض یہ ہوتا تھا کہ غیب دانی یا شگون شناسی کے ذریعہ سے یا جاٹوروں کے رووون کو دیکھ کر یا دیوتاؤں کی استمالت در صاجوئی کے لیے جھٹٹ چڑھا کر دعاؤں آئندہ کی نسبت حکم لگائیں۔ جب مسیحیت کا دور آیا تو رازداران شریعت کا باب یہ قدرت اس سے بھی اونچا ہو گیا یعنی پادریوں نے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ ہم اپنی سفارش یا شفاعت کے ذریعہ معاملات عالم کے انضباط و انقیاد میں حصہ لے سکتے ہیں۔ آفات و بلیات کو ٹال سکتے ہیں منتحیات دنیوی کا انعام دلا سکتے ہیں۔ معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں بلکہ قانون قدرت تک کو بدل سکتے ہیں۔

پس کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ کو کہ کائنات کا انتظام غیر متغیر قانون کے تابع ہے بہ نظر استحسان دیکھیں۔ اس مسئلہ سے اُن کی شان میں بڑھ لگتا تھا۔ اُن کی وقعت میں فرق آیا جاتا تھا۔ ایسا خدا اُن کے نزدیک نہایت ہی سہیب و مکروہ تھا جس پر انسان کی التجاؤں اور منتوں کا مطلق اثر نہ ہو سکے جس کی سر مہری و بے اعتنائی اُسے بندہ کے خضوع و خشوع پر ملتفت نہ ہونے سے اور جوہر تقدیر کی خوفناک بیرونیوں میں جکڑا ہوا ہو۔

لیکن اجرام سماوی کی باقاعدہ حرکات ہر زمانہ میں ارباب بعیرت کے دل پر ایک گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب بدن کی روشنی کا بڑھنا اور گھٹنا۔ قمر کا کمال و زوال موسموں کا اوقات مقررہ پر نمودار ہونا۔ سیارہ کی عجیبی نہی حرکت۔ یہ اور اسی قسم کے ہزار بانفشات اگر قدرت کے باقاعدہ و غیر متغیر عمل کے کرسٹے نہیں تو کیا ہیں۔ جو لوگ ابتدائے اس نتیجہ پہنچیں اُن کے دل میں شاید کسوت خسوف کے مشاہدہ سے یہ سوچ کر غمزدہ پیدا ہوا ہو

کہ قدرت کی مدد سے سترہ مین یہ ناگہانی اور نامعلوم تفرقہ کید یا لیکن کسوف و خسوف کے
تکرار اور اس تحقیقات نے کہ ان کے اوقات ظہور کی نسبت علم ناطق لگایا جاسکتا ہے یہ حد
مطلقاً سنا دیا ہوگا۔

فلکیات کی نسبت ہر قسم کی پیشین گوئیوں کا انحصار اس واقعہ کے اعتراف پر ہے کہ
قوانین قدرت کے عمل میں آج تک نہ کوئی مداخلت یا تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔
سائنس دان فلسفی کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی جو حالت کسی ساعت مدینہ میں پائی جائے گی وہ
حالت ساعت سابق کا بلا واسطہ نتیجہ اور حالت ساعت مابعد کی بلا واسطہ علت ہوگی۔ قانون
اور نسبت جبراً شرطی کے محض دو مختلف نام ہیں۔

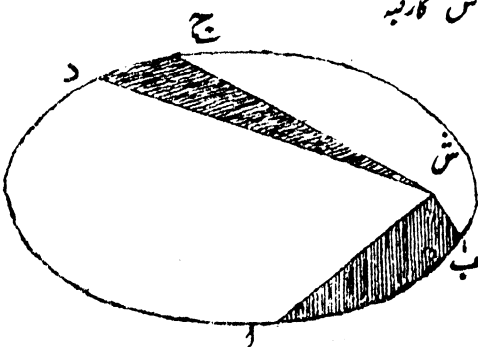
کوپرنیکس کی وفات کے کوئی پچاس سال بعد جان کپلر ساکن ورمبرگ نے سیاروں کو
ابعاد و اوقات اور سرعت رفتار و اشکال ادوار کی تحقیقات شروع کی۔ کپلر اس مسئلہ کا
مقابل تھا کہ آفتاب مرکز عالم ہے اور اسکو یقین و اتق تھا کہ آفتاب کے گرد جو سیارے
گھومتے ہیں ان کی گردش کو آپس میں ربط و تعلق ہے اور اگر ان گردشوں کی سرعت کے ساتھ
جانچ کی جائے تو جن قوانین کی یہ حرکات تابع ہیں وہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ کپلر نے اس مقصد
کی تکمیل کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انکو برہمی اور دوسرے ہیئت والوں کے جو جو ارتعاشات
و مشاہدات فلکی اُس کے ہاتھ آئے انہیں اُن اندازوں کے ذریعہ سے جانچا جو مختلف
قیاسات پر مبنی تھے اور اگر کوئی قیاسی اندازہ مشاہدات کے مطابق نہ ثابت ہوا تو اسے
خارج کر دیا۔ کپلر کو جو محنت اس کام میں اٹھانی پڑی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے چنانچہ وہ
خود کہتا ہے کہ سوچتے سوچتے اور حساب لگاتے لگاتے میری یہ حالت ہو گئی کہ قریب تھا
کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ آخر اس محنت کا اُسے ثمرہ ملا اور تیسرے مین اُس نے اپنی کتاب
حرکات سبارہ مربعیہ شائع کی جس کتاب میں حرکات مربع کو اُس نے اس قیاس کے
ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی تھی کپلر نے آفتاب کے گرد اس وضع میں گردش

کرتے ہیں کہ اُن کی حرکت سے ایک کامل دائرہ بن جاتا ہے جس کا مرکز آفتاب ہوتا ہے اور سیارہ دوار اس دائرہ کے محیط پر اپنے مرکز کو رکھ کر اپنے محور پر گھومتا ہوا آفتاب کے گرد دور در کرتا ہے۔ لیکن بعد میں کپلر کو معلوم ہوا کہ (۱) سیاروں کا مدار مستدیر نہیں ہے بلکہ ایلیپسی شکل ہے جس کا ایک مرکز آفتاب ہوتا ہے اور (۲) سیارہ سے بجانب آفتاب جو خط متحرک کہیں چا جائے اُس کی جھپٹ میں فضا کا جو منطقہ آتا ہے اُسے سیارہ کی زمانہ گردش سے برابر کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ دونوں اصول اب کپلر کے پہلے اور دوسرے قانون

لے اگر دو سیاروں کو ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر ایک دفتین میں گاڑ کر ان میں تار کے کا ایک گروہ حلقہ ڈالا جائے اور فیصل کی نوک سے تار کے کو تان کر تینوں کے ساتھ ساتھ نوک کو حرکت دی جائے تو جو بیضی شکل پیدا ہوگی وہ شکل ایلیپسی کہلائے گی۔ دونوں سیاروں اس شکل کے دو مرکز ہوں گے۔ سیاروں میں جس قدر زیادہ فاصلہ ہوگا اُسی قدر اس شکل کی ایلیپسیت زیادہ ہوگی۔ اور جس قدر کم فاصلہ ہوگا اُسی قدر یہ شکل دائرہ کی قریب ہوگی تا آنکہ اگر دونوں سیاروں کو ملا دیا جائے اور پھر دوسری تان کر فیصل کی نوک سے حلقہ کہیں چا جائے تو بجائے شکل ایلیپسی کے کامل دائرہ پیدا ہو جائے گا۔ مترجم

۵۔ سر رابرٹ ہال نے اپنی کتاب ”دی اسٹوری آف دی ہیوس“ (داستان اخلاک ہمیں اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”ہر سیارہ آفتاب کے گرد ہر نقطہ پر جس رفتار کے ساتھ گھومتا ہے اُس کی سرعت اس قدر ہوتی ہے کہ اگر اس نقطہ سے بجانب آفتاب ایک خط کہیں چا جائے تو وہ خط مساوی رقبوں کو مساوی زمانوں میں طے کرے گا۔“

مثلاً اگر شکل ذیل میں اب ش اور ج د ش کا رقبہ



مساوی ہو تو سیارہ یہ شکل ایلیپسی بناتا ہوا آفتاب کے گرد گھومتے گا وہ اب کو باد جو کہ اُس کا فاصلہ ج د سے زیادہ ہے ایک ہی وقت میں طے کرے گا اس کی وجہ یہ ہے

کے نام سے موسوم ہیں۔ آٹھ سال بعد کیلر نے تیسرا قانون دریافت کیا جس نے آفتاب اور سیاروں کے اوسط درمیانی فاصلہ اور اُن کے زمانہ گردش کے باہمی تعلقات کی تعیین کر دی۔ اس قانون کے الفاظ یہ ہیں: یہ گردش کے زمانے کا مربع اوسط فاصلہ کے مکعب سے برابر کی نسبت رکھتا ہے۔ اس قانون کا اعلان کیلر نے اپنی کتاب خلاصہ نظام

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱۷ پر کتاب کا شروع د کے مقابلہ میں سن یعنی خمس سے زیادہ قریب ہے اور از روے اصول حرکت سیارہ اس منقلہ میں پہنچتے ہی بوجہ قریب آفتاب زیادہ مربع السیر ہو جاتا ہے لیکن منقلہ ج د چونکہ آفتاب سے نسبتاً زیادہ دور ہے لہذا یہاں سیارہ کی رفتار اسی نسبت سے سمت پڑ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت مرور مساوی ہو جاتا ہے۔ مترجم

۱۷ جونکہ سیاروں کی حرکت کا ن الاستدار نہیں ہے بلکہ ایلچی ہے ہذا گردش کی حالت میں ہر سیارہ کا فاصلہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے لیکن باوجود اس تبدیلی کے ہم اس فاصلہ کا تعین اس کا اوسط نکال کر کر سکتے ہیں جس کی سب سے زیادہ آسان شکل یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کو کم سے کم فاصلہ کے ساتھ جمع کر کے اُس کا نصف لے لیا جائے۔ یہ نصف مقدار اوسط فاصلہ کہلائے گی۔ کیلر اچھی طرح جانتا تھا کہ مختلف سیاروں کا زمانہ گردش مختلف ہوتا ہے اور اُسکو یہ بھی معلوم تھا کہ اوسط فاصلہ جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر زمانہ گردش بڑا ہوگا۔ اس علم کی بنا پر اُس نے دو ن کی باہمی نسبت دریافت کرنی چاہی۔ حساب لگانے سے اُسے معلوم ہوا کہ زمانہ گردش اوسط فاصلہ سے برابر کی نسبت نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے کہ اگر یہ نسبت صحیح سمجھی جائے تو جس سیارہ کا اوسط فاصلہ دوسرے سیارہ کے اوسط فاصلہ سے دگنا ہوگا اُس کا زمانہ گردش بھی دوسرے سیارہ کے زمانہ گردش سے دگنا ماننا چاہیے۔ حالانکہ مشاہدہ کی نفی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بعید سیاروں کا زمانہ قریب سیاروں کے زمانہ کے مقابلہ میں دگنے سے زیادہ اور گنے کے قریب ہے۔ کیلر نے اپنی فوق العادت مہندسان قابلیت سے اُس محنت کے بعد جو کسی معمولی دماغ کے انسان کو دیوانہ بنا دیتی آخر میں صحیح نسبت دریافت کر لی جو اُس کے تیسرے قانون میں مضمر ہے۔

اور تیرٹن کی کتاب "پرنسپیا" کے نتائج ہونے سے پہلے کسی نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین کپلر کا فلسفیانہ مفہوم اُس زمانہ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خود اُن نتائج سے بے خبر تھا جو آگے چل کر لامحالہ ان سے نکلنے والے تھے۔ اُس کی غلطیاں تباہی ہیں کہ یہ نتائج اُس کے ذہن سے کوسوں دور تھے مثلاً اُس کا خیال یہ تھا کہ ہر سیارہ ایک نفس ماطفہ کا جو درک کلیات و جزئیات سے منظر و مہبط ہے۔ اور پانچویں بڑے سیاروں کے اودار کی مقنا ویر علم ہندسہ کے جبریات خمسہ کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں۔ اجماعاً وہ یہ سمجھتا تھا کہ سیارہ مریخ کا دور مریضوی الشکل ہے لیکن کہیں مدتوں کی دماغ سوزی کے بعد جا کر اُسے اس عظیم الشان حقیقت کا علم ہوا کہ یہ شکل الہیامی ہے۔ اس خیال کی بنا پر کہ اجرام سماوی فساد و زوال سے منترہ ہیں ارسطو کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان کی حرکات کامل الاستدراج ہیں اور بجز حرکات مستدیر کے اجرام سماوی میں اور کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جاتی۔ کپلر تلخی کے ساتھ شکایت کرتا ہے کہ یہ عقیدہ اس زمانہ کا چور ہے۔ اُس کی فلسفیانہ جبریت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس عقیدہ کو جس لوگ صدیوں سے بلا چون و چرا تسلیم کرتے پناہ دے گئے تھے اُس نے یک بیک پس پشت ڈال دیا۔

بعض اہم مسائل میں کپلر کی رائے نیوٹن پر سبقت لے گئی ہے اور کپلر الفضل للمقدم کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مثلاً اصول کشش ثقل کے متعلق صحیح صحیح خیالات اول اسی نے ظاہر کیے ہیں اُس کا بیان ہے کہ مادہ کا ہر ذرہ اُس وقت تک حالت سکون میں رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا ذرہ اس سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ پتھر کی ایک سل اگر زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو زمین اُس سل کو اور بھی زیادہ توت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اجسام ایک دوسرے کی طرف اپنے اپنے ثقل کی مناسبت سے حرکت کرتے ہیں۔ زمین میں اور جاذبہ میں جو فاصلہ ہے وہ چوٹن برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

تو زمین چاند کی طرف اگر اس میں سے بقدر ایک حصہ کے بڑھنے لگی تو چپ اند باقی ترین حصے طے کرے گا۔ کپلر یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ سمندر میں مد و جزر کشش مگر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ اور سیاروں کی وجہ سے ضرور ہے کہ حرکات قمر کے تناسب میں خلل پیدا ہو۔

ہیئت کی ترقی کے تین دور قرار دئے جاسکتے ہیں۔ دور اول اجرام سماوی کی عقبی یعنی ظاہری حرکات کے مشاہدات اور تصاویر سے تعلق رکھتا ہے۔ دور ثانی میں ان کی حقیقی حرکات خصوصاً سیاروں کی گردش کے قوانین کی حکشیف ہوتی ہے اس دور کو کوپرنیکس اور کپلر کے کارناموں فرمایاں کر دیا۔ دور ثالث ان قوانین کے اسباب کی تحقیق کا زمانہ ہے یہ زمانہ نیوٹن نے پایا۔

دور ثانی کا ترقی کر کے دور ثالث ہو جانا علم تحریک اجسام کے ارتقا پر مبنی ہے جو علم ارتقائے مسمیہ میں یعنی مدرسا سکندریہ کی مستعدی کے زمانہ سے جا مد و ساکن تھا۔

مسیحی یورپ میں لیونارڈ و ڈاؤنسی سے پہلے جو مشہور علماء میں پیدا ہوا فلسفہ حرکات و جہل کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ سائنس کے احیا کا سہرا لارڈ بیکن کے سر نہیں ہے بلکہ ڈاؤنسی کے سر ہے۔ جگین نہ صرف ریاضیات سے بے بہرہ تھا بلکہ مسائل طبیعیہ کی تحقیقات میں ہندسہ و ریاضی کے استعمال کو غیر مفید خیال کرتا تھا۔ اس نے نظام کوپرنیکس کے تسلیم کرنے سے ازراہ استحقار انکار کیا ہے اور اس پر لغو و مہمل اعتراضات کئے ہیں۔ ادھر تو گلیلیو اپنے ہمت با نشان دور بینی اکتشافات کی سرحد پر پہنچا ہوا تھا۔ اودھر بیکن یشکوک ظاہر کر رہا تھا کہ علمی تحقیقات میں آلات سے کام لینا سودمند نہیں ہو سکتا۔ طریقہ استفادہ یعنی جزئیات سے کلیات کے استدلال کا طریقہ اس سے منسوب کرنا تاریخ کے سبق کو بھلا دینا ہے۔ اس کا فلسفہ علمی اعتبار سے ذرا بھی مفید ثابت نہیں ہوا اور کسی شخص کے دل میں ان تخیلات سے استفادہ کرنے کا خیال تک نہیں پیدا ہوا۔ مجر انگریزی ناظرین کے بیکن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ڈاونسی کے حالات سے ہم آگے چل کر زیادہ مفصل بحث کریں گے اس مقام پر ہم صرف اس قدر لکھنا کافی خیال کرتے ہیں کہ اُسکی جو تصانیف مسودہ کی شکل میں ابھی تک موجود ہیں ان میں سے دو تو میلان کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ایک پیرس میں ہے پیرس والا نسخہ نیولین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ڈاونسی کے ستر سال بعد ولندیز مہندس اسٹیوینسن پیدا ہوا جس کی کتاب اصول توازن و اعتدال ۱۵۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چھ سال بعد گلیلیو کا رسالہ علم الحركات شائع ہوا۔

اٹلی کے اس نامور شخص کی بدولت علم الحركات کے دو تین اصولی قوانین دریافت ہوئے جو قوانین حرکت کے نام سے موسوم ہیں۔ ان قوانین کی دریافت سے جو نتائج مترتب ہوئے وہ نہایت ہی اہم ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حرکات مسلسل مثلاً حرکات اجرام سماوی قوت کے دوامی استعمال و اوقات ہی سے قائم رہ سکتی ہیں لیکن گلیلیو کے قانون آدل نے ظاہر کر دیا کہ ہر جسم حالت سکون یا حالت حرکت بظاہر غیر مخت پر قائم رہتا ہے تا وقتیکہ کوئی خلل انداز قوت اُسے اس حالت کے بدلنے پر مجبور نہ کرے اس ابتدائی اصول کا معنی طور سے سمجھ لینا طبیعی بنیاد کے اصولی واقعات کو افہام کے لیے لازمی ہے۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سطح زمین پر تمام حرکات جلد ختم ہو جاتی ہیں لہذا ہم یہ بادی النظری نتیجہ نکالتے ہیں کہ سکون اجسام کی فطری و جبلی حالت ہے۔ پس اگر ہم کو اطمینان ہو جائے کہ ہر جسم سکون و حرکت دونوں میں سے کسی کے ساتھ مساوات نہیں رکھتا بلکہ ہر حالت پر برابر قائم رہتا ہے تا وقتیکہ کوئی مخالف قوت مغل نہ ہو تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے اپنی معلومات میں کس قدر ترقی کی ہے۔ اس قسم کی خلل انداز قوتیں جن سے عام حرکات متاثر ہوتا ہے رگڑ اور اندفع ہوا ہیں۔ جب قوتیں موجود نہ ہوں گی تو حرکت استمراری ہوگی۔ پچنانچہ اجرام سماوی جو فضا کے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں ایک حال پرستندہ متحرک ہیں۔

قوتوں کی مقدار میں خواہ کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کا عمل بالاشتراك و بالاتفاق اس طور پر ہوگا کہ گویا ایک ہی قوت اپنا اثر دکھا رہی ہے دوسری غیر موجود ہے۔ مثلاً جب کسی توپ کے منہ سے گولہ زمین پر گر دیا جاتا ہے تو وہ بوجہ کشش ثقل کے اثر کے سطح زمین تک ایک خاص وقت میں پہنچتا ہے لیکن اگر اسی گولے کو توپ میں بارود بھر کر چھوڑا جائے تو اگرچہ اب یہ ایک ثانیہ میں کئی ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر جائے گا لیکن کشش ثقل کا اثر اس پر اب بھی بعینہ وہی ہوگا جو پہلے تھا۔ قوتوں کی آمیزش سے کوئی انحراف یا کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر طاقت نے اپنا اثر مخصوص دکھا دیا ہے۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں بویریلی - ہوک - اور ہائینس کی تصانیف نے اس بات کو روز روشن کی طرح عیان کر دیا کہ حرکات معیبر کی قوجہ گلیلیو کے قوانین کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ بویریلی نے اتمام مشتری کی حرکات پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک مرکزی قوت کے عمل کو یوں کر حرکت مستدیر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوک نے ظاہر کیا ہے کہ ایک خارجی مرکزی کشش حرکت مستقیم کو مائلہ و مرکز حرکت مستدیر بنا سکتی ہے۔

مثلاً وہ مدار ہے کہ جو نہ صرف یورپین سائنس طلبہ انسان کی دماغی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ یعنی اس سال نیوٹن کی بے مثل اور زندہ جاوید کتاب ”پرنسپیا“ شایع ہوئی۔

اس اصول کی بنا پر کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی مقدار کی نسبت مستقیم اور اپنے فاصلہ کے مربع کی نسبت معکوس سے کھینچتے ہیں نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی کی سطح زمین پر جو اجسام اوپر سے نیچے کی طرف گرے زمین ان کی سرعت رفتار سولفٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر مرکز زمین سے چار ہزار میل کے فاصلہ پر ایک جسم سولفٹ فی ثانیہ کی سرعت رفتار سے اس کی طرف کھینچتا ہے۔ سطح زمین سے اگر یہ جسم چار ہزار میل نیچے سنی مرکز زمین سے آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر موجود ہو تو چونکہ مرکز زمین سے اس کا فاصلہ بمقابلہ سطح زمین دگنا ہے لہذا اس سے قانون کشش ثقل کشش ثقل

نام حرکات کی معقول اور شافی وجہ بیان کی جاسکتی ہے اور کپلر کے قوانین یعنی حرکات اہلیلیجی -
 فصنا سے ملے نمونہ اور نسبت وقت و مسافت کے متعلق اسی اصول کو مد نظر رکھ کر پیش از پیش
 حکم لگایا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں نیوٹن کے معاصرین کو حرکات مستدیر
 کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ یہ تو ایک صورت خاص تھی یعنی اس کا تعلق مشتری کے قواہج کی حرکات
 سے تھا لیکن نیوٹن کی عقل و قیقتہ سچ نے اشکال حرکت کے عام مسئلہ کو حل کر دیا۔ جس میں
 حرکات مستدیر و اہلیلیجی و قریب البیضوی و بعید البیضوی گویا مخروطات کی کل حرکات کی خاص
 خاص صورتیں شامل تھیں۔

آکسندریہ کے مہندسون نے بیان کیا تھا کہ گرتے ہوئے اجسام کا رخ زمین کے مرکز کی
 طرف ہوتا ہے۔ نیوٹن نے ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا لازمی ہے اس لیے کہ کسی کرہ کے کل اجزاء
 ترکیبی کی کشش کا عام اثر ایسا ہی ہے کہ گویا ان سب کا نقطہ اتصال اس کا مرکز ہے۔

اس مرکزی قوت کو جو اجسام کے ہبوط کی تسبیب کرتی ہے کشش ثقل کا نام دیا گیا۔ اس
 وقت تک بجز کپلر کے اور کسی کو یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ اس قوت کی حد اثر کہاں تک ہے
 نیوٹن نے سوچا کہ ممکن ہے کہ اس قوت کا عمل چاند پر بھی ہوتا ہو اور یہی وہ قوت ہو جو چاند کو
 خط مستقیم سے منحرف ہو کر زمین کے گرد گردش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ قانون مرجع معلوم
 کی بنا پر یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ آیا کشش زمین گردش قمر کے بدرجہی نتیجہ کی علت کا فی
 ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جہاں زمین کی پیمائش کے جو نتائج اُس وقت بہم پہنچ سکتے تھے
 ان کے ذریعہ سے نیوٹن کو یہ معلوم ہوا کہ انحراف جرم قمر صرف تیرہ فٹ فی دقیقہ ہی حالانکہ
 اگر مسئلہ کشش ثقل صحیح ہو تو یہ انحراف پندرہ فٹ ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ ہم کو معلوم ہو چکا
 ہے پکار ڈن نے ۱۶۸۷ء میں ایک درجہ ارضی کی پیمائش زیادہ صحت اور تدقیق کے ساتھ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲۳۔ فاصلہ کی نسبت معلوم سے گھٹ جیسے گی یعنی ایک چوتھائی رہ جائے گی۔

بالفاظ دیگر ایک ثانیہ میں وہ جسم صرف بقدر چار فٹ کے گڑے گا۔ مترجم۔

کی جس نے جسامت زمین اور اس لحاظ سے فاصلہ قمر کا اندازہ بدل دیا۔ ۱۶۸۶ء میں جب بعض مسائل متعلقہ پر "رائل سوسائٹی" میں مباحثہ ہو رہا تھا تو نیوٹن کی توجہ اس اندازہ کی طرف منطقت ہوئی۔ چنانچہ وہ پکار ڈکے عمل کی نقل کر لکھ لایا اور اپنے پرانے کاغذات نکال کر از سر نو حساب لگانے میں مشغول ہوا۔ جب وہ نتیجہ کے قریب پہنچا تو اُسے ایسی گہرے ہٹ ہوئی کہ نتیجہ کے استخراج کے لیے اُسے مجبوراً اپنے ایک دوست سے مدد لینے پڑی۔ یہ نتیجہ حسب امید برآمد ہوا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ چاند کا اپنے مدار پر قائم رہنا اور زمین کے گرد گھومنا کشش ثقل ارضی کی قوت کا نتیجہ ہے۔ غرض کپلر کے اس خیال کی جگہ کہ جسامت سماوی عقول عالیہ کے مرکز ہیں ڈیکارٹ کے اس خیال نے ولی کہ فصاحت میں انشیر یعنی جو ہر لطیف کی لہرین اٹھ رہی ہیں جن کے زور سے اجرام سماوی حرکت کرتے ہیں اور ڈیکارٹ کے خیال کے بجائے نیوٹن کا اصول قوت مرکزی قائم ہو گیا۔

اسی قوت کشش ثقل کی وجہ سے زمین اور باقی تمام سیارے آفتاب کے گرد شکل الیپسی بناتے ہوئے گردش کرتے ہیں اور ان میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے اُس کا باعث وہ عمل ہے جو ایک سیارہ کے جرم کا نقل دوسرے سیارہ پر کرتا ہے۔ اگر نقل اجرام کی مقدار اور اُن کا فاصلہ معلوم ہو تو اختلاف کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ زمانہ مابعد کے مہندسون نے اس کی شکل محکوس بھی دریافت کر لی۔ یعنی اگر کیفیت اختلاف معلوم ہو تو جرم ذوالاختلال کا موقع اور نقل معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سیارہ یورینس کا اپنے قیاسی موقع سے منحرف ہونا سیارہ نیپچون کے اکتشاف کا باعث ہوا۔

نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے تو انین تحریک اجسام کو اجرام سماوی کی حرکات سے تطبیق دی اور اس بات پر زور دیا کہ سائنس کے قیاسات کی تصدیق و توثیق مشاہدہ و محاسبہ کی موافقت کے ذریعہ سے کرنی چاہیے۔

جب کپلر نے اپنے تین قوانین کا اعلان کیا تو پیشوا ایمان کلیسا نے انہیں مذہب و ناروا

قرار دیا۔ نہ اس لیے کہ وہ غلط تھے بلکہ کچھ تو اس لیے کہ ان سے نظام کو پرنکس کی تائید ہوتی تھی اور کچھ اس لیے کہ کسی غیر متغیر قانون کو مشنیت ایز دی و توفیق ربانی کا مزاحم سمجھا خلافت مصلحت ہے۔ دنیا ایک نماشا گاہ سمجھ لی گئی تھی جس میں خدا کی مرضی ہر روز اپنے کرشمے دکھائی رہتی تھی اور یہ امر خباب باری کی جلالت و جبروت کے منافی سمجھا گیا تھا کہ اُسکی مشنیت کسی قاعدے یا قانون کی پابند ہو۔ پادریوں کی طاقت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنے رسوخ و اثر سے خدا کے عزائم علی الاطلاق کو نسخ کر سکتے ہیں۔ یعنی مدارت سارون کی نحوست کا اثر کم کر سکتے ہیں۔ دھوپ نکھو سکتے ہیں مینہ برسوا سکتے ہیں۔ کسوف و خسوف کو رکوا سکتے ہیں۔ سیل قدرت کے بھاؤ کا رخ بدل سکتے ہیں اور ہر طرح کے معجزے اور کرامتیں دکھا سکتے ہیں۔ اسی طریقے سے گھڑی کی سوئی فی رجعت تہقیری کر کے پیچھے کی طرف چٹا شروع کر دیا تھا اور آفتاب و ماہتاب چلتے چلتے آسمانوں کے وسط میں رک گئے تھے۔

نیوٹن کے زمانے سے ایک سو سال پہلے ایک بہت بڑا مذہبی و سیاسی انقلاب ہو رہا تھا جو اصلاح کنیسہ کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اس انقلاب کی بدولت خیال انسانی کو کامل آزادی تو میسر نہیں ہوئی تھی لیکن قسیمیّت کے قدیم پرزے بہت کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے اصلاح یافتہ ممالک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نیوٹن کی تصانیف کا مذہبی پہلو سے تخطیہ کرے اور پادری بھی نہ چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں خواہ مخواہ دخل دین بول اول ٹسٹنٹ فرقہ کی توجہ اپنے بہت بڑے دشمن یعنی کیتھولک فرقہ کی سازشوں کا ٹوڑ کرنے میں بھی رہی اور جب اس طرف سے اطمینان ہوا اور اصلاح کے وہ شاخسانے جن کا پھوٹا لازمی تھا نکلنے شروع ہوئے تو براؤنسٹون کی توجہ حریف و رقیب کلیساؤں پر مبذول ہو گئی۔

”لو تھوٹن“ ”کیلیونسٹ“ ”اپسکو پلین“ اور ”پرسبیٹرن“ فرقوں کو اپنے مذہبی جھیلوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ نیوٹن کے مہند سائنہ اکتشافات پر اپنا وقت ضائع کرتے۔

غرض ان فرقوں کے باہمی فسادات نیوٹن کے مہتمم باشندان نظریہ کے لیے ذریعہ قوت بن گئے۔ مکفیر و تخطیہ تو کجا کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور یہ نظریہ چپکے چپکے پوری قوت پکڑ گیا۔ اس کا فلسفیانہ مفہوم ان عقاید کے مقابلہ میں جو ان فرقوں کا مابہ التمزاع تھی بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز تھا۔ اس نے نہ صرف آفتاب کو اپنے نظام کا مرکز تسلیم کر کے کپلر کے قوانین کی صحت کا اعتراف کیا بلکہ ثابت کر دکھایا کہ پادریوں کی مخالفانہ دلائل خواہ کیسی ہی قوی کیوں نہ ہوں لپکتی آفتاب ضرور ہے کہ ہمارے نظام کا مرکز ہو اور کپلر کے قوانین مہندسانہ لزوم یا جبر کا نتیجہ ہیں۔ ناممکن ہے کہ یہ قوانین وہ نہ ہوں جو ہیں۔

اس کل بحث سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ نظام شمسی کی حرکات میں بڑائی مداخلت خلل انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کے نظم و نسق کی عنان اُس غیر متبدل و غیر متغیر قانون کے ہاتھ میں ہے جو بچاے خود مہندسانہ جبر کا نتیجہ ہے۔

ہرشل نے اول سے دور بین سے جو مشاہدات کیے اُن کی بنا پر اُسے یقین ہو گیا کہ چھٹا فلکی میں بہت سے دھڑے ستارے بھی موجود ہیں۔ دھڑے سے مراد یہی نہیں کہ وہ اتفاقیہ طور پر ایک ہی خط نگاہ پر واقع ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ

۱۷۸۱ء میں ہرشل سے مراد ہے جو ایک مشہور و معروف ہیئت دان تھا اور ۱۷۸۳ء میں بختام مینور پیدا ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں ہرشل انگلستان گیا اور وہیں بودو باش اختیار کر لی۔ مردودہ زمینیں جو شک بہت جھوٹی تھیں جن سے اُس کا شوق رصد بینی پورا نہ ہوتا تھا لہذا اُس نے خود ایک بہت بڑی دور بین بنائی شروع کی جس میں اُسے کامیابی ہوئی اور اس کی مدد سے اُس نے نظام شمسی کا وہ سیارہ دریافت کیا جو پورینس کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ جارج ثالث نے اُس کی نمایاں علمی خدمات کے صلہ میں اُس کا وظیفہ مقرر کیا اور خطاب سے بھی سزاوارتہ کیا۔ اُس کا انتقال ۱۸۲۲ء میں ہوا۔

مربوط و منوط ہیں۔ اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کے گرد گھومتا ہے۔ ہر شل ثانی نے ان مشاہدات کو جاری رکھا اور بہت کچھ سمجھ دی۔ برج نبات النفاش کبریٰ کے دہرے ستارے کے ایلچی دار کی ماہیت سیریری نے دریافت کی تھی اور نتیجہ نکالا تھا کہ اس کو کامل دور کی مدت سوا اٹھاون سال ہے۔ ایک اور دہرے ستارے کے حالات تہنڈ نے دریافت کیے تھے۔ اس کا نام کارونا (اکلیل النور) ہے اور اس کے دور کا زمانہ سات سو چھتیس سال ہے۔ ان شمس جزائی کی حرکت داری کا ایلچی شکل ہونا صاف بتاتا ہے کہ قانون کشش ثقل نظام شمسی کی حدود سے بھی بہت پرے نافذ ہے۔ بلکہ یون کہنا چاہیے کہ جہاں تک دور بین پہنچتی قانون کی عملداری نظر آتی ہے۔ ڈکبرٹ نے "انسائیکلو پیڈیا" دائرۃ المعارف کے دیباچہ میں لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ کائنات محض ایک واقعہ واحد یا با لفاظ دیگر ایک حقیقت عظمیٰ ہے۔

پس ان تمام واقعات سے کیا ہلکے نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ شمس و کوکب کو خدا نے پیدا کیا اور اپنی مشیت علی الاطلاق سے اُن کو ایسے قوانین کے تابع کر دیا جن کے تحت میں اُس مشیت کا اقتضا تھا کہ یہ اجرام حرکت کریں؟

یا اس امر کے باور کر دے کہ کوئی معقول وجہ موجود ہے کہ شمس باوجود یہ نظام کسی حکم غیر موجب کی بنا پر معرض وجود میں نہین آئے بلکہ قانون کا عمل اُن کے وجود میں آنے کا باعث ہوا ہے؟

لیکس کی تحقیقات کے بموجب نظام شمسی میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں تمام

۱۔ سرولیم کا بیٹا سر جان فریڈرک ولیم ہرشل ایک نامور باپ کا نامور بیٹا ہے۔ مشہور میں پیدا ہوا فن ہیت میں اُس کی دقت نظر اور مسلسل اداں محک محنت نے بہت کچھ معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ باپ بیٹے ہر اشد کے نام سے چلے جاتے ہیں۔ ہرشل ثانی کا امتداد مشہور میں ہوا۔

منزعم

سیارے اور اُن کے اقمار جن اشکال ایللیچی میں حرکت کرتے ہیں اُن کی ایللیسیت اس قدر کم ہے کہ اُن پر تقریباً دائرہ کی معرفت صادق آتی ہے۔ تمام سیارے ایک ہی سمت میں اور تقریباً ایک ہی سطح پر گردش کرتے ہیں۔ اقمار اور سیاروں کی گردش کا رخ ایک ہی ہے۔ آفتاب سیاروں اور ان کے اقمار کی گردش مجری و گردش دوری کا رخ ایک ہی ہے اور اس گردش کی سطوح میں بہت کم تفاوت ہے۔

ممكن ہنہین کہ موافقت و مطابقت کی اتنی بہت سی صورتیں محض بحسب اتفاق کا نتیجہ ہوں کیا یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا ہنہین ہے کہ ان تمام اجسام کی شیرازہ بند ایک قوت ہے اور ایک رشتہ بطور قدر مشترک ان سب کو ربط دینے والا موجود ہے اور یہ ایک ایسے جرم عظیم الشان کے اجزاء ہیں جو نشر و تحیل سے پہلے واحد و منفرد تھا؟

لیکن اگر ہم تسلیم کر لیں کہ جس مادہ سے نظام شمسی مرکب ہے وہ ایک منفہ شکل منبأ النجوم یعنی بصورت غبار کو کبھی موجود تھا اور اپنے محور کے گرد گھومتا تھا تو تمام وہ خصوصیات جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے از رو اصول حرکات الاجسام لازمی نتائج کے طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سیارگان و اقمار و بنجیم کی ترکیب پندہ پر ہونے کی معقول توجیہ ہمارے ہاتھ آ جاتی ہے۔ ہر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بیرونی سیارے اور اقمار اندرونی سیاروں اور اقمار سے کیوں بڑے ہیں ہم بتا سکتے ہیں کہ بڑے سیارے کس لیے زیادہ تیزی سے گھومتے ہیں اور چھوٹے سیارے کی حرکت میں آہستگی باقی جاتی ہے اور بیرونی سیاروں کے اقمار اندرونی سیاروں کے اقمار کے مقابلہ میں کیوں زیادہ ہیں۔ ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ سیارے اور اقمار اپنے اپنے دور گردش زمانہ میں طے کرتے ہیں۔ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ زحل کے حلقے کس طور پر بنے ہیں ہم سمجھ جاتے ہیں کہ آفتاب کی موجودہ طبیعی حالت کی کیا وجہ ہے اور ارض و قمر میں کی طبقات الارضی سرگزشت سے ہم واقف ہیں کیوں کہ مختلف مدارج تغیر طے کرتے ہوئے موجودہ حالت کو پہنچے۔

لیکن مخصوصیات مثلاً کہ بالا میں دو مستثنیات بھی پائی گئی ہیں جو یورینس اور پلوٹون سے متعلق ہیں۔

اگر اس قسم کے منبأ بہ النجوم کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو باقی تمام شائع خود بخود نکلتے چلے آتے ہیں البتہ ایک بہت بڑی شکل سنگ راہ ہوتی ہے۔ یعنی جن دنیاؤں کو خدا نے بنایا ہے ان سے خدا سے تدبیر خارج ہوا جاتا ہے۔

اول ہم کو یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا ایسے منبأ بہ النجوم کے وجود کا اعتراف کرنے کے لیے کوئی قوی شہادت بھی ہم پہنچ سکتی ہے یا نہیں۔

مسئلہ منبأ بہ النجوم کا اصولی حصہ ہر شے اول کے اس دور میں اکتشاف پر ہے کہ افلاک میں جابجا نوز کے زور و رخشان بقیے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے بعض اس قدر بڑے ہیں کہ مجرور گاہ کو بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بقلع پر جب زبردست دور بینوں کے ذریعہ سے نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ کوکب کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے لیکن ایک آدھ بقیعہ نور مثلاً برج جوزا کا منبأ بہ اکبر ایسا بھی ہے جسے زبردست سے زبردست دور بینیں بھی کوکب میں نہیں کر سکیں۔

جو لوگ مسئلہ منبأ بہ النجوم کی حقیقت کا اعتراف نہ کرنا چاہتے تھے انھوں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ عدم تحلیل کی وجہ دور بینوں کا نقص ہے۔ ان آلات مشاہدہ میں دو جدا گانہ قوتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی قوت اقتباس ان کے "نظر" (زجاجہ) کے دور پر اور قوت ایضاح صورت ان کی سطوح نظریہ کی غایت لطافت و زکاوت پر منحصر ہوتی ہے۔ بڑی دور بینوں

لے خدا سے قدیر تو شاید خارج ہو جائے مگر اس کا بنایا ہوا ضابطہ یعنی وہ قانون جس کا مفہوم ان تبدلات لسنۃ اللہ تبدیل ملا میں مفرجہ خارج نہیں ہو سکتا۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہم مقنن کے قایل ہیں۔ آپ قانون کے۔ ہم ذلت کا اعتراف کرتے ہیں آپ صفات کا۔ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ آپ مادہ حرکت کو۔ ع۔ جلوس ہو چکا جبکہ نہ ہم خالی نہ ہم خالی۔ مترجم

میں و نصف اول الذکر تو بوجہ اپنی جسامت کے بدرجہ تمام موجود ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری مصنف شاذ و نادر ہی کبمال الوجہ پائی جاتی ہے جس کا باعث یہ ہے کہ یا تو اُن کی اصولی ترکیب ہی ناقص ہوتی ہے اور یا وزن کے باعث حمیدگی پیدا ہو جانے سے سطح نظریہ بگڑ جاتی ہے۔ لیکن تاریکی کسی دور میں میں یہ دونوں مصنفین پوری طرح سے موجود نہ ہوں۔ اس سے غبار انجم کا انفکاک بصورت نقاط منفصل نہیں ہو سکتا۔

حسن اتفاق سے اس عقدے کے حل کرنے کا دوسرا سان بھی موجود ہے۔ ۱۸۴۶ء میں مصنف کتاب ہذا نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ اجسام مستوقد یعنی جلتے ہوئے اجسام کے الوان منشور کا انعکاس متسلل ہوتا ہے یعنی اس میں یہ سیادہ و ہاربان پائی جاتی ہیں نہ روشن و ہاربان اس سے پہلے و آؤ فرس نے یہ تکشیف کی تھی کہ غلاز (گلاس) مستوقد کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلل ہوتا ہے۔ پس ان دونوں انکشافات کو پیش نظر رکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی ضبابۃ النجوم سے جو روشنی خارج ہوئی ہے اُس کا انعکاز مستوقد سے یا اجرام و گواہ و شمس مستوقد ہیں۔ اگر اس کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلل ہو تو مجھنا چاہیے کہ یہ ضبابۃ حقیقی یا غلاز مستوقد ہے اور اگر متسلل ہو تو مجموعہ انجم سمجھنا چاہیے۔

۱۸۶۴ء میں سٹرگنس نے ایک ضبابہ کو جو برج آفریکیوں واقع ہے اسی معیار میں جانچا تو معلوم ہوا کہ یہ ضبابہ حالت غازیہ میں ہے۔ اس کے بعد متعدد مشاہدات ہوئے اور ساتھ ضبابۃ النجوم کا امتحان کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے انیس کے الوان منشور کا انعکاس غیر متسلل ہے اور باقی کا متسلل۔

ایسی حالت میں ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخر کار طبیعی و علمی ثبوت اس امر کا ہم پہنچ گیا ہے کہ مادہ کے عظیم الشان انبار غازیہ حالت میں موجود ہیں اور اُن کے التہاب کے اشتداد کی یہ کیفیت ہے کہ اُن کی روشنی کا رنگ بالکل سفید ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ لیبلیس کا قیاس جہت سوجہ و شہادت ناطق پر مبنی ہے۔ اس قسم کے کوکبی تودہ مستوقد کی تہرید

تجیر کے ذریعہ سے لازمی ہے اور انجا دگر گوش اس کے فتاح ناگزیر ہیں۔ ضرور ہے کہ اس تودہ میں سے جدا ہونے والے نخل آئین جن کی سطح ایک ہی ہو اور سیارے اور قمار پیدا ہوں جو ایک ہی طرح گردش کرتے ہوں۔ اور وسط میں ایک آفتاب رہ جائے جس کے گرد یہ سیارے گھومتے ہوں۔ غرض ایک ہیولانی مادہ سے قوانین قدرت کے عمل کے باعث ایک مدون و مرتب نظام پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت کے بتدریج کم ہونے سے مادہ و نیوٹن کی شکل قبول کر لیتا ہے۔

۱۔ انہیں خیالات کو ہم نے نظم کا لباس پہنا ہے۔ یہ نظم جس کا انداز بیان فلسفیانہ نخل کے نقل کی ایک حد تک ملانی کرتا ہے۔ حضرات ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے جو خشک فلسفہ پڑھتے پڑھتے اکتا گئے ہوں گے تفصیل بیان درج کی جاتی ہے۔

اول اول جب نہ تھا کچھ بھی مجزوات خدا	ماسوا کا شکل و صورت سے نکلن تھا جدا
تو کے منفصل اجزائے تھے اس قدر	ساخت افلاک میں ذروں کا طوفان تھا بیا
سرکھٹ جاتا ہے دادتی قدم میں جبکہ ہم	کچھ نہیں پاتا خلا میں وہ ہیولا کے سوا
اس جگہ اس سلسلہ پر ہم نہیں کرتے مین بحث	ابستہ کیوں کر ہوئی ہوگی کب اس کی انتہا
ہم فقط آنا کہیں گے قرن گرے و شمار	رفنہ رفتہ آدھ پانے لگا نخل و نما
پہلے جو کچھ منفصل تھا ہو گیا اب متصل	تو وہ فیر سے فاسق کو کب درسی بنا
کھا کے ذروں نے تقاد مہلے پیہم سو گر	پہلے پیدا کی حرارت اور بعد اس کے ضیا
کچھ تو سیارے بنے اور کچھ تو ابست بن گئے	کچھ ہوئے ماہ منیر اور کچھ شمس باز فہ
اس طبع بید نفاس شمس قائم ہو گئے	جن کا پھیلا ہے خداجانے کہاں تک سلسلہ
اپنے محور پر ہوئے سرگرم گردش آفتاب	اور لگا گردان کے سیاروں کا پھر فوج جگمگا

جس مکان کے ہم کہیں ہیں یہ بھی اک سیارہ ہے

محکم قدرت کا اک چھوٹا سا آتش پاہ ہے

معرض ہستی میں جب آیا ہذا آفتاب

ذرت تھا اس کی ہوا اس کی تھا انتہا

اگر نفا مٹنسی اور ذابت سیار کی دنیاؤں کی آفریش کی حقیقت یہی ہو تو ہمیں قانون کی
عملداری کے متعلق اپنے دائرہ نیال کو مجبوراً وسیع کر کے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳۲

حرقۂ تنویر کا گویا کروڑوں میل میں دو سے دریا سے فضا پر تیرتا تھا اگر حجاب
جرم تھا اب کی طرح اُس کا سراپا آتشین کود کی بھی تھی دہی اُس کی جو ہے اُس کا شباب
گرد و پیش اُس کے نہ تھی آداسہ انجم کی بزم تھی محیط اُس کی خلا ہے انتہا و بے حساب
یکہ و تنہا وہ رابع تھا خلا کے صحن میں ایک بھی کوکب نہ تھا اُس وقت اُس کا ہر کباب
زمین اُس نے گزارین عالم تجرید میں اپنی تنہائی پہ صدیوں اُس نے کھایا پیچ و تاب
جس طرح ہوتا ہے کوہ آتش افشان شتمل جوش میں رہ رہ کے آیا آخر اک دن آفتاب
پہلے بھڑکی کے منہ سے جیسے نور کو پھرتے ہیں پل کچھ تارے ٹوٹ کر اُس سے گر و مثل شہاب
آٹھ سیارے ہی ہیں جو توالیع اُس کے ہیں ان میں اور اُس میں ہوا قائم تجاذب کا حجاب
دیکھ کر اپنی ولادت کے طریقہ کو یو نہی کر لیے پیدا امنہوں نے اپنے اپنے اشتاب

کہتے ہیں جس کو نظام شمس انور ہے یہی

وہم جس کا عقل میں لاتا ہے جگر ہے یہی

جب زمین اُکڑ ہوئی صحن خلا میں جہلہ گر خاصیت خورشید کی اُس میں عیان تھی ہر سر
نکل بھی گردی تھی اُس کی اپنے صدر کی طرح جرم بھی تھا مثل خورشید اُس کا اک موج شر
متصل تجر سے لیکن بے اصناف و زمان رفتہ رفتہ ہو چلا زایل حرارت کا اثر
آتشین حالت تبدیل ہو گئی سیال سے ہو گیا جس سے مزاج ارض گویا گرم تر
پھر تبدیلیج انجاد اپنا عمل کرنے لگا اور جو رابع تھا پہلے بن گیا وہ اب مہر
سنگ خمار کی زمین نے ایک چادر اوٹلی جس کے نیچے پڑا تھا درد و آتش میں بھڑ
جا بجا لیکن بلندی اور پسختی چھپ گئی مادہ از بسکہ اندر کا ہوا زبرد زبر

کائنات میں جو بے شمار اجرام پھیلے ہوئے ہیں نہ صرف ان کی تکوین بلکہ ان کی صیانت میں بھی قانون ہی کو دخل ہے۔

لیکن اس مقام پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ کا اعتراض انتہا سے بعقیدگی پر دلالت نہیں کرتا؟ کیا ہم قادر مطلق خدا کو اُس دنیا سے جسے اُس نے پیدا کیا ہو بے دخل

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳۳

تحقین یہ نامور ایان اس سطح سنگین پر جہان
بن گئے کہسار اور میدان بلند سی تھی جہان
اور جہان بستی تھی اُس میں کر لیا دیا نے گھر
اک گھٹا ٹوپ انحرور کا چھار ہاتھ ہر طرف
آج لیتا ہے انہیں کا نام انسان مجبور
جسے جل تھل کو دے پل بھر میں بن کر ابرتر

اتحاد مرد و ابر و عدد باد و برق سے

موج آب و بخار سپکی تا مغرب شرق سے

ہو چکا جس رقت کامل یہ مواد و طین
وقت آہنچا کہ ہو سر سبز باغ روزگار
غائبہ ابداع صنایع ازل ظاہر کرے
رو گیا باقی تھا بڑا تا اب نہ تھا اک جان کا
زندگی اک راز ہے اور راز دار اک راز خود
ہیں مغاہر ہیں کے بنفش کے لیے عین القیاس
اس چھپی قوت سے ظاہر اہل دنیا کو کیا
وہ دم و نای و مور و سبزہ و آب و حجر
اور ہوئی جب معدل بن کر حرارت بھی عین
اور مولید نملۃ سے بھرے مہد زمین
پردہ فطرت پر مخلوقات کے نقش و نگین
ڈھلی چکا سانچے میں تھا دنیا کا جسم نازنین
جس کا پروہ عقل ان فی اُنھا سکتی بہن
ہیں سوار جس کے دانش کے کوئی یقین
اُس چھپی قوت نے جو ہے رمز عقل و لیلین
صنعت باری کے خرم کر یہ سب ہیں خوش چین

پنج حکمت سے بناے بے حساب اُس فوجہاں

اپنی قدرت کے دکھائے لاجواب اُس نشان

نہیں کر رہے ہیں ؟

ہم نے صاف مطلع پر ابھر گرتے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ سیاہی کا ایک دھندلا سا نقطہ غبار کا ایک ننھا سا مرغولہ اول اول نمودار ہوتا ہے اور تدریج بڑھتے بڑھتے سیاہ وغلیظ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر کالی گھٹا چھا جاتی ہے۔ یہ گھٹا انوکھی اور نرالی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ آفتاب کا نور جب اس مین سے چھٹتا ہے تو ایک عجب و دلفریب سماں نظر آنے لگتا ہے۔ لکھ بڑے ابر دوش ہو ابر سوار ہو کر بڑے چلے جاتے ہیں گھٹا چھٹنے لگتی ہے اور بس طرح تدریج نمودار ہوتی تھی اسی طرح شاید آہستہ آہستہ کم ہوتی ہو کی ہوا مین غائب ہو جاتی ہے۔ اور مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے اجزائے مغنوط مین سے یہ گھٹا مرکب تھی حرارت مین تخفیف ہو جانے کے باعث اُن آبِ بخشرون کے انجاد سے پیدا ہوئی جو پہلے سے کرہ ہوا مین موجود تھے اور منہج ہو کر انہوں نے سماجی شکل اختیار کر لی۔ بادل کی تابانی عظمت کی وجہ ہم علم مناظر و مرایا کے اصول پر کرتے ہیں۔ ہوا کے نور سے اس کی نقل و حرکت کا سبب بیان کرتے ہوئے ہم علم تحریک اجسام کے اصول پیش کرتے ہیں۔ اس کے نمودار ہو کر غائب ہو جانے کی وجہ ہمارے نزدیک علم کیسا کے اصول مین پائی جاتی ہے۔ یہ ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اس شکل گزیر یا کی تکوین و ترکیب خدا کی بلا واسطہ مداخلت سے منسوب کریں۔ اس کے کل و انعمات متعلقہ کی توجیہ ہم طبعی قوانین کی بنیاد پر کرتے ہیں اور شہادہ ادب و احترام مانع آئے کہ ہم بادل کی تخلیق کے لیے جناب باری سے بے قدرت کو بروئے کار آنے کی زحمت دیں۔

لیکن اگر حقیقت سے دیکھا جائے تو کائنات کی حقیقت بھی اس بادل سے زیادہ نہیں۔ اُس کے اجزا بخارات آبِ تھے۔ اس کے اجزا اشموس و عوا لم ہیں ہزار ہی نظرون مین گو اس کی عظمت و کمکت کی کوئی انتہاء نہ ہو لیکن عقل غیر محدود و لازوال کے نزدیک

اس کی ہستی ایک رمتی بدلی ہے۔ جس طرح آسمان پر لکھا دل تباہ لکھتا تھا اسی طرح یہ نظام ہواست
دینی کائنات اسے شمار دوسری دنیاؤں کا قائم مقام ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہیں اور اُن گشت
دنیاؤں کا پیشرو ہے جو وجود میں آنے والی ہیں۔ غرض انقلاب و تبدل علت و معلول
اور سبب و مسبب کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

اگر طبیعیات کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ کرے اور بادل کے اسباب پر غور کر سکتے
ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل علم حوادث الجو کے صغائر میں داخل ہیں تو کیا اسی اصول کی بنا پر دنیاؤں
اور کائناتوں کی ابتدا و آفرینش کے مسائل پر غور کرنے کی ہموار اجازت نہیں ہو سکتی؟ اس لحاظ
کہ آخر یہ دنیاؤں بھی بادل ہی ہیں اگرچہ اُن کی سمت مکان کا پیمانہ کسی قدر زیادہ ہے اور
ان کی حقیقت کہہ کرے سے زیادہ نہیں اگرچہ اُسکی سمت زمان کا معیار کسی قدر کم نا پائدار
ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ایسی حد فاصل قائم کر سکے جسکے ایک طرف طبیعیات کا
عمل ہو اور دوسری طرف مابعد طبیعیات کا؟ کیا اشیاء کی مقدار اور مدت بقا کے متعلق ہمارے
تجاسات بعض اعتبار ہی نہیں ہوتے؟ برج جوزا میں جو منبایۃ النجوم نظر آتا ہے اگر ہم اُس میں
موجود ہوں تو کیا شاندار نکلارہ ہمیں دکھائی دے۔ اس کے مہتمم باشندان انقلابات کا ظہور
میں آنا اس کے آتشیں غبار کا منجمد ہو کر دنیاؤں کی شکل اختیار کرنا ہمیں اس قابل معلوم کہ خدا
بذات خود موجود ہو کر اُن کی نگہبانی کرے۔ اس مقام بعید سے جہاں کروڑوں میل کی ہماری نگاہوں
کے سامنے کوئی ہستی نہیں اور شمس بازو فضا سے فلکی مین ہمیں چمکتے ہوئے دُور کے
برابر نظر آتے ہیں۔ برج جوزا کا یہ منبایۃ النجوم دہندلی سے دہندلی بدلی سے بھی زیادہ مبہوم
معلوم ہوتا ہے۔ گلیلیو نے برج جوزا کا ذکر کرتے وقت اسے اس درجہ حقیر و بیچ میسر نہ سمجھا ہے
سلا اسی خیال کو شاعر نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا۔ چٹک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا۔

مترجم

کہ اس کا حوالہ تک نہیں دیا اور اگر کوئی شخص اس کی تکوین و تخلیق کو کسی علت ثانیہ سے منسوب کرتا اور جو انقلابات اس میں ہو رہے ہیں اُن کے لیے خدا کی مطلق العنان دست اندازی کو ضروری نہ سمجھتا تو اُس زمانہ کے کٹر سے کٹر باوری بھی اُسے قابل الزام نہ خیال کرتے۔ پس جب اس ضابطہ النجوم کے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں تو وہ نفس ناطقہ جو وہاں کی کسی دنیا میں موجود ہوگا ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ اس ضابطہ النجوم کی وسعت ہمارے نظام شمسی سے کروڑوں گنی زیادہ ہے ہم وہاں سے مطلق نظر نہیں آتے اور اس لیے وہاں کی عقل کے لیے ہمارا عدم وجود برابر ہے۔ کیا وہ عقل ہماری آفریش اور بقا کے لیے خدا کی فوری مداخلت کو ضروری و لازمی تصور کریں گی؟

نظام شمسی سے قطع نظر کر کے اب ہم اس کے ایک جزو حقیقہ یعنی اپنے کرہ زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جون جون زمانہ گزرتا گیا ہے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کیا یہ تبدیلیاں ربانی مداخلت کا نتیجہ ہیں یا غیر متغیر قانون کے مسلسل اور نہ ٹٹنے والے عمل کا؟ قدرت کی شکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور طبقات الارضی زبانوں میں یہ تغیر نہایت وسیع اور حیرت انگیز پایا نہ پر ہوا ہے۔ لیکن اُن قوانین میں جو ان تغیرات پر حاوی ہیں خفیف سی تبدیلی بھی نہیں ہوتی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن وہ نہیں بدلتے۔ موجودہ نظام کون و فساد اُس عظیم الشان زنجیر کا محض ایک حلقہ ہے جس کا ایک سرِ ماضی کی غیر معین و بر تراز احصاء حد کی طرف چلا گیا ہے اور دوسرا سرا مستقبل کی غیر محدود و خارج از قیاس پہنائی کی جانب پھیلا ہوا ہے۔

اس امر کی طبقات الارضی اور ہستی شہادت موجود ہے کہ قرون ماضیہ میں زمین اور چاند کی حرارت بمقابلہ زمانہ موجودہ بہت زیادہ تھی۔ یہ حرارت بتدریج کم ہوتی گئی لیکن کمی کا عمل اس قدر بطی الاثر تھا کہ کسی مختصر مدت میں اُس کا محسوس ہونا ممکن نہ تھا۔ البتہ طویل زمانوں کے انقضاء کے بعد یہ کمی نمایاں ہوتی گئی۔ جو حرارت بذریعہ تھخیر زمین سے خارج ہوتی ہے

وہ نقصان میں ملے گی ہے۔

ادہ کے کسی نوادہ کی تہرہ ہائے خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ تاہم مسلسل نہیں ہوتی یعنی اس کا عمل رک رک اور تھم تھم کر نہیں ہوتا۔ بلکہ ریاضی سے کہ ایک مقررہ قانون کے تابع ہوتی ہے۔ اگرچہ اُن تغیرات عظیمہ کے لیے جن سے زمین یہاں بحث ہے نہ تو نیوٹن کا کلیہ کام دیتا ہے نہ ڈیوالنگ کا اور نہ میٹ کا۔ اس واسطے سے ہمارے دعوے میں کوئی فرق نہیں آسکتا کہ ایک زمانہ میں حرارت زمین کی رفتار ذرا زیادہ تھی۔ ایک زمانہ میں یہاں تک کم ہوئی کہ دور زمہرہ پر یہ نمودار ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے معمول سے زیادہ ہو گئی۔ یہ بحث ہی ہمارے دعوے پر کوئی اثر ڈال سکتی ہے کہ آیا یہ اختلافات سطح زمین کے بلند و پست ہونے کے باعث پیدا ہوئے یا حرارت آفتاب کے وقت الاستداد ہونے کی وجہ سے حرارت آفتاب کا وقت الاستداد ہونا حرارت کی تدریجی کمی میں محض بمنزلہ ایک اختلال کے ہے۔ سیاروں کی حرکات کے اختلالات سے اصول کشش ثقل کی تائید و توثیق ہوتی ہے نہ کہ تردید و تغلیط۔

حرارت کا یہ زوال ظاہر ہے کہ ہمارے کرہ کی طبیعی نوعیت میں بے شمار تبدیلیوں کا باعث ہوا ہوگا۔ سکڑنے کی وجہ سے اُس کا حجم بہت کم ہو گیا ہوگا۔ اُس کے دن کا سول گھنٹہ ہوگا۔ اُس کی سطح شکستہ ہو گئی ہوگی اور جن جن طبقات کی قوت اندفاع سب سے زیادہ کم ہو گئی وہاں بڑے بڑے دراڑ اور غار پڑ گئے ہوں گے۔ سمندر کی کثافت بڑھ گئی ہوگی۔ اس کے پانی کی مقدار گھٹ گئی ہوگی۔ کرہ ہوا کے اجزاء سے ترکیبی حصہ صا انحرات آبی اور کاربانک ایسڈ (محوصۃ الفحیم) کی مقدار میں تغیر واقع ہو گیا ہوگا۔ ہوا کا دباؤ کم ہو گیا ہوگا۔

یہ انقلابات اور بہت سے دوسرے تغیرات جو ان کے ساتھ لازم موزوم ہیں غیر مسلسل طور پر نہیں بلکہ نہایت ترتیب و باقاعدگی سے واقع ہوئے ہوں گے اس لئے کہ وہ علت کبرئے یعنی زوال حرارت جو ان تغیرات کے ظہور کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کے تابع تھی۔ لیکن ان اہل تبدیلیوں کا اثر کائنات غیر فی حیات ہی پر نہیں پڑا کائنات ذی حیات

بھی ساتھ ساتھ برابر ساتھ رہتی گئی۔

ہر شکل ذوی الاعضا خواہ وہ از قسم نباتات ہو یا از قسم حیوانات اُسی وقت تک تبدیلی قبول نہیں کرتی جب تک کہ اُس کے حوالی میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر حوالی بدل جائیں تو وہ شکل یا تو تغیر ہو جائے گی اور یا بالکل معدوم ہو جائے گی۔

اگر تغیر حوالی نورسی یا گہائی ہو تو انعام زیادہ تر یہی قیاس ہے لیکن اگر تغیر علی التدریج ہو تو تبدیل یا تقلیب کا امکان زیادہ ہوگا۔

چونکہ اس واقعہ کے یقینی ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت کے مظاہر غیر ذی روح میں قرنہا قرن کے مرور سے وسیع و عظیم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ چونکہ کدہ زمین کا بیرونی خول اور سمندر اور کدہ ہوا وہ نہیں ہیں جو کسی زمانہ میں تھے۔ چونکہ خشکی اور تری کی تقسیم اور دوسری طبیعی حالتیں بدل گئی ہیں۔ چونکہ مخلوقات ذی حیات کے حوالی میں اس قدر عظیم الشان تغیرات ہوئے ہیں لہذا صاف ظاہر ہے کہ ان مخلوقات کو بھی اسی طرح کے مارج فنا واستحالة طے کرنے پڑے ہوں گے۔

اس قسم کے فنا و استحالة کے وقوع میں آنے کی ناطق اور قطعی شہادت اس کثرت سے موجود ہے کہ یقین کو مجبوراً اُس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

اس موقع پر ہم مکرر اس امر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ چونکہ وہ قوت جو ان تغیرات کا باعث تھی خود ایک ہندسی قانون کی پابندی کر رہی تھی لہذا اس کے یہ نتائج بھی اسی قانون کے تابع تصور ہونے چاہئیں۔

ان تمام مباحث سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوقات ذوی الاعضا کی ترقی قانون غیر ممکن التفسیر کے عمل کی تابع ہے خدا کی غیر مسلسل غیر مربوط اور سنت شکن مداخلت کا حاصل نہیں ہے۔ ان مباحث سے ہمارے اس خیال کو بھی تقویت ہوتی ہے کہ بچا سے تخلیق کے اُس فعل کے جو بے منتہا صادر ہوا ہو ایک جسم ذوی الاعضا کی شکل کا مستحیل ہو کر دوسری شکل

اختیار کر لینا بہت زیادہ قرین عقل ہے۔ تخلیق یا پیدائش کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شے دفعتاً خود بخود نمودار ہو جائے اور استعمال سے مراد یہ ہے کہ ایک شکل جو پہلے سے موجود ہے بتدریج متغیر ہوتی ہوئی دوسری صورت اختیار کر لے۔

اس طور پر ہمارا ادراک مسئلہ ارتقا کی حقیقت عظیمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر وجود ذوی الاعضاء حوادث کے سلسلہ سے مربوط و منوط ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس وجود کو دوسرے مفہام پر آفرینش سے کوئی لگاؤ نہیں اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے سلسلہ علت و معلول سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے واجب الوجود تصور کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق اُس برتر از احصا سلسلہ حوادث سے ہے جو زمانہ ماضی میں علی سبیل تذہج پیدا ہو کر زمانہ موجودہ تک پہنچا ہے اور سلسلہ مقدرات آئندہ کی تیاری کا سامان کر رہا ہے۔ اس وسیع زنجیر کے حلقوں کا انقباض کچھ کچھ وقفہ پر تبدیل بحالت بسط ہو جاتا ہے۔ یعنی ارتقا کا اثر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ان تغیرات کے دوران میں وہ قوانین جن کی حدودی اس زنجیر کی تیاری کی ذمہ دار ہے مطلق نہیں بدلتے۔

اگر ہم حیوانات کی کسی جنس کے ظہور پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کا وجود تفسیر و استعمال کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ تخلیق کے ذریعہ سے مجدداً نمودار ہوا۔ اس کی ابتدا بہ شکل ناقص اُن دوسری اشکال کے درمیان ہوتی ہے جن کا دور حیات قریب الانقراض ہے اور جو معدوم ہونے کے قریب ہیں۔ اس کی متعدد نوعین یکے بعد دیگرے بتدریج نمودار ہوتی ہیں اور ہر نوع پہلی نوع سے زیادہ کامل و مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ کئی قرون کے بعد وہ منتہاے الکلیت پر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں سے اسی تدریج اور آہستگی کے ساتھ زوال شروع ہوتا ہے تا آنکہ اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح سراپردہ عدم میں چلی جاتی ہے۔

مثلاً اگرچہ حیوانات ذات اللہی دور ثالثہ و دور ثالثہ مالاخریٰ سے مخصوص ہیں لیکن یہ جنس اپنی آمد کا اعلان کیے بغیر اسی دور میں دفعتاً و بغتہ ظاہر نہیں ہوتی۔ دور ثانیہ کو

کے قرون بعیدہ میں ہم اسے بشکل ناقص اس طور پر باقی رہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ زندہ رہنے کے لیے ہتھ پاؤں مار رہی ہے۔ بالآخر یہ ترقی کرتے کرتے کامل شکل و مقاسب الاعضاء ہو گئی ہے۔

اسی طرح جنس ہوام الارض قرون ثانیہ کی حیاتی خصوصیات میں سے ہے۔ جس طرح ہم کسی بدلتے ہوئے طلسمی پردہ تصویر میں ایک منظر کی صورت کو دھندلا اور مدہم ہوتا ہوا اور ان دھندلی صورتوں میں سے ایک نئی صورت کو نمودار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں جو تبدیلی واضح و نمایان ہو کر نہایت صاف نظر آنے لگتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر دوسرے مرقع کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے اسی طرح زمین پر رہنے والے حشرات الارض بشکل ناقص و موہوم نمودار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ منہماے شباب کو پہنچ کر انحطاط کے رستہ پر پڑ لیتے ہیں۔ ان تغیرات میں ایک بھی ایسا نہیں جو فوری دنا گہائی ہو بلکہ یہ درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں غیر محسوس طور پر ختم ہوتے چلے جاتے ہیں

یہ نتائج وہ ہیں جو کسی طرح تل نہ سکتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ گرم خون والے حیوان قرون اولی کی اس ہوا میں زندگی بسر کر سکیں جس میں جوئے الفلم کا عنصر اس درجہ غالب تھا۔ لیکن درختوں کے پتوں نے سورج کی شعاعوں کے ساتھ مل کر کیسا دی طریقتہ پر اس زہریلے عنصر کو ہوا سے خارج کر دیا۔ جو صحنی جو ہر کوئلہ کی شکل میں زیر زمین دفن ہو گیا۔ کسی جن کا عنصر اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس طہر پر حیوانات زندہ رہنے کے قابل ہو گئے۔ کہہ ہوا میں جب یہ تبدیلی ہوئی تو سمندر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ جوئے الفلم کا جو جزو اعظم اس میں ملا ہوا تھا وہ اس سے جدا ہو گیا اور چونے کا پتھر جو اب تک پانی میں محلول تھا رسوب بن کر ٹھوس ہو گیا۔ جس قدر کوئلہ طبقات زمین میں پیوند ہوا اسی قدر کلس معجم غیر مقرر شکل حالت میں نہیں بلکہ اشکال ذوی الاعضاء بن کر علیحدہ ہو گیا۔ آفتاب کی شعاعیں روز بروز اپنا عمل کرتی رہیں لیکن اس کام کے ختم ہونے کے لیے بے انتہا دلائل کی ضرورت تھی۔ کہہ ہوا کا زہریلے اجزاء کی آمیزش

سے پاک و صاف ہونا، تر ہونا، قرن کے مرد کا محتاج تھا۔ علیٰ ہذا القیاس سرد خون والے حیوانات کے دور کا گرم خون والے حیوانات کے دور میں صدم ہونا مدت ہائے دراز کے امتداد کا مقصد تھا۔ لیکن یہ طبعی تغیرات، بجا بندی قانون عمل میں آتے رہے اور اجسام ذوی الحیا کی تبدیل شکل ناگہانی یا خدا کے کسی بے ضابطہ فعل کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ ان تغیرات طبعی کا لازمی و لابدی نتیجہ ہونے کے لحاظ سے ان کی طرح قانون کا حاصل تھی۔

اگر اس مضمون پر تفصیل سے نظر ڈالیں مقصود ہو تو ناظرین میری کتاب "تاریخ انسان" ہیومن فریا لوجی، "علم حیات انسانی" کی دوسری جلد کے پہلے دوسرے اور ساتویں ابواب "خط فرماؤ" میں یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

غالباً اس سوال کا جواب اب آسانی سے دیا جاسکے گا کہ آیا انتظام عالم ہائے ہندو قانون ہے یا دخالت ربانی کا نتائج ہے جو سلسلہ علت و معلول کے سلسلہ کو توڑتی رہتی ہے۔ اس سوال کے ہر جواب پر نظر غائر ڈالنے کے لیے ہم ایک ایسے نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اگرچہ ایک لحاظ سے تو بے حقیقت محض ہے لیکن ایک اعتبار سے نہایت اہم اور معنی خیز بھی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کی تاریخی زندگی تقنا و قدر کی نہ ملنے والی منزل میں ارتقا سے سابق المتعین کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ آیا کوئی شہادت اس واقعہ کی موجود ہے کہ اقوام کی زندگی قانون غیر متغیر کی تاریخ سے آگے اور آیا یہ خیال صحیح ہے کہ جماعت انسانی میں افراد انسانی کی طرح اجزاء عدم میں سے دفعتاً پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ ان اجزاء کے تدریجی ارتقا سے پیدا ہوتے ہیں جو پہلے سے بے شکل تھے موجود تھے؟

مسئلہ ارتقا کا مفہوم جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ کڑھ زمین پر زندگی کے نمودار ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک اشکال ذوی الاعضا کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے۔ جس کے اجزاء نے درج شدہ و نامزد منزل میں ملنے کے لیے ہر ایک کے لیے اگر

کوئی شخص اس مسئلہ کو قابل اعتراض یا قابل تحقیر خیال کرے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ جن تبدیلیوں میں اُسے کلام ہے اُن کی مرحلہ پیمائی وہ خود کر چکا ہے۔ نوہینے تک جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں تھا اُس کی زندگی کی نوعیت آبی تھی اور اس زمانہ میں اس نے درجہ بدرجہ بہت سی متاثر و متغیر مناسب شکلیں بدلیں۔ جب وہ پیدا ہوا تو اُس کی زندگی آبی سر ہوئی ہو گئی وہ ہو امین سانس لینے لگا۔ نئی قسم کی غذا اُسے دی جانے لگی۔ اُس کی پرورش کا طریقہ بدل گیا لیکن ابھی نہ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا نہ پہچان سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُسے ہوش و حواس کی نعمت عطا ہوئی۔ اُسے معلوم ہونے لگا کہ ایک بیرونی و خارجی دنیا بھی موجود ہے۔ وقت مقررہ پر اُس کے اعضا تبدیل غذا کے خوگر ہو چلے۔ دانت نکل آئے اور خوراک بدل گئی۔ شیر خوارگی کے زمانہ کے بعد طفولیت کا دور آیا اور عہد طفولیت مبدل بد عالم شباب ہو گیا۔ اُس کا جسم نشوونما پانچ گیارہ سال تک ساتھ ساتھ قوائے عقلی بھی ترقی کرتے گئے۔ جب اُسکی عمر اسل کے قریب پہنچی تو بوجہ اُس ترقی کے جو اسکی جسم کے خاص خاص اعضائے کی تھی اسکی اخلاقی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نئے جذبے نئے خیالات اور نئی آسائشیں اس پر اپنا اثر ڈالنے لگیں۔ اس بات کا ثبوت کہ ان اعضا کا ارتقا ان جذبات کے ظہور کا باعث تھا فن تشبیہ ابدان کی ہونگا فیون سے ہم پہنچتا ہے اور یہ ترقی یا تبدیلی بہین ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جسم کو منتہا سے بلوغ اور دماغ کو منتہا سے کمال پر پہنچنے کے لیے کئی سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر کار ریجان بلوغ کی حد پہنچتی ہے اور اس کے بعد بچکانہ کارنامہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہیں اس دور کے حسرت ناک نظارے یعنی قوائے جسمانی و ذہنی کے ضعف کی تصویر کشی کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ قول منالنے کی آمیزش سے پاک ہے کہ ہر انسان جو روے زمین پر موجود ہے ایک حمدی سے بھی کم مدت میں ان تمام منازل کو طے کر لیتا ہے بشرطیکہ اُس کا خاتمہ قبل از وقت نہ ہو چکا ہو۔

کیا زندگی کی ان تمام منازل کے طے کرنے میں ہر شخص کو قدم قدم پر مداخلت ربانی

کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے یا بجائے اسکے یہ عقیدہ زیادہ تر قرین عقل ہوگا کہ وہ بے شمار نفوس انسانی جو رو سے زمین پر آباد رہ چکے ہیں ایک غیر متغیر و ہمہ گیر قانون کے تابع ہیں۔ لیکن افراد اقوام کے اجزائے عنصری ہیں ان کا تعلق اقوام سے وہی ہے جو اجزائے جسمانی کو جسم کے ساتھ ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی نظام جسمانی میں داخل ہو کر اپنا کار معوضہ انجام دیتے ہیں اور جب یہ کام ختم ہو چکنا ہے تو وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اور جسم سے علاج کر دیے جاتے ہیں۔

فرد کی طرح قوم بھی بغیر اپنے علم کے وجود میں آتی ہے اور اُس کی موت میں بھی اُس کی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قومی و انفرادی زندگی میں بحزاس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ قوم کی عمر بمقابلہ فرد کی عمر کے ذرا زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم اپنی ساعت موقوف سے ایک لمحہ بھی زیادہ زندہ رہے۔ ہر قوم کی زندگی پر اگر نظر غائر ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ اگر اس کو زندگی کے کل مدارج طے کرنے کا موقع ملا ہے تو بچپن۔ جوانی۔ بڑاپے سبھی منزلوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔

افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں بشرطیکہ زندگی کی مختلف منازل طے کی گئی ہوں۔ خاص خصوصیات بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور چونکہ افراد کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زندگی حکومت قانون کی تابع ہے لہذا یہ استدلال غیر حق بجانب نہیں ہے کہ اقوام کی رفتار ترقی بلکہ کل بنی نوع انسان کا ارتقاء بحث و اتفاق سے متاثر نہیں ہوتا اور فوق العادات دست اندازیان تاریخی واقعات کے شیرازہ کو پراگندہ نہیں کرتیں بلکہ ہر تاریخی واقعہ کسی واقعہ ماضی کا معلول ہے اور اُن واقعات کے لئے جو ظہور میں آنے والے ہیں بمنزلہ علت ہے۔

لیکن نتیجہ مذہب جبر یہ یعنی اُس یونانی فلسفہ کا اصل اصول ہے جس کی نسبت ہم ایک مقام پر بیان کر آئے ہیں کہ مصیبت کے وقت جب انسان کا بجز بیکسی کے اور کوئی یارو

مدگار نہیں ہوتا یہ فلسفہ اُسکے لیے سرمایہ تسلی و تسکین ثابت ہوا اور نہ صرف مشاہیر یونان بلکہ رومہ الکبریٰ کے جلیل القدر مدبروں سپہ سالاروں اور فرمان رواؤں کو مضبوط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتا رہا۔ اس فلسفہ نے نجات و اتفاق کے عنصر کو ہر شے سے خارج کر دیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ تمام واقعات کو جو جبر و قدر کے لزوم لاد کے تابع ہیں خیر کامل کی تکمیل کا ذریعہ قرار دینا چاہیے اس لحاظ سے یہ فلسفہ گویا صدق و خلوص - تساحت و نقشف - نیکی و پاک بازی کی تعلیم دیتا تھا اور بنی نوع انسان کو یہ سکھاتا تھا کہ عقل و تمیز سے کام لیں بیشک کے اس قول سے شاید ہمیں یارے اختلاف نہ ہو گا کہ جبریتیں یعنی بیرون حکیم زینو کی تباہی نسل انسانی کے حق میں ایک بہت بڑی آفت تھی اس لیے کہ یہی وہ لوگ تھے جن میں سے اکابر و مشاہیر پیدا ہوئے۔

لاطینی سحیت اپنی پاپائی شکل میں اس اصول کی قطعی مخالفت ہے کہ انتظام عالم بذریعہ قانون چل رہا ہے۔ کلیساے عیسوی کی اس شاخ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معجزہ کن کرستون اور فوقی قدرت تصرفات کا ایک اچھا خاصہ نمونہ پیش نظر ہو جائے گا۔ اس روزنامچے کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ مقدس بزرگوں کی التجاؤں نے بسا اوقات نظام قدرت کو (بشرطیکہ ایسا کوئی نظام حقیقت میں موجود ہو بھی) درہم و برہم کر دیا ہے۔ مورتوں اور تصویروں نے عجیب و غریب کرشمے دکھائے ہیں اور ہڈیاں بال اور دوسرے تبرکات کرستون کو ظہور میں آنے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اشیا کی حقیقت و صداقت کا معیار ان کی غیر ممکن التزید تاریخی اصلیت نہیں ہے بلکہ ان کی معجزانہ اہد کرست آفرینی ہے۔ ایسی منطق کے نزاعے ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے جو ایک ادعا کا ثبوت کسی دوسرے واقعہ غیر متعلقہ کی ناقابل فہم شہادت سے ہے؟

دور جاہلیت کے تاریک ترین زمانہ میں بھی حقیقت شناس اور معقولیت پسند مسیحیوں کو ان وہابی تصرفات اور کراماتی دست اندازیوں کے صحیح ہونے میں ضرور شبہ ہوا ہو گا۔ نظام

قدرت کے باقاعدہ ارتقا میں عظمت و جبروت کی ایک ایسی شان نظر آتی ہے کہ ہم اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہماری انفرادی زندگی کے واقعات میں اس بلا کا تسلسل پایا جاتا ہے کہ ہر دو دوسرے کی زندگی میں خوارق عادت یعنی اس تسلسل کے انقطاع کا عمل میں آنا طبعاً اور نہیں آتا۔ ہر سمجھدار آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ قدرت نے اُسکی ذات کے لیے اپنی روش کبھی نہیں بدلی۔ اُس کے لیے کبھی کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر واقعہ کو کسی واقعہ سابق سے منوط و مربوط پاتا ہے اور اُسکی علت اہل اسے معلول قرار دیتا ہے۔ جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُسکے فلان و عینس کی خاطر سنت اللہ تبدیل ہو گئی قانون قدرت بدل گیا اور فلان فوق القدرت واقعہ معجزے کے طور پر ظاہر ہوا تو لامحالہ اُسے یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ و عینس یا تو خود فریب خوردہ ہے یا دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔

غرض جب اصلاح کفیسہ کا زمانہ آیا تو نشانات آسمانی کے بارے میں رو من کتہ و کتہ یسایون کے عقیدے کو سخت صدمہ پہنچا بعض بڑے بڑے متاہلین اور نیز پراٹھنٹ کھدیا مسئلہ جبر و قدر کے قابل ہو گئے کہ کیوں زین کا مہم فیہ ہو کر کہتا ہے کہ ہم ازل کے روز سے جبکہ ابھی

مصلیٰ کتب خاک میں بیٹے کو نہ کر	مکڑے مکڑے تھا کھینچا پارہ تھا نہ کر
کبھی تھی شانِ سالار ہوئے دستِ مہر و شکر	گرچہ تھا دل کا تقاضا دیکھے جی کھول کر
نئے صحابہ بھی شریک اس غم میں پیغمبر کے ساتھ	سب کے دل اس صدمہ جا کھاہے تھو پراثر
اتفاقاً آفتاب اس دن گہن میں آگیا	ظلمتستان بن گیا جس سے دینہ سر
اک مجال نے کہا فطرتِ حقیقت سے کہ آج	ہو گوار اس غم میں ہے سوچ بھی یاغیر
جو جواب اس بات کا مس کو پیسہ دیا	اب زر سے منت کش ہے سفاک تار بخت
کیا تعلق آدمی کے علم سے سوچ کو بھلا	اک نشانِ قدرت حق ہے کون ای کو بفر

عالم کا نام و نشان بھی نہ تھا پابند قضا و قدر کیے گئے ہیں اس پابندی میں ہماری رضا مندی کو کوئی دخل نہیں بلکہ کار فرما سے قدر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھ کر ہمیں جیسا چاہا بنا دیا۔ کیلون کا یہ دعویٰ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ جو افعات گزرتے ہیں وہ ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔ اس طور پر کئی صدیوں کے گزرنے کے بعد دوسری صدی کے مسیحی فرعون یعنی فرقاہ سیلیڈین و ویلٹا کٹن کے خیالات پھر نمایاں ہونے لگے اور یہ وہی فرقے تھے جن کے ادریت آمیز عقاید نے مسیحیت کی شاخ میں مسئلہ تثلیث کا پیوند لگا دیا تھا۔ ان فرعون کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان سے تمام افعال پر سمیل اضطرار سرزد ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایمان بھی ایک دہبی نعمت ہے جس سے انسان کو مجبوراً مستفیض ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کا اخلاقی پہلو گویسا ہی قابل اعتراض کیون نہ ہو لیکن اُس کی نجات کے لیے لازمی ہے کہ ایمان میں غلط نہ آنے پائے اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا سے بزرگ و برتر ہی تمام اشیاء کا مصدر و مخرج ہے۔ اس طرح وہ خیالات رواج عام پا گئے جن کو سینٹ اگسٹائن نے اپنی تصانیف میں بوضاحت دہرایا یعنی خدا نے اپنی فوق القانون مشیت سے بعض اشخاص کی قسمت میں بلا لحاظ اُن کے ایمان یا اعمال صالحہ کے راحت ابدی لکھ دی ہے۔ اور اسی طرح بعض دوسرے اشخاص کو مبتلا سے عذاب نکل کر دیا ہے۔ پیروان مسئلہ تاخر تقدیر بہبوط کا یہ عقیدہ تھا کہ بہبوط آدم ثنیت ایزدی کے اقتضا کے تلج تھا یعنی حضرت آدم خدا کی اجازت سے مبتلا سے معصیت ہوئے اور پیروان مسئلہ تقدم تقدیر بہبوط یہ مانتے تھے کہ بہبوط اپنے مہلک نتائج سمیت ازل سے مقدر ہو چکا تھا اور ہمارے آبا سے اولین شروع ہی سے کوئی اختیار نہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے اس جماعت کا عقیدہ سینٹ اگسٹائن کے اس قول کے خلاف تھا کہ :-

”یہ کہنا گناہ ہے کہ بجز حنات کے خدا کسی اور امر کو بھی مقدرات میں داخل کرنا ہے۔“
پس کیا خیال صحیح ہے کہ نجات ابدی خدا کے اُن مقدرات میں سے ہے جن کے ذریعہ سے

قبل از انکہ بنیاد عالم رکھی گئی اُس نے اپنی پوشیدہ مصلحت کو اس غرض کی تکمیل کے لیے وقت کر دیا کہ بنی نوع انسان کے ایک منتخب اور برگزیدہ طبقہ کو امانت و عذاب مخلد سے نجات دلائی جائے؟ کیا یہ سچ ہے کہ جماعت انسانی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہیں قادر مطلق نے بلا وجہ بے قصور غیر منتہی مصیبت اور غیر مختتم عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟

۵۹۵ء میں عقاید عیسوی کی توضیح کے لیے جو تحریر بمقام لیمتھ (واقع انگلستان) قلمبند کی گئی اُس میں یہ فقرہ درج ہے کہ "خدا نے بعض انسانوں کو ازل ہی سے سعید بنایا ہے اور بعض کو شقی قرار دیا ہے۔" مشاعرہ میں اُس سچی کونسل نے جو بمقام ڈارٹ منعقد ہوئی تھی اس عقیدے کی تائید کرتے ہوئے اسکے مخالفین کو ملعون قرار دیا اور اُن کے ساتھ ایسی سختی کا برتاؤ کیا کہ بہت سے لوگوں کو ممالک غیر میں جا کر پناہ لینے پر مجبور کیا۔ انگلستان نے بھی جیسا کہ اس کے دستور العمل عقاید کے سترہویں فقرہ سے پایا جاتا ہے اس عقیدہ کی حمایت کی۔

رومن کیتھولک عیسائیوں نے پرائسٹنوں پر رب سے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ انہوں نے انتظام عالم میں قانون کی مداخلت کو ایک حد تک قیلم کر لیا ہے۔ لیکن ان جملے پیچھو لوں کے پھوڑنے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یورپ میں جہاں جہاں پرائسٹ مذہب نے رواج پایا معجزے اور کرامتیں صادر ہوئی ایک قلم موقوف ہو گئیں اس موقوفی سے اُس بہت بڑے ملی منافع کا بھی خاتمہ ہو گیا جو کلیسا کو خافقا ہوں اور تبرکات کی مسیحائی سے حاصل ہوا کرتا تھا۔ تذکرات الغفران جو اصلاح کینسہ کے محرک تھے کہنے بند ہو گئے اور ان پر دانون کی تجارت جبکہ مطلب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ پادریوں کی خدمت میں ایک قوم سترہ کروڑوں کسے پر خدا کی طرف سے کہلے بندوں گناہ کرنے کی اجازت مل جائے ماند پڑ گئی۔

اصلاح کینسہ کا فلسفیانہ مفہوم اس رومن کیتھولک عقیدے کے ابطال پر متضمن تھا کہ خدا قسیمی شفاعت کی تحریک پر معاملات انسانی میں مسلسل دست اندازی کرتا رہتا ہے لیکن اس ابطال میں سب کے سب اصلاح یافتہ کلیساؤں نے خاطر خواہ حصہ نہیں لیا

سائنس نے گزشتہ چند سال سے شہادت کا جو انبار اس مسئلہ کے متعلق جمع کرنا شروع کیا ہے کہ انتظام کائنات تابع قانون ہے۔ اُسے ان میں سے اکثر کلیساؤں نے استنباہ بلکہ عدم استحسان کی نظر سے دیکھا ہے لیکن شہادت کا وزن روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ اس تشنگ و ناپسندیدگی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو جائے۔

جب حالت یہ ہے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ ہم کٹنیشس کے ہر صفر پر کٹنیشس کے اس قول کو اپنا اصول سمجھ کر قرار دین کہ ایک ابدی و غیر متغیر قانون تمام اشیاء اور تمام زانون پر حاوی ہے۔



دسوان باب

لاطینی مسیحیت اور تمدن جدید کا تعلق

ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک لاطینی مسیحیت نے یورپ کے عقل واداک پر غلبہ کیا رکھا جس کے نتائج کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے۔

ان نتائج نے جو شکل اختیار کی وہ اصلاح کینہ کے وقت شہرہ ماکہ حالت اور خانگی و عمرانی زندگی میں یورپ کی حالت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام یورپ کے کندھوں پر دہری حکومت کا جو رکھا ہوا تھا یعنی ایک انہیں حکام دینی کی مٹا بست کرنی پڑتی تھی دوسری طرف حکام دینی کی۔ اہل یورپ جہالت ادا نام پرستی اور تکالیف مذہب میں مبتلا تھے۔ رومن کیتھولک مذہب کی ناکامیابی کی وجہ۔ پاپائیت کی سیاسی تاریخ۔ دینی دروہانی حکومت سے ترقی کر کے یہ مطلق العنان شخصی حکومت کی شکل میں بدل گئی۔ کر دیا لون کی انجمن اور کتھوریا کی کارروائی۔ پاپائی خزانہ کے لیے بیش قرار حاصل کی ضرورت بہ افغانی کی محرک ہوتی ہے۔

جو فائدے یورپ کو کیتھولک عہد حکومت میں پہنچے ان میں حکومت کے منشا کو کچھ دخل نہ تھا بلکہ وہ محض اتفاقی یا منہی تھے۔

عام نتیجہ یہ ہے کہ پاپائیت کا سیاسی اثر موجودہ زمانہ کے تمدن کے حق میں مضر تھا۔

لاطینی مسیحیت جو تھی سے لے کر سولہویں صدی تک یورپ کی مادی اخلاقی اور عقلی حالت

کی ذمہ دار ہے۔ اب چین یہ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے یہ کس طرح عہدہ برآ ہوئی۔

موجودہ کج فکری اغراض کے لحاظ سے ہم جو کچھ لکھیں گے صرف یورپ ہی کے متعلق

لکھیں گے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پاپائیت کا یہ دعویٰ کہ اُسے الوہیت کے ساتھ ایک نسبت قریبہ ہے اور ساری دنیا کو اُسکی اطاعت کرنی چاہیئے اُسے کل بنی نوع انسان کی حالت کا جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ جنوبی و مشرقی ایشیا کے عظیم اُشان اور قدیم مذاہب کے مقابلہ میں اُسکے اثر کا فقدان ایک اہم اور نکتہ خیز بحث پیدا کرتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا اثر وہیں تک پہنچا جہاں رومۃ الکبریٰ کا شہنشاہانہ اقتدار نافذ تھا لیکن اس سیاسی نتیجہ کو وہ ازراہ غایت استحقار رد کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کینسہ کے آغاز پر بہت لوگ ایسے تھے جو اُس وقت کی تمدنی حالت کو زمانہ قدیم کی حالت سے مقابلہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ نہ تو یورپ کے اخلاق میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ بلحاظ عقل و ادراک اُس نے کوئی ترقی کی ہے اور نہ لوگوں کی حالت میں کوئی اصلاح ہوئی ہے۔ خود رومۃ الکبریٰ کی عظمت و شوکت صفحہ شہنشاہی سے محو ہو گئی تھی۔ سنگ مرمر کی وہ سرکلین جن پر قیصر اگستس کو ایک زمانہ میں ناز تھا نابود ہو چکی تھیں۔ اجرے ہوئے ہیکل۔ ٹوٹے ہوئے مینار کھنڈروں سے پٹے ہوئے کمپنا کی عظیم اُشان نہروں کی طویل مقف محرابیں حسرت ناک ویرانی کا مرقع نگاہ کے سامنے پیش کرتی تھیں۔ کیپٹل کا برج مشید جس پہاڑی پر واقع تھا اُس کا نام اب کوہ گوسفند ہو گیا تھا اس کو کہ یہاں بکریوں کے گلے رکھے جاتے تھے۔ جس مقام پر قورم کی وہ عالی شان عمارت تھی جہاں روماء کے آئین و قوانین وضع ہو کر دنیا میں نافذ ہوئے تھے اُسے اب احاطہ خاک لپٹتے تھے اس لیے کہ یہاں گائین بندہ تھی تھیں۔ قیصرہ کا پر تکلف محل مٹی کے ڈھیر وں میں چھپ گیا تھا جن پر جہاڑ جھنکار اُگے تھے۔ کراکھار کے حمام اپنے جلو کا چمن اور حوضوں سمیت خزانہ آب کے برباد ہو جانے کے باعث جس سے اُنھیں بانی پہنچا کرتا تھا مدت کے ویران ہو چکے تھے۔ اس عظیم اُشان عمارت کے کھنڈروں میں بلند محرابوں اور وسیع جو تروں پر بچھلدار بیلین اور خوشبودار بھاریان ہر طرف اُگی

جو لی تھیں۔ رومہ الکبریٰ کی ویران عمارتوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان عمارت عیسیٰ کا لائبریریجیم کہ صرف ایک تہائی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اس میں نوے ہزار نمائندگیوں کی نشست کی گنجائش تھی لیکن انقلاب روزگار نے ازمنہ وسطیٰ میں اسے قلعہ بنادیا اور اس کے بعد روم کے ناخلف دنا لایق فرمانرواؤں نے اس کی دیوار میں توڑ توڑ کر اپنے محلوں کے بنے پتھر کی سلون کا ذخیرہ فراہم کیا۔ پاپایان رومین سے بعض نے اس میں بشمینہ بانی اور شورہ سازی کے کارخانے قائم کیے اور بعض نے یہ تجویز کی کہ اس کے عالیین چھتوں اور کماچون میں دیواروں کی دکانیں لگائی جائیں۔ وہ لوہے کے قبضے جن سے اس کے پنجر جڑے ہوئے تھے چوری باجکے تھے۔ دیواروں میں دراڑیں بڑھ گئی تھیں اور سلسلہ شکست درنیت جاری تھا۔ خود روئانات کی جو مختلف قسمیں اس عظیم الشان کھنڈر میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی ماہیت پر متعدد کتابیں زمانہ حال میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ڈی فلو آف دی کالینٹرنیم (رہنمات کالینٹرنیم) میں چار سو بیس انواع کا حال موجود ہے۔ پرانی پرانی وسیع دولکش عمارتوں کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے ستون صنوبر اور عرعر اور بوسیدہ دستکاری کے ابھردین نقش دیواروں سے جدا ہو ہو کر گرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

لہ پروڈیسر اڈورڈ ٹیلر نیلو آف دی رائل سوسائٹی اپنی کتاب "انتھراپالوجی (علم الانسان) کے صفحہ ۲۳۳ پر نرئی فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج کل پتھر کی عمارت کے طریقہ تعمیر کے متعلق ہمارا عام خیال یہی ہے کہ پتھر کی عمارتوں کو جوڑنے کے لیے ان کے درمیان چوڑے پانچ کی ایک تہ بچھا دی جائے لیکن مصر اور یونان قدیم کی خوبصورت اور شاندار عمارتوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ان شک چٹائی کا رواج تھا۔ سلین تلے اوپر چن دی جاتی تھیں اور ان کی پیوستگی کے لیے چوڑے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مان جب پتھر دن کو خاص طور سے جوڑنا نہ منظور ہوتا تھا تو دیوار کے قبضہ استعمال کیے جاتے تھے۔

عالم نباتات بھی اس حسرت اندوز تفسیرین شریک تھا۔ رحمان جو ایک زمانہ میں آئینہ نشان کے کنارے بہ کثرت بچھوٹا تھا تقریباً معدوم ہو گیا تھا۔ لارل (شجرۃ النار) کی جگہ جس کے پتے کبھی تاجداروں کی پیشانی کو زینت بنھتے تھے۔ عشق پہچان کی پل آگ آئی تھی جو موت کی علامت ہے۔

لیکن شاید اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اس تمام ویرانی و بربادی کے ذمہ دار پاپایان روما ہنرین قرار دئے جاسکتے۔ اور اس ادعا کی تائید میں بیان کیا جائے کہ ایک سو چالیس برس سے کم کے عرصہ میں روما کو ایکر۔ جنسک۔ اریسمر۔ وٹینیز اور ٹائیلا نے یکے بعد دیگرے سخر کیا اس کی بہت سی بڑی بڑی عمارتیں قلعوں اور برجوں کی شکل میں بدل دی گئیں۔ وٹینیز نے کمپینا کو برباد کر کے نہروں کو ضائع کر دیا۔ ٹائیلا نے قیصر کے محلوں کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر قوم لامبرڈ نے اس کے محاصرہ پر محاصرے کیے۔ اس کے بعد آربرٹ گسکارڈ اور اُس کی نارمن فوج نے شہر کو اتھوٹا ن مینار سے لیکر قلمین دروازہ تک اور لیٹرن سے لے کر کتیشیل تک جلا دیا۔ بعد ازاں کانسیل بوربون نے اسے لوٹا اور اُجاڑا۔ کئی دفعہ دریا سے ٹاپیر کی طغیانی نے اسے غرقاب کیا اور بار بار اس کو زلزلہ کے صدمے پہنچے پڑے۔ یہ سب سچ ہے لیکن ہم کیا ولی کے التزام کو بھی نہیں فراموش کر سکتے جو اپنی تاریخ فلازنس میں لکھتا ہے کہ اٹلی پر شمال کی وحشی اقوام نے جس حد حملے لگے انکو لکھا ولی پاپائے یوہیم کا معاصر اور پند رہوین صدی کے مشاہیر اہل تدبر سے ہے لیکن اگرچہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فلسفی اور سب سے بڑا تدبر سمجھا گیا ہے پھر بھی اُس کی شہرت قابل رشک ہنرین خیال کی جاتی۔ اس لیے کہ اُس نے فن تدبیر مملکت اور حکمت عملی کی بنیاد بے ایٹانی چلائی۔ بدعہدی اور بے اصولی پر رکھی ہے۔ اسی لیے اُس کا نام غدارانہ چال بازی کا مرادف ہو گیا ہے۔ لارڈ میکالے لکھا ولی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگ اُس کے ال نام سے جو شاہ اور اُس کے مسیحی نام سے شیطان مراد لینے لگے۔

کیسے سب پاپایان روما کی تحریک سے کیسے اس لیے کہ انہیں نے ان جینیوں کو اٹلی پر
 چڑھائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ روما کی تباہی و بربادی کا باعث گاتھ یا ڈنل یا تارمن یا
 عرب قوم کی حملہ آوری نہیں ہے۔ بلکہ خود پاپایان اور اُن کے بھتیجوں نے اس خوبصورت
 شہر کو غارت کیا اپنی چونے کی بجیٹوں کے لیے اُنھوں نے اس کے کھنڈروں کو مصالحہ
 بہم پہنچایا۔ اپنے محلوں کی تعمیر کے لیے اُنھوں نے قدیم عالیشان عمارات کے پتھر اکھڑا
 اکھڑا کر منگواسے۔ پرانے مندروں اور مہیکلوں کی غارت گری سے گرجاؤں کی آرائش
 کا سامان لیا۔

اس وحشیانہ پن کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ مندر توڑ توڑ کر گر جانا سبے جا بین !! اس
 الزام اور اسی طرح کے دوسرے الزامات کا۔ یہ پاپایان روما کے دامن سے نہیں جھوٹ
 سکتا عالیشان کا زخمی وضع کے ستونوں کو خیر و برچھا کر ان بزرگواروں نے سچی اولیا
 کی صورتیں بنوا لیں۔ شاندار مسخری چوکوں سے دیناروں کی پاپائی کتبوں کے انتقال
 سے بے حرمتی کی گئی۔ قیصر سیورس کے ہمد کی بے نفیر عمارت بیٹیز و نیم کو اس غرض سے
 منہدم کیا گیا کہ اُس کے امد سے سینٹ پیٹر کا گر جا تعمیر کیا جائے۔ پچھتین کی کالسی
 کی چھت گھا کر وہ ستون ڈالے گئے جن سے سینٹ پیٹر کے روضہ کو آراستہ کیا گیا۔

کیپٹل کے برجین و مڑبو کا گھنٹہ اپنی مائی گونج سے بہت سے پاپاؤں کی موت
 کا اعلان کر چکا تھا اور عمارت کی بے حرمتی اور لوگوں کی فاسد اخلاقی کا سلسلہ بدستور جا رہا
 تھا۔ غرض پاپائی روما کو قدیم روما کا کچھ باس نہ تھا بلکہ اور اُس سے الٹی نفرت تھی جس کا
 رہ رہ کر اظہار ہوا۔ پاپایان روما اول اول فرمان ردا یان قسطنطنیہ کے ماتحت تھے۔ پھر
 تاجداران فرانس کے مددگار ہو گئے اور اس کے بعد یوپ کی عمان فرمان فرمائی اُن کی
 ہاتھ میں آگئی۔ گویا اُن کی حکومت نے بھی ہمسایہ اقوام کی حکومت کی طرح نفیر و انقلاب کی
 مختلف مراجع طے کیے اور اُن کے اغراض و مقاصد اور مطالبات و دعادی یک قلم

بدل گئے۔ پاپائیت کو تغیر نہیں ہوا تو نہایت ایک بات میں نہیں ہوا یعنی اس کا تقصیب بہتور
 قایم رہا۔ چونکہ اسے یورپ کی مذہبی زندگی کے مرکز ہونے کا دعویٰ تھا لہذا اس نے پاپائیت
 سے خارج ہر مذہبی وجود کے تسلیم کرنے سے اصرار کے ساتھ انکار کیا حالانکہ اس میں
 ذرا بھی کلام نہیں کہ سیاسی اور دینی ہر ایک اعتبار سے وہ از سر پایا بوسیدہ اور متعفن ہو چکا
 تھی۔ آرمس اور تو تھرنے جب روم کی بے دینی اور دہریت پر نظر ڈالی تو اُن کے اٹھام
 اتفاقاً اور اس پر لرزہ طاری ہو ہو گیا۔

ان واقعات میں سے اکثر کی تفصیل کے لیے ہم رینکی کی وقایع نویسی کے رہین منت
 ہیں جس نے اپنی تاریخ میں روم کے اخلاقی مفساد و ذمائم کی تصویر کھینچ دی ہے انتخاب
 کے وقت پاپایان روم عموماً عمر رسیدہ و سالخورہ ہوتے تھے۔ اس لیے عنان اقتدار ہمیشہ نئی

۱۷ یو پولڈوان رینکی زمانہ حال کا ایک بہت بڑا جرمن مورخ۔ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۷ء میں
 وفات پائی۔ اُس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات کو بے روور عایت بلا کم
 کاست درج کرتا ہے اور ڈالتی رائے یا رجحان کو وقایع نگاری میں مطلق دخل نہیں دیتا۔ اگر دوسرے
 یورپین مورخین بھی اسی اصول پر چلتے تو تاریخ تدلیس و مفرق کے اُن عیوب سے پاک ہوتی
 جو یورپ کے عارض تہذیب پر ہمیشہ ایک بدنامہ کے ہیں۔

تاریخ پاپایان روم کی نسبت جس کا ڈیرس نے متن میں حوالہ دیا ہے لارڈ میکالے لکھتے ہیں کہ بر فیسر رینکی
 کی تصنیف اُن طعن میں جہاں جرمن لٹریچر کا رواج ہے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور یہ ایک
 ایسے شخص کی مشق قلم کا نتیجہ ہے جو مکملہ سنی و دقیقہ سنجی اور وسیع النظری کے اعتبار سے افران وائل
 میں سربر آوردہ ہے۔ کتاب کا طرز تحریر نہایت دلپسند و دل نشین ہے متانت و درانت اس کے
 حرف حرف سے مترشح ہے۔ تعصب اور جھجھکاؤ اس میں نام کو نہیں پایا جاتا اور ابتلا سے لیکر انتہا تک
 رواداری کے ساتھ بلا روور عایت لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ اور اس کے
 انگریزی ترجمہ ہی کی تنقید کرتے ہوئے جولیٹی سارا آسٹن کا کیا چواہی لارڈ میکالے نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ ترجمہ

ماہتوں میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ ہر انتخاب امیدوں اور تمناؤں کا انقلاب ہوتا تھا۔ جس جماعت کے نام افزہ کو بام ترقی پر پہنچنے کا موقع حاصل ہوا اور ہر شخص کو اپنے دامن میں دولت اور طاقت کے گنج خانہ لگان کا سمیٹنا ممکن نظر آئے اس کا ہر فرد بھلا کیوں نہ دوسروں کے حقوق کی پابندی کی دھن میں لگا ہوا ہو۔ اگرچہ واقعہ اصلاح کینہ کے وقت روہا کی آبادی گھٹتے گھٹتے اسی بڑے رہ گئی تھی پھر بھی عہدہ داروں کی تعداد بہت بڑی تھی اور ان عہدوں کے امیدواروں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ کامیاب پانچ ہزاروں خدمتین عطا کر سکتا تھا اور یہ وہ خدمتین ہوتی تھیں جن پر سب سے بڑا تقاضا لازم نہایت بے دردی سے برطرف کر دئے جاتے تھے اور بہت سی جدید خدمتیں اس غرض سے قائم کی جاتی تھیں کہ امیدوارانِ ملازمت کے ہاتھ فروخت کی جائیں۔ کسی امیدوار کی دیانت یا قابلیت کو ہرگز پیش نظر نہ رکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان امور پر لحاظ ہوتا تھا کہ وہ فریق مقتدر کی کیا خدمت کر چکا ہے یا کر سکتا ہے اور ماموری کے معاوضہ میں کسی قدر نذرانہ پیش کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ ہمارے امریکن ناظرین ان حالات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ کے انتخاب کے موقع پر بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں مجلس انتخاب پاپا سے ہوا۔ جماعت نامزدگی پریزیڈنٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے چندان متغایر نہیں ہے۔ فرقہ انتخاب جس کے نام پر پڑتا ہے اسے دو نواں صورتوں میں بہت سے عہدوں کے عطیہ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ولیم ساکن ماسبری کا بیان ہے کہ اُس کے زمانہ میں اہل رومانے صداقت اور تقدس کا اچھا خاصہ کیو پار قایم کر رکھا تھا۔ کوئی پاک یا مقدس شے ایسی نہ تھی جس کا بھادوسے بچاؤ نہ ہو۔ مقرر نہ ہو۔ اُس کے زمانہ کے بعد بھی کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ کلیسا کی حالت اور بدتر ہو گئی اور کلیسا آج بلب مفعیت بن گیا۔ اٹلی میں اس طور پر ہمیش قرار دینے میں جمع کی گئیں اور ہماک مہم سے ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف بہ لطافت الحیل بڑی بڑی زمینیں حاصل کی گئیں۔ روپیہ جمع کرنے کا سب سے زیادہ ناپاک حیل فروخت تذکرات انجمن تھا

سفین خرید کر مشتری من مانے گناہ کر سکتا تھا۔ غرض اخلاقی مذہب لوگوں کو لوٹنے کا فن بن گیا تھا۔

ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک رومایا پاؤن کے زیر نگین رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصہ میں اس پر بہت سی تباہیاں ایسی آئیں جن کے وہ جواب دہ نہیں ٹھہر سکتے لیکن یہ ذمہ داری یقیناً اُن پر عاید ہوتی ہے کہ اُن کی طرف سے کبھی کوئی برزور یا مستقل کوشش اس شہر کی مادی و اخلاقی اصلاح کے لیے عمل میں نہیں آئی۔ بجائے اسکے کہ اس بارے میں روماکوئی ایسی نظیر قائم کرنا جو دنیا کے لیے واجب القلیب ہو اُس نے ایک ایسی حالت کی مثال پیش کی جو ہر طرح سے قابل نفرت ہے۔ القصد روماء کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب واقعہ اصلاح ظہور پذیر ہوا تو نو بہت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کوئی صاحب اتقا اجنبی یہاں آکر کارہ اور متاخر ہو سکے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

پایان رومانے سانس سے تو اس بنا پر قطع تعلق کر لیا تھا کہ یہ اُن کے دعاوی سے بالکل مغایر ہے۔ البتہ اخیر اخیر میں نہایت لطیفہ کی سرپرستی شروع کی تھی۔ لیکن موسیقی و نقاشی گو بجائے خود سرمایہ لذت و آسائش حیات ہوں پھر بھی اُن میں کوئی ایسی زندہ طاقت موجود نہیں ہے جو ایک کمزور قوم کو شہزور بنادے یا جماعت انسانی کی مادی راحت و آسائش میں بالاحتلال اضافہ کر سکے۔ اسی لیے اصلاح کے وقت اس شخص کی نظردن میں جو روماکی حالت پر نظر غائر ڈال چکا تھا اس شہر کی تمام زندہ توانائی سلب ہو چکی تھی وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ دنیا کی دنیوی یا دینی ترقی میں حصہ لے سکے۔ نظام جمہوری و شہنشاہی کو ترقی پذیر قواعد کے بجائے اُس نے باپائیت کے جادو غیر متحرک اصول قائم کر لیے تھے اُس کی دینی حالت تو یہ تھی کہ اُس پر زہد اتقا کا ایک غیر حقیقی طمع چڑھا ہوا تھا اور دنیوی ترقیات کی قسم سے اُسکے قبضہ میں فنون لطیفہ تھے۔ اس لحاظ سے

گو یا وہ کسی راہب کی اُس لاش کے مشابہ تھا جو مین ابھی تک کپوشینی طبقہ کے راہبوں کے مدفن میں بھروسے رنگ کی کفن اور ہے اور ہاتھ مین دعاؤں کی کتاب یا کچھ مرچھا ہوئے پھول لیے نظر آتی ہے۔

”مدینۃ البقاہ“ (روما) کی تصویر کا یہ رخ دکھانے کے بعد اور لاطینی مسیحیت نے اس کے ساتھ جو جو سلوک کیے اُن پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم کل براعظم یورپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب جو جماعت انسانی کے پیشوا درہنہ ہونے کا مدعی تھا اپنے نتائج کے لحاظ سے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اقوام کی حالت باعتبار اُن کے سود و بہبود کے بنیاد پر اُن کی آبادی کی کمی و بیشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ آبادی پر طرز حکومت (یعنی اُس کی جمہوریت یا شخصیت) کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ البتہ تدبیرِ مملکت و طرزِ نظم و نسق کا اثر اُس کے شمار و اعداد پر چھا جاتا ہے جن مصنفین نے اس مضمون پر غور کیا ہے اُنہوں نے قابلِ اطمینان طور پر ثابت کر دیا ہے کہ آبادی کا گھٹنا بڑھنا جماعت انسانی کی قوت تولید و قوت مدافعت حیات کے باہمی توازن پر منحصر ہے۔

قوت تولید سے مراد وہ مفروضاتِ فطرت ہیں جو تولیدِ نسل انسانی کی کل مین ظاہر ہوتے ہیں ایک حد تک اس قوت کا دار و مدار آب و ہوا پر ہے لیکن چونکہ یورپ کی آب و ہوا مین چوٹی اور سولہویں صدیوں کے درمیان کوئی محسوس تغیر نہیں ہوا لہذا ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ براعظم یورپ مین یہ قوت زمانہ زیر بحث مین بحالتِ اصلی قائم رہی۔

قوت مدافعت حیات سے مراد وہ تمام اسباب ہیں جن سے بقائے افراد انسانی مشکل ہو جائے۔ اس قسم کے اسباب مین غذا کا ناکافی ہونا لباس کا غیر مکتفی ہونا اور مسکن کا ناقص ہونا شامل ہیں۔

ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر قوت مدافعت گھٹ کر غیر محسوس ہو جائے تو قوت تولید

آبادی کو ۲۵ سال میں دگنا کر سکتی ہے۔

قوت مدافعت کے عمل میں آنے کے دو طریقے ہیں۔ جسمانی و دماغی۔ مدافعت کی جسمانی قوت اولاد کی تعداد کو کم کر دیتی ہے۔ اور زندگی کا اوسط گھٹا دیتی ہے۔ مدافعت کی دماغی قوت اُن لوگوں کو جن پر اخلاق اور خصوصاً مذہب کا گہرا اثر ہو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ تا وقتیکہ اُن میں بیوی بچوں کی خبر گیری و پرورش کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت نہ پیدا ہو جاوے شادی نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت معینہ میں جس قدر شادیاں ہوتی ہیں اُن کی تعداد کو خوراک کی قیمت کی شرح کے ساتھ ایک خاص نسبت ہوتی ہے خوراک میں جس نسبت سے اضافہ ہوتا ہے اُسی نسبت سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے اور قوت تولید اس درجہ طاقتور ہے کہ وہ ذرائع معاش سے تجاوز کر جاتی ہے اور ان پر مسلسل دباؤ ڈالے رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں ضرور ہے کہ افلاس کی ایک خاص مقدار دنیا میں موجود ہو۔ یعنی جماعت انسانی کے ایک طبقہ کے لیے فاقہ کشی کرنا ضروری ہے۔

مختلف ممالک کی آبادی میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں اُن کا ثبوت منفصلہ ذیل مثالوں سے مل سکتا ہے۔ جہتین کی فوج کشی نے اٹلی کی آبادی کو بے حد گھٹا دیا۔ شمالی افریقہ مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے قریب قریب ویران ہو گیا لیکن جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو آبادی پھر ترقی کر گئی۔ طریقہ جاگیر داری کے رواج سے تمام یورپ کی آبادی بڑھ گئی اس لیے کہ جاگیر میں بمقابلہ اُن متوسلین کی تعداد کے جن کی قوت بھری کا وہ ذریعہ تھیں زیادہ جتنی ہو گئیں۔ حروب صلیبیہ نے آبادی کو بہت کچھ گھٹا دیا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لڑائیوں میں بہت سے آدمی مارے گئے اور کچھ یہ کہ بہت سے تندرست اور صحیح البدن لوگوں کو متاہلانہ زندگی سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح کے انقلابات براعظم افریقہ میں بھی ہوئے ہیں۔ میکسیکو کی آبادی ہسپانویوں کی اُس وحشیانہ سفاکی اور ظالمانہ دستبرد

کی وجہ سے جس نے یہاں کے تہذیب یافتہ باشندوں کی عافیت تنگ کر دی اور انہیں زندگی کی طرف سے ناامید کر دیا۔ بقدر بیس لاکھ کے گھٹ گئی۔ یہی حال پیر و کا بھی ہوا۔ انگلستان کی آبادی نارمن فتوحات کے وقت تقریباً بیس لاکھ تھی۔ پانچ سو سال میں یہ بمشکل دگنی ہو سکی اس جہود کی ذمہ دار ایک حد تک غالباً وہ پاپائی مصلحت تھی جس نے پادریوں کو تہجد کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مصلحت نے قانونی قوت تو لید پر قبضہ و اثر ڈالا لیکن حقیقی قوت تو لید پر اس سے خاک افزہ پڑا اس مسئلہ پر جن لوگوں نے نظر فار ڈالی ہے وہ مدت کے مطمئن ہو چکے ہیں کہ علانیہ تجربہ خفیہ عیاں کا مترادف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام انگلستان چنچ اٹھا کہ ملک میں ایک لاکھ عورتیں ایسی موجود ہیں جنہیں پادری خراب کر چکے ہیں اور اسی بنا پر عامہ خلافت اور نیز حکومت انگلستان نے اُن خانقاہوں کو جو رہبانیت کا مرکز تھیں بند کر دینے کا قصد کر لیا۔

ہم نے اپنی کتاب بتاریخ خانہ جنگی امریکہ میں اسی مسئلہ پر بعض خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا اقتباس اس مقام پر خالی از لطف نہ ہو گا۔ "آبادی کی اس جامد اور استقراری حالت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو خوراک بصد وقت و رحمت حاصل ہو۔ تن ڈھکنے کو کافی کپڑا میسر نہ آئے۔ جسم غلاطتوں سے آغشته ہو۔ رہنے کے لیے جو بیڑیاں ایسی بنائی جائیں کہ موسم کی سختی سے بچاؤ نہ ہو سکے۔ سردی گرمی کے تباہ کن اثر کے سد باب کی کوئی صورت نہ ہو غلیظ اور بانی ابھرنے پھیلے ہوئے ہوں۔ حفظان صحت کی تدابیر معقود ہوں۔ اطباء و عالج نام کو دکھائی نہ دیں۔ گندے لتوید ٹٹنے ٹٹنے کی چارہ گری بے سود ثابت ہو معجزوں اور کرامتوں کی ادبچی دکان کا پکوان پھیکا اور سیٹھا نکلے غرض مصیبتوں تکلیفوں اور عاجزی کی اس طویل فہرست کا اگر خلاصہ کیا جائے تو آبادی کے جامد و غیر متحرک ہونے کا مفہوم یہ ہو گا کہ شرح اموات کا اوسط غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم ابھی مزید تفصیل کی گنجائش رکھتا ہے۔ یعنی اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ شرح پیدائش کا اوسط معمول سے

گھٹا ہوا ہوا بالفاظِ بگڑناکت کا دروازہ بند ہو گیا میاشتی کی گرم بزاری ہو۔ درپردہ نسق و نغور ہوتا ہو۔
اخلاق کا قوام بگڑ گیا ہو۔

”بائستہ گان امریکہ کے لیے جو ایک سائنس کا بہت بہتہ ہیں جہاں کل تک ایک شیخ
اور ناقابلِ نفوذ جنگل چھایا ہوا تھا مگر جہاں آج اس آبادی کا جوہم بہتہ ہر پچیس سال کے بعد مقررہ
رفتار کے مطابق دگنی ہو رہی ہے تحقیقی و اضافی زندگی کی یہ خوفناک تفسیع ایک نہایت ہی حسرت
واقفہ ہے وہ یہ تقاضا ہے تخریرِ دیانت کرین مگے کہ آخر وہ کس قسم کا طرزِ نظم و نسق تھا جس کا دعویٰ
تو یہ تھا کہ انسان کے معاش و معاد کی اصلاح و ترقی اس کا نصب العین ہے لیکن جب نتیجہ پر
نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو خوفناک تباہی اور مصیبت انسان پر نازل ہوئی وہ ہمہ گیری
میں جنگ و با اور فحش کی سہ گانہ بلاؤں کے متفقہ اثر سے کہیں نہ ہی ہوئی تھی اور اس پر طرہ کہ اگر کوئی
کو گمان تھا کہ اس طرزِ حکومت میں ان کی دنیوی بھلائی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس زمانہ کی حالت
اور آج کل کی حالت کا اگر مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ انگلستان
کی اسی جغرافیائی سطح پر آج دس حصہ زیادہ لوگ آباد ہیں اور آبادی کے روز افزوں اصناف کی
یہ حالت ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے انہوہ کثیر دنیا کے مختلف حصوں میں جا جا کر آباد ہو رہے
ہیں۔ جو شخص عہدِ گزشتہ کو ادب و احترام کی نفرت دیکھتا ہے اُسے جو قیاس کر لینا چاہیے
کہ اس قسم کے طرزِ نظم و نسق و تدبیرِ مملکت کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے“

یورپ کی آبادی کے ان تغیرات کے ساتھ ساتھ آبادی کی تقسیم بھی متغیر ہوتی رہی ہے
سلطنتِ روم میں مسیحیت کے شائع ہونے کے بعد سے آبادی کا مرکز شمال کی طرف منتقل
ہو گیا اور وہاں سے صنعت و حرفت کی ترقی کے باعث مغرب کی طرف چلا گیا۔

اب کسی قدر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ان مدافعات تو توں کی نوعیت پر
نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے یورپ کی آبادی کو ایک ہزار سال تک حالتِ جمود و سکون میں
رکھا۔ براعظمِ یورپ کی سطح کا بہت بڑا حصہ حق و دوق اذ بے راہ جنگلوں سے گھرا ہوا تھا کہیں

کبھین راہبوں کی خانقاہیں اور بستیان آباد تھیں۔ نشیبی مقامات اور دریاؤں کے دونوں
جانب سینکڑوں میل لمبی دلدلین پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے عفونت انگیز بخارات نکل نکل کر دور
دور تک وبا پھیلاتے تھے۔ پیرس اور لندن میں مکانات لکڑی کے تھے جن کی درزوں پر گارا
لگا ہوا تھا اور چھتین پرال یا سرکندوں کی تھیں۔ ان مکانوں میں روشن دان اور کھڑکیاں نہ ہوتی
تھیں اور آہ کی کل کے زانہ ایجاد تک بہت کم مکان ایسے تھے جن کا فرش چوبلی ہو۔ درمی
یا قالین ایک ایسا سامان آرائش تھا جسے کوئی جانتا تک نہ تھا۔ اس کا قایم مقام پرال تھا
جسکی کچھ مقدار فرش پر بچھا دی جاتی تھی۔ گھروں میں دودکش بھی نہ ہوئے تھے۔ اُس چوبلیے
کا دھواں جو کافی اندھن کے میسر نہ آنے سے بے رونق نظر آتا تھا چھت کے ایک دروازے
میں سے باہر نکل جاتا تھا ہرے کہ ایسے جھونپڑے موسم کی سختی کو کس طرح روک سکتے تھے۔
بدروہین بالکل موجود نہ تھیں اور صفائی کا مطلق انتظام نہ تھا۔ سڑے ہوئے فضلہ اور کوڑے
کرکٹ کا دروازہ پر ڈھیر لگا رہتا تھا۔ مرد عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور اکثر
گھر کے جانور بھی اسی حجرے میں ٹھونس دئے جاتے تھے۔ اس طوفان بدتمیزی میں ممکن
نہ تھا کہ حیا اور اخلاق قایم رہ سکے۔ بستر بالعموم پرال کا ایک تھیلہ ہوتا تھا اور لکڑی کا ایک
گول کندا تکیہ کا کام دیتا تھا۔ جسمانی صفائی سے لوگ مطلق نا آشنا تھے۔ بڑے بڑے ارکان
دولت یہاں تک کہ کٹر بری کے لاٹ پا درسی کے سب سے جلیل القدر حکام ان درجہ گندے ہوتے
تھے کہ ان کے سچ کپڑوں میں جو مین بھنیہ کے مانگن سے سواتھیں۔

چنانچہ انگلستان کے ایک تاجدار کے حریف ٹامس بیٹ کی یہی حالت بیان کی گئی
ہے۔ جسمانی عفونت کے چھپانے کے لیے عطریات کا بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ عوام ان تک
کا لباس چرمی ہوتا تھا جو ساہا سال تک کام دیتا تھا اور جس میں جسم کا میل برابر جمع ہوتا رہتا تھا
لہٰذا فزون متوسط کے میسایوں کی اس گندگی اور گھٹاؤ نے پن کی اگر تحصیل کی جائے تو اُس کا عنصر غالب
وہ مجنونانہ قصب ثابت ہوگا جو یورپ کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تھا چونکہ حبانی طہارت

ہفتہ میں جس شخص کو کھانے کے لیے ایک دفتہ گوشت لہجاتا تھا وہ فارغ البال اور آسودہ حال متصور ہوتا تھا۔ گیون میں کوئی بدرونہ ہوتی تھی۔ سرکین نہ تو کٹی ہوئی ہوتی تھیں نہ اُن پر روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوٹھڑیوں کے دروازے کھول دئے جاتے تھے اور کورڈا کچر دھون بلا تکلف باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ جو بیچارہ شاست کا مارا رہ گزرتنگ و تارگلی میں سے ہاتھ میں مدہم ٹٹاتی ہوئی لالین لیے گزر رہا ہوتا تھا وہ اس آلائش کے سیلاب سے لت پت اور شور پور ہو جاتا تھا۔

اینٹس سلویس نے جو آگے چل کر پاپس نانی کے نام سے مسند پاپائی پر متمکن ہوا اور جس کی تحریر اس لحاظ سے نہایت قابلانہ و غیر متعصبانہ سمجھی جاوے گی۔ اپنی سیاحت جزائر برطانیہ کے مشرق حالات قلابند کیے ہیں۔ یہ سفر اُس نے ستلڈام کے قریب اختیار کیا تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ کسانوں کے مکانات خشک چٹائی کے پھردن کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا۔ چھتیں گھاس بھوس کی تختیں اور بیل کی ایک اینٹھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات موٹھ مسٹر ہیان تک درختوں کی جھال تک کا استعمال کرتے تھے۔ بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے ناواقف تھے۔

گارے سے لے ہوئے سرکنڈون کی کوٹھڑیاں۔ بجدے اور بے ڈھنگو ٹرون کے گھر۔ بے ددکش کی بے رونق دیوانہ مارا گٹھیاں۔ جوڈن کھٹلون اور لپسوڈن سو

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶۲۔ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھی لہذا ضرورت تھا کہ پادری شست و شو سے قاطبہ ابا کرین اور اپنے چیلون کو بھی یہی پٹی پڑھائیں چونکہ مسلمان صاف ستھرے رہتے تھے اس لیے لازم تھا کہ پادری گندے رہیں۔ عزن من تشبہ بقوم فہو منہم کے اصول پر انہوں نے اس حد تک عمل کیا تھا کہ مسلمان اگر دن کو دن کہتے تو پادری کہتے تھے کہ نہیں رات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی صدیوں تک مسیحی دنیا خلافت اور مہجرت میں لٹھری رہی۔

ہر سے ہرے جسمانی اور اخلاقی غلاظتوں کے بھٹ۔ سردی سے بچنے کے لیے اعتدال کے گرد ہزار کے پلٹے ہوئے میٹھے۔ بخار سے سمکے ہوئے کسان کے لیے عالموں اور سیانوں کی چارہ گری کے سوا اور کسی تدبیر کا نہ ہونا!! ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کیونکر ممکن تھا کہ آبادی میں ترقی ہو سکے؟

بہت حالت یہ ہو رہی ہو تو کون سی تعجب کی بات ہو کہ شہدے کے قحط میں انسان کا گوشت پکایا اور چھا گیا۔ اور شہدے کے قحط میں لندن کے ۱۵ ہزار باشندے بھوکوں مر گئے یا دبا کے بعض حملوں میں لوگ اپنے مرے کھانوں کی تجہیز تکفین کرنے والا کوئی فطر نہ تھا۔ شہدے کی دباؤ میں مشرق سے اٹھی اور تجارتی رستے سے ہوتی ہوئی یورپ پر چھا گئی وائس کی ایک ٹلٹ آبادی ضائع ہو گئی۔

دیہات اور شہروں کے عوام انسان کی تو یہ حالت تھی ہی لیکن امرا کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ انگلو سکس قوم کی بد اطواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ساکن ماس برسی کہتا ہے کہ وہ اس قوم کے امرا پیٹو اور عیاش تھے اور کبھی گرسبے نہیں جاتے تھے۔ نماز فجر اور نماز قداس کے ادا کرنے کا اُمنوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ انکا بادری جسکو ان کی کاسٹرکٹ نے ان کی نظروں سے گرا رکھا تھا ان کی خوابگاہ میں جا کر بیدار ہونے سے قبل جلد بدلہ نماز کے الفاظ دہرا جاتا تھا اور ان کے کان میں ایک غلط بھی پڑتا تھا۔ عام لوگ حاملہ امرا کے پنجہ ظلم میں پھنستے ہوئے تھے۔ ان کی جائدادیں چھین جاتی تھیں وہ دور دراز ممالک میں ہجرت کرنا بھیج دے جاتے تھے۔ ان کی لڑکیوں کو یا تو دارالافتاء میں بٹھادیا جاتا تھا اور یا وہ لونڈیاں بنا کر بیچ ڈالی جاتی تھیں۔ دن رات شراب کے دو پیالے چلتے رہتے تھے اور جو برائیاں بدستی کی رفیق ہیں وہ ظاہر ہو کر مردوں کو نامرد بناتی جاتی تھیں۔ جاگیر دانوں کے قلعے گویا ڈاکوؤں کے گھر ہو رہے تھے۔ چنانچہ یہی مورخ جسکی تحریر سے ہم نے اوپر اقتباس کیا ہے بیان کرتا ہے کہ مرد اور عورتیں

ان قلمون میں کچھ بلانی جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے انگوٹھوں یا پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ان کے اعضا آگ سے جھلسے جاتے تھے۔ گرہ دار رسیوں کو ان کے سر کے گرد لپیٹ کر مروڑا جاتا تھا۔ غرض زرفدیہ وصول کرنے کے لیے طرح طرح کے عذاب انہیں پہنچائے جاتے تھے۔

یورپ بھر میں بیش قرار شاہزادہ اور ذمہ داری کی بڑی بڑی سیاسی خدمتوں پر پادری مامور تھے۔ ہر ملک میں دہری حکومت تھی۔ ایک تو مقامی یعنی دینی حکومت اور دوسری غیر ملکی حکومت جس کے اقتدارات کا مصدر و مرکز پاپا ہے۔ روم کا تھا۔ روم کے اثر کا مقامی اثر پر غالب ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے ایک شخص واحد کا شہنشاہانہ ارادہ پورے کی تمام اقوام کے متحدہ و متفقہ ارادہ کے مقابلہ میں کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوتا تھا اور یہ اپنی وحدت و اکتناز کے بے انتہا طاقتوں کا جامع تھا۔ علیٰ ہذا القیاس مقامی اثر کا مضبوط ہونا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ اول تو خود ہمسایہ سلطنتوں کی باہمی رقابتیں اسے کمزور کر دیتی تھیں اور رہی سہی طاقت کے سلب کرنے کے لیے رومانی رتیب کی حیل و فریب تفرقہ ہر دو زبان کافی تھیں۔ ایک بھی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ مختلف دول یورپ نے اپنے مشترک مصلحتیں کو رک دینے کے لیے آپس میں اتحاد قائم کیا۔ جب کبھی کسی بحث کے چرچے سے اتحاد کا خدشہ پیدا ہوتا تھا تو نہایت جالاکی سے یہ جھگڑا علیحدہ علیحدہ چکا دیا جاتا تھا اور ہر حکومت کو بالعموم پاپا سے روم کے سامنے گردن انقیاد جھکانے ہی بنتی تھی۔ پاپائی مداخلت کافی دباؤ دہی نظری مقصد تو مختلف اقوام کے اخلاقی و روحانی حقوق کی نگہداشت ہوتا تھا لیکن اصلی و حقیقی غایت یہ ہوتی تھی کہ ذرا بیخ آمدنی میں توفیر کا پہلو نکالا جائے اور پادریوں کے جم غفیر کی شکم پروری کی سبیل پیدا کی جائے۔ جو محاصل اس طور پر پاپائی عزائم میں داخل ہوتے تھے وہ بسا اوقات مقامی حکومت کے مداخل سے بدارت بڑے ہوتے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً جب آئوٹ رابع نے یہ مطالب کیا کہ کنیسا سے انگلستان تین سو مزید اطالوی

بادریون کا متکفل ہوا اور تسکین کے گرجا میں اُس کا ایک بھتیجا جو سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا ایک بڑی خدمت پر مامور کیا جاسے تو معلوم ہوا کہ جو رقم پہلے ہی سے ہر سال غیر ملکی بادریون پر صرف ہوتی تھی وہ اُس رقم کے مقابلہ میں جو شاہی خزانہ میں داخل ہوتی تھی گنی تھی۔

اعلیٰ طبقہ کے بادریون نے تو ہر ملکی خدمت پر جو کچھ بھی باعث منفعت تھی قبضہ کر ہی رکھا تھا اور ہر دیر کا صدرِ امہب کثیر التعداد غلاموں کے مالک ہونے کے لحاظ سے بڑے بڑے امیرون اور جاگیردارین کا مقابلہ کرنا تھا چنانچہ بعض صدرِ امہبون کے پاس بیس بیس ہزار غلام موجود تھے لیکن گدائی پیشہ راہبوں کے لیے بھی معاش کے وسیع ذرائع موجود تھے۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا تھا جہاں یہ نظر نہ آتے ہوں اور غربا کے قوت لایوت میں اپنا حصہ نہ بناسیتے ہوں۔ نیکے اور نکمٹو بادریون کا ایک انبوا کثیر جسے ارادت میں ممالک غیر منسلک تھے ایسا تھا جس کی زندگی کا بلی اور بے کاری میں کٹتی تھی اور جو اپنا ہیٹ محنت مزدوری کر سنے والوں کے پائینے سے پاتا تھا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن تھا کہ چھوٹے چھوٹے کسبت بڑی بڑی جاگیروں میں ضم نہ ہوتے چلے جائیں غریبا کا فلاں روز بروز نہ بڑھتا جاسے اور جماعت انسانی کی حالت رو بہ اصلاح ہونے کے بجائے پایہ اخلاق سے ساقط نہ ہوتی چلی جائے۔ دیرون صومعون اور خاقا ہون سے ماہر تحصیلِ علم کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ اور کیوں کر کی جاتی؟ کلیسا کی مصلحت۔ اسی میں تھی کہ لوگ جاہل رہیں۔ چنانچہ یہ اصول عام طور سے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جمالت زہد و تقا کی مان ہے۔

ردمانہ جمہوریت اور شہنشاہیت کے زمانہ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا تھا کہ مستحکم پلون اور پختہ سڑکوں کے ذریعہ سے اپنے دور دست صوبوں کے ساتھ سریع السیر تعلقات قائم رکھے جائیں۔ پلون اور سڑکوں کی تعمیر اور مرمت افواجِ رومۃ الکبریٰ کے اہم فرایض میں داخل تھی۔ اس اصول پر کار بند ہونے سے اُس کا فوجی تفوق برقرار رہا۔

لیکن پاپائیت کے زمانہ میں چونکہ روما کی حکومت ایک بالکل جداگانہ اصول پر مبنی تھی اور اُس کو اگلی سی ضرورتیں درپیش نہ تھیں لہذا اس فرض کی بجا آوری کو اُس نے ددل مقامی کی بے اعتنائی کے لیے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ بھر میں کوئی سڑک ایسی نہ تھی جو سال کا اکثر حصہ بند نہ رہتی ہو۔ حمل و نقل کے عام ذرائع بیلوں کے بے ڈھنگے چھکڑے ہوتے تھے جو گھنٹہ میں تین چار میل سے زیادہ نہ جا سکتے تھے۔ جہاں کشتیاں بہم نہ پہنچ سکتی تھیں مال تجارت کہ وہ بھی کیف و کم کے اعتبار سے چندان قابل لحاظ نہ ہوتا تھا گھوڑوں اور خچروں پر لا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا یا جاتا تھا۔ جب فوج کے بڑے بڑے دستوں کو نقل و حرکت کی ضرورت پیش آتی تھی تو مشکلات اس قدر بڑھ جاتی تھیں کہ اُن پر غالب آنا دشوار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حروب صلیبیہ کے مجاہدین اولیٰ کے کوچ کی کہانی ان مشکلات کا مرقع ہے۔ نقل و حرکت بین الممالک کی یہ دو تین اور زحمتیں اُس تاریکی اور جہالت کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار تھیں جو عام طور سے پھیلی ہوئی تھی۔ اکیلا اکیلا مسافر جان جو کھوں میں ڈالے بغیر سفر نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ کوئی دلدل یا جنگل ایسا نہ تھا جہاں ڈاکو اور لٹیرے موجود نہ ہوں۔

جہالت اور لاعلمی ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ یورپ میں شرمناک کراستوں اور معجزوں کی بھرا ہوا تھی۔ کوئی سڑک ایسی نہ تھی جس پر زایرون کے ٹھٹ کے ٹھٹ اولیا کی اُن خانقاہوں کی طرف ارادت کی باگین اٹھا سے نہ جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں جو اپنی مسیحائی اور شفا بخشی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھیں کلیسا نے ہمیشہ اسی مصاحت کو پیش نظر رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے۔ اس لیے کہ وہ خانقاہوں کو آگ جلب منفعت بننے سے بہت کچھ روکتا ہے۔ زمانہ اس منفعت رسان زور و تبلیغ کی آخر قلعی کھول کر رہا۔ یورپ میں آج کتنی خانقاہیں ہیں جن کی دکانداری کا سلسلہ بدستور قائم ہے؟

جو بعض اس قدر ناتوان ہوتے تھے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ پہنچا سکتے تھے۔
 اُن کا اعتدال ہی حافظ تھا۔ پھر روحانی علاج یعنی اُن لاطینی دعاؤں کے جو اُس پر دم گردی جاتی تھیں
 اُس کے لیے اور کوئی فکھل مداوا نہ تھی۔ امراض کے روکنے کے لیے گرجاؤں میں دعائیں
 لڑا دی جاتی تھیں۔ لیکن حفظ صحت کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی جاتی تھی۔ نہایت یہاں تک
 پہنچ گئی تھی کہ شہر فرط عفونت سے سڑا رہا تھا اور دبا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے
 لیکن باورسی صاحب السدا و باکاسان دعا سے کر رہے ہیں۔ سینھ کی جھڑی کھینچنے میں نہیں
 آتی یا مساک باران کی وجہ سے سقامت نہ گام کا اندیشہ ہے لیکن یہ بزرگوار اپنے چند
 حامیوں کے زور سے سینھ کو رکوا یا برسا دینے کے مدعی ہیں۔ سورج یا چاند کو گہن لگ گیا
 ہے یا کوئی دہرا ستارہ نمودار ہوا ہے لیکن یہ عقل کے پتلے ان قدرت کے کرشموں کو بھانپ
 آسانی سمجھ کر ادعیاں توڑے ان کی نحوست مٹانے کی فکر میں ہیں۔ جب شمس اُٹھتا ہے وہ مدار
 ستارہ جو پہلی کے نام سے موسوم ہے نمودار ہوا تو اسکی شکل ایسی خوفناک اور اس کا منظر ایسا
 مہیب تھا کہ خود تقدس آب الوہیت انساب جناب کیلکسٹس خاص پاپا سے روکوا اپنی روح
 القدس توتہ سے اس کی مرافعت پر ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسا زبردست عمل پڑا
 اور انہی بدعتیں بھجھیں کہ مارے ڈر کے یہ خبیث ستارہ دم دبا کر اُپتیا کا پتلا فوسفات میں
 غائب ہو گیا اور کہیں پچہتر سال کے بعد اس کے ہوش دھواں اس حد تک بجا ہوا کہ اس نے
 دوبارہ نمودار ہونے کی جرأت کی۔

اولیاء کے تصرفات روحانی اور دعاؤں کے ذریعہ سے مرافعتوں کو جو شفا ہوتی تھی اُس کا
 طبیعی اندازہ اگر لگایا مقصود ہو تو اُس زمانہ کی اور آج کل کی شرح اموات کا مقابلہ کر لینا کافی
 ہو گا اُن دنوں تیس میں ایک آدمی مر جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ روحانیت کے سچا
 پیارا نہ صرف مادیت کا عمل ہے بحساب اوسط چالیس میں ایک آدمی مر جاتا ہے۔

یورپ کی اخلاقی حالت روز بروز روشن کی طرح اُس وقت آشکارا ہو گئی جب کوئمبرگ کے بعض

جزائرِ غربِ الہند سے مرضِ باؤ فرنگ اپنے ساتھ لگاتے لائے۔ یہ بیماری حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یورپ بچے میں پھیل گئی۔ ادنیٰ واسطے غریب و امیر سب کے سب اس شرمناک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور تو اور باپاے مقدس حضرت لیو دم بھی تو تاپال بیٹھے اور نیم کی ٹہنی پالتے ہوئے پاسے لگے۔ اکثر لوگ جو شامت اعمال سے یہ دکھ بھر رہے تھے یہ عذر پیش کرتے تھے کہ یہ ایک وبائی مادہ ہے۔ جو سمیت اجزائے ہوا کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو اس مادہ کی اشاعت کا باعث ہوا کی سمیت نہ تھی بلکہ فطرتِ انسانی کی ایک خاص کمزوری تھی جسے وہ روحانیات بھی زایل نہ کر سکی تھی جو انسان کے لیے صد امان سے بمنزلہ چراغِ ہدایت تھی۔ خانقاہوں کے طبی کوششوں پر خاص خاص تبرکات کی موجود نہ تھا گسٹری مسترا تھی۔ ان میں سے بعض تبرکات ایسے تھے جن کی نوعیت عقل کو منحصر کر دیتی تھی متعدد دیر اور خانقاہیں ایسی تھیں جن میں جنابِ مسیح کا کائون کا تاج موجود تھا۔ گیارہویں صدی میں وہ برچار کہا جاتا تھا۔ جس سے آپ کا پہلو چھیدا گیا تھا۔ اگر کوئی شخص ازراہِ جسارت یہ سوال کر بیٹھا کہ ان سب کا اصلی ہونا کیوں کر ممکن ہے تو وہ دہرہ اور مرتد قرار دیا جاتا۔ حربِ صلیبیہ کے دوران میں طبقہ ہیکلیین کے سوراؤن نے یوحنا کلیم سے مقدس درخیزہ کے دودھ کی بوتلیں لالاکر صلیبی افواج کے سپاہیوں کے ہاتھ میں دے دیں اور منہ مانگے دامنِ یحییٰ اور خوب بھی نفع کمایا۔ یہ بوتلیں

۱۵ جب بیت المقدس اور کل ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ کر مسیحی دنیا کی غیرتِ یسعی متعصب کا دریا جوش میں آیا اور حربِ صلیبیہ کا خوریزہ سلسلہ شروع ہوا تو چند مسیحی برادران اس غرض سے قائم ہو گئے کہ جو مسیحی زائر ارض مقدس کا سفر اختیار کریں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے یہ جماعتیں طبقہ ہیکلیین کے نام سے موسوم ہیں۔ بعد میں اس طبقہ کا مقصد دینِ مسیحی کی حمایت اور مسلمانوں کا استیصال ہو گیا۔ اس طبقہ کے جاننا زاکین اگرچہ رہبانیت اور زہد و اتقا کا دم بھرتے تھے لیکن ان سے بسا اوقات ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی تھیں جو بڑے سے بڑے فاسق و فاجر کو بھی ہرق انفعال میں ڈبو دینے کے لیے کافی ہوتیں۔

ازراہ غایت ارادت و عقیدت بعض بڑے بڑے مذہبی امکان میں بدقون نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی رہیں۔ لیکن دینہ ولیزنی اور اہلٹائی میں بیت المقدس کی پائس خانقاہ کا درجہ شاید سب سے بڑا ہوا تھا جس کے تبرکات میں روح القدس کی ایک انگلی بھی داخل تھی۔ اس شرمناک بطلان پرستی کو زمانہ موجود نے حقارت آمیز خموشی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہی تبرکات ہزار ہا خوش عقیدہ لوگوں کی کشت ارادت کو اپنے روحانی چھینٹون سے سیراب کرتے تھے لیکن آج وہ اس درجہ ناپاک اور ذلیل خیال کیے جاتے ہیں کہ کسی عجائب خانہ میں بھی انھیں جگہ نہیں ملتی۔

آخر اُس حران کی کیا وجہ ہے جو یورپ کی امانت سے عہدہ برآ نہ ہونے کی شکل میں کلیسا کو نصیب ہوا؟ اگر رومن نے یورپ کی روحانی و مادی ترقی کو حقیقت میں اپنا نصب العین قرار دیا ہوتا۔ اگر جانشین پطرس یعنی ساری دنیا کے گڈریے نے صدق دل سے واحد الغرض ہو کر اپنے گلہ کی بیہیزوں کی رکھوالی کی ہوتی اور اُن کی دنیاوی آسائش اور دینی نجات کو اپنی غایت النیات سمجھا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ کلیسا کو اسل کامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

یہ وجہ بڑی آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسے قلمبند کیا جائے گا تو حیا سوز معصیت کا ایک طوار تیار ہو جائے گا۔ فقرات ذیل میں ہم تو جیسا جو واقعات سپرد قلم کرتے ہیں وہ کیتھولک مصنفین کی تحریرات سے ماخوذ ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو ان واقعات کا اعادہ مصنفین مذکور ہی کے الفاظ میں کیا جائے۔

جو داستان ہم اب بیان کرتے ہیں اُس سے معلوم ہو گا کہ کیونکر ایک جماعت متحدہ نے ترقی کرنے کے لئے مطلق العنان حکومت شخصی کی شکل اختیار کر لی۔

قدیم الایام میں ہر گرجا اُس توانق کی نفی کیے بغیر جو جملہ اصولی امور میں اُسے کلیسا کے عمومی کے ساتھ جہنا تھا اپنا انتظام کامل آزادی کے ساتھ جداگانہ طور پر خود کرتا تھا۔ اور اپنی روایات و تادیبات کو انفرادی حیثیت سے برقرار رکھ کر اُن تمام مسائل کو جنہیں کلیسا کے عمومی

کے اعراض سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ یا جن میں کوئی اصولی بحث مضمر نہ ہوتی تھی خود مقامی طور پر فیصلہ کر دیتا تھا۔

نہیں مدی کے آغاز تک یہی حالت قائم رہی اور کلیسا سدا کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائی۔ لیکن ۱۸۳۸ء کے قریب سینٹ اسی ڈور رساکن اسٹینڈرڈ کے مرتبہ کے برسے متاومی بہت کچھ قدرت و تدلیس کے بعد فرانس کے مغربی علاقہ میں شائع کیے گئے۔ جن میں پاپا یان زمانہ سابق کے تقریباً ایک سو وینٹی فرمان اور دوسرے حکام کلیسا کی بناؤنی تحریکات اور مسیحی کونسلوں کے فیصلہ جات شامل تھے ان جعلی فتاویٰ کی اشاعت نے پاپائیت کے اقتدار کو بہت کچھ وسیع کر دیا۔ کلیسائی حکومت کے پرستار طریقہ کو بدل دیا اور اسے جمہوریت کے پیرائے سے چارمی کر کے مطلق العنان حکومت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ سب کے سب اس وقت مدما کے حلقہ گوش ہو گئے اور اس وقت اعظم یعنی پاپا سے دو داخل مسیحی دنیا کے پادریوں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ ہڈییرنڈر پاپا سے اگلیوری سالیج) نے بعد میں اس پر بدتم باشان کو مشش کی کہ دول پیرپا کو ایک ربانی الاصل قسیمی حکومت کی صورت میں بدل دیا جائے جس کا شہنشاہ پاپا سے روا ہو۔

گر گلیوری سالیج جو اس مہتم باشان منصوبہ کا بانی تھا جانتا تھا کہ اس کی تجویز کے کامیاب ہونے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ قسیمی مجالس کے ذریعہ سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک فرمان اس معنوں کا جاری کیا کہ قسیمی مجالس کے انعقاد کا حق پاپاؤن اور ان کے نائبوں کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مزید تقویت کی غرض سے اسے اسلم ساکن لگانے کے کچھ تو قیوم اسمیڈوری منسوبات اور کچھ نو تراشیدہ فتاویٰ کی بنا پر قانون کلیسا کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا۔ روم کی فوجیت اور برتری کے بقرار رکھنے کی غرض سے نہ صرف ایک جدید ضابطہ دیوانی و دینی کی تیاری ضروریات سے تھی۔ بلکہ ایک نئی تاریخ کا گہر دیا جانا بھی لازمی تھا۔ اس تاریخ میں بادشاہوں کے تحت حکمرانوں کے نام لکھے اور مسیحی برادری سے خارج کیے

جانے کے ذمہ داتعات اس غرض سے دیے گئے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ ہمیشہ سے پاپا پان روا کے مطیع و منقاد تھے۔ پاپاؤن کے زامین و واجب العمل ہونے کے لحاظ سے کتب مقدسہ کی آیات کے ہر درجہ قرار دئے گئے۔ ان کو شمشون کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ارض مغرب میں یہ عقیدہ عام طور سے پھیل گیا کہ مسیحیت کی ابتدا اسی سے پاپا پان روا کلیسا کے عمومی کے واضعان و امین رہے ہیں چونکہ مطلق العنان فرمان روا مجالس شور یہ کے روا دار نہیں ہو سکتے لہذا پاپائیت نے بھی جب مطلق العنان ہونا چاہا تو قصد کر لیا کہ بعض قومی کلیساؤں کی مجالس جو زیادہ آزاد و روا اور سرچڑھی ہیں تو خودی جابین اور صرف انہیں مجالس کو قائم رہنے دیا جائے جو پاپائے اعظم کی بدو و سلفہ گرامی میں ہیں یہ بجائے خود ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔

آٹھویں صدی میں ایک اور روایت روم میں تراشی گئی جو بہت سے اہم نتائج کی ذمہ دار ہے۔ وہ روایت یہ تھی کہ چونکہ پاپائے سلطنت کے فیصلے خط مبین کو مرنس جذام سے اچھا کر دیا تھا اور اصطلاح بھی دیا تھا لہذا قیصر نے اس کے شکرانہ میں اٹلی اور مغربی صوبے نذرانہ کے طور پر پاپائے مقدس کی خدمت میں پیش کیے۔ تھے اور نیز بطور اظہار اطاعت حضرت پاپا کی سائیس کی خدمت انجام دی تھی اور حضرت اقدس کی لکھوڑے کی باگ تمام کر کچھ دور چلا تھا اس مزویر کا مقصد یہ تھا کہ تاجداران فرانس اپنی اصلی قدر پہچان جائیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ جو علاقے وہ کلیسا کو دے رہے ہیں اس میں ان کا کچھ احسان نہیں ہے بلکہ محض حق کو حقدار تک پہنچا رہے ہیں۔

حکومت پاپائی کے جدید نظام کا سب سے زیادہ زبردست حربہ ”فنا داسے گریٹین“ تھا۔ یہ کتاب جو بارہویں صدی کے وسط میں شائع ہوئی انفرانز ویر کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھی۔ اس کی مدد سے کل مسیحی دنیا بوساطت پاپائے روما اطالوی پارلیون کی ملکیت ہو گئی۔ اس نے یہ اصول قائم کر دیا کہ انسان کو اعمال حسنہ پر مجبور کرنا اللہ ماحدہ و زائد کو حذاب وینا

قتل کرنا اور اُن کی جائداد قرق کر لینا جائز و مستحسن ہے۔ جو شخص مسیحی برادری سے خارج کیا جا چکا ہو اُسے مار ڈالنا قتل اُن میں تلزم منراہنہ نہیں ہے۔ اور پاپائے مقدس بلحاظ اُس غیر محدود برتری کے جو اُسے قانون پر حاصل ہے ابن اللہ کا ہمپا یہ ہے۔

اجتماع قوت کی یہ نئی تحریک جو نوجون ترقی پذیر ہوتی گئی اُن اصول کا جو زمانہ قدیم میں مسافری مسیحیت سمجھے جاتے بے محابا اعلان ہوتا گیا۔ مثلاً کمال بے باکی اور جسارت سے یہ دعوے کیا جانے لگا کہ کل کلیسا پاپائے مقدس کی جائداد ہے اور وہ اس سے جو کام چاہے کر سکتا ہے۔ سیونیٹ دوسرن کے حق میں گناہ ہے لیکن اُس کے حق میں گناہ نہیں ہے۔ وہ قانون سے بالا اور برتر از احتساب ہے۔ جو شخص اُسکی نافرمانی کرے وہ گردن زدنی ہے۔ ہر مصلحت یافتہ شخص اُس کی رعیت ہے اور خواہ وہ شخص چاہے یا نہ چاہے عمر بھر تک اُسکی رعیت رہے گا۔ بارہویں صدی کے ختم تک پاپا یان روم اپطرس کے نائب تھے آؤسنٹ ثالث کے زمانہ کے بعد وہ نائب مسیح ہو گئے۔

لیکن ہر مطلق العنان فرمان روا کو خزانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کلیہ سے پاپا یان روم مستثنیٰ نہ تھے۔ نائبان پاپا کا عہدہ ہلدیرینڈ کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ ان کا فرض بعض دفعہ تو یہ ہوتا تھا کہ کلیساؤں کا معائنہ و تنقیح کریں اور بعض دفعہ کسی خاص خدمت پر مامور کیے جاتے تھے لیکن ہر صورت میں انھیں مالک اُن سے کوہ الپس سے روپیوں اور اثرفینوں کی ٹولیاں باندھ کر لانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ چونکہ پاپائے مقدس قوانین وضع کرنے کے علاوہ اُن کے مسنوخ و معطل کرنے پر بھی مقتدر تھا لہذا ایک قانون اُس مسنون کا نافذ کیا گیا کہ جو شخص چاہے خدا نہ ادا کر کے پرواہ نقص قانون حاصل کر سکتا ہے۔ جو دیور روم کو خراج ادا کرتے تھے اُن کے اختیارات میں پاپا کی طرف سے دست اندازی نہ ہوتی تھی۔ غرض پاپائے روم اسقف عالم ہو گیا۔ ہر ابریشیہ (اسقف کا علقہ اختیار) پاپائی

سلا کلیسا کے عہدوں کی خرید و فروخت۔ مترجم

حدود و ارضی میں داخل تھا اور پاپا بوجہ متصادف الاختیار ہوسنے کے ہر مقدمہ کی مثل اپنی
 عدالت میں طلب کر سکتا تھا۔ اس وقت کے ساتھ اُس کے تعلقات وہی تھے جو ایک
 ملحق انسان بادشاہ کے اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ ہوتے ہیں کسی اسقف کو اجازت تھی
 کہ بغیر اُس کی اجازت کے مستغنی ہو اور جو ابرشہ استغفی کی وجہ سے خالی ہوتا تھا اُس پر جدید اسقف
 کے تقرر کا اختیار بجز اُس کے اور کسی کو حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس غرض سے کہ اُسے پروانہ نقص قانون
 کے اختیار اجرا کے استعمال کا موقع ملے۔ عدالت ہائے ماتحت کے فیصلوں کی ناراضی سے
 عدالت العالیہ پاپائیت میں اپیل والہ کرنے کی بات بات پر فریق متعلقہ کو ترغیب دی جاتی
 تھی ہزاروں ڈگریاں بغرض تھیں جو اس کی جاتی تھیں۔ جن کی بدولت رومین ڈیپوٹن سپریم
 لکھتی ہوا چلا آتا تھا۔ جب کسی ایسے شخص کے لیے بہت سے امیدوار ہوتے تھے تو پاپا اکثر ان
 سب کو نکال سا جواب دیکر کسی ایسے شخص کو اس عہدہ پر مقرر کر دیتا تھا۔ پادریوں کو بسا اوقات روم
 میں سا لہا سال تک ملازمت کے لیے امید داری کرتی پڑتی تھی اور وہ یا تو امید داری کرتے
 کرتے دوسری دنیا کو سدا رہ جاتے تھے۔ اور یا بوریادہ ہٹا ہٹا کر پاپائیت کی خواست
 و ارشاد داغ سینے پر لے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے گھروں کو لوٹ جاتے تھے جرمی
 کو اس بارے میں بقابل تمام دوسرے ممالک کے زیادہ رنج ناکامی برداشت کرنا پڑا اور
 یہی وجہ تھی کہ تخم اسلام کی روئیدگی کے لیے یہاں کی زمین میں سب سے زیادہ قابلیت
 پیدا ہو گئی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں پاپاؤن نے اپنے اقتدارات کو غیر معمولی طور
 پر بڑا لیا۔ بجائے اسکے کہ پہلے کی طرح وہ کسی خالی شدہ ابرشہ پر اپنے کسی منظور نظر کے
 مقرر کیے جانے کی سفارش کرتے اب وہ ایسے تقررات کے متعلق قلعی حکم داری کرنے
 لگے۔ چونکہ اُن کے اطالوی غرضداروں کی دکان دوزی مندر تھی لہذا بجز اس کے اور
 کوئی علاج نہ تھا ممالک غیرین اُن کے لیے عہدے تجویز کیے جائیں۔ ایک ایک قسمت
 کے لیے رومین سینکڑوں پادری امید داری کرتے کرتے مرجاتے تھے اور جب

حضرت عزرائیل کی تہمت سے اس طور پر جکڑنا لی ہوتی تھی تو پاپا اس جگہ کا انتقام استحقاقاً خود کرنا تھا۔
 اول اول یہ استحقاق روم تک محدود رہا۔ بالآخر یہ دعویٰ پیش کیا گیا کہ پاپا سے مقدس کو
 بلا تفریق و امتیاز کل کلیسا کی خدمتوں کے انتقام کا حق حاصل ہے اور بروقت تقرر اسقف کا
 یہ حلف اٹھانا کہ وہ پاپا کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا قسیمی اور سیاسی دونوں مفہوم
 رکھتا ہے۔ جو ممالک شہنشاہی حکومت تھے ان میں اس طور پر روحانی عصمر کی طاقت بدرجہ
 غایت بڑھ گئی۔

پاپائی قوت کے اس اکتنازد اجتماع کے لیے ہر قسم کے حقوق نہایت بیدروچی سے
 پامال کیے گئے۔ گداہی پیشہ راہبوں کے طبقوں سے پاپائیت کو اس مقصد کی تکمیل میں بہت
 بڑی مدد ملی۔ گویا پاپا اور یہ طبقے ایک طرف تھے اور اساقف اور ان کے ماتحت پادری دوسری
 طرف۔ پاپا سے روم کے دربار نے تمام وہ حقوق غصب کر لیے جو مجالس عامہ مجالس مطرانہ
 (کونسل متعلقہ دارالسلطنت) اساقف اور قومی کلیساؤں کو حاصل تھے۔ چونکہ پاپا کے نائب
 بات بات پر دست اندازی کرتے تھے لہذا اساقف نے اپنے ماتحتین کو ان کی بے عنایتی
 پر روک ٹوک کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اور چونکہ گداہی پیشہ راہبوں کی مداخلت حد سے زیادہ بڑھ گئی
 تھی اس لیے دیہاتی پادریوں کے اختیار بالکل سلب ہو گئے اور جو رہا سہا افراتھا سے
 ان راہبوں نے پاپائی تذکرات الغفران اور پرواسخات نقص قانون بیچ بیچ کر زایل کر دیا۔
 ان حرام کو محلال اور ناجائز کو جائز کر دینے والی سندوں کی فروخت سے جو روپیہ وصول ہوتا
 تھا وہ سیدھا روپیہ بیچ جاتا تھا۔

مالی مزدورین سے مجبور ہو کر بہت سے پاپا اس ذلیل حیلہ جوئی پر اتر آئے کہ جب کسی
 فرمانروا یا اسقف یا رئیس یکلین کا مقدمہ پاپائی عدالت میں پیش ہوتا تھا تو اس سے
 کہا جاتا تھا کہ ایک جام طلائی جس میں دو کاشت بھرے ہوئے ہوں بطور نذرانہ پیش کرے۔

لے ڈالنی روپیہ کا ایک سکہ جو بیس میں چلتا تھا۔ مترجم

اسی قسم کی ضرورتیں۔ جشن جولائی کے انعقاد کی محرک ہوئیں۔ پاپائے سکسٹس راج نے بہت سے جدید عہدے قائم کیے اور ہر عہدہ بموض تین یا چار سو دو کات کے فروخت کر ڈالا۔ پاپائے انوسٹ ٹامن نے اکیلے پاپائی رہن رکھا۔ پاپائے یوہیم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے تین پاپاؤن کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی جو رقم اُس کا پیشرو خزانہ بین چھوڑا تھا اول تو

لے جب اقبال بنی اسرائیل کے ساتھ تھا اور حکومت اُن کے ہاتھ میں تھی تو ان کے سلاطین کا یہ دستور تھا کہ ہر پچاسویں سال ایک بہت بڑا تیو بار مناتے تھے اور اس موقع پر ریایا کے ساتھ طرح طرح کے سلوک اور احسان کرتے تھے۔ عام غلام آزاد کر دے جاتے تھے۔ تمام قیدیوں کو رہائی دے دی جاتی تھی۔ تمام قرض معاف کر دے جاتے تھے۔ تمام جائیدادیں حواملی مالکوں کے ہاتھ سے گزشتہ نصف صدی میں نکل چکی تھیں۔ انہیں واپس دے دی جاتی تھیں۔ اسی تیو بار کا نام جولائی ہے جس کے عام معنی خوشی کے ہیں یہ تہذیبی ایک عبرانی لفظ یوہل سے مشتق ہے جس کے معنی نفیری کے ہیں۔ چونکہ جشن جولائی کا اعلان نفیری یا عری کی صدائے کیا جاتا تھا اس لیے اس کا نام یوہل یا جولائی پڑ گیا۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی کلیسا سے مدد من کتھو ملک نے بھی جشن جولائی منانا شروع کیا چنانچہ پہلے جشن کے انعقاد کا اعلان پاپائے بائی فیس ٹامن نے ۱۸۹۹ء میں کیا۔ جشن اول بجاہ سالہ قرار پاسے پھر حضرت مسیح کی عمر کے اعداد کی مناسبت سے سی دس سالہ ہو گئے اور بالآخر بہت دینچ سالہ قرار دیے گئے۔ اصلی غایت اس جشن کے انعقاد کی جیسا کہ مصنف نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ اس موقع پر عقل کے اندھے اور گمانٹھ کے پر سے عیسائیوں سے پاپاؤن کو نڈانہ وصول کرنے کا میلہ ہاتھ آجائے۔ چنانچہ ان سوتھوں پر پاپائی خزانہ میں کروڑوں ہی روپیہ داخل ہو جاتا تھا۔ جشن جولائی کلیسائی خوشحالی میں پاپائی طرف سے ہر اُس شخص کو جو اعزازات سری کے بعد عشاے ربانی کی صحبت میں شریک ہوتا تھا خاص خاص گرجاؤں میں داخل ہونے کی شرط کے ساتھ ہمدانہ مغفرت عطا کیا جاتا تھا۔

اُس پر ہاتھ صاف کیا اُس کے بعد اپنی دولت پر دست تہذیر دراز کیا اور صوبہ یہ بھی کافی تنہائی
تو اپنے جانشین کے مترتبہ مدخل کو پہلے سے وصول کر کے لیکھا جو کھا برابر کر دیا۔ اُس نے
دو ہزار ایک سو پچاس جدید خدمتین قائم کر کے فروخت کیں۔ مشربون کے لیے روپیہ لگانے
کی اس سے بہتر ترکیب نہ تھی۔ اس لیے کہ اصل سرمایہ پر بارہ فیصدی سود کہیں گیا ہی نہ تھا۔
اس سود کے استحصال کے لیے وہ ممالک موجود تھے جہاں کیتھولک مذہب رائج تھا یورپ
بحرین کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں سرمایہ اس قدر با منفعت طور پر لگایا جاسکتا ہو جسے رومین۔
اخلاق الرہن کے ذریعہ سے اور نیز عہد دن کو نہ صرف ایک دفعہ بلکہ مکرر فروخت کر کے بڑی
بڑی زمین وصول کر لی جاتی تھیں عہدہ داروں کا اضافہ اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے
عہدہ کو دوبارہ بیچ ڈالیں۔

اگرچہ سود خواری پاپائی اجتہاد کی زد سے ممنوع تھی لیکن پھر بھی پاپائی عدالت العالیہ کے
مشعلق ایک بہت بڑا بینک قائم ہو گیا تھا جو پادریوں کی لازمت کے امیدواروں اور اہل مقدمہ
کو نہایت سخت شرح سود پر روپیہ قرض دیتا تھا۔ پاپائی مہامیون کے لیے تو گویا سود لینا
سب سے اچھا اور باقی سود خوار مطرود و مردود تھے۔ پاپائی عدالت العالیہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی
کہ یہ ورپ بھر کے پادری اگر اُس کے مقروض ہوں گے تو پاپائیت کی اغراض کو سب سے
کچھ نفع ہو گا اس لیے کہ عدالت اُن پر من مانا دباؤ ڈال سکے گی اور اگر وہ دباؤ نہ مانیں گے تو
عدم ادا سے سود کی علت میں انہیں کلیسا کے حلقہ سے خارج کر سکے گی۔ ۱۷۷۳ء میں جب
حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ نصف مسیحی دنیا حلقہ کلیسا سے خارج ہو چکی ہے۔ اس وقت کا
انراج اس لیے عمل میں آیا کہ وہ پاپا کے نامیون کے مطالبات سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے
اور عام اشخاص اس لیے خارج کئے گئے کہ وہ مجبور ہو کر تذکرات العقران یا اجازت نامجات
نقض قانون خریدین اور پاپائی کارندوں کو اُن کی منہ مانگی قیمت ادا کریں۔ تمام ورپ کے
تیسری مدخل روہ کی طرف کھینچے ہوئے چلے جاتے تھے جو ارتش یہوئیٹ۔ سود خواری۔

بددیانتی اور استحصال بالجبر کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ستلندہ سے جو تحریک اجتماع و انتشار قوت کی تاریخ آغاز ہے۔ پاپاؤن نے اپنے خاص گٹھ کی بھیڑون کی دیکھ بھال بالکل چھوڑ دی تھی یعنی روما کی آبادی کی روحانی عورت پر وادخت اور کلیسا سے روما کے اندرونی انتظامات کی طرف توجہ کرنے کی اُنھیں مطلق فرصت نہ تھی۔ ممالک غیر کے ہزاروں معاملات جن میں سے ہر ایک بجائے خود بہت بڑا ذریعہ آمدنی تھا اُنھیں ہر وقت مصروف رکھتے تھے۔

اسقف آلبورڈ پاپو کا بیان ہے کہ ”میں جب کبھی ایوان عدالتِ عالیہ پاپائیہ میں داخل ہوتا تھا تو ارکانِ عدالت یعنی پاپا کے گمشدہوں کو اشرفیاء گنتے ہوئے پاتا تھا جن کے ڈیسپر کے ڈیسپر ہر طرف لگے رہتے تھے“ پاپائی عدالت کی حدودِ ارضی کی توسیع کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ قانون سے مستثنیٰ کرنے کا ڈھنگ ایسا ڈالا گیا تھا کہ جو شخص مستثنیٰ ہوتا تھا اُسے ہر وقت ایک نیا استثناء حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اسقف کو مجمعِ الاکلیروس کے مقابلہ میں خاص خاص رعایتیں حاصل تھیں۔ تو مجمعِ الاکلیروس بھی بمقابلہ اساقف خاص رعایات سے مستفیض تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اساقف خانقاہیں اور عام اشخاص نابان پاپا کے استحصال سے مستثنیٰ تھے۔ غرض استثناء کا یہ سلسلہ پاپا مقدس کی خواہش جلبِ منفعت کی طرح کہیں ختم ہوتا ہی نہ تھا۔

پاپائیت کا مدار اب جن دو طاقتوں پر تھا ان میں سے ایک تو کرڈینالوں کی مجلس تھی اور ایک ”کیوریا“ یعنی عدالتِ عالیہ پاپائیہ۔ ستلندہ میں پاپا کا انتخاب کرڈینالوں کی کثرتِ رائے سے ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ انتخاب کل رومن کیتھولک پادریوں کی طرف سے علیٰ مین آتا تھا اور روما کے مجسٹریٹوں اور سربراہانِ بادشاہتوں کا استصواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ لیکن پاپا سے منکوس ثانی نے حق انتخاب کو مجلسِ کرڈینالوں کی آرا کو دؤملت پر محدود کر کے تو یقیناً انتخاب کا حق شہنشاہِ جرمنی کو عطا کر دیا۔ تقریباً دو سو سال تک کرڈینالوں کی حکومت مختصہ و مجتمہ اور پاپا کی حکومت مطلقہ و منفردہ میں ایک

دوسرے پر غالب آنے کے لیے کشمکش ہوتی رہی اور آپس میں خوب خوب دُور و نِج ہوئے۔ کر دینال اس باعث پر تو راضی تھے کہ بابا کی حکومت خارجہ مطلق العنان ہو اور اُس کے اقتدارات کے اس شعبہ میں مطلق دست اندازی نہ کی جائے۔ لیکن بوقت انتخاب اُس کے موافق رائے دینے سے پہلے وہ اُس سے یہ اقرار لے لیتے تھے کہ حکومت میں اُن کو بھی ایک خاص حصہ دیا جائے گا۔ انتخاب کے بعد اور رسمِ تطہیر کے ادا ہونے سے پہلے وہ خاص خاص مراعات پر کاربند ہونے کی قسم کھاتا تھا مثلاً یہ کہ مدخل میں کر دینالوں کو بھی شریک کر گایا اُن کو ہر طرف نہ کرے گا اور سال میں دو مرتبہ اس بحث کے لیے اُن کی مجلس کے منعقد ہونے کی اجازت دے گا کہ آیا وہ اپنے عہد پر قائم رہا ہے یا نہیں۔ لیکن بابا اپنے عہد پر کبھی قائم نہ رہے اور متواتر بیان شکنی کے مرتکب ہوئے۔ کر دینال چاہتے تھے کہ کلیسائی حکومت اور آمدنی میں اُنہیں زیادہ حصہ ملے لیکن بابا قوت اور دولت کی اس علیحدگی کے کسی طرح رد و ادارہ نہ تھے۔ کر دینالوں کی آرزو تھی کہ شکوہ و اضطراب اور اسراف و تبذیر میں سربراہانِ آئین اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ رقمِ خطیر درکار تھی۔ ان میں سے ایک کے اختیار میں ایک دفعہ پانچ سو عہدے تھے ان کے اعدا و اقربا اور ملازمین و متوسلین کا تکفل بھی لازمی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکتِ فرانس کی پوری آمدنی بھی اُن کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی۔ لبغض و دند اُن کی رقابتوں کی وجہ سے سالہا سال تک کسی بابا کا انتخاب نہ ہوتا تھا۔ گویا اپنے اس طرزِ عمل سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نائبِ مسیح کے بنیہ بھی کلیسا کا کام آسانی میں لگتا گیا رہوین صدی کے خاتمہ پر کلیسا سے رومادربار رومادہو گیا۔ بجائے اس کے کہ مسیحی بہترین مسماتی ہوئی اپنے گڈریے کے پیچھے پیچھے روماء کے مقدس باڑے میں پھرتی ہوئی نظر آئیں۔ محزون کارندوں موصول اور دوشہ مات وادوستد کی تصدیق کرنے والے عہدہ داروں کا ایک محکمہ قائم ہو گیا جس میں مراعات ناموں تذکرات النفر

اور استثنائوں کا لین دین ہوتا تھا اور اہل مقدمہ باہتوں میں غرضیان لیے عینہ بعینہ پھرتے ہوئے دکھا کی دیتے تھے۔ روم ہر قوم و ملک کے امیدواران ملازمت کا نقطہ اجتماع بن گیا تھا۔ دینی ڈگریوں باپائی نوازش ناموں عفو و غفران کے تذکرہ داران کتاب گناہ کے اجازت ناموں فرماؤں اور فیصلوں کے طوابع نے جو یورپ اور ایشیا کے ہر حصہ کے لوگوں کے نام شب دروز جاری رہتا تھا گیسائے مقامی کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پس پشت ال دیا سینکڑوں ایسی اشخاص اس خدمت کی بجا آوری پر مامور تھے جو سکونت ہی "کیوریا" میں رکھتے تھے ان کی زندگی کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ باپائی خزانہ کی آمدنی کی توفیر سے سختی ترقی قرار پائیں تمام مسیحی دنیا "کیوریا" کی باج گزار رہی تھی۔ مذہب کا یہاں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ "کیوریا" کے عہدہ داروں کو سیاسی مباحثہ منسل حضومات اجراء تعمیل ڈگریات دینی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ روحانی امور میں اپنا وقت صنایع کرین ہر کشش قلم کی ایک خاص قیمت مقرر تھی۔ تذکرات الفرائض اجازت نامجات نقص قانون بسندات نبات پروانہ جات حلت محرکات و ممنوعات کی حذب و فروخت مال تجارت کی طرح ہوتی تھی اہل مقدمات کو پیراسی سے لڑ کر باپا تک سب کی مٹھی گرم کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ مقدمہ جیتنا محال تھا۔ غیر مستطیع لوگوں کو نہ ترقی مل سکتی تھی اور نہ ملنے کی امید تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر باورسی یہ سمجھنے لگا کہ اسے روم کی مثال کی تقلید کا حق حاصل ہے اور اپنے مقتدیوں کی روحانی تواضع اور عشاے ربانی کے ذریعہ سے جائز و ناجائز طور پر حسبہ روم پیہ بھی وصول ہو سکتا ہو وصول کرنا چاہیے۔ حلب منفعت کا یہ استحقاق اس نے رومین دہ روم ادا کر کے خرید لیا جو مہاجن سے قرض لی گئی تھی۔ اگر اس طور پر روم پیہ نہ وصول کیا جاتا تو یہ قرض کیونکر ادا ہوتا۔ جب "کیوریا" کا مستقر روم سے ایوینٹان میں منتقل ہوا اور اطالیوں

۱۷ فرانس کے جنوبی و مشرقی حصہ میں دریائے راین کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور اس دیوے کا کیشن ہے جو لائن سے مارسل کو جاتی ہے۔ مسیحی مسابہ مقابر اور اماکن یہاں کثرت سے موجود ہیں اور ان کی شاندار عمارتیں تسمیت کے اس مرکز کی خصوصیات سے ہیں۔ چنانچہ باپا سے جان بست وہم کا مقبرہ سولہویں صدی

کی طاقت فرانسیسیوں کے پاس چلی گئی۔ تو پھر بھی قدیم حالت بدستور قائم رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ اطالیوں کو بصد حسرت معلوم ہوا کہ سو۔ تہ کی چیز یا ان کے ہاتھ سے اٹا کر فرانسیسی اڈے پر جا بیٹھی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات سنا گئی تھی کہ باپائیت ان کا موردنی حق ہے اور جس طرح شریعت موسوی کے دور میں یہودی خدا کے خاص بندے تھے اسی طرح شریعت عیسوی کی رو سے خدا کا فیضان خاص انہیں پر نازل ہوا ہے۔

تیرہویں صدی کے خاتمہ پر ایک جدید مملکت دریافت ہوئی جس میں بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی قابلیت موجود تھی اس مملکت کا نام مٹکھ تھا۔ عقل کے اندھون اور گانٹھ کے پوروان کو یہ یقین دلایا گیا کہ حضرت باپا اس سرزمین کی گناہگار آبادی کو تذکرات الغفران کے اجراء سے خالی فرما سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی دام نزویر کا بچھایا جانا ضروری نہ تھا۔ دن دھاڑی لوگوں کی چشم اعتماد میں خاک جنو کی جاتی تھی۔ غرض اسقفی طاقت کے ابتدائی جراثیم نے نشو و نما پا کر رفته رفته ایک بہت بڑی زبردست شخصی سلطنت کی شکل کھڑی۔

محکمہ احتساب عقاید نے پابائی تو ت کو ایسا زبردست بنادیا کہ اس کی مزاحمت و مدافعت محال ہو گئی۔ جو شخص مخالف کرنا تھا آگ میں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کسی شخص کے دل میں مخالفانہ خیال کا ناشی ہونا عام اس سے کہ اس خیال کا اظہار کسی خارجی علامت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہر جرم سمجھا جاتا تھا۔ جون جون زمانہ گزرتا گیا محکمہ احتساب عقاید کا طرز عمل زیادہ وحشیانہ ہوتا گیا۔ محض شہ کی بنا پر ملزم کو شکنجہ کی سزا دی جاتی تھی۔ ملزم کو الزام لگانے والے کا نام تک نہ بتایا جاتا تھا۔ اسے کسی قانون دان شخص سے مشورہ لینے کی اجازت تک نہ دی جاتی تھی۔ اس محکمہ کے فیصلہ کی نہ داد تھی نہ فریاد۔ افسران محکمہ یعنی ارکان احتساب کو حکم تھا کہ رحم و لیت نہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸۰ کے فن تعمیر کی بہترین یادگار ہے۔ ۱۳۳۷ء سے ۱۳۳۸ء تک ادنیان باپائیت کا صدر مقام رہا۔ ۱۳۳۸ء میں یہاں کی آبادی ۲۷۴۰۰۰ تھی ۱۳۳۹ء میں ۲۷۶۰۰۰ ہو گئی۔ آج کل یہ شہر اپنی تجارت خصوصاً ریشمی کپڑوں کے کارخانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

مترجم

دل میں مطلق نہ آنے دین۔ ملازم کا عقاید منسوب سے توبہ کرنا بھی بے سود و لا حاصل تھا۔ لازم کے ناکردہ گناہ خافان کا مال و اسباب ضبط کر لیا جاتا تھا۔ جس میں سے آدھا پاپا کے خزانہ میں چلا جاتا تھا اور آدھے سے ارکان احتساب اپنے دوزخ کی تواضع کرتے تھے۔ پاپا سے آٹھ ثالث کا قول تھا کہ ملاحدہ کی اولاد کی صرف جان بخشی کرنی چاہیے اور وہ بھی محض بہ تقاضائے ترحم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نکوئس ثالث کے سے ڈاکو پاپاؤن نے اس مقدس عدالت کی لوٹ کے مال سے اپنے خاندان کو نہال اور مال مال کر دیا۔ اور ارکان احتساب کو تو ہر روز اس کی بدولت ترلے ملنے رہتے تھے۔

پاپائیت کے قبضہ کے لیے فرانسیسیوں اور اطالویوں میں جو جہد و جدہ ہوئی وہ جو دہویں صدی کے مشہور مذہبی تفرقہ کی ذمہ دار ہے۔ پالین تک دور قیام پاپا ایک دوسرے پر رب و شتم کرتے رہے اور دور قیام پاپائی عدالتیں بہ تقاضائے جانب منفعت اقوام یورپ کو جو نمک بن کر چٹٹی رہیں۔ بالآخر پاپاؤن کی تعداد دوسے بڑھ کر تین ہو گئی اور اشتعال امر و ادا کے خراج ربانی کے لیے تین جداگانہ مرکز قائم ہو گئے۔ لوگون کی ارادت و عقیدت منقطعہ میں پڑ گئی وہ جبران تھے کہ کس پاپا کو اصلی اور سچا نائب، جناب مسیح کا تصور کریں اور عشا سے ربانی و صراحت و سببیں پاک مذہبی رسوم کی تفسیر کے متعلق کس سے اور کیوں کر اشتاد کریں۔ مسیحی انجمن میں جائز مجتہدانہ قیاس کی کرسی ممدارت خالی تھی۔ ہر شخص مجبور تھا کہ اپنا مجتہد خود بنے لوگون کو معلوم ہونے لگا کہ کلیسا کے باؤن میں عدالت العالمیہ پاپائیہ کی جو زنجیر بڑھی ہوئی ہے اس کا ٹوٹنا اور ایک مجلس عمومی کا قیام ہونا کلیسا کی سلامتی کے لیے ضروریات سے ہے چنانچہ مجلس عمومی کے قیام کی کوشش بار بار کی گئی۔ اس کوشش کی غایت یہ تھی کہ اس مجلس کو مسیحی دنیا کی پارلیمنٹ بنا دیا جائے جس کا اعلیٰ عہدہ دار انتظامی پاپا ہو۔ لیکن وہ ذاتی اثرات اور نفسانیتیں جو مدت ہا سے مدیر کے زمام و مقاصد کا نتیجہ تھیں کیوں کر ایک بیک علاج پذیر ہو سکتی۔ عدالت العالمیہ پاپائیہ کا باز اور پھر گرم ہو گیا اور پارلیون کا وہی انگلاستجارتی لینڈین

پھر شروع ہو گیا۔ اہل جرمنی نے جنہیں عدالتِ عالیہ باپائے کر اقدرات میں کبھی حصہ نہ ملا تھا اصلاح کی ان کو ششون میں سب سے بڑھ کر حصہ دیا۔ لیکن جب حالت بد سے بدتر ہوتی چلی تو ان کو بھی ماننا ہی پڑا کہ مجالسِ عمومی کے ذریعہ سے اصلاح کفایت کی توقع رکھنا لاحاصل ہے۔ چنانچہ ارمس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے کہ ”اگر مسیح اپنے بندوں کو ان گوناگون قسیدہ منظمی سے نجات نہ دلائیں گے۔ تو ترکوں کے ظلم کی سختی کم ہو جائے گی“ غرض کلیسا کی حالت اس

لے ارمس کا یہ فقرہ شصت نفرت اور عناد کے اُن سنگانہ جذبات کا پختہ طے جس کا خون پادریوں کی آنکھوں میں مسلاؤں اور مضبوط ترکوں کو دیکھ کر رہ کر اترتا چلا آیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تفسطنینہ کے تحت پر سلطان سلیمان قاضی جیسا عادل و بیدار مغز فرمان روا حکم تھا جسے یورپ بھی عالیشان کا لقب دے کر نہیں نہ رہ سکا۔ اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ سلطان سلیمان کا چیل و شش سالہ عہد حکومت اُس حسن سلوک و مہارت کے لحاظ سے جو عیسائی رعایا کے ساتھ کی گئی، ترکی کی تاریخ میں اپنی غیر آپ ہے تو ارمس کی حق بانٹنا ہی پرہیز ضربِ المثل والی اُس آنکھ کی چھتی سوچتی ہے جس کی شان میں ”عیبِ نمایہ نہ ترش و نظر“ کہا گیا ہے۔ سرائیہ و ذکرِ سیسی اپنی تاریخِ ترکی میں لکھتے ہیں کہ ”سلیمان نے اپنے ہر دیر اس کے نام فرمانِ طبی کیا کہ قیام امن و امان کی فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ امیر و غریب مسلم و ذمی سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور عدل و انصاف سے سربمجاوہ نہ کیا جائے۔ اُس کے اس فرمان کو براری دینے سرائیہ اور اس کی عام طور سے تعمیل کی گئی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان پر ایک زیر دست اور سات ہی مہربان حکومت کا سایہ ہے۔ یہ تو یورپ کا خیال ہو اور ارمس صاحبِ ترکوں کو ظالم اور جابر قرار دین۔ پھر یہ کہ پادریانہ تعصب نہیں تو کیا ہے!!

یکم مئی ۱۵۶۷ء وقارِ تاریخ ہے جس کا واقعہ کسی طرح واقعہ کر بلا سے کم نہیں اس لیے کہ اس دن مسلمانوں کو اندلس سے جہانِ اُمنوں نے آٹھ سو سال تک بڑے کرد فر اور آن بان کے ساتھ سلفیت کی شعی طرح طرح کے عذاب کے ساتھ نہایت عذرا نہ و سفاکاء طور پر دیس نکالا دیا گیا۔ سلطان سلیمان صاحبِ قرآن کا زمانہ حکومت ۱۵۶۷ء سے لیکر ۱۵۶۷ء تک ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں ترک آج کل کی

درجہ ابتر ہو گئی تھی کہ کردیانوں کا منصب علانیہ فروخت ہونے لگا تھا اور پاپائے اہم کے عہد میں تو برقیسی مذہبی خدمت نیلام ہوتی تھی۔ زندگی کا اصول مغضوب یہ ہو گیا تھا کہ اول دولت بعدہ عزت عہدہ داروں میں ایک بھی ایسا تھا جو آنکھ سے اوجھل ایماندار ہو یا گواہ لائے بغیر پاکبازی کا ادعا کر سکے۔ کردیانوں کے ادعوائی رنگ کی محملی عبائین اور سفید خجاب کے طیلان دھوئے کی ٹٹی ہو رہے تھے جن کی آرزو میں کوئی خباثت نہ تھی جس کا یہ بزرگوار ارتکاب نہ کرتے

بقیہ نوٹ جمعہ ۳۰ - طرح دول یرپ کے چوگان کی گیند بنے ہوئے تھے بلکہ خود ان سے ہر نصرانی حکومت کی کہ وہ جی تھی۔ سپین کے مسیحی طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اگر مسلمان بس کی تمشیر آبدار ہو گئی کے بنگرین یہ پہلی شخص ہیں سلطنت سے عیسائیوں کو اسی طرح کمال دینا یا زبردستی مسلمان بنانا جس طرح اُس کے مامورین فریڈرک و ساجیالے کیا تھا تو وہ ہر طرح سے حق بجانب ہوتا تو اگر مسلمان کی خاطر ہم اسے کچھ دیر کے لیے غلام کہہ لیتے لیکن اس کی انسانیت اور شرافت نفس اس سے ظاہر ہے کہ جب اس نے جزیرہ رودس کو طبقہ سینٹ باپا کے سیکرٹریں سے فرج کیا جنہوں سے اس کا مقابلہ بہت تک جہم کرنا پڑا، بے جا کسی سے کیا تھا تو پچاسے اس کو اور اس کے رکی طرح غلطہ خطاب میں آکر ان کو نیست و نابود کر دینا یا فراموشی مند و ساجیالے کی طرح ان کے آئندہ یادگاروں کو مٹا دینا اس نے رودس کے مسیحی باشندہ نکو پوری مذہبی آزادی عطا کی اور حکم دیا کہ ان کے آئندہ ان کی سب سے جڑی نہ کی جائے بچے ان کے والدین سے نہ پھینے عبائین اور ان کے تمام مذہبی اکران اور قومی علامات کو برقرار رکھنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مارشل دمانٹ جس نے ۱۸۳۳ء میں رودس کا سفر کیا لکھتا ہے کہ تین سو پندرہ سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ طبقہ سینٹ جان کے طویل القدر ہیکلین کو دو سو بارہ سال تک اس جزیرہ پر قابض رہ کر آخر اپنی سپر ڈانٹی پڑی۔ ترکوں نے اپنے بہادر حریفوں کا یہاں تک ادب کیا ہے کہ ہیکلین کا محلہ ابھی تک قائم ہے اور ہر گھر کے دروازے پر ابھی تک اپنے سابق کمین کا ڈھڑے اور سرکہ ابھی تک ثبت ہے۔ ہیکلین کی بنائی ہوئی عمارت بھی دستور موجود ہیں اگرچہ ان میں آج کل کوئی رہتا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بہادر دن کی روحیں یہاں مقیم ہیں۔

جون اور کوئی گناہ نہ تھا جو ان حضرات سے صادر نہ ہوتا ہو۔

کلیسا کی وحدت (اور اس لحاظ سے اس کی طاقت) اس امر کی متقاضی تھی کہ لاطینی کا ہندسہ لاطینوں کی زبان مقدس عام طور سے ہو۔ لاطینی ہی کے استعمال کے بدولت روم اور پاپ کا جزو لا ینفک بنا رہا اور تعلقات بین الاقوام کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ لاطینی زبان کے بین الاقوامی استعمال نے روم کو جو قوت بخشی اُس کے مقابلہ میں امن اقتدارات کے اثر کی کوئی ہستی نہیں جن کے سماوی الاصل ہونے کا پاپائیت کو ادعا تھا اور اگرچہ اس کو اپنے کارناموں پر بہت بڑا تازہ ہے لیکن وہ اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتی کہ باوجود اتنی بڑی طاقت کے جو آئندہ اُس کے کسی جانشین کو حاصل نہ ہو سکے گی اُس نے کچھ اس سے بھی زیادہ کیوں نہیں کر دکھایا۔ اگر پاپا بیان روم اپنی ہوس راینون اور دنیا پرستیوں میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ اُنکے ایک اشارہ پر تمام براعظم بالاتفاق ایسی رتی کرتا کر دنیا دگر رہ جاتی۔ اُن کے نائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جا سکتے تھے اور آئر لینڈ سے لیکر بوسنیا اور آلمی سے چلکر اسکاٹلینڈ تک بلا تکلف آپس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں ذیل ہو گئے تھے اور ہر ملک میں اُنھیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف ہاتھ آ گئے تھے جو ایک ہی زبان بولتے تھے اور مہات الامور میں اُن کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار تھے۔

ایسی حالت میں یونانی زبان کے احیا اور ابرانی زبان کی ترویج پھردمانے جس نفرت و عداوت کا اظہار کیا وہ کچھ بے وجہ نہ تھا اور جو تشویش اُسے یہ دیکھ کر دامنگیر ہوئی کہ السنہ جدیدہ کی دیوار گنوار دبولیوں کی بنیاد پر چنی جا رہی ہے وہ بیجا نہ تھی۔ پیرس کے مدرسہ الہیات کے اس ترو و آمیز استفسار کو کہ اگر یونانی و ابرانی کے پڑھنے کی اجازت دی جائے گی تو مذہب کا کیا مشر ہوگا۔ اگرچہ کروینال زمینر کے عہد کے خیالات کی گونج سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن اس کی نہ میں ایک حقیقی خدشہ بھی معترف تھا۔ لاطینی کے

رواج عام پر روم کی طاقت کا انحصار تھا۔ اس کے انحطاط کے ساتھ اُس کا زوال وابستہ تھا۔ اس کے عدم استعمال کے یہ معنی تھے کہ روم کی مد اشرافی کے ایک چھوٹے سے صوبہ تک محدود ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپین زبانوں کی ترقی روم کی بربادی کا باعث ہوئی ہے۔ یہ زبانیں گرائی پیشہ راہبوں اور اُن بڑے عوام الناس کے درمیان تبادلۂ خیال کا موثر ذریعہ بن گئیں اور ان میں سے ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنی اولین تصانیف میں روم کو نشانہٴ شہارت و آماجگاہِ ملامت نہ بنایا ہو۔

غرض یورپ کے مختلف الاسٹریٹجی کی ترقی باپائی مسیحیت کے زوال کی ہمعصر ہے۔ باپائی عہد حکومت میں نامکن تھا کہ یورپ کا لٹریچر وجود میں آسکے۔ ایسیلے کہ باپائی وحدت علمی وحدت کی متفانسی تھی جبکہ مفہوم یہ تھا کہ صرف ایک ہی علمی زبان ہر جگہ رائج ہو۔

اگرچہ ایک زبان واحد کے مالک ہونے کی وجہ سے کلیسا کی قوت میں ایسا جبرست انگیز اضافہ ہو گیا لیکن اُس کی طاقت کا اصلی راز اُس دسترس میں پوشیدہ تھا جو اُس نے نہایت چالاک سے لوگوں کی خانگی زندگی پر حاصل کر لی تھی۔ اس کے فقدان کے ساتھ اُس کا اثر بھی گہت گیا اور ساتھ ہی بین الاقوامی امور میں اُس کی سیاسی مداخلت بھی برائے نام رکھ سبھیت سے پہلے جب تاجداران روم کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا تو سلطنت کے

صوبوں میں جہاں رومی افواج کی چھا و نیاں قائم ہوتی تھیں وہ ب مقامات تہذیب و شہادتگی کے مرکز بن جاتے تھے۔ صنعت و حرفت اور امن و امان کی جو حالت ان مقامات میں پائی جاتی تھی اُس کی مثال گردد رواج کی وحشی اقوام پر جو برطانیہ فرانس اور جرمنی میں آباد تھیں اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی اور اگرچہ حکام روم کا یہ فرض نہیں تھا کہ اقوام مفتوحہ کی تلاح و بہبود میں نمایاں دلچسپی ظاہر کریں بلکہ اُن کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان اقوام کی حالت ذلیل رہے۔ کیونکہ پستی حالت حلقہٴ تجریشی و اطاعت کی بنی کی مدد و معاون ہوتی ہے لیکن پھر بھی عایا کی تمدنی و معاشرتی حالت میں منفرداً و مجتمعاً برابر اصلاح ہوتی گئی۔

جب رومیوں کا دور دورہ ہوا تو اسی قسم کے نتائج خود بخود مہرور میں آنے شروع ہوئے۔ بیرونیجات میں فوجی چھان بین کی جگہ دیر قائم ہو گئے۔ گاؤں یا شہر میں گرجا و عبادت گاہ تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اول الذکر کے سامان عیش و عشرت اور ثانی الذکر کے مواظف و نفعیج نے لوگوں پر ایک زبردست ڈالا۔

خاندانوں کے نظام معاشرت کی تنظیم حکومت ملکی کے ضابطہ کی تعیین اور دولیورپ کی ترکیب میں پاپائییت کے طرز عمل نے جو حصہ لیا اس کے محاسن پر نظر ڈالتے وقت ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ تیسری حکمت عملی کا خاص مقصد اصلاح تمدن نہ تھا بلکہ اعتلا سے کلیسا تھا۔ پس دنیا دار لوگوں کو جو فوائد پہنچ گئے وہ مقصود بالذات و معہود بالہدایت نہ تھے بلکہ ذیلی و اتفاقی تھے۔

اقوام کی مادی حالت کی اصلاح و ترقی کے لیے کوئی نتیجہ غیر مستقل بالذات تدبیر پاؤں کی طرف سے اختیار نہیں کی گئی۔ ان کے نشوونما عقلی کے لیے کوئی طریقہ عمل میں نہیں لایا گیا اور اٹھا انہیں ان بڑے بلکہ جاہل مطلق رکھنے کی کوشش کی گئی۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں یہ سن کر انسان کی حالت کیفیت کے چرچاؤں سے بہتر نہ ہونے پائی۔ وسائل نقل و حرکت اور ذرائع ریل و رسائل کو جو وسیع خیالات کے مہمومین ہوا کرتے ہیں مہلک و غیر متحرک رہنے دیا گیا۔ آبادی کا اکثر حصہ ایسا تھا جسے ساری ہر اپنے گھر سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق نہ ہوا اس بد نصیب طبقہ کو نہ اصلاح حالت کی امید تھی نہ کسی ترقی کی توقع۔ اخلاس کے سد باب اور قحط کے اندھ کے لیے بڑے پیمانہ پر کوئی تجویز نہ سوچی گئی۔ واکو اجازت تھی کہ کھلے بندوں جہاں چاہے پھرے اور جس شہر پر چاہے چھا پڑے۔ بہت ہی روک ٹوک ہوئی تو کسی پادری نے دو چار لاطینی دسائیں بڑ بڑا دیں۔ برسی خوراک ناقص لباس اور ناکافی مکان برابر اپنا اثر کیے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار سال کے بعد یورپ کی آبادی دگنی بھی نہ ہوئے پائی اگر کسی حکومت کا فن تدبیر مہلت پیدائش کو روکنے اور اموات کا باعث ہونے کے اعتبار

سے قابلِ موفدہ مٹھہر سکتا ہے نو پاپائیت پر کشا بڑا سوا غلہ عاید ہوتا ہے !

کیتھولک مذہب کے اس عام اثر کی تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنی آپ کو تو خیر جو کچھ نفع پہنچایا وہ ظاہر ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ساتھ کیا بھلائی کی راہب کی خانقاہ کی شاندار تصویر بردہ تصور پر کہنچو۔ اس میں عیش و عشرت اور راحت و آسائش کا ہر ایک سامان لمہین فلزائے گاہ تشری ہوئی گھاس کے زمر دین تھنے چو لون کے چین۔ بیہودہ درختوں کے صلیبے اچھلتے ہوئے نوارے ترنم آفرین نرین بھی کچھ پاؤ گے۔ لیکن ان نعمتوں کا تعلق بچارے بازوہ کسان سے نہ ہوگا جو کسی دلدل کے کنارے ایک بوٹے چھپر کے نیچے بے یار و مددگار سکھیاں بھرتا ہوا دم توڑ رہا ہوگا بلکہ ان کا تعلق خانقاہ کے سجادہ صاحب سے ہوگا جن کے ناگن کی پھیل جن کی ترمیتوں۔ شکروں اور تازی کتون کی صیدا فگنی جن کے نعمتخانہ اور خمیانہ کے اطعمہ لذیذہ و اسٹور نفیسہ کی حکایت سے ایجن کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ یہ عیش پرست راہب اس مذہبی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے جس کا مرکز اٹلی ہے۔ وہ روم کا باجگزار اور مطیع و منقاد ہے اور اس کا کوئی ضل ایسا نہیں ہوتا جس سے روم کے نواید کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ جب ہم اس زمانہ کے عالیشان گرجاؤں اور کلیساؤں پر نظر دوڑاتے ہیں جن کا شمار فن تعمیر کی سچائی کے کرشموں میں ہے اور جھین دیکھ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پاپائیت کے حقیقی معجزات یہی عمارتیں ہیں۔ اور جب ہم ان مہتمم بالشان اور دل پر رعب طاری کرنے والے مذہبی مراہم کو جو ان گرجاؤں میں ادا کیے جاتے تھے اس دھندلے نور کو جو رنگارنگ آئینوں والے دریچوں میں سے چھننا تھا۔ ان سریل آواز دن کو جن کے الاپ کی سامعہ فریبی ملائیک کے نغموں سے کسی طرح کم ہوتی۔ ان پادریوں کو جو اپنے مقدس خلعت ہائے فاخرہ زیب تن کیے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ ان سر بسجود عبادت گزاروں کو جو ایک اجنبی اور نامعلوم زبان میں دعائیں اور نمازین سن رہے ہوتے تھے۔ غرض جب ہم اس تمام عالیشان مذہبی نظارہ کو اپنے تصور میں

لاتے ہیں تو بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ عبادت گزاروں کی روحانی فلاح کی خاطر تھا یا ردِ مادی زبردست اور سہمہ گیر طاقت کا پاپائے حلال و غطیت اور بھی اونچا کرنے کی غرض سے؟

لیکن شاید کوئی شخص اس کے جواب میں یہ کہے کہ انسانی مساعی محدود ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جنہیں کوئی سیاسی نظام اور کوئی انسانی طاقت خواہ اُس کا ارادہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو انجام نہیں دے سکتی۔ انسان دشیانہ حالت سے ترقی کر کے دفعۃً شایستہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ایک وسیع براعظم ایک ہی دن میں مہذب نہیں ہو سکتا۔

یہ سب سچ ہے مگر پاپائیت کے جانچنے کے لیے اس قسم کا معیار پہلے ہی مقرر نہیں کیا گیا۔ کیتھولک طاقت کی نسبت جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ وہ ازراہ غایت استحقاق انسانی الاصل ہونے سے منکر ہوئی بلکہ اس وقت تک منکر ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اُس کا ماخذ ربانی ہے اور اُسکو الوہیت کے ساتھ باواسطہ نسبت ہے۔ پاپائے اعظم خلیفۃ السنی الارض ہے اُس کا اجتہاد خطا سے پاک ہے اُس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو معبود کے ذریعے سے ان ہونی بات کو ہونی کر دکھائے۔ ایک ہزار سال تک اُس نے یورپ کی عقل و ادراک پر جا بزاں اور قہرانہ حکومت قائم رکھی اور اگرچہ بعض باجداروں نے سرکشی کی راہ سے کبھی کبھی اُس کی مخالفت کی لیکن مجموعی حیثیت سے یہ مخالفت ایسی بے حقیقت تھی کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کے حل و عقد و سبب و کشاد کا مدار علیہ پاپائے روم ہی تھا۔ جو واقعات اس فصل میں بیان کئے گئے ہیں ان پر بلاشبہ سو لھوین صدی کے پراٹسٹنٹ علم برداران اصلاح کی نظر غائر پڑ چکی تھی۔ اور وہ نتیجہ نکال چکے تھے رومن کیتھولک مذہب اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی سے بالکل عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ بلکہ ضلالت افراد و کار کا مجموعہ بن گیا ہے۔ پس سچی مسیحیت کے احیاء کی صرف یہی شکل ہے کہ قرونِ اولیٰ کے عقاید و مراسم کو از سر نو تازہ کیا جائے۔ اس فیصلہ پر حامیان اصلاح دفعۃً و بغتۃً نہیں پہنچے تھے۔

ایک مدت ممتد سے بہت سے پیشوایان مذہب اور روشن خیال علما و فضلا کی یہی رائے تھی چنانچہ ازمنہ و سلی میں نواسمکن طبقہ کے متقی اور پرہیزگار راہب اس خیال کو صاف طور سے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے کہ روم کے ایک قیصر کی لستراہیون نے سچے مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اصلاح کے لیے مواد ایک عرصہ سے تیار ہو رہا تھا۔ سترنگ بچالی جا چکی تھی۔ مرنے والی دکھانے کی دیر تھی تو سحر کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام شمالی یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ مریم مذرا کی پرستش ادویا سے مراد طلبی معجزہ شمالی میریضیوں کا کراماتی علاج۔ انتخاب گناہ کے لیے تذکرۃ الخیران کی خرید اور پاپا پرستوں کی مٹھی گرم کرنے والے باقی کے تمام اُن اعمالِ سیئہ کا جو عیسائیت سے منسوب کر دئے گئے تھے لیکن اُس سے حقیقت میں تعلق نہ رکھتے تھے یک قلم خاتمہ کر دیا جائے۔ کیتھولک مذہب کو ایک ایسی طاقت ہونے کی حیثیت سے جس کی غایت فلاح و ترقی انسان تھی اپنے اس دعوے میں کہ اُس کا طرز عمل معلل بتائید آسمانی ہے صاف ناکامی ہوئی اُس کے کارناموں اور اُس کے اداؤں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک ہزار سال تک اُسے انسان کی اصلاح حالت کا موقع دیا گیا۔ لیکن جب اُس کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ نبی نوع انسان کی جس جماعت کثیر کو اسکے حوالہ کیا گیا تھا اُسکی حالت جسمانی و عقلی ترقی کے اعتبار سے اُس حالت کے مقابل میں بہت ہی پست تھی جس میں یہ جماعت پائی جانی جا رہی تھی۔

گیارہواں باب

سائنس کا تعلق تمدن جدیدہ کے ساتھ

سائنس کے عام اثرات کی مثال تاریخ امریکہ سے۔

سائنس کا یورپ میں داخل ہونا۔ اسلامی اسپین سے چلکر سائنس کا گزر شمالی اٹلی میں ہوا۔ جہاں بوجہ اس کے کہ پاپائیت کا مستقر آئیوین میں منتقل ہو گیا تھا اس نے خاطر خواہ فساد نہ پائی۔ چھاپہ، بحری اسفار اور اصلاح کینسہ کا اثر۔ اعلیٰ مجلس علمی تعلیم سائنس کا عقلی اثر اس نے یورپ میں ادراک کی طرز و روش بدل ڈالی۔ لندن کی رائل سوسائٹی اور دوسری علمی مجلسوں کے کارناموں سے اس کی تصدیق و توثیق۔

سائنس کا اقتصادی اثر اُن بینکار ایجادات متعلقہ فن جہتیل و فن طبیعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو چودہویں صدی کے آغاز سے لگی ہیں۔ ان ایجادات کا اثر صحت بدلی۔ اور خانگی زندگی اور نیز فنونِ رزم و بزم پر۔

اس سوال کا جواب کہ سائنس نے بنی نوع انسان کو کیا نفع پہنچایا ہے۔۔۔

یورپ کی تاریخِ زمانہ اصلاح کینسہ اُن اثرات کے نتائج پر روشنی ڈالتی ہے جو رومی مسیحیت نے اصلاحِ تمدن پر ڈالی۔ اگر ہم امریکہ کی تاریخِ زمانہ حال پر اسی طرح کی نظر اٹھاد ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سائنس کے اثرات سے کیا کیا نتائج مترتب ہوئے ہیں۔

سترہویں صدی میں اہلِ یورپ کی ایک مختصر سی جماعت بحرِ اوقیانوس کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئی تھی۔ جزیرہ نیو فاؤنڈ لینڈ (ارضِ جدید) میں چونکہ کاڈ مچھلی کا صنعت

شکار بہ کثرت تھا لہذا فرانسیسیوں نے ایک جھولی طسی نو آبادی سینٹ لارنس کے شمال میں قائم کر لی تھی۔ قوم انگریز قوم ڈچ اور قوم سوئیڈ کے لوگ نیو انگلینڈ (انگلستان جدید) کے سوا حل اورٹڈل اسٹیٹز (ریاستہائے متوسط) میں آباد تھے اور فرانسیسی پرائسٹون کی کچھ جماعت کیرولائنا میں رہتی تھی۔ یہ افراد کہ فلا ریڈائین آب بقا کا ایک چشمہ ہے جس کا بانی پی کر انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے چند ہسپانویوں کو یہاں لے آئی تھی۔ ان میں سیاحون نے جو گاؤں قائم کر لیے تھے ان کے پرلی طرف ایک وسیع وغیر معلوم سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس میں خانہ بدوش وحشیوں کے گروہ بھرتے تھے۔ ان وحشیوں کی تعداد خلیج میکسیکو سے لے کر سینٹ لارنس تک ایک لاکھ اسی ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان کی زبانی یورپین فوڈاردون کو معلوم ہوا کہ اندرون ملک میں آب شیرین کے وسیع سمندر موجود ہیں اور ایک بہت بڑا دریا ہے جس کا نام تسی تسی ہے اس دریا کے بارہ میں ان کے اقوال مختلف تھے۔ بعض کا یہ قول تھا کہ یہ دریا درجینا میں سے ہوتا ہوا بحر اوقیانوس میں جاگرتا ہے بعض کہتے تھے کہ درجینا میں سے نہیں بلکہ فلا ریڈائین سے گزرتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ دریا بحر الکاہل میں جاملتا ہے اور بعض کا قیاس یہ تھا کہ اس کا دہانہ خلیج میکسیکو ہے۔ بحر اوقیانوس کی طوفان خیز موجیں جن کو عبور کرنے کے معنی یہ تھے کہ کئی مہینے کا سفر اختیار کیا جائے ان یورپین پریسیوں کو ان کے وطن سے جدا کر لی تھیں ان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسے کونے میں پڑے ہوئے ہیں جہاں کسی کو ان کی خبر نہیں ہو سکتی۔

لیکن انیسویں صدی ابھی ختم نہ ہونے باقی تھی کہ ان بے سردسان اور بے بارو مددگار آوارگان وشت غربت کی اولاد دنیا کی ایک زبردست اور طاقتور قوم ہو گئی۔ اس قوم نے ایک ایسی جمہوری سلطنت قائم کر لی جس کا علم بحر اوقیانوس سے لے کر تباہ سال بحر الکاہل لہراتا تھا۔ دس لاکھ سپاہیوں کے ایک لشکر جہاز کی مدد سے جس کا شمار صفحہ قرطاس ہی کی زینت

نہ تھا بلکہ جو میدان جنگ میں موجود تھا اس قوم نے ایک خانگی حریت کا تختہ سطوت و اقتدار الٹ ڈالا۔ اس کے جنگی بیڑے میں سات سو جہاز شامل تھے جن پر پانچ ہزار نو ہین چڑھی ہوئی تھیں اور ان میں سے بعض توہین ایسی بھاری تھیں کہ دنیا میں اس لحاظ سے اُن کا جواب نہ تھا۔ ان جہازوں کے سامان محمولہ کا مجموعی وزن پانچ لاکھ ٹن تھا۔ اپنے قومی حقوق کی حفاظت میں اس قوم نے پانچ سال سے کم کی مدت میں چار سو کروڑ ڈالر خرچ کیے تھے۔ اس کی مردم شماری سے جس کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا معلوم ہوا کہ اس کی آبادی پچیسویں سال دگنی ہو رہی ہے جس سے یہ اُمید قائم کرنی بجا نہیں کہ اسی صدی کے خاتمہ پر اس قوم کی آبادی تقریباً دس کروڑ ہو جائے گی۔

ایک دیران براعظم جو سنسان اور سونا پڑا ہوا تھا صنعت و حرفت کا اکھاڑا بن گیا جس میں کلون کے چلنے کے شور اور آدمیوں کی پیچیدہ حرکت نے ایک نئی روح چھونکائی جہاں پہلے ایک گھنا بے راہ فگل چھایا ہوا تھا وہاں صدیوں کا شہر اور قصبے آباد ہو گئے۔ رونی تبا کو اور اناج جیسی بیش قیمت پیداوار کے کثیر المقدار انباروں نے تجارت کی رونق بڑا دی کاؤن سے سونا۔ لوہا اور کوئلہ اس مقدار میں نکلنے لگا کہ عقل کو باور نہیں آتا تھا۔ بر تعداد کلیساؤں دارالعلوم اور مدرسوں نے ثابت کر دیا کہ اس مادی ترقی کے دوش بدوش عقلی و روحانی ارتقا کا عمل بھی جاری ہے۔ ذریعہ نقل و حرکت کا انتظام بھی خاطر خواہ کر دیا گیا۔ ریل کی سڑکیں طول میں یورپ کی آہنی سڑکوں کے مجموعی طول سے بڑھ گئیں۔ سترہ سو بیس یورپین سلسلہ ریل کا مجموعی طول ۶۳۳۶۰ میل تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کا سلسلہ ۷۰۵۰ میل لمبا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک خلیج براعظم کے عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور بحراد قیانوس کو بحر الکابل سے ملائی تھی۔

لیکن امریکہ کی ترقی میں یہ مادی نتائج ہی قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اخلاقی اور تمدنی نتائج بھی ہماری توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں مثلاً چالیس لاکھ حبشی غلام یک قلم

آزاد کر دئے گئے۔ قانون میں اگر رعایت کا میلان پایا گیا تو بحق غراب پایا گیا۔ واصلان قانون کا مقصد یہ تھا کہ افلاس کا انسداد کیا جائے اور غیر مستطیع طبقہ کے لوگوں کی حالت درست کی جائے۔ قابلیت کے لیے ترقی کی راہ کھول دی گئی اور سب رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ ترقی کا کوئی ایسا وجہ نہ تھا جس پر ذہین اور محنتی شخص فائز نہ ہو سکے۔ بعض بڑی بڑی سرکاری خدمتوں پر ایسے شخص مامور تھے جو ابستہ اہلیت غربت اور کس پہرہ کی حالت میں تھے لیکن بڑے بڑے ہستے ان جلیل القدر مدارج پر پہنچ گئے۔ میل جول کی مساوات تو لوگوں میں خیر نہ پائی جاتی تھی اور دو متمدد اور آسودہ حال جماعتوں میں اس کا پایا جانا ممکن بھی نہیں لیکن عدلیت کے حقوق سے ادنیٰ واسطے یکساں بہرہ اندوز تھے اور یہ مساوات نہایت تشدد کے ساتھ قائم رکھی گئی۔

شاید یہ کہا جائے کہ اس غیر معمولی ترقی کا باعث وہ مختص المقام و مختص الحیثیت علین تھیں جو کسی قوم کو اس سے پہلے پیش نہ آئی تھیں۔ ترقی کا ایک وسیع میدان کھلا پڑا تھا اور ایک پورا براعظم ہر اُس قوم کو جو اس کے ساحلوں تک آنے کی زحمت گوارا کرتی حق مقابضت و ملکیت عطا کرنے کے لیے تیار تھا۔ قدرت کو مسخر کرنے اور اُس کے خرمن فیضان سے خوشہ چین ہونے کے لیے بجز محنت اور جہارت کے اور کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن ہم تو یہی سمجھیں گے کہ اُن مسافروں کے لیے جنہوں نے نئی دنیا کی عظیم ایشیا نو آبادی قائم کی ترقی کی راہ پر ایک بہت بڑے اصول نے میل و فرنگ کا کام دیا۔ اسی اصول کی رہنمائی سے ان خاصوش مقامات کو جہاں ابدالاباد سے سناٹا چھایا ہوا تھا تہذیب و شایستگی کا مرکز بنا دیا۔ جنگوں و ریادوں پہاڑوں اور بیابانوں سے ہر اسان ہوئے بغیر دیرانی کو آبادی سے تبدیل کر دیا اور ایک صدی کے اندر ایک پورے براعظم کو مسخر کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں مکیکو اور پیرو پر اہل اسپین کی اُس فوج کشی

کے نتائج پر نظر ڈالنا خالی از انتباہ نہ ہوگا جس نے ان ممالک کے ہجرت انگیز تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ یہ تمدن ہسپانوی تمدن پر گہنی ایک اعتبار سے فوقیت رکھتا تھا۔ اس تمدن نے فولاد اور بارود کی مدد کے بغیر عروج حاصل کیا تھا۔ اس تمدن کا انحصار غلامت کے اوپر کانٹوں پر تھا جو نہ گھوڑوں کے محتاج تھے نہ بیلوں کے اور جنگ نہ ہل کی ضرورت تھی نہ جوئے کی۔ اہل اسپین کے لیے ترقی کی راہ صاف کھلی تھی۔ ادن کے رستہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن انہوں نے کیا تو یہ کیا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کی کرائی محنت کو غارت کر دیا۔ ان میں سے لاکھوں بد نصیب قسبی القاب حملہ آوروں کی دہشتیانہ خونخواری کا شکار ہوئے۔ وہ قوین جو صد سال سے فارغ البالی اور آسودہ حالی کی زندگی بسر کرتی چلی آتی تھیں اور ان رسوم اور رواجوں کی پابند تھیں جنہیں تاریخ نے اُنکے لیے سوزون ثابت کیا تھا ایک بیک غنہ و بد امنی کی بلا میں گرفتار ہو گئیں۔ اوہام پرستی کا مرض چاروں طرف پھیل گیا اور لوگوں کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا بہت بڑا حصہ کلیسا سے روماکے قبضہ میں چلا گیا۔

ہم نے مذکورہ بالا مثال کو جس کا انتخاب تاریخ امریکہ سے کیا گیا ہے دوسری مثالوں پر جو تاریخ یورپ سے اخذ کی جاسکتی تھیں اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس سے اس واقعہ کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ عمل ارتقا میں خارجی اثرات کا تصرف بہت ہی کم ہوا۔ یورپ کی سیاسی ترقی امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے طرز عمل اور نتائج پر غور کرنے سے پہلے ہم مختصر بیان کریں گے کہ سائنس نے یورپ میں کس طرح رول کر پایا۔

یورپ میں سائنس کی ترویج

حروب صلیبیہ نہ صرف سالہا سال سے روماکے کلیسائی خزانہ کو اُن میں قرار قیون سے پاٹ رہی تھیں جن کا ماتہ ہر مسیحی قوم کا خوف یا آفت تھا بلکہ ان کی وجہ سے باپائی طاقت خطرناک طور پر بڑھ گئی تھی۔ اُس دو علی حکومت میں جو یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی دینی

حکومت کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور دینی حکومت کی حیثیت اس کے خادم کی سی رہ گئی تھی۔ مسیحی دنیا کے اطراف و اکنات سے ہندوستانی رومین چلی آرہی تھیں کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو لوگوں سے روپیہ وصول کرنے کے لیے نہ تراشا جاتا ہو۔ چاندی سونے کا ایکسینہ تھا کہ موسلا دار اٹلی پر برس رہا تھا۔ دینی فرمانرواؤں کے خزانے خالی ہو چلے محاصل کی مقدار قلیل اور غیر کمزنی رہ گئی۔ امدنی کی کمی کے باعث انتظام چلانا دشوار ہو گیا۔ فلپ الملقب بہ فیئر (خوشنور) شاہ فرانس (دست ۱۳۱۶ء) نے جب دیکھا کہ اسکی مملکت سے بغیر اسکی اجازت کے لکھو کھا روپیہ یون باہر کھنچا جاتا ہے تو اس نے دل کڑا کر کے نہ صرف اس مضمون کے امتناعی احکام جاری کر دیے کہ اس کے فرمان کے بغیر چاندی اور سونا برآمد نہ کیا جائے بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ مذہبی جاگیروں اور قسیمی جائیدادوں سے محصول شاہی وصول کیا جائے۔ اس فیصلہ کا صادر ہونا تھا کہ پاپائیت اور حکومت فرانس میں ایک مہلک جنگ چھڑ گئی۔ پاپائے شاہ فرانس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا بدلہ یون لیا کہ پاپائے بائیس نامن پر دہریت کا الزام لگا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ پاپا کا چالان مجلس عمومی کے اجلاس میں کیا جائے۔ اسی اثنا میں اس نے چند معتبر اشخاص کو اٹلی بھیجا جنہوں نے بائیس کے محل واقع آگنی میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ ایسی سختی کی کہ وہ چند دن میں مر گیا۔ اس کا جانشین پاپائے پینڈکٹ یازدہم زہر دیکر مار ڈالا گیا۔

شاہ فرانس نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ پاپائیت کے زایم و مفاسد کی کامل اصلاح کی جائے اور یہ عہد چن دیا تو ہی خاندانوں ہی کا درخت نہ ہو جائے جو اپنی چالاکی سے یورپ کی سرحد الا اعتقادی کو سیم وز کی شکل میں بدل رہے تھے بلکہ فرانس کے رسوخ کا عنصر اس میں غالب ہو۔ چنانچہ کروینا لون کے ساتھ اس بارہ میں اس کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک فرانسیسی صدراعظم پاپائی مسند پر بٹھایا گیا۔ اور اس نے کلیمنٹ خامس کا لقب اختیار کیا۔ دربار پاپا فرانس کے شہر آونیان میں اسٹھ آیا اور رواج اب تک مسیحیت کا پایہ تحت

تھا اس شرف سے محروم ہو گیا۔

ستر سال گزرنے کے بعد پاپائیت کی قسمت نے پلٹا کھایا یعنی ۱۷۷۳ء میں مدینۃ البقا (روما) کو پاپائے اعظم کے مستقر حکومت بننے کا شرف از سر نو حاصل ہوا۔ اس عرصہ میں بوجہ اس کہ پاپائیت کا رسوخ جزیرہ نماے اٹلی میں گھٹ گیا تھا شمالی اٹلی کے بڑے تجارتی شہروں میں وہ عقلی تحریک جلد جلد پھیل گئی جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی بعض اور بھی مبارک و سازگار حالتیں نمودار ہو چلیں۔ حروب صلیبیہ کے انجام سے تمام سچی دنیا کے عقائد میں خلل ڈال دیا۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ فتح و شکست کو عام طور سے حق و باطل کا رباتی معیار سمجھا جاتا تھا ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی رغم انفت مسیحیت ارض مقدس پر مسلمان قابض ہو گئے۔ وہ ہزار ہا سچی سورا جو شکست کھا کر اپنے گھروں کو لوٹے بلاتامل اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے پاپائے گئے کہ کلیسا نے ان کے حریفوں کی جو تصویر کھینچی تھی اس سے وہ بالکل مختلف تھے یعنی وہ بزدل و حشی اور ظالم نہیں تھے بلکہ شجاع خلیق اور عادل تھے۔ جنوبی فرانس کے خوش گزران شہروں میں عشق و عاشقی کے افسانوں کا چہرہ چا پھلتا جاتا تھا۔ خانہ بدوش بھاٹ اور گویے لوگوں کو اپنے نو تصنیف گیت اور اشعار سناتے پھرتے تھے۔ ان اشعار کے مضامین تغزل و قصید اور رزم و بزم کی داستانوں ہی تک محدود نہ ہوئے تھے بلکہ اکثر ان میں ان وحشیانہ مظالم مثلاً لنگوئیک کے واقعہ قتل عام کا بھی ذکر ہوتا تھا جن کے ارکاب کی ذمہ دار پاپائی حکومت تھی۔ علی ہذا القیاس ان نظموں میں پادریوں کی سپہ کاریوں اور بد چلنیوں کے واقعات بھی مذکور ہوتے تھے۔ مسلمانان اندلس سے عیسائیوں نے "شور لری" کا

۱۷۷۳ء فرانس کا وہ خوش سواد صوبہ ہے جو ۱۷۷۳ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ ۱۷۷۳ء میں اس کا الحاق فرانس کی عمارت کے ساتھ ہوا۔ مترجم

۱۷۷۳ء - لفظ "شوری" میں سپاہیانہ حاننازی - جنسی لطیف یعنی طبع نہوان کا ہمدردیادیت ادب و احترام - جان جو کھوں میں ڈالنے کا شوق اور نام آدمی کی خواہش کے وہ گوناگون مفہوم شریک میں جو فردن ۱۷۷۳ء

اولو العزمانہ وکریمانہ خیال مستعار لیا اور اسی کے ساتھ خود داری و آبرو پروری کا وہ شرفیاء
سبق بھی حاصل کیا جس نے آگے چل کر یورپ کو شرافت نفس کے دستور العمل کے وضع کرنی
میں مدد دی۔

پاپائیت اگرچہ اپنے مرکز اصلی پر واپس آگئی لیکن وہ اقتدار جو پاپاؤن کو ستر سال پہلے
جزیرہ نماے اٹلی میں حاصل تھا زندہ نہ ہو سکا۔ رو اسے گئے ہوئے اور نہیں دوں لون سے
زیادہ کا زمانہ ہو چکا تھا اور اگر وہ اپنی پوری شان جلالت و جبروت کے ساتھ بھی واپس آتے
تو ہم اُس عقلی ترقی کا رد عمل نہ کر سکتے جو اُن کی غیبت میں بروے کار آچکی تھی۔ لیکن پاپائیت
کی رجعت فرمان روائی کی غرض سے نہ تھی بلکہ انقراض و انقسام کی غرض سے اور اُس اعتراض
عظیم کا مقابلہ کرنے کے مقصد سے جس نے چودہویں صدی میں سیحیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان
اندرونی فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپاؤن کی تعداد ایک سے دو اور دو سے تین ہو گئی جن میں سے
ہر ایک مسیح کے نائب حقیقی ہونے کا مدعی تھا اور اپنے رقیب کو ملعون و کذاب قرار دیتا تھا۔ اس
طوفان بے تیزی نے یورپ کی عقیدت و ارادت کو مبدل بہ نفرت و حقارت کر دیا اور اُس نے
مصمم عزم کر لیا کہ اس شرمنگ تو تو میں میں کا جلد خاتمہ ہو جانا چاہیے یہ اعتقاد کہ خدا کا ایک
نائب زمین پر موجود ہے اور وہ پاپا ہے جس سے خطا کا سرزد ہونا ممکن نہیں اس تھا کا فضیحتی
کے مقابلہ میں بھلا کیوں کر صحیح ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے
لائق پادریوں نے یہ تحریک کی کہ مجلس عمومی قائم کی جائے جو گویا یورپ کی دینی پارلیمنٹ
ہو اور پاپا کو اس مجلس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا جائے۔ یورپ کے نصیب اچھے ہوتے اگر
یہ تحریک منظور ہو جاتی یہ جنگ جو سائنس اور مذہب میں چھڑی ہوئی ہے ہرگز برپا نہ ہوتی۔
اصلاح کنیسہ کا بیو پچال ہرگز نہ سما۔ پراٹسٹنٹ فرقوں کی مخالفت کا علم ہرگز بلند نہ ہوتا۔
لیکن کاتھولکس اور ہسپل کی کونسلین اطالوی جوے کو کند ہے سے نہ اتار سکیں اور یہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۵-۳۹۶ میں شجاعت و شرف کا لازمہ سمجھے جاتے تھے۔ مترجم

دلپذیر منتبرہ اُن سے مترتب نہ ہو سکا۔

اس طور پر کیتھولک مذہب کمزور ہو رہا تھا۔ اس کا کاہن بوسی بوجہ عقل و ادراک کے سینہ سے جون جون کم ہوتا گیا روح کی سنگینگی بڑھتی گئی۔ اور عقل انسانی ترقی کرتی گئی۔ مسلمانوں نے پرانے سوتی کپڑوں اور دہائی سے کاغذ بنانے کا فن ایجاد کیا تھا اور اہل دین چھاپہ کار فن چین سے جا کر سیکھ آئے تھے۔ چھاپہ اور کاغذ کی ایجاد دین لازم و ملزوم تھیں۔ اب وہ وقت آگیا کہ بلا خوف و مزاہمت تمام دنیا کے انسان آپس میں تبادلہ خیالات کرنے لگیں۔

چھاپہ کی ایجاد نے کیتھولک مذہب کے سینہ میں ایک زخم جانتان لگایا کتابت۔ دستخط کے بین العمرانی حق پر اس سے پہلے پاپائیت نے بلا مشارکت احد سے قبضہ کر رکھا تھا۔ پاپائی مرکز سے مختلف المدارج پادریوں کی رسالت سے احکام و فرامین جاری ہوتے تھے اور منبر سے پڑھ کر سنا دئے جاتے تھے۔ مطبوعات نے اس حق خاص اور اُن غیر معمولی اقتدار کو جو اس کا لازمہ تھے یک قلم مٹا دیا۔ زمانہ حال میں منبر کا اثر بہت ہی کم رہ گیا۔ بے خطیب کے قائم مقام آج کل اخبار نویس ہیں۔

پھر بھی پاپائیت اپنے پرانے حق سے جدوجہد کیے بغیر دست بردار نہ ہوئی۔ نئے فن کے اُن نتائج پر جو قصائے مہر کی طرح ٹل نہ سکتے تھے جب اس کی نظر پڑی تو ایک نظارتہ المطبوعات قائم کر دیا گیا جس کی تخریج کی سختی سے مکتوبات و جراید کے روکنے کی کوشش کی گئی۔ کتاب چھاپنے کے لیے قلمی نظارت سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اور اجازت نامہ اُس وقت ملتا تھا جب پادری صاحب کتاب کو بالاستیعاب دیکھ کر اُس کی نسبت اظہار پسندیدگی فرماتے تھے۔ اور اس کے صحیح العقاید ہونے کی تصدیق کرتے تھے۔ شائع میں پاپا سے الگ ریڈر سادس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے وہ اہل مطابع کلیسا سے خارج قرار دئے گئے جو باطل عقاید شائع کریں۔

۱۵۷۰ء میں لیٹرن کونسل نے حکم دیا کہ بجز اس کتاب کے جس کا تحریر بھی معائنہ ناظرین کلیسا کرکے ہوں اور کوئی کتاب شائع نہ کی جائے ورنہ شائع کرنے والے کو کلیسا سے خارج کیا جائیگا اور اس کے جرمانہ کی سزا بھی دی جائے گی۔ نظارت مطبوعات کے عہدہ داروں کو حکم تھا کہ اس بات کی نہایت احتیاط رکھیں کہ کوئی تحریر ایسی نہ چھپنے پائے جو عقایدِ راسخہ و صحیحہ کے خلاف ہو۔ اس تقید کی تہ میں یہ اندیشہ مضمر تھا کہ ممکن ہے کہ مذہبی مناظر چھڑ جائے اور سچی بات جو اب تک چھپی ہوئی تھی ظاہر ہو جائے۔

لیکن جہالت کی طاقتوں کی یہ محبوزانہ حدود جہد بیکار ثابت ہوئی۔ لوگوں میں دماغی و عقلی راہ و رسم مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئی۔ اس راہ درسم نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے زمانہ حل کے اخبار کی صورت اختیار کر لی جو ہر روز دنیا کے ہر حصہ کی تازہ ترین خبریں شائع کرتا ہے۔ مطالعہ ایک عام شغل ہو گیا اور یہ وہ نعمت تھی جس سے قدیم الایام میں بہت کم لوگ بہرہ ور تھے زمانہ حال کے تمدن کی بعض نہایت ہی نمایان خصوصیات کا راز اسی شوقِ کتب بینی و مطالعہ اخبارات میں پوشیدہ ہے۔

غرض کاغذ کی ساخت اور چھاپہ کے استعمال نے یورپ کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس آلاتِ جہاز رانی میں کمپاس یعنی قطب نما کا اعناض بڑے بڑے مادی و اخلاقی نتائج کا باعث ہوا۔ ہندوستانی تجارت نے اہل دینس اور اہل تجوا کو ایک دوسرے کا رقیب بنا کر امریکہ کی تحقیقات کرائی۔ ڈچی گامانے افریقہ کا چکر کاٹا اور سیگیڈن نے زمین کے گرد اگر د جہاز رانی کی۔ سفرِ سوخر الذکر پر جو انسان کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ہے نظر ڈالتے ہوئے ہمیں اس امر کی طرف سے خالی الذہن نہ ہونا چاہیے کہ کیتھولک مذہب نے قطعی طور پر بلا نگہداشت ترویج یہ عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ زمین چمٹی ہے۔ آسمان بہشت کا صحن ہے اور دوزخ دنیا سے ساغل میں ہے۔ بعض پادریوں نے جن کے اجتہاد میں بوجہ ان کی جلالتِ قدر کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی شکلِ زمین کی کرویت کے ابطال میں فلسفیانہ

اور مذہبی دلائل پیش کی تھیں چنانچہ اس کا ذکر ہم پیش کر بھی چکے ہیں۔ اب یہ بحث دفعہ ختم ہوگئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کلیسا غلطی پر تھا۔

جن تین بڑی سیاحتوں کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ان سے ایک فقط یہی اہم نتیجہ نہیں نکلا کہ انطاع شکل زمین کی جس غیر انسانی غلطی میں کلیسا مبتلا تھا۔ اس کی اصلاح ہو گئی۔ کولمبس ڈی گاما اور میکسین کی روح مغربی یورپ کے تمام اولوالعزم اور باہمت اشخاص میں سرایت کر گئی۔ لوگوں کے معاد و معاش کی غایت الغایات اب تک عقیدہ تھا کہ بادشاہ کے ساتھ وفاداری برتی جائے اور کلیسا کی متابعت کی جائے گویا لوگوں کی زندگی کا مقصد اس وقت تک استفادہ نہ تھا بلکہ افادہ تھا۔ ان کی محنت کا نمرہ اپنے لیے نہ تھا بلکہ دوسروں کے لیے تھا۔ اس عقیدہ کا سیاسی اثر ترقی پذیر ہو کر حروب صلیبیہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ان لڑائیوں میں ہلاک ہو گئے جن سے اُنھیں خاک فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اور جن کا نتیجہ بجز حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہ نکلا تھا۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے نفع اگر کسی طبقہ کو ہوا تو پاپاؤن کر دینا لون اور روم کے دوسرے پادریوں کو یا دینس کے مالکان جہاز کو لیکن جب اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا کہ مسکوپرو اور ہندوستان کی دولت بر اس شخص کے حصہ میں آسکتی ہے جو ہمت اور جرأت رکھتا ہو تو وہ اغراض و مقاصد جنھوں نے یورپ کی سب سے چین اتوام میں بیداری کی روح پھونک رکھی تھی ہوا کے منہ کی طرت و ذرت بدل گئے۔ کارٹیز اور پزارو کی داستان کو ہر شخص ذوق و شوق سے سننے لگا۔ یہی جوش کی جگہ بحری مہات نے لے لی۔

اگر ہم اس اصول کو الگ سارے دیکھنا چاہیں جو اس زمانہ کے حیرت انگیز تمدنی انقلاب کی تہ میں مضمر تھا تو اس کے پہچاننے میں ہمیں ذرا وقف نہ ہوگی۔ اب تک ہر شخص نے اپنی خدمات اپنے دینی یا دینی آقا کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ لیکن اب سے اس نے قدم کر لیا کہ اپنی محنت کے نمرہ سے خود تمتع حاصل کرے تشخص جس سے مراد انفرادی عصیت ہے

غلبہ پارہا تھا اور ایثار مٹ کر خیال محض رہ چلا تھا۔ اس تمہید کے بعد ہم کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ کلیسا پر کیا بیت رہی تھی۔

تشنص کا انحصار اس اصول پر ہے کہ ہر شخص اپنا آقا آپ ہے اور اس کو آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ ہر اسے چاہے قائم کرے اور اپنے ارادہ کو جس وقت چاہے عمل میں لائے اس اصول کے لحاظ سے اُسے ہر وقت اپنے انہائے جنس کے ساتھ سرگرم مسابقت رہنا پڑتا ہے گویا اس کی زندگی قوت عملی کا ذریعہ اظہار ہے۔

یورپ کے صدیوں کے جمود کو حرکت میں بدل دینا۔ اس جسم میں جو اب تک غیر متحرک تھا ایک بے یک بیداری کی روح پھونکنے اور اصول تشنص کو اس کی غایت الغایات بنا دینا ان اثرات و اقتدارات کی مخالفت تو توں کو اس۔ کہ مقابلہ میں لاکھڑا کرنا تھا جو اب تک اسے پامال کر رہی تھیں۔ جو دہویں اور پندرہویں صدیوں میں وہ اضطراب آمیز کشمکش برابر جاری رہی جو آنے والے معرکہ عظیم کا پتہ دیتی تھی۔ سو اہویں صدی کے شروع (۱۵۱۷ء) میں یہ معرکہ شروع ہو گیا۔ اصول تشنص مجسم ہو کر ہینی کے ایک جنگ راہب کی صورت میں نمودار ہوا اور اس لحاظ سے بغاوت کے محل آغاز پتر مشیح ہما فیدہ شاید ضرور تھا کہ وہ اپنی حق طلبی دینی شکل میں کرے۔ پہلے تو تذکرۃ الغفران اور بعض چھوٹے چھوٹے معاملات پر ایک آدم پکڑ کر یفون میں ہوئی لیکن لڑائی کا اصلی سبب بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ یعنی مارٹن لوتھر نے اپنے قسوسی بالا دستوں سے جو دہا میں بیٹھے بیٹھے تمام مسیحی دنیا کے عقاید کے اجاڑنے ہوئے تھے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے اجتہاد کا پابند نہیں ہوں۔ بائبل کی تاویل و تفسیر کے متعلق مجھے بھی آزادی حاصل ہے جس میں کوئی شخص درست و غلط انسانی نہیں کر سکتا۔

اول اول رومانے مارٹن لوتھر کو ایک بائبل مافریا پر اور اور جھگڑا پادری سے زیادہ سمجھا اور اگر ”انکو زیشن“ کا قابو چلتا تو اس کا کام چٹکی بجا۔ تیسرے میں تمام کر دیا گیا ہوتا۔ لیکن جنگ

جون جون طولی کہنچیتی گئی یہ معلوم ہوتا چلا کہ لو تھر اکیلا نہیں ہے بلکہ اُس کی پشت پر ہزار ہا صمیم العزم اشخاص موجود ہیں جو اُس کے قلم کے حلوں کی تائید اپنی تلوار کی ضربوں سے کر رہے ہیں۔

لو تھر کو روانے جس جس طرح سے کو سا ہے اور اُس کے اعمال کی جس جس طرح سے تنبیہ کی گئی ہو وہ اس درجہ ترش و تلخ ہے کہ سن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثلاً مقدس نکتہ چنبون نے ارشاد فرمایا ہے کہ "لو تھر کا باپ اُس کی ماں کا خادم نہیں تھا بلکہ ایک خیمہ تنہا تھا جو اُس کی ماں کا آشنا تھا۔ لو تھر دس سال تک ایمان و کفر کی دو گونہ چوگان کی گیند بنا رہا اور آخر میں وہ ہڑ ہو گیا۔ وہ بقاء کے روح کا منکر تھا۔ شراب اس کی گھنٹی میں بڑی تھی اور اسی لیے اُس نے شراب خواری کی تعریف میں نظمیں تصنیف کیں یہ کتب مقدسہ کی توہین کرتا تھا۔ خصوصاً حضرت موسیٰ کی شان میں کلمات اہانت آمیز استعمال کرنے کا عادی تھا۔ جو وعظ کرتا تھا اُس کے ایک لفظ کو بھی دل میں سچ نہ سمجھتا تھا۔ سینٹ جیمس کے خط کی نسبت اُس کا یہ قول تھا کہ اُس کی نعمت پر کاہ سے زیادہ نہیں۔ واقعہ اصلاح کیتھ کو اُس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کے ظہور کا باعث سارون کی نحوست ہے" لیکن رومن کیتھولک پادریوں کی زبان پر باوجود اُس کو کہیں نحوست کے جو اصلاح کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے یہ نا تراشیدہ اور سوتیانہ فقرہ چڑھا ہوا تھا کہ آسمان نے اصلاح کا انڈا دیا اور لو تھر اس سے سینے بیٹھ گیا۔

رومانے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ واقعہ اصلاح بعض شوریدہ سر پادریوں کا ایک عارضی حمور تھا۔ اُس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ انقلاب اُس اندرونی تحریک کی انتہائی شکل تھا جو دو صدیوں سے یورپ میں ہو رہی تھی اور جس کی طاقت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اسکو یہ نہ سوچا کہ اگر انقلاب کی اور کوئی وجہ تحریک نہ بھی ہوتی تاہم لوگون کو ذاتی عزت و فکر اور ذاتی اجتہاد پر مجبور کرنے کے لیے ایک اکیلا یہ واقعہ کیا کم تھا کہ تین پاپا ایک وقت میں موجود ہوں اور تینوں کی

۱۰ کہ روکے یافت۔ لو تھر نے اسکو کوجا لیاں دی تھیں یہ اُس کا بدلہ ہے۔ مترجم

فرمان برداری لوگوں پر واجب ہو۔ کانسٹنس اور پریس کی مجالس نے ثابت کر دیا کہ ایک قوت ایسی بھی موجود ہے جسے باؤڈن کی قوت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو دیر پا اور خونریز ہنگامے واقع ہوئے ان کا خاتمہ عبدنامہ وسٹیفیلیا نے کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ وسطی و شمالی یورپ نے روم کے عقلی جبر کا جو اپنے کندھے سے اتار پھینکا ہے۔ اصول تشخص نے میدان مار لیا ہے اور ہر شخص کا یہ حق مسلم قرار پا چکا ہے کہ وہ اپنا مجتہد آپ ہے۔

لیکن نامکن تھا کہ اجتہاد شخصی کے اس حق کو استقرار کا نتیجہ صرف اسی قدر رکھ کر رہ جائے کہ لوگ کیتھولک مذہب کے منکر ہو جائیں۔ آغاز اصلاح کے وقت جب بعض ممتاز و سربراہان وہ اشخاص مثلاً آرمس نے جس کا شمار بائبل ان اصلاح میں ہے اسے ترک کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اکثر پیشوایان اصلاح کو علم سے سخت نفرت ہے۔ ایسے پیشواؤں کے ساتھ کرسمس کا مطلب یہ تھا کہ جہالت و تعصب کی گرم بازاری ہو۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ پرائسٹنٹ مذہب بھی فرقہ و اعتزال کی اُن قوتوں کا تحتہ مشق بنیں جو اس کے وجود میں آنے کی محرک ہوئی تھیں اس کا مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جانا ایک لازمی بات تھی۔ ان فرقوں کو جب اپنے مذہب اطالوی حریف کی طرف سے کھٹکنا نہ ملتا تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی مختلف ممالک میں جب ایک پرائسٹنٹ فرقہ برسر اقتدار ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو خون میں بلاتا مل اپنے ہاتھ رنگ ڈالے۔ لیکن جب امتداد روزگار نے ستم رسیدوں کو ستم گاروں پر غالب کر دیا اور انہوں نے اپنی مظلومیت کی تلافی کینہ و انتقام سے کی تو فریقین نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ایک فرقہ جو حقوق اپنے لیے طلب کرتا ہے اُن ہی حقوق سے دوسروں کو بھی فائدہ اٹھانے سے۔ غرض ان خونریز ہنگاموں اور غرضوں سے وہ اصول عظیم قائم ہوا جو مسالمت یا رواداری کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن مسالمت بھر بھی ایک درمیانی درجہ ہے جو پرائسٹنٹ مذہب کا عقلی انحلال و انفکاک ہوتا جا سکے گا

یہ درمیانی درجہ ترقی پذیر ہو کر اُس مترقبہ حالت میں تبدیل ہوتا جائے گا جو دنیا میں ہمیشہ سے فلسفہ کا نصب العین رہی ہے یعنی وہ تمدنی حالت جس میں ہر شخص کو خیال کی کامل آزادی حاصل ہو بجز ان لوگوں کے جو اصول و مالت پر خوف یا دباؤ کی وجہ سے کار بند ہوں اس اصول کے پابند وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دوسروں کی آراء و عقاید کو وقت کی نظر سے دیکھتے اور تسلیم کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں پس ظاہر ہے کہ اس اصول کا ناخذ فلسفہ فلسفہ ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مذہب سے تعصب کو تقویت پہنچتی ہے۔ اور فلسفہ اس کا رد عمل یا نتیجہ نکالتا ہے۔

اصلاح کینسکا علائقہ مقصد یہ تھا کہ فلسفہ میں اور اُس کے جانشینوں نے سچیت اور سلطنت، و مہ انکبری میں موافقت مصالحت پیدا کرنے کی نیت سے بت پرستی کے جن کے اس اصول کا ناخذ مذہب بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس مذہب کی تعلیم یہ ہو کہ ”لکم دینکم ولی دین“

”لا اکواہ فی الدین“۔ مترجم

لیکن ایک مذہب ایسا بھی ہے جس کے پیروں نے تعصب سے ان تاریخی الفاظ میں بیزاری ظاہر کی ہے۔ لیس منادہ الی عصیۃ و لیس منافقہ عصیۃ و لیس مناصات علی عصیۃ خیر الی الشیء یحیی و یصلح۔ لسان الہند مولانا الطائف حسین حالی نے اپنی یادگار راز مہدس میں حضور و رکائات صلعم کے اس ارشاد پاک کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

ڈرایا تعصب سے آن کو بچ کہہ کر کہ زلہ رہا اور مرا جو اسی پر ہوا وہ ہماری باعث سے باہر وہ سانحہ ہمارا نہ ہم اُس کے یاور

نہیں حق سے کچھ اُس محبت کو بہرہ

کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرہ

تاریخ اسلام پر اگر نظر ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے عام طور سے اپنے مادی برحق کے اس غلو مقدس کو اپنے سیاسی و عقلی دستہ العمل کا اصل الاصول قرار دئے رکھا ہے۔

مترجم

خیالات و رسوم کو مسیحیت میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اُس سے خارج کر دے جائیں۔ ٹسٹمنٹ
جماعت یہ چاہتی تھی کہ مذہب عیسوی میں فردن اولیٰ کی پاکیزگی اور نراہیت کی نشان اوسٹن
پیدا کر دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم عقاید کی بجالی کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے وہ
تمام رسمیں ترک کر دیں جن میں بت پرستی کا شائبہ بھی پایا جاتا مثلاً مریم عذرا کی پرستش
موقوف ہو گئی۔ اولیائے مرادین مانگنے کا طریقہ جاتا رہا۔ انجیلیں یعنی اصلاح یافتہ کلیسا کو
پیشواہین یقین دلاتے ہیں کہ مریم عذرا نے زواجی زندگی کے فرائض اختیار کر لیے تھے
اور اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں چنانچہ اُن کے بطن سے کئی ایک اولادیں بھی ہوئیں
لیکن بت پرستی کی اشاعت کے ساتھ یہ خیال کہ آپ یوسف نجار کی بیوی تھیں دونوں سے
محو ہو گیا اور آپ ملک آسمان اور خدا کی مان بن گئیں۔

عربوں کے ادب کی طرح جس نے مسیحی دنیا پر جنوبی فرانس اور سسلی کی راہ سے پیش
قدمی کی تھی اُن کا سائنس بھی انہیں دونوں رستوں سے یورپ میں داخل ہوا۔ پاپاؤن کو
تو دیس نکالا ہی چکا تھا اور وہ بجائے روم کے ادیان میں مقیم تھے۔ اس کے علاوہ
اعتزال عظیم یعنی باپائیت کی تفریق کا واقعہ بھی برسرِ تائید تھا لہذا اسلامی سائنس کے قدم
شمالی اٹلی میں مضبوطی سے جم گئے فلسفہ مشائیہ نے اُس خلافت سے آراستہ ہو کر جو ان
نے اس کے لیے تیار کیا تھا بہت سے خفیہ اور علانیہ پیرو پیدا کر لیے ایسے لوگوں کی
تعداد کم نہ تھی جو اس فلسفہ کا خیر مقدم نہایت تپاک سے کرتے اور اس کے مسائل کو نقطہ
استحسان دیکھنے کے لیے تیار تھے۔ لیونارڈو ڈاؤنسی کا شمار اسی جماعت میں ہے۔ وہ اس
اصول موضوع کا بانی ہے کہ سائنس میں استدلال بجز تجربہ اور مشاہدہ کے معتبر اور مفید یقین
نہیں ہو سکتا۔ حقائق قدرت پر صحیح روشنی صرف تجربہ ہی ڈال سکتا ہے اور قوانین قدرت
مکی دریافت کے لیے تجربہ کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاؤنسی نے ثابت کیا کہ ایک نقطہ پر دو
عمودی قوتوں کا عمل کسی مستطیل کے خط الزاویہ کے عمل کے مشابہ ہوتا ہے جس کو اصطلاح

ان قوتوں کو ظاہر کرتے ہیں اس اصول کے معلوم ہونے کے بعد غیر مستقیم قوتوں کے مسئلہ کا حل ہونا بہت آسان ہو گیا۔ اس مسئلہ پر ایک صدی بعد اسٹیوینس نے از سر نو روشنی ڈالی اور قوتِ جبرِ ثقل کی تشریح کے متعلق اس سے کام لیا۔ ڈاونسی نے بہرِ مہرِ پر قوت کے بجز غیر مستقیم صرف یکے کے جانے کے مسئلہ کی بخوبی توضیح کی۔ رگڑ کے قوانین جن کا عمل ثبوت آگے چل کر اناکٹس نے دیا اُنسی کے دریافت کیے ہوئے ہیں۔ اصولِ حقیقتِ عتِ رفتار کی ماہیت سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سطحِ مائل اور قوسِ ماسے مدور پر اجسام کے فنون کی شرائط پر اُس نے مفصل بحث کی ہے عکسی تصویر کہینچے کا کیمیرا اُسی کی ایجاد سے ہے علمِ ترکیبِ اجسام حیوانات و نباتات کے متعدد مسائل کی نسبت اُس نے صحیح خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طبقات الارض کے جدید علم کے بعض مہات المسائل مثلاً آثارِ متحجرات کی نوعیت اور تہہ اے اعظم کے ارتفاع کی نسبت جو امور اُس نے بیان کیے ہیں ان کی تجربہ نے آج تصدیق کر دی ہے اُس نے اس مسئلہ کی تشریح کی ہے کہ چاند کی روشنی زمین کے نور کا عکس ہے۔ یہ عام حقیقات شخص جس کی قابلیت میں حیرت انگیز تنوع کی شانِ نظم آتی ہے۔ فنونِ سنگ تراشی و صناعی و انجینیئری میں بھی یدِ طولی رکھتا تھا اور اپنے زمانے کے فنِ ہیئت فنِ تشریحِ ابدان اور فنِ کیمیا میں بھی اُسے دستِ گاہِ کامل حاصل تھی نقاشی میں وہ میکائیل انجیلو کا مقابل تھا۔ اور جب ایک دفعہ ان میں مسابقت ہوئی تو قوتوں کا سہرا اسی کے سر رہا۔ سنائیہ یا ڈل گریزی کی ڈامینیکن خانقاہ کے نعمت خانہ کی ویلا پر اُس کا جو مرقع موسوم ہے ”عشاءِ اخیر“ موجود ہے۔ اُس نے بہت بڑی شہرت پائی ہے اور مصوروں نے اس کی جیسیوں نقلیں اتاری ہیں۔

شمالی اٹلی میں جب ایک دفعہ سائنس کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو بہت جلد کل جزیرہ نمایاں اس کا اثر پھیل گیا اس کے پرستش کرنے والوں کی مدد افزوں تعداد کا پتہ اُن علمی مجلہوں سے چلتا ہے جو بہ کثرت قائم ہوتی جاتی ہیں اور جلد جلد ترقی کر رہی ہیں۔

یہ مجلسین اُن اسلامی مجالس کا چہرہ بہ تعین جو بزمانہ سابق غرناطہ و قرطبہ میں موجود رہ چکی
تھیں اسلامی تمدن نے جس راستہ پر اپنے نقش قدم چھوڑے تھے اُس پر گویا مسافر
کی لہر گارتھ قائم کرنے کی غرض سے شہتہ نوین ٹھونڈ کی اکاڈمی کی بنا ڈالی گئی۔ جو
آج کے دن تک قائم ہے لیکن یہ اکاڈمی جزیبی فرانس کے دل خوش کن لٹریچر ہی
کا مرکز تھی اور اس کا نام اسی مناسبت سے ”دی اکاڈمی آف فلورنٹ گیمبر“ (چھستان آف
رکھا گیا تھا۔ علم طبعیات کو ترقی دینے کی غرض سے پہلی علمی مجلس کی بنیاد پلزمین بیٹھا
پورٹانے ڈالی۔ تراوشی کا بیان ہے کہ حکام کلیسا نے اس مجلس کو بند کر دیا۔ اس کے
بعد پرنس فریڈرک سیسی نے رومین ایک مجلس بنام ”لنٹن“ (فندیہ) قائم کی۔ اس
مجلس کا مقصد اس کے نشان ہی سے ظاہر تھا یعنی ایک سیاہ گوش آسان کی طرف منہ
اٹھا ہے اپنے بچوں سے ایک تین سو اے ”سربیس“ کو نوج رہا ہے۔ فلارنس کی
اکاڈمی شہتہ نوین قائم ہوئی اس کے ارکان کا اجلاس فرانزواسے فلارنس کے محل
میں ہوا کرتا تھا دس سال تک یہ مجلس قائم رہی اس کے بعد پاپائی حکومت کے ایما
سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور اس علم کشی کے معاون منہ نوین فرانزواسے فلارنس کا بھائی
کردینال بنا دیا گیا۔ بڑے بڑے مشاہیر و مشائخ اس مجلس کے رکن تھے
داخلہ کی شرط یہ تھی کہ ایمان و مذہب کو ترک کر دیا جائے اور تحقیق حق کا عزم کر لیا جائے
ان مجالس نے حامیان علم کو اُس کچھ غلو سے جس میں وہ اسے تک رہتے چلے آئے تھے
اپس میں ملادیا اور ان کو تبادیلہ خیالات اور اتفاق باہمی کا موقع دیکر ترقی علوم و فنون میں بہت بڑا حصہ لیا۔

سائنس کا عقلی اثر

تاریخی بحسب کہ سائنس بڑے عظیم پورپ۔ میں کیونکر داخل ہوا بیچ میں بطور حبلہ
لے یونانی علم الاصنام میں اس کئی سرواے کئے کا نام ہے جو جہنم کی درباری کی خدمت پر طبقہ سافل کے دیوتا
پلوٹو کی طرف سے امور ہے۔ مترجم۔

معارضہ آگئی تھی۔ اب ہم اس ذیلی بحث کو چھوڑ کر اصل عنوان یعنی سائنس کے طرز عمل اور نتائج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمدن جدید پر سائنس کے دو پہلوؤں سے اثر ڈالا ہے۔ (۱) علمی و (۲) اقتصادی ان عنوانات کی ذیل میں اس اثر پر باسانی بحث کی جاسکتی ہے۔

سائنس کا عقلی اثر یہ ہوا کہ روایت کا اقتدار بالکل زایل ہو گیا۔ کسی استاد کے دعوے بلا دلیل کو خواہ اس کا نام کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور کیسی ہی تعظیم کے ساتھ کیوں نہ لیا جاتا ہو اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فلاسف کی علمی مجلس نے اپنے ارکان کے لیے دھلمہ کی جو شرائط مقرر کی تھیں اور لندن کی شاہی سوسائٹی نے جو مقولہ اپنی علمی علامت کے طور پر اختیار کیا اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روایت کی سائنس کے نظروں میں کہاں تک وقعت رہتی ہے۔

طبعی مباحث میں سائنس نے فوق القدرت اور خارق عادت امور کو بطور شہادت تسلیم کرنے سے ابا کیا۔ شگوان یا آسمانی نشان کے ثبوت کو جس کا قدیم الایام میں یہودیوں کے ہاں رواج تھا اس نے ترک کر دیا اور ایک واقعہ کے ثبوت کو دوسرے واقعہ غیر متعلقہ کا ثبوت مان لینے سے انکار کر دیا۔ اس طور پر وہ منطق جو صد ہا سال سے رایج چلی آتی تھی باطل ہو گئی۔

طبعی تحقیقات میں سائنس کا طرز عمل یہ تھا کہ کسی مفروضہ قیاس کی تنقید کی غرض سے اول کسی صورت خاص کو پیش نظر رکھ کر اس قیاس کی بنا پر اندازہ قائم کیا جاتا تھا اور اس کے بعد تجربہ یا مشاہدہ کر کے تحقیق کر لیا جاتا تھا کہ اس تجربہ یا مشاہدہ کا نتیجہ اندازہ قائم نمودہ کے نتیجہ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں اگر مطابقت نہ پائی جاتی تھی تو وہ قیاس رد کر دیا جاتا تھا۔ اس طرز عمل کی ایک دو مثالیں ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

نیوٹن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کشش زمین یعنی کشش ثقل کی جد عمل چاند

تک ہو اور یہی وہ وقت ہو جو اُسے زمین کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس قیاس کی بنا پر جب اُس نے حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جرم قمر اپنے مدار پر حرکت کرنے ہوئے خط الماس سے ایک دقیقہ میں بقدر تیرہ منٹ کے منحرف ہوتا ہے۔ لیکن اُس مسافت کا اندازہ لگانے سے جو اجسام سطح زمین پر گرتے وقت ایک دقیقہ میں طے کرتے ہیں اور اس مسافت کو مربع معکوس کی نسبت سے گنا ہوا فرض کرنے سے معلوم ہوا کہ مدار قمر پر جو کشش ہوگی وہ اجسام کو پندرہ منٹ سے بھی زیادہ کھینچے گی۔ غرض اُس وقت نیوٹن نے یہی سمجھا کہ اُس کا قیاس صحیح نہیں ہے۔ لیکن اتفاق سے کچھ مدت کے بعد ایک درجہ ارضی کی چٹانیں زیادہ صحت کے ساتھ کی گئی۔ اس چٹانیں نے زمین کے اندازہ جسامت اور فاصلہ قمر کو جو کرہ ارض کے نصف قطر کی بنا پر ناپا گیا تھا متغیر کر دیا۔ نیوٹن نے اب اپنا تحفہ از سر نو شروع کیا اور جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں یہ تحفہ جب قریب بہ انتہام ہوا تو یہ دیکھ کر کہ مترقبہ مطابقت ظاہر ہونے کے قریب ہے وہ ایسا گھبراہٹ کا حسابی عمل ختم کرنے کے لیے اُسے مجبوراً اپنے ایک دوست سے فرمائش کرنی پڑی۔ اب وہی قیاس بدلائل قاطع ثابت ہو گیا۔ ایک اور مثال طریقہ زیر بحث کو کافی طور پر واضح کر دے گی۔ یہ مثال اُس مسئلہ کی یاد سے متعلق ہے جو فلو جیٹن (جو ہر حرارت) کے نام سے موسوم ہے۔ اسٹائل نے جو اس مسئلہ کا موجودہ تھایہ دعویٰ کیا کہ قابلیت اضطرام یا سوزندگی کا ایک ایسا عنصر کائنات میں موجود ہے جس میں اجسام کے ساتھ اتصال پیدا کرنے کا خاصہ پایا جاتا ہے اس عنصر کا نام اُس نے فلو جیٹن رکھا تھا۔ اسٹائل کا قول تھا کہ وہ شے جسے فلزاتی اکسید کہا جاتا ہے جب اس عنصر کے ساتھ ملتی ہے تو فلز یعنی دھات پیدا ہوتی ہے لیکن اگر "فلو جیٹن" نکال لی جائے تو دھات اپنی اصلی خاکی صورت یعنی اکسید ہی حالت میں بدل جائے گی۔ اس اصول کی رو سے گویا فلزات اجسام مرکب یعنی مٹیان ہیں جن میں فلو جیٹن ملی ہوئی ہے۔

لیکن اٹھارہویں صدی میں کیمیادی تحقیقات کے آلات پر کانٹے ٹکا اصاد کیا گیا۔ اب کیمیادان آسانی سے حکم لگانے کے قابل ہو گئے کہ فلو جسٹن "والا اصول صحیح ہے یا نہیں اس لیے کہ اگر یہ اصول صحیح ہو تو دہات بمقابلہ اپنے اکسید کے بھاری ہونی چاہیے کیونکہ اول الذکر میں ایک جزو یعنی "فلو جسٹن" ایسا موجود ہے جو ثانی الذکر میں سفال کیا گیا ہے۔ لیکن جب کسی دہات کا کوئی حصہ وزن کیا جاتا ہے اور وہ اکسید بھی تولی جاتی ہے جو اس سے نکلتی ہے تو اکسید بھاری ثابت ہوتی ہے۔ اور یہاں اگر مسئلہ فلو جسٹن "غلط ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس تحقیقات کو جاری رکھا جائے تو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اکسید یا کلس جو اس کا ابتدائی نام تھا ہوا کے ایک جزو کے شمول کی وجہ سے اور بھی زیادہ بھاری ہو جاتی ہے۔

یہ تجربہ علی العموم لیوازیرو سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ کہ فلزات کا وزن تھکس سے بڑھ جاتا ہے لیوازیرو کے زمانہ سے بہت پہلے بعض یورپین کیمیادانوں کے تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکا تھا بلکہ اس کی حقیقت مسلمان کیمیادانوں کو پہلے ہی سچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ لیوازیرو پہلا وہ شخص تھا جس نے اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور اس کے ہاتھوں اس نے علم کیمیاء میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

"فلو جسٹن" والے قیاس کا ترک کیا جانا اس حقیقت کی ایک تین مثال ہے کہ علمی مفروضات و قیاسات اگر واقعات سے مطابق نہ ہوں تو وہ کس آمادگی سے رد کر دیے جاتے ہیں۔ یہ وہ کچھ ہے جس میں سند و روایت کا گزر نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں استناد و استدلال و اسباب قدرت سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استفسار کا جو جواب قدرت دے گی وہ ہمیشہ صحیح ہوگا۔

اب اگر ان فلسفیانہ اصولوں کا جن پر سائنس کی ترقی منحصر تھی ان اصولوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جن پر سیدیت کا دار و مدار تھا تو معلوم ہوگا کہ سائنس درایت کا دامن

گرفتہ تھا تو مذہب روایت کا سائنس نے اندازہ و مشاہدہ کے توافق یا عقل اور واقعہ کے تطابق پر زور دیا تو مذہب نے اسرار و اوهام پر سائنس نے اپنے قیاسات کو جب مطابق حقایق فطرت نہ پایا تو بلا تامل رد کر دیا۔ لیکن مذہب نے کورانہ تقلید سے کام لے کر ان عقاید کی رکاب تھام لی جو ناقابل فہم اور برتر از عقل تھے دونوں کا تفرقہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ ایک طرف سے حشرات ظاہر ہونے لگی تو دوسری طرف سے نفرت۔ جن لوگوں نے چشم انصاف کھلی رکھے کہ ان دونوں حریفوں کی زور آزمائی کا تماشا دیکھا انہیں معترف ہونا پڑا کہ سائنس جلد جلد قیاسیت کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

اس طور پر فن ریاضی تحقیقات علمی کا بہت بڑا آلہ بن گیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ فن علمی استدلال کا آلہ بن گیا۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دماغ کے عمل کو حرکت اضطراری کی شکل میں بدل دیا اس لیے کہ اسکی علامات اکثر و بیشتر فکر و غور کی قائم مقام ہو گئیں۔ محکم و تدقیق استدلال کی عادت جس نے اس کے فیض سے نشو و نما پایا دوسرے علوم و فنون میں بھی داخل ہو گئی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عقلی انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ معجزات و کرامات کے ثبوت سے لوگوں کی تشفی ہو سکے یا وہ منطق و ریاضت کین ہو سکے جس پر ازمنہ وسطیٰ میں عقل انسانی بھروسہ کرتی تھی۔ ریاضی نے نہ صرف طریقہ خیال بلکہ رجحان خیال میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ ان معنایں کا جن پر مختلف علمی مجالیں اور انجمنیں اس زمانہ میں بحث کرنے لگیں اگر ازمنہ وسطیٰ کے مباحث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

لیکن ریاضی کا فائدہ قیاسات و نظریات کی تصدیق و توثیق تک ہی محدود نہ تھا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے اس کے ذریعہ سے ادن حقائق کی نسبت پیشین گوئی بھی ہونے لگی۔ جو ابھی تک نامعلوم تھیں۔ اس لحاظ سے گویا اسے قیاسیت کی پیشین گوئیوں کا جواب سمجھنا چاہیے۔ فن ہدیت نے اسی طرح سے سیارہ چنچون کا انکشاف کیا اور فن

مناظر و مریا کے مسئلہ ارتعاش نور کے صغریٰ دکھری سے وہ نتیجہ برآمد ہوا جو شعاع نور کے انعطاف مخروطی کے نام سے موسوم ہے۔

ادھر تو ریاضی کی بدولت علوم طبیعی میں یہ حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود یہ فن مدارج ارتعاش کے رہا تھا۔ ہم ذیل میں اجمالی طور پر اس ارتقا کی کیفیت قلم بند کرتے ہیں۔

فن الجبر کے ابتدائی جبرائیم اسکندریہ کے مہندس ڈیوفنٹس کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی بیان کیا جاتا ہے سابق میں اقلیدس نے دارالعلم اسکندریہ ہی میں علم ہندسہ کی عظیم الشان حقیقتیں منطقیانہ ترتیب کے ساتھ جمع کی تھیں۔ ساراکیزونین ارستیدس نے علم ہندسہ کے اعلیٰ مسائل کو استقصا کے عمل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی تھی علمی رجحان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر علوم و فنون کی سرپرستی جاری رہتی تو الجبر کبھی کا ایجاد ہو گیا ہوتا۔

سادہ فن الجبر کی معلومات کے لیے ہم عربوں کے رہین منت ہیں۔ ریاضی کی اس شاخ کا نام تک انہیں کارکھا ہوا ہے۔ دارالعلم اسکندریہ سے اس فن کے جو بچہ کچھ اجزاء تک پہنچے تھے ان میں انہوں نے اُس معلومات کا اضافہ کیا جو ہندوستان سے حاصل کی گئی تھی اور بیخ و ترتیب کے بعد اس اصلاح یافتہ مجموعہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدون کیا۔ عربوں سے یہ فن تیرہویں صدی کے شروع میں اٹلی پہنچا۔ لیکن اس پر اس قدر کم توجہ کی گئی کہ تین سو سال تک یورپ میں کوئی کتاب اس فن پر نہ لکھی گئی۔ ۱۴۹۶ء میں پشیولی نے پہلی مرتبہ ایک کتاب بنام ”فن الجبر“ شائع کی۔ ۱۵۵۰ء میں کارڈن ساکن سیلان نے مساوات مکعبہ یعنی تیسرے درجے کی مساوات کے حل کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ۱۵۵۰ء میں سیپیونیرو اور اُس کے بعد ٹارٹلیا اور ویٹا نے مزید مفید اصناف کیے۔ اب علمائے جرمنی نے اس فن پر اپنی توجہ

مذکور کرنی شروع کی تھی وہ زمانہ تھا جب کہ علامات نویسی ناقص حالت میں تھی۔

سلسلہ ۱۰ میں ڈیکارٹ کی تصنیف فن ہندسہ پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب جس میں اصول الجبر کا اطلاق خطوط مقوس کی تعریف و تحقیق پر کیا گیا ہے ریاضیات کی تاریخ میں بمنزلہ ایک نئے دور کی مہدی کے ہے۔ اس سے دو سال قبل گولیسری کا رسالہ مقادیر لایہ تجزیہ

پر شائع ہو چکا تھا اس طریقے کو ہارلیلی اور بعض دوسرے ریاضی دانوں نے ترقی دی۔ اب

حساب مقادیر لا متناہی اور نیوٹن کے طریقہ فضلی اور لائبٹشر کے طریقہ حساب جزئیات

و طریقہ حساب تامی کی ترقی کے لیے رستہ کھل گیا۔ اگرچہ اصول علم الفضل کے نکات کا سرمایہ

نیوٹن کے پاس کئی سال سے جمع تھا لیکن اس نے اس موضوع پر سلسلہ نمکب کوئی تصنیف

شائع نہ کی۔ جن ناقص علامات کا استعمال نیوٹن کرتا تھا اس کی وجہ سے طریقہ فضلی کا عمل موثر و

کارگر نہ ہوتا تھا۔ اس انتشار میں فن الجبر کو یورپ میں بہت ترقی ہوئی۔ برنولی کے بھرنے

اس کے بعض اعلیٰ مسائل کو نہایت خوبصورتی سے حل کر دیا جبکہ نتیجہ یہ ہوا کہ لائبٹشر کا طریقہ

حساب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا جس میں بہت سے ریاضی دانوں نے بہت کچھ ادا کرنے

اور اصلاحیں کیں۔ یہ زمانہ ترقی غیر معمولی سرعت کے ساتھ اٹھارہویں صدی میں برابر

نہا رہی۔ شکل و عدد میں پر جس کا اکتشاف نیوٹن سابق میں کر چکا تھا ٹیلر نے سلسلہ

میں اپنے مشہور طریقہ اختلافات کا اعناذ کیا جو آج تک اس کے نام سے موسوم ہے۔

توکر نے سلسلہ ۱۰ میں حساب اختلافات جزئیہ کا طریقہ رائج کیا۔ ڈیکارٹ نے اس طریقہ کو

اور زیادہ وسعت دی۔ اس کے بعد توکر اور لگرنج نے طریقہ تعبیرات کی بنیاد ڈالی اور

سلسلہ ۱۰ میں لگرنج نے طریقہ اعمالی استخراجی ایجاد کیا۔

لیکن اعلیٰ جرمنی۔ انگلستان اور فرانس ہی تک ریاضیات کی یہ عظیم الشان

تحریک محدود نہ تھی۔ ریاضی کے سر پر جو عقلی تاج رکھا ہوا ہے اس میں اکادمیست

نے توکار غم کی ایجاد سے ایک نیا ہیرا چڑ دیا۔ اس عظیم الشان ایجاد کے لحاظ سے

علمی دنیا نیپئر آف مرچنٹن کی ممنون احسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے مثل ایجاد کی علمی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے سے فہم قاصر ہے۔ طبیعیین و ہیت دان زمانہ موجودہ گریٹیم کالج کے استاد ریاضی پروفیسر برگس کے اس قول پر سچے دل سے صا کرینگے کہ ”آج تک اس درجہ دل پسند اور حیرت افزا کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی“ کپلر جس کا نام علمی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا کہتا ہے اور بجا کہتا ہے کہ ”علم کی جس شاخ نیپئر نے اپنی قابلیتوں کو صرف کیا اُس کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شخص ہے“ نیپئر کا انتقال ۱۶۱۷ء میں ہوا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ لو کارنم کی ایجاد نے علم و ہیت کی محنت گھٹا کر اُن کی عمر دگنی کر دی ہے۔

قلت گنجائش مانع ہے کہ فن ریاضی کی ترقیات پر زیادہ مبسوط بحث کی جائے۔ اس کے علاوہ ہم ریاضی کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ سائنس نے انسانی تمدن کی ترقی میں کیا حصہ دیا۔ اس مقام پر بے اختیار یہ سوال پھر تازہ ہوتا ہے کہ اس کی کیا معنی ہیں کہ گھسیانے اپنے بارہ سو برس کے خود مختار اور عہد حکومت میں ان کا بھی ہونے نہیں پیدا کیا؟

ریاضی بسیط یا ریاضی مطلق کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تحفیں میں ہیں اُن آلات کی ضرورت نہیں پڑتی جو اکثر لوگوں کو میسر نہ آسکیں۔ ہیت کے لیے رصد گاہ اور کیمیا کے لیے سہل کا ہونا ضرور ہے لیکن ریاضی دان کو صرف طبیعت کے لگاؤ اور چند کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فن کا اکتساب نہ صرف کثیر کا مقاضی ہے نہ کسی مددگار و خادم کی اعانت کا محتاج۔ ایسی حالت میں خیال ہوتا ہے کہ رہبانیت کی خلوت، گزین زندگی کے لیے بھی اس سے زیادہ دل پسند اور اس سے بڑھ کر روح کو بالیدگی بخشنے والا سف غلہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس استفادہ کے جواب میں کیا ہم بھی خدا خواستہ جناب پادری یوسیبیس صاحب

کے مصنف ہو کر یہ کہیں کہ ”یہ محنت لا حاصل چونکہ ہماری نظروں میں نہایت ہی ذلیل ہے اس لیے ہم اس کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ اعلیٰ تر حقائق کے اکتساب کو زیادہ مفید خیال کرتے ہیں“ اعلیٰ تر حقائق کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ تو ارشاد ہو کہ وہ کونسی حقیقت ہے جو حق مطلق پر فضیلت رکھتی ہے؟ کیا جھوٹی روایتیں بے بنیاد کرامتیں اور باطل افتراء پر دانیان ہی وہ حقیقتیں ہیں جنہیں حقائق علیہ کے مقابلہ میں انضلیت کا ادعا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نے اتنی مدت تک سائنس کے رستہ میں رکاوٹیں ڈالے رکھیں۔

اس علمی حلقہ کی پہلی ہی جھپیٹ میں حکام کلیسا کو معلوم ہو گیا تھا جو اصول سائنس شائع کر رہا ہے وہ مردود مذہب کے عقاید سے مطلق لگا نہیں کھاتے۔ اسی لیے انہوں نے سائنس کی مخالفت میں ناخون تک کا زور لگایا اور جائز و ناجائز سبھی طرح کی کوششیں اس کی تخریب کے لیے کیں۔ علوم عملی سے جن کا دار و مدار تجربہ اور مشاہدہ پر تھا۔ پادریوں کو اس قسم سخت عداوت تھی کہ جب فلانس کی اکاڈمی بند ہوئی تو ان کے گھر میں گھمی کے چراغ جلے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مار لیا۔ اور یہ معاذ نہ جذبات کچھ رومن کیتھولک مذہب ہی کے سینہ میں جوش زن نہ تھے۔ پراٹسٹنٹ مذہب کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ جب لندن کی رائل سوسائٹی سر شاہی مجلس کی بنا ڈالی گئی تو پادریوں کی طرف سے اس پر ایسی سخت لے دے ہوئی کہ اگر شاہ چارلس ثانی اس کی علانیہ حمایت نہ کرتا تو اس کا اُسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پادریوں نے اس سوسائٹی پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ چاہتی ہے کہ مذہب مردود کو مٹا دے۔ پونیورسٹیوں کو نقصان پہنچا دے اور علوم قدیمہ کا ستیاناس کر دے۔

اس علمی مجلس کی رودادوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انماں کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کا انعقاد ۱۶۶۲ء میں ہوا اور اُس وقت سے لیکر اب تک جو جو علمی تحریکات و اکتشافات ہوئی ہیں۔ ان سب میں اس کی مستعدی شریک

غالب رہی ہے اس نے نیوٹن کی تصنیف ”پرنسپیا“ اپنے اہتمام سے شائع کی۔ ہسپلی کا بھری سفر جو ہسپلی وہ مبہم تھی جبکہ اہتمام کسی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر ہوا ہو اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا اس نے تشریب حزن کے متعلق متعدد تجربے کیے اور آروسی کی تحقیقات و دوران حزن کو تسلیم کر لیا۔ چوبک کے مرض میں مریض کو ٹیکا لگانے کی ترغیب اسی نے دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادی کیرولائن نے بادشاہ سے چھ ایسے مجرموں کی جان بخشی بغرض تجربہ کرائی جن کی نسبت سزائے موت کی تجویز ہو چکی تھی اور اس کے بعد شہزادی نے خود اپنے بچوں کے ٹیکا لگوا۔ اسی کی تائید سے بریڈلی نے اپنے عظیم الشان اکتشافات یعنی اختلات منظر ذابت کو مکمل کیا اور استنزاع محو ارض کے دریافت کی۔ اور یہ وہ دو اکتشافات ہیں جن پر ڈالامبر کے قول کے مطابق ہیئت جدیدہ کی تدفین و حکیم منحصر ہے۔ اسی کی کوششوں سے مقیاس الحرارة میں جو میزان مارج حرارت ہے اور تیسرے سین کی جیسی گھڑی میں جو میزان وقت ہے اصلاح ہوئی۔ اسی کی مساعی سے ۱۷۵۲ء میں تقویم گریگوری و سی باوجود مشہور مذہبی مخالفت کے انگلستان میں رائج ہوئی۔ عوام و جہلا کا یہ خیال تھا کہ ”رائل سوسائٹی“ نے ان کی عمر کے گیارہ دن گنتا دے ہیں اسی لیے وہ ایسے برفروختہ ہوئے کہ سوسائٹی کے بعض ”فیلوز“ (اعضا) کو ان کے ہاتھوں جان کو لالے پڑ گئے اور ایک طیش آلودہ انبوہ کے غضب سے انہوں نے بھاگ کر بمشکل اپنا چھٹا چھڑا باپادری وکیل نے جو جیویٹ فرقہ کا ایک عالم تھا انقلاب تقویم کے مسئلہ میں بہت دلچسپی ظاہر کی تھی لہذا سوسائٹی کو مجبوراً اس کا نام مخفی رکھنا پڑا بریڈلی کا انتقال اتفاق سے اسی ہل چل میں ہو گیا لہذا جہلانے نہایت مشہور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ یہ مرگ مفاجات خدا کا قہر تھا جو اپنے گناہ کی پاداش میں نازل ہوا۔

اگر ہم اس عالی شان مجلس کی خدمات کا موزون طور پر اعتراف کرنا چاہیں تو اس کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کئی ادراق مطلوب ہوں گے۔ ڈائینٹ کی دور میں جبے رنگ

راسٹن کا باخترہ انقسام جسکی ایجاد اول اول مشاہدات فلکی کی تصحیح و تحکیم کا باعث ہوئی۔
 ستین اور ڈوگن کی مساعی سے سطح زمین کے ایک درجہ کی پیمائش۔ سیارہ زہرہ کے مرور
 کے ارتداد کے لیے کپتانیہ لگائی سیاست۔ زمین کے گرد اُس کا بحری سفر۔ اُس کا یہ ثبوت
 کہ مرض احتراق خون کی بنا جس سے طویل بحری سفرون میں مسافر بچ نہیں سکتا میوہ اور ترکاری
 کے استعمال سے دفع ہو سکتی ہے۔ قطب شمالی و قطب جنوبی کی مہمات۔ مسکیدن کے تجربوں
 کے ذریعہ سے جو مقام شہر الین علی مین لائے گئے اور نیز کیونڈش کے تجربوں کی وساطت
 سے تحائف ارض کی تہیں۔ ہرشل کا اکتشاف سیارہ۔ یورینس۔ کیونڈش اور واٹ کی تحلیل
 اجزائے آرب لینڈن اور پیرس کے طویل البلد کے فرق کی تعیین۔ بطاریہ کپراٹھ کی ایجاد۔
 ہر اسلہ کی پیمائش فلکی نیک کا اصول مقدار شدت کو متفرق دینا اور مسئلہ ارتعاش اور کو قوی
 دلائل سے ثابت کرنا۔ جیلخانہ اور دوسری عمارات میں جو ارسالی کا انتظام شہر کی روشنی
 کا انتظام ہیریہ غار۔ رقص نمازیہ کے طویل کی تحقیق اختلاف عرض البلد کے لحاظ سے
 کشش نقل کے اختلافات کا اندازہ تقوس ارضی کی تحقیق کا عمل۔ راس کی مہم قطبی۔ قوی
 کی ایجاد فانوس سلامتی اور تحلیل حریمیات و ارضیات۔ اور سٹڈ اور فوڈس کے کپراٹھ
 و مقناطیسی اکتشافات۔ پیچ کا باخترہ تخمین۔ ہیمبولٹ کی تحریک پرستور و مقناطیسی
 کے قیام کی تدابیر۔ سطح زمین پر ایک ہی وقت میں مختلف مقناطیسی اختلافات کے
 حادث ہونے کی تحقیق و تصدیق بغرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ "مابلی سوسائٹی" کی علمی
 کارناموں کی مکمل فہرست بھی بخوبی طوالت یہاں صرح کرنے سے ہم قاصر ہیں اس کے
 قالب میں بھی وہی روح کار فرما تھی جو فلاس کی علمی مجلس کی زندگی کا باعث ہوئی تھی
 اور اسی لیے اس کا نشان امتیازی یہ فقرہ تھا۔ "تقلید جلد سے پرستور" اس نے ادہام
 و روایات کو اپنی حدود سے خارج کر دیا اور صرف محاسبہ مشاہدہ اور تجربہ کو بجایز رکھا۔
 یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہیے کہ ان غیر معمولی کوششوں اور نمایان کامیابیوں کے لحاظ

سے وایل سوسائٹی یکہ دہنہا تھی۔ پورپ کے تمام دارالسلطنتوں میں مساوی الامتیباز اور مساوی الفوز دار العلم مجالس اور انجمنیں قائم تھیں جو معلومات انسانی اور تمدن جدید کے ارتقا میں برابر حصہ لے رہی تھیں۔

سائنس کا اقتصادی اثر

علمی نظر سے اگر صحیفہ فطرت کی ورق گردانی کی جائے تو نہ صرف انسان کے عقلی تصورات کی رسانی صرفت اور حقیقت شناسی کے سقائات عالیہ تک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی طبیعی وادبی حالت کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ واقعات محققہ کے اقتصادی استعمال کی کوئی ایسی شکل نکالے جس سے وہ اس کے معاش کی اغراض کی تکمیل کر سکیں۔

اصول علمی کی تحقیقات کے بعد بہت جلد ایجادات علمی کا ظہور ہوتا ہے۔ علم و عمل کا یہ باہمی تعلق ہمارے زمانہ کی خصوصیت مختصہ ہے۔ اس نے دنیا کے تمدن میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

زمانہ سابق میں جنگ استر قافا ہوا کرتی تھی۔ خارج غلاموں کے کھپ کے کھپ لپٹے ساتھ لے آتا تھا اور ان سے جبراً محنت لیتا تھا اس لیے کہ انسانی محنت میں انسانی محنت ہی کے ذریعہ سے تخفیف ہونی ممکن تھی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ قدرت کی طبیعی اور جبر ثقلی قوتوں سے کام لینے میں بدرجہا زیادہ فائدہ ہے تو اقوام کی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ کسی نئے علمی اصول کا استعمال یا کسی نئی کل کی ایجاد ایک جدید غلام کے حصول کی بہ نسبت زیادہ نفع رسان ہے تو صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہو گئی۔ ان جدید اکتشافات کا اثر یہاں تک ہوا کہ اہل امریکا وروس کی طرح ان قوموں نے بن کی آبادی کا بڑا حصہ غلاموں سے مرکب تھا یہ دیکھ کر ہمدردی

انسانی اور اغراض شخصی اب ایک دوسرے کی مغائر نہیں رہیں۔ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔

عرض ہم ایک ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی ایک نمایان خصوصیت یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی مُنت کا قائم مقام کلون کو بنایا جائے۔ اس زمانہ کی جبرِ تغیلی ایجادات نے تمدن اور معاشرت میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ہم اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے قدرتی طاقتوں سے مدد مانگتے ہیں۔ فوق القدرت طاقتوں سے چارہ جوئی نہیں کرتے۔ کیتھولک مذہب اسی جدید تمدن سے جو اس طور پر پیدا ہوا ہے۔ اباکرتا ہے۔ پاپائیت بہ ہانگ دہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ اُسکو موجودہ حالت سے ہرگز کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کو دور جاہلیت کی طرف رجعت نفہری کی جائے۔

یہ حقیقت انسان کو حضرت مسیح سے چھ سو برس پیشتر معلوم تھی کہ اگر گہرے ایک ٹکڑے کو گرگڑا جائے تو اُس میں جذب و دفع کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ ظہورِ مسیح سے سولہ سو سال بعد تک یہ حقیقت محض بچوں کا کھیل ہی رہی اور اس سے کسی نے فائدہ نہ اُٹھایا۔ لیکن جب اس پر علمی طریقہ سے بحث کی گئی اور ہندسہ مناظرہ اور تجربہ کی کوئی ٹپرکس کر اس کے نتائج کو عملی طور پر کام میں لایا گیا تو اسی اونی سی حقیقت کی بدولت انسان اس قابل ہو گیا کہ خشکی اور تری کے عایل ہونے کے باوجود ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے سے طرفہ العین میں بات چیت کر سکے۔ اس حقیقت نے دنیا کی قانون کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا ہے۔ فرمانِ روا سے وقت کو بلا لحاظ زمان و مکان اجراءِ احکام و فرامین پر قدرت عطا کرنے سے اس نے تدبیر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور سیاسی قوت کے سابقہ تخلخل کو عتافت سے بدل دیا ہے

عجائبِ فائدہ اسکندریہ میں ایک کل یعنی جسے تیر دریا صنی دان نے حضرت مسیح سے

کوئی ایک سو سال قبل ایجاد کیا تھا۔ یہ کل دخانی قوت سے چلتی تھی اور اس کی شکل دیسی سی تھی جیسی آج کل باخترۃ استرہامیہ یعنی رد عمل کرنے والے انجن کی ہوتی ہے۔ یہ انجن جو دنیا کی ایک نہایت عظیم الشان ایجاد کا ہیولی تھا سترہ سو سال تک محض ایک اعجوبہ سمجھا جاتا رہا۔

زانہ حال کے دخانی انجن کی ایجاد کو بخت و اتفاق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اسے غور فکر اور تجربہ کا عقلی باصل سمجھنا چاہیے سترہویں صدی کے وسط میں بعض مہندسوں نے جو علم الحركات والہیل کے ماہر تھے دخانی قوت سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں شروع کیں۔ ان کوششوں کو دات نے انکار ہوین کے وسط میں مکمل کر دیا۔

دخانی انجن بہت جلد تمدن کا مزدور بن گیا۔ اس نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان اشخاص کو جن کی عمر ڈالیا دہوتے ڈھونے کٹ جاتی زیادہ مفید مشغولوں کا موقع دیا۔ جو لوگ پہلے حال تھے اب حکیم بننے کے قابل ہو گئے۔

اقل اول اس سے بند بیہ نل پانی کھینچنے اور اسی قسم کا دوسرا کام لیا گیا جس میں محض طاقت صرف ہوتی تھی لیکن زیادہ مدت نہ گزرے پانی بھی کہ سوت کا تنے اور کپڑا بننے کی لطیف صنعت میں حصہ لیکر اُسے ثابت کر دیا کہ اس میں باویک اور نازک کام کرنے کی قابلیت بھی موجود ہے۔ اس نے صنعت و حرفت کے عظیم الشان کارخانے قائم کروئے اور دنیا کا ہزارہ اسی کے طفیل چلنے لگا۔ غرض اقوام عالم کے صنعت و حرفت کی اس نے صورت ہی بدل دی۔

پہلے دریادوں اور اُسکے بعد سمندوں میں جب دخانی انجن سے جہاز رانی کے متعلق کام لیا گیا تو اُس نے کشتیوں اور جہازوں کی سرعت رفتار کو دگنا چو گنا پچگنا کر دیا۔ امریکہ سے انگلستان پہنچنے میں پہلے چالیس دن صرف ہوتے تھے اب آٹھ ہی دن میں یہ سفر طے ہونے لگا۔ لیکن خشکی کے سفر میں دخانی انجن کی طاقت حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوئی جو فاصلہ انسان پہلے ایک دن میں بھی طے نہ کر سکتا تھا۔ اب ایک گھنٹے سے

بھی کم مین طے ہونے لگا۔

دخانی انجن سے نہ صرف انسانی سفیدی و کارگزاری کے میدان کو وسیع کر دیا ہے بلکہ فاصلہ کے اعتبارات کو گھٹا دینے سے انسانی زندگی کی قابلیتوں کو بڑا دیا ہے۔ کائناتوں کے تیار شدہ مال اور زراعتی پیداوار کے سریع السیر نقل و نقل سے اس نے انسانی صنعت و حرفت کی تحریک مین ایک بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

گھڑی کی ایجاد نے دخانی جہاز رانی کے فن کو درجہ کمال پر پہنچانے مین ایک بڑی حد تک تحریک کی اسلئے کہ اس ایجاد کی بدولت نہایت صحت کے ساتھ یہ معلوم ہونے لگا گیا کہ سمندر مین جہاز کس وقت کس موقع پر ہے۔ عجائب خانہ اسکندریہ مین سائنس کی ترقی اس وجہ سے ایک بڑی حد تک رکی ہوئی تھی کہ کوئی ایسا آلہ نہ تھا جس سے وقت یا حرارت کا اندازہ کیا جاسکے یعنی نہ اُس زمانہ مین گھڑی موجود تھی نہ مقیاس الحرارت کا وجود تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایجادیں لازم و ملزوم ہیں اس مین شک نہیں کہ عجائب خانہ اسکندریہ مین آبی گھڑیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اُن کی ساعت خمائی صحیح اور قابل اعتماد نہ تھی۔ ان مین سے ایک گھڑی کو جو منطقۃ البروج کی علامات سے مزین تھی فردن اولیٰ کے بعض جابل عیسائیوں نے ضائع کر دیا۔ اور ایک مقدس عالم سینٹ ہالیکارپ نے اس کی نسبت نہایت نہایت معنی خیز لہجہ مین ارشاد فرمایا کہ ”ان تمام خبیث و بدون کی شکل مین ایک ایسے سفلی علم کی صورت نظر آتی ہے جو دشمن ایمان ہے“ کہیں مثلاً غ مین جا کر گھڑی درجہ صحت کو پہنچی۔ ہو کہ نے جو یونین کا معاصر تھا اس مین دو لابل تبدیل اور چکر دار کمائی دو پرزے بڑے۔ اس کے اور مختلف پرزے مثلاً لنگر۔ کلالہ۔ متنی اور منتشر یکے بعد دیگرے اضافہ کیے گئے ورجات حرارت کے تغیرات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور اس کے لیے مزید تربیات کی گئیں یہاں تک کہ بہرین اور آئلڈ نے گھڑی کو وقت کا ایک نہایت ہی صحیح پیمانہ بنا دیا۔ گھڑی کی ایجاد پر گارڈ فری کا فرولہ انکاسی یعنی سدس دائرہ کی شکل کا وہ آلہ مستند ہوا جسکی وجہ سے چلتے جہاز

میں مناجات فکلی کا ارتقاد ممکن ہو گیا۔

فن جہاز رانی میں جو ترقیان ہو رہی ہیں ان سے انقسام اقوام پر ایک قوی اثر پڑا ہے۔
مستمرات یعنی نوآبادیان بڑھ رہی ہیں اور انکی نوعیت تغیر پذیر ہو رہی ہے۔

لیکن ان بڑے بڑے اکتشافات و ایجادات ہی نے جو تحقیقات علمی کا حاصل ہیں
انسان کی حالت کو ہمیں بدلاہر بہت سی جھوٹی چھوٹی ایجادات نے جو بجائے خود چندان قابل
لحاظ نہیں مجموعی حیثیت سے تمدن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جو وہوین
سدری میں سائنس نے قوت ایجاد کو ایک حیرت انگیز تحریک پہنچائی اور اس قوت فراہم آپ کو
ان علمی نتائج کے استخراج پر دقت کروا جو سود مند سی کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ قانون نے
موجودہ دنیا کو اپنی ایجاد سے منقول نفع حاصل کرنے کا استحقاق بذریعہ سند ایجاد عطا کیا
جس سے لوگوں کو نئی نئی ایجاد دین کرنے کی انگ پید ہوئی۔ اس قسم کی ایجادات کا ذکر
ہم اس مقام پر بسبیل تذکرہ سرسری طور پر کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان سے تمدن کس قدر
متاثر ہوا ہے۔ آؤ کشی کی کل کے جاری ہونے سے مکانات کے فرش چوبی ہو گئے اور میٹ
پونے پتھر کے فرش خواب و خیال ہو گئے بشیغہ سازی کے کارخانوں کے قائم ہونے
سے آئینہ دار کھڑکیوں کا مکانات میں اضافہ ہو گیا اور کمرے گرم رہنے لگے لیکن آئینہ بندی
کا فن سولہویں صدی سے پہلے کمال کو نہ پہنچا۔ سولہویں صدی میں شیشہ میرے سے تراشا
جانے لگا۔ دو دکشوں کے اضافہ سے مکانات کی ہوا صاف ہو گئی پہلے وہ دھندلے کے
جمو پٹروں کی طرح دھوئیں سے بھرے ہوتے تھے اور ان کے اندر کی دیواریں
کالک سے لسی ہوئی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں دو دکشوں کی وجہ سے منقطع بارہ کے مکانات
میں وہ سامان راحت ہبسا ہو گیا۔ جسے آتش دان سے تعبیر کرتے ہیں اب تک آگ تاپنے
اور مکان کو گرم رکھنے کا ذریعہ صرف یہ تھا کہ دھواں بھٹنے کے لیے چھت میں ایک سداغ کرنا
کر دیا جاتا تھا۔ الا وہاں کے فرش کے بیچوں بیچ ایک گرما کو دبا جاتا تھا اور جب بھی

گل کرنے کی سرکاری گھنٹی بجتی تھی یا رات ہو جاتی تھی تو ایک سرپوش سے اُس گرہے کو ڈھک دیا جاتا تھا۔

اگرچہ پادریوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی لیکن لوگوں کے ان خیالات کی کسی طرح روک تھام نہ ہو سکی کہ دباؤن کو خدا کا قبر نہ سمجھنا چاہیے جو بندوں پر اُن کی بد اعمالیوں کی پاداش میں نازل ہوتا ہے بلکہ غلامت اور تباہ حالی کا مادی نتیجہ تصور کرنا چاہیے اور اُن سے بچنے کا مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ بیرون اور اولیائوں سے دعائیں مانگی جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ شہروں میں صفائی کا انتظام کیا جائے اور ہر شخص خود بھی جسمانی صفائی کا خیال رکھے۔ بارہوا صدی میں پیرس کی گلیاں مارے غلامت اور عفونت کے سڑا سہی ہوئی تھیں حکومت نے مجبور ہو کر سڑکیں صاف کرائیں اور اُن پر کنکر کٹوا سے۔ گندگی کا دور جو تھاکہ پچش اور دباؤ بخار فوراً جاتا رہا۔ اس طور پر بتدریج شہر کی صفائی کی قریب قریب وہی حالت ہو گئی جہاں کے اسلامی شہروں میں نظر آتی تھی یہاں سڑکیں صدیوں سے پختہ آتی تھیں۔ غرض پیرس میں جبکہ حسن اب معذروں بڑھتا چلا سورون کے رکھنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن ہس حکم پریسٹنٹون کے ڈیز کے راہب بہت بگڑے اور شقاقی ہوئے کہ اس خانقاہ کے سورون کو بے روک ہر جگہ پھرنے کی اجازت ہوئی چاہیے۔ کلیسا کے عتاب کی تاب کوئی نصرانی حکومت اس زمانہ میں نہ لاسکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً فرانسیسی حکومت کو اپنے حکم میں کثرت جو نت کرنی پڑی اور معاملہ اس طرح رفع دفع ہوا کہ اس خانقاہ کے سورون کے گلے میں گھنٹیاں لٹکا دی جائیں۔ شاہ لونی الملعب ہ فریہ کا بیٹا شاہ فلپ ایک دن گھوڑے پر سوار جارا تھا کہ ایک سورنی سامنے آگئی گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور بادشاہ کو لیسکر گرا۔ جس کا گرتے ہی دم نکل گیا۔ بالا خانوں اور کھڑکیوں میں سے دھو دن باہر پھینکنے کی لوگوں کو عام عادت تھی جس کی وجہ سے آئندہ روزند لٹ پت ہو جاتا کرتے تھے حکومت کی طرف سے اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ شہر میں باپائی حکومت کے انتہاء کر

وقت جب مصنف کتاب ہذا کو روما کی سیر کا اتفاق ہوا تو گلیوں میں گھورے کے ڈھیر دن گدے پانی کے ڈبروں کی یہ کیفیت تھی کہ کپڑوں کو نجاست کی آلودگی سے بچانے کے لیے مندر تھا کہ گزرنے والے کی آنکھیں کبھی کبھی آسمان کی طرف اٹھ جانے کے بجائے زمین کی سطح و مستقل درباری کیا کریں۔ سترہویں صدی کے شروع میں برلن کی گلیوں کی یہ حالت تھی کہ ان کو کبھی صاف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس شہر کا قانون یہ تھا کہ جو دیہاتی سودا سلف خریدنے کی غرض سے اپنا چھکڑا لیکر بازار میں آئے وہ واپسی کے وقت چھکڑے میں کپڑا کرکٹ بھر لے جایا کرے سڑکوں کی کشائی کے بعد نالیوں اور بدر رووں کی تیاری کی کوشش کی گئی لیکن اول اول یہ کوشش ناقص اور ادھوری رہی۔ جو لوگ سوچ سمجھ رکھتے تھے ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ شہر دن اور نیز ان مکانوں میں جو الگ تھلگ واقع ہیں جب تک نالیوں اور بدر رو کا انتظام نہ کیا جائے گا صحت و بہت نہ رہ سکے گی۔ اس کے بعد عام گزرگاہوں کی روشنی کا انتظام ہوا۔ جن لوگوں کے گھر اب راہ واقع تھے اول تو ان پر اس قاعدے کی پابندی لازم کی گئی کہ موم بتیان یا چراغ اپنی کھڑکیوں میں روشن رکھیں تاکہ ان کی روشنی سڑک پر بھی پڑتی ہے اس کے بعد قریب و غریب کے اسلامی طریقہ کو پیش نظر رکھ کر سرکاری طور پر روشنی کا انتظام کیا گیا لیکن یہ انتظام اٹھارہویں صدی سے پہلے جبکہ گاس کی روشنی ایجاد کی گئی تکمیل کو نہ پہنچا۔ سرکاری لائٹینوں کے نصب کیے جانے کے ساتھ ساتھ رات کے پہرے اور پولیس کا انتظام بھی کیا گیا۔

سولہویں صدی کے آغاز پر کلون کی ایجاد اور دست کاریوں کی اصلاح نے تمدن اور معاشرت پر نمایاں اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ دیواروں پر صورت دیکھنے کے آئینے آویزاں نظر آنے لگے۔ طاقتوں پر وقت دیکھنے کی گھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آتش دانوں پر کالین بن گئیں۔ اگرچہ اکثر مقامات کے باورچی خانوں میں گاس بچونس اور لکڑی ابھی تک ایندھن کا کام دیتی تھی لیکن کوئلہ کا استعمال عام ہو چلا کھانا کھانے

کے کردار میں میزبانانِ نعمت کے لئے خوان گئے ہوئے نظر آنے لگے۔ تجارت کا ہاتھ مالک غیر کی نعمتیں اس پر چنے لگا۔ شمالی ممالک کی بزمہ اور غیر مصفا شرابوں کی جگہ جنوب کی لطیف اور پرجہ خربہ سنے لے لی۔ برت خاسے تعمیر ہو گئے۔ ہوا کی چکیدن میں آنے کی چھنے سے روئی زیادہ سفید اور زیادہ نفیس بنیاد ہوئے کھلی۔ آتو۔ فیل مرغ کا گوشت اور تباکوہ و نمین تمین جو پہلے بوجہ نادر اور کم باب ہوئے کے خاص خاص نوگون کو میسر آتی تھیں۔ اب ان کا ذائقہ کام و زبان کے لئے عام ہو گیا۔ پہلے لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ کانٹے لے جواہلی میں ایجاد ہوا اس گھناؤنے طریقہ کی اصلاح کر دی۔ فرش مہذب و شائستہ تو سون کے دسترخوان کی صورت ہی بدل گئی۔ چارچین سے قہوہ عرب سے اور شکر بند وستان سے آنے لگی جن کا استعمال بہک بڑی مسکرات و منشیات کا قائم مقام ہو گیا۔ پیرالی کے فرش کی جگہ دریوان اور تالینون لے لے لی۔ خوبگاہوں میں صاف ستھرے پلانگ اور ایلے پچھوئے موجود ہو گئے۔ نوشہ خالون میں صاف اور نفیس پوشاک کے متعدد ہو گئے۔ صیا ہو گئے۔ بہت سے لہر دین میں بکاسے اس چشمہ آب کے جہان سے ہر شخص بقدر اپنی ضرورت پانی بھر کر لے جاتا تھا یا پانی کے اس نل کے جوگی میں نصب ہوتا تھا گھر پانی کا نل جاری ہو گیا۔ دھپتین جو بزمانہ سابق میل اور کھوش سے غلیظ ہو جاتی تھیں اب بیل پوئے اور نقش و نگار سے مزین ہو گئیں۔ حمام کا استعمال عام ہو چلا۔ جسم کی بدبو کا رد عمل کرنے کے لئے عطریات کے استعمال کی ضرورت کم گئی۔ حدیقہ آرائی و دین بندی کے دل پذیر مذاق کو روز بروز ترقی ہوتی چلی اور مالک غیر سے بہت سے نونو پھولوں کے پودے لاکر گلشنوں میں لگائے گئے مثلاً گل شببو۔ کرن پھول۔ گل اکیل۔ گل زرگس۔ گل شقیق لغمانی۔ گل صد برگ۔ سواری کی قسم سے اول پانکایان اور تام جہام راج ہوئے اس کے بعد بندکانڈیان استعمال ہونے لگیں اور آخرین کرایہ کی گاڈیان راج ہو گئیں۔

مکون کا گھر گھر چا سو چلا۔ گوار و ہانیون تک بھی ان کی رسائی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ ہل چوتنے۔ سچ لے لے گھاس کا۔ ٹٹنے۔ مفصل کی لادنی کرنے اور دائیں چلانے کے آلات مکمل ہوئے گئے۔ باوجود ان پادریوں کے مواعظ و نصائح کے جو بھیک کا شہکار لے ہوئی یورپ کے ہر شہر میں

دوبد پھرتے تھے لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہو چلا کہ فلاکت ام الجرائم اور حجاب العلم ہے۔ اور تجارت کے ذریعہ سے دولت کمانا بمقابلہ اس جادو ملکیت کے جو بذریعہ جنگ حاصل ہو مہرباب افضل ہے۔ مانیکیو کا قول ہے کہ تجارت قوموں کو تو ملاتی ہے مگر افراد کو لڑائی اور جنس اخلاقی کا بیوہ پار کرتی ہے۔ یہ قول اگرچہ سچ ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت ہی کی بدولت دنیا میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ تجارت کا نصب العین یہی ہے کہ عالم میں امن و صلح کا علم ہر اتنا ہو نظر آئے۔

جب سے سائنس اپنا فیض رسان اثر دنیا پر ڈالنے لگا ہے اور قوت ایجاد صنعت و فخر کا ہاتھ بٹائے لگی ہے انسان کے تمدن اور معاشرت کی حالت میں غیر معمولی اصلاح اور ترقی ہوئی ہے۔ ان اصلاحات و ترقیات کی تفصیل کے لئے بجائے کئی ضخیم جلدوں کے ان چند اوراق پر اکتفا کرنا اگرچہ مغفون کو تشنہ چھوڑنا ہے اور قلت گنجائش میں مزید ایضاح کی اجازت بھی نہیں دیتی لیکن بعض امور پھر بھی ایسے ہیں جنہیں غموشی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بارملونا کی بندرگاہ غلافائے اندلس کی عظیم الشان بحری تجارت کا مرکز تھی۔ یہاں سے سینکڑوں جہاز قیمتی مال تجارت سے لدے ہوئے اطراف و انکاف عالم میں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودی تاجروں کی اعانت سے فن تجارت میں بہت سے جدید اصول اختیار کیا ایجاد کئے تھے اور یہ اصول علم کے نظری مسائل کے ساتھ ان کی فیض رسانی کی بدولت یورپ کی تجارتی جماعتوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس طور پر حساب نویس کا طریقہ ذواذرا چین یا حساب مروج رائج ہو گیا جس میں آمدنی اور خرچ کا روزانہ حساب و وجدگانہ قانون میں بالمقابل لکھا جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس۔ ہمہ کی مختلف قسمیں بھی رائج ہو گئیں اگرچہ پادری کڑکڑاتے اور بڑبڑاتے ہی رہے۔ ہیرہ آتشزدگی و ہیرہ بحری کی ممانعت پادریوں کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ اس بنا پر ہوئی کہ یہ ایک فتنہ ہے جو گویا قضا و قدر کا امتحان لیتا ہے۔ زندگی کے ہیرہ کے عدم جواز کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہوا کہ اس فعل سے گویا خدا تعالیٰ کی مشیت کے نتائج میں دخل دہی مقصود ہے۔ سو ویا کفالت پر روپیہ قرض دینے کی جو کوٹھیاں یعنی بینک اور بندھک کے ساتھ کارمہ قائم تھے۔ ان کی سخت

مخالفت کی گئی۔ خصوصاً زیادتی شرح سود کو رہا خواری کے ذیل نام کی آئین قابل نفرت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہ وہ خیال ہے جسے ابھی تک بعض ناترقی یافتہ جماعتوں میں پایا جاتا ہے موجودہ شکل کی ہندیاں جن میں وہی اصطلاحات مستعمل تھیں جو آج کل زیر استعمال میں رائج ہیں انسر تصدیق قبائلیات کا عہدہ قائم ہو گیا اور ہندوؤں کے سکارنے سے پہلو تہی کرنے والے پر گرفت ہوئے لگی۔ غرض جو مبالغہ کیا جاسکتا ہے کہ تجارت کی کل آج جن پردوں کے زور سے پہلے ہی ہے وہ اُس زمانہ میں تمام و کمال رائج ہو چکے تھے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ امریکہ کی دریافت نے یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اٹلی کے بہت سے دولت مند تاجروں کا بہت سیودی، اٹلی، انگلستان اور فرانس میں جا کر آباد ہو گئے اور ان ممالک میں ان کی وجہ سے تجارت کی مخالفت تجارتی گروہوں کے پاپاؤن نے جس سے زیادہ سود کھانے والوں کو مردود و ملعون قرار دیا تھا۔ یہودی جنہیں ان ممالک کی کچھ پروانہ تھی بھاری سود پر پر دیر قرض دے دے کر خوب مالدار ہو گئے تھے۔ پاپائی پائس ثانی نے یہ دیکھ کر کہ اس سے مسائیلوں ہی کا نقصان ہے کٹھن صنعت واپس لے لیا۔ بالآخر قیود ہم کی اجازت سے بندھا کر کے سامہو کاری قائم ہو گئی اور پاپائی کی طرف سے اس مضمون کا ایک تبدیلی آمیز فرمان جاری ہوا کہ جو شخص ان کو ٹھیکوں کے جواز کے خلاف قلم اٹھائے گا وہ کلیسا سے خارج کر دیا جائے گا۔ پرائسٹوں نے محض ضد کی وجہ سے ان مہاجنی کارخانوں کی مخالفت شروع کی۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ جس چیز کو رواج و جایز بتائے اُس پر پرائسٹ ناجایز سمجھیں۔ جب اس دینی عقیدے کو کہ زلزلہ کی طرح دیا بھی خدا کا قہر ہے جو انسان پر اُس کے اعمال سیئہ کی پاداش میں نازل ہوتا ہے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تو وہاں کے وضع کی کوشش قرطینیوں کے قیام سے عمل میں لائی جانے لگی۔ نتیجہ یقینی انسانی چپک کے ٹیکے کا طریقہ مسلمانوں کا دریافت کیا ہوا تھا۔ مسئلہ مین ٹیڈ می میری وارنٹی مانٹیک جب قسطنطنیہ سے اس طریقہ کو اپنے ہمراہ لائین تو پادریوں نے اس کی تردید کی جیسی سخت مخالفت کی کہ اگر انگلستان کا شاہی خاندان اپنی مثال سے اس کے استعمال

کی ترغیب نہ دلاتا تو اس کا رواج پذیر ہونا محال تھا۔ علیٰ ہذا القیاس جب اس طریقہ میں اصلاح کر کے
 ہمتیج البقر یعنی گائے کی چھپک کے ٹیکے کا طریقہ رائج کیا گیا تو اس وقت بھی پادریوں نے مخالفت
 کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا حالانکہ ایک صدی پیشتر غال غال ہی کوئی چہرہ ایسا نظر آتا تھا جو چھپک
 کے داغوں سے مسخ نہ ہو گیا ہو اور آج کل ایسا چہرہ شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے جس پر چھپک کے داغ
 ہوں۔ اسی طرح جب امریکہ میں ادویہ بے ہوشی کی اہم دریافت ہوئی ادویہ ادویہ زچگی کی حالتوں
 میں استعمال کی جانے لگیں تو پادریوں نے حسب معمول اس استعمال کی مخالفت کی نہ اس لئے
 کہ از روئے اصول علم الابدان یہ استعمال قابل گرفت تھا بلکہ اس بنا پر کہ کتاب پیدائش کے
 تیسرے باب کی سولہویں آیت نے جو لعنت کا طوق عورت ذات کے گھے میں ڈال دیا ہے
 وہ اس عداوت کو شش سے اتر جاتا ہے۔

ایجاد و ابداع نے فطرت مفیدہ ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ سامانِ تعمیر
 طبع ہی ہم پہچانا شروع کر دیا۔ اٹلی میں سائنس نے قدم رکھا ہی تھا کہ اجموہہ پسند لوگوں کے مکالموں
 میں طرح طرح کے متحرک و میل نواز جنہیں جادو کا کھیل کہا جاتا تھا نظر آنے لگے۔ ان میں جادو
 کی لائسن کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا۔ پادریوں کو اگر حکمت عملی اور تجربہ آزمودہ فلسفہ سے نفرت تھی
 تو وہ بلاوجہ نہ تھی اس فلسفہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ پیدا ہوا یعنی بھان متی کا تاثر کرنے والے
 اُلی بزرگواروں کی مسابقت کا کامیابی کے ساتھ دم بھرنے لگے جو صاحبِ اعجاز و کرامت سمجھے
 جاتے تھے۔ وہ جعلی خوارقِ عادت اور جھوٹی کرامتیں جو گرجاؤں میں پیش کی جاتی تھیں بازار میں
 ہمارے شاکر کے واسطے پادریوں کے کرتبوں کے سامنے پھیل پڑ گئیں۔ جرمات مقدس پیشوایانِ کلیسا
 سے نہ ہو سکتی تھی وہ مداری۔ لے کر کے دکھا دی۔ یعنی وہ منہ میں سے آگ کے شعلے نکالنے لگا۔
 وہ جتنے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے لگا دانتوں میں سرخ جلتے ہوئے لوہے کی سلاخ پکڑنے لگا۔
 منہ میں سے کوئیون انڈے نکالنے لگا اور کٹ پتلیوں کے ذریعہ سے معجزے دکھانے لگا۔
 بایں ہمہ معجزات کا قدیم خیال بڑی مشکل سے ٹٹنے میں آیا۔ ایک گھوڑے پر جسے اُس کو مانگتے

بہت سے عجیب عجیب کرتب سکھار کے تھے سلسلہ عین بمقام لڑ بن مقدمہ چلایا گیا اور اس جرم کی علت میں کہ اُس پر بھوت سوار ہے پھارے بے زبان جانور کو آگ میں جلا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک سینکڑوں عورتیں اس الزام میں زندہ جلائی جاتی رہیں کہ وہ چڑھیں ہیں۔

اکتشافات و ایجاد کا سلسلہ جب ایک دفعہ قائم ہو چکا تو اس کی ترقی نہایت سرعت کے ساتھ علی التسلل ہونے لگی۔ دونوں کا ایک دوسرے پر برابر عمل اور رد عمل ہوتا رہا اور ان کی وجہ سے خرق عادت کی جڑ کھوکھلی ہوتی گئی۔ قوس قزح کی تشریح ڈی ڈائمنس نے شروع اور نیوٹن نے ختم کی۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ قوس قزح مظہر قہر خدا نہیں ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے بلکہ پانی کے قطروں میں نور کی شعاعوں کے عمل کا کرشمہ ہے۔ ڈی ڈائمنس کو صدر استغف کے عہدے اور کرونیال کے منصب کی امید پر ہکا پھسلا کر رومین بلایا گیا۔ جب وہ یہاں پہنچا تو اُسے ایک عالیشان محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس الزام کی بنا پر کہ وہ روم اور انگلستان میں اتحاد و مراعات کا محرک ہے وہ سینٹ انجیلو میں قید کر دیا گیا جہاں اُس کا انتقال ہو گیا۔ اُس کا تابوت ایک شیشی عدالت کے سامنے لایا گیا اور زندقہ و اتحاد کے جرم کی علت میں محمدانہ کتابوں کی ایک ڈھیر کے ساتھ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ میں جھونک دیا گیا۔

فریٹکن نے اس بات کا ثبوت دے کر کہ کیمیا اور برقی قوت دراصل ایک ہیں جو میٹر کو اس کے صوامع سے محروم کر دیا۔ ادھام باطلہ کے کرشموں کی جگہ حقائق کے عجائبات نے لڑ لی۔ دو برہمن عکس انگن اور دو برہمن بے رنگ نے جو اٹھارہویں صدی کی ایجادات ہیں انسان کو اس قابل بنادیا کہ وہ کائنات کی غیر محدود عظمت و شان کے چہرے سے پردہ اٹھا سکے۔ اور مکان لامتناہی و زبان بے پایان کا اُس حد تک جو انسان کے لئے ممکن ہے اندازہ کر سکے۔ کچھ مدت بعد خرد برہمن بے رنگ نے عالم صغیر کی بے انتہا و دقیق موجودات کو انسان کے پیش نظر کر دیا۔ غبار اُسے ہاؤنوں سے بھی اوپر لے گیا اور آفرغرامی کے ذریعہ سے وہ سمندر کی

تہ تک پہنچ گیا۔ مقیاس الحرارة اور مقیاس الہوائے اُسے مدارج حرارت کی تعیین اور ہوا کے
 و باؤ کے اندازہ کی قابلیت عطا کی۔ کانٹے کے رواج سے فن کیمیا کی دقیقہ سنجی بڑھ گئی اور یہ ثابت
 ہو گیا کہ مادہ غیر ممکن الفاس ہے۔ اکیسجن ہائیڈروجن اور بہت سی دوسری غازوں کی دریافت الومینیم
 کلکس اور دوسری فلزات کے تجربات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خاک و باو و آب عناصر نہیں ہیں۔
 اُس علی غریبت و مستعدی سے کام لے کر جس کی تعریف کے لئے ہمارے پاس کافی الفاظ
 موجود نہیں ہیں واقعہ در زہرہ سے فائدہ اٹھایا گیا اور مختلف حصص ارض میں علی مہات بھیج کر زمین
 اور سورج کا درمیانی فاصلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ ۴ سے لے کر مسئلہ ۱۰ تک یورپ نے جو عقلی
 ترقی کی اُس کا اندازہ پہلی کے مدار تارے سے ہوتا ہے۔ سال اول الذکر میں جب یہ تارہ نمودار
 ہوا تو اُسے خدا کے تہر و غضب کی اسمانی علامت سے تعبیر کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ اس کا ظہور جنگ
 و با اور گوناگون بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ پاپائی مقدس کے حکم سے یورپ بھر کے گرجاؤں کے
 گھنٹے بلائے گئے تاکہ اُن کی جُن جن سے تارہ دم و بار بھاگ جائے۔ دین دار اور خوش عقیدہ
 نصرانیوں کو ایسا ہوا کہ روزانہ نماز پر ایک جدید نماز کا اضافہ کریں۔ اس قسم کی نمازیں اور دعائیں پہلے
 بھی کسوف و خسوف اور خشک سالی و بارش کے موقع پر کارگر ثابت ہوئی تھیں چنانچہ اس
 موقع پر بھی جب تارہ غائب ہو گیا تو یہ اعلان کیا گیا کہ عالیجناب تقدس مآب حضرت پاپائی اعظم کو
 خدا نے و مدار تارے پر فتح عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس اثنا میں پہلی کو کپکڑا اور نیوٹن کے اکتشافات کی
 مدد سے یہ معلوم ہوا کہ اس و مدار تارے کی حرکات پر یہی دینا کے عجز و الحاح اور منت و زاری کو
 قابو نہیں ہے بلکہ مقدرات نے ایک ایسی شکل مدار کا چکر اس کے پاؤں میں ڈال رکھا ہے۔
 وہ جانتا تھا کہ مقضیات قدرت سے وہ اس بے باکانہ پیشین گوئی کو اپنی آنکھوں پر اچھوتا نہ دیکھ سکے گا
 لہذا اُس نے آئندہ نسل کے ہیئت والوں کو نصیحت کی کہ مسئلہ ۴ میں اس کی واپسی کا انتظار
 کریں۔ اس پیش گوئی کا جرت حرجت پورا ہوا اور اسی سال میں تارہ مکر نمودار ہوا۔

اگر کوئی شخص بیجا طرہ ازہمی سے پاک ہو کر اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ رومن کیتھولک نصرانی

اپنی طول طویل مدت حکومت میں یورپ کی عقلی اور مادی ترقی میں کس قدر حصہ لیا۔ اور اس کے مقابلہ میں سامتس نے اپنے مختصر عہد میں کیا کر دکھایا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچے گا کہ اس تقابل میں شان و فساد نظر آرہی ہے۔ حالانکہ واقعات و حقائق کی جو فہرست ہم نے گذشتہ اوراق کے ذریعہ سے پیش کی ہے وہ نہایت ہی غیر مکمل اور ناقص ہے۔ ہم نے فنون نوشت و خواندگی کی ترویج کی بدولت مدارس عامہ کے ذریعہ سے تعلیم کی اشاعت اور کتب بین جماعت کے روز افزون اضافہ۔ اخباروں اور تنقیدی رسالوں کے ذریعہ سے عام رائے کی تولید و اخبار نویسی کی بڑھتی طاقت ڈاکٹرانہ اور سستے محصول ڈاک کے ذریعہ سے فائلی اور عام خبروں کی اشاعت اور اخباری اشتہاروں کے شخصی اور عمرانی فوائد کا ذکر نہیں کیا۔ ہم نے یہ نہیں بتایا کہ پیرس کے ہسپتال کے بعد جو پہلا شفا خانہ تھا عام شفا خانے قائم ہو گئے۔ قید خانوں میں اصلاح کی گئی۔ مجرموں کے لئے دارالاصلاح اور غیر مستطیع لوگوں کے لئے عملی خانے کھولے گئے۔ نہرین قیصر کی گئیں۔ حفظان صحت کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مردم شماری کا انتظام کیا گیا۔ ہم نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ انطبوع حرارت مسبوکہ یعنی سیسے کے حرارت کو جاکر چھاپنے کی ایجاد کیونکر ہوئی۔ ٹلو رائن سے کپڑا سفید کرنے کی ترکیب کب معلوم ہوئی۔ روئی سے بنولے جدا کرنے کی اور پارچہ بانی کے پتلی گردن کی وہ حیرت انگیز ایجادات جنہوں نے کپڑے کا نرخ بے حد سستا کر کے انسان کی جسمانی صفائی آسان اور صحت پر اضافہ کر دیا ہے۔ کس طرح عمل میں آئیں۔ ہم نے طب و جراحی کی عظیم الشان ترقیات علم ابدان کی جدید معلومات۔ فنون لطیفہ کی تحریک۔ فلاح اور اقتصادیات دیہی کی ترقی۔ کیمیاء و کھادوں اور ذراعتی ملکوں کے رواج۔ لوہے کی ساخت اور اس کو وسیع کارخانوں اور نیز الاراع و اقسام کے ریشمی ادنیٰ اور سوئی کپڑوں کے کارخانوں کے قیام۔ عجائب و غرائب متعلقہ علم حیوانات و آثار قدیمہ میں نواور و عجائبات کی فراہمی پر ایک سطر لکھ نہیں سکتے۔ ہم نے اس اہم مضمون کو بالکل ہی قلم انداز کر دیا ہے کہ کلیں کیونکر خود بخود تیار

ہونے لگیں اور پھر پڑا ہونے اور رندہ پھیرنے کے ان آلات متحرک اور نیزہ دوسرے آلات کا مطلق حال نہیں لکھا جن کے ذریعہ سے انجنون کی تیار می ہند سائنس کے ساتھ عمل میں آنے لگے۔ ہم نے کافی طور پر نیل سے بحث کی ہے نہ تار برقی سے نہ علم حساب سے نہ تھر کے چھاپہ سے نہ ہوا کشی کے نل سے نہ برقی بطری سے نہ سیارہ یونیورس یا چیمپون کے اکتشاف سے۔

نہ سو سے بھی اوپر چیمپون کی تحقیقات سے۔ نہ شہابہ مثالیہ اور مدار تارون کے باہمی تعلقات سے۔ ہم ان علمی مہمت کی توضیح کے حق سے عہدہ برا نہیں جو اسکے جو مختلف حکومتوں کی طرف سے براہ منشی و تری ہیئت و جغرافیہ کے مختلف اہم مسائل کے حل کرنے کے لئے جا سجا

بیمچی گئیں اور نہ ان پیش بہاد کا مل اعیار تجربوں کی شرح کیفیت ہی ہم نے قبلہ کی ہر جوان حکومتوں کے ایسا سے طبیعات کے اصولی نکات کی لغین کے لئے عمل میں لائے گئے۔ ہم نے انیسویں صدی تک کی بعض عظیم الشان علمی فتوحات کی طرف اشارہ تاک نہیں کیا۔ علم الوجودات کے متعلق اس صدی کے محققین کے مہتمم بالشان قصورات۔ مقناطیسی اور کھربائی حقایق کی دریافت فن فوڈ گرافی (عکاسی)، الکتش ایجاد۔ فلکیات کے متعلق تجزیہ ایوان لور سکوس کا استعمال فن کیمیا کو ایوڈ گڈ و یائل ویرٹ اور چارٹس کے قوانین تلمذ کے تابع کرنے کی کوشش۔

غیر ذوی الامضاء مادہ سے مصنوعی طور پر اجسام ذوی الاعضاء کی تولید جس کے فلسفیانہ نتائج کی اہمیت میں کلام نہیں۔ علم ترکیب حیوانات و نباتات کی بنافن کیمیا پر رکھنے سے اس علم کا استتباب۔ جغرافیائی سیالشی اور سطح زمین کی ہیئت کذائی کے صحیح نقشہ جات کی ترتیب۔ لوبی التقویب بند و قون اور آہن پوشش جہازوں کی تیاری۔ فن حرب کے انقلابات و قون کے حق میں اس آہ خیر و برکت یعنی سینے کی کل کی ایجاد۔ صنایع و بدایع کی کرشمہ ریزی۔ دنیا کے مہر گیر سیلون کی رونق اور صنعت و دستکاری کی نمایشون کا افتقاد۔ یہ وہ اصمہ میں جن پر ہم نے قلم تک نہیں اٹھایا۔

ایجادات و اکتشافات علمیہ کی جو فہرست ہم نے اوپر درج کی ہے اگرچہ وہ بادی النظر

میں طویل نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طوالت پر بھی نہایت ہی موجز و مجمل بلکہ ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھنے سے ہماری نگاہ سرسری طور سے اُس عقلی بل چل پر جا پڑتی ہے جس کی شورش میں روز افزون اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا ایک فانوس نیالی ہے جس کے مثالی نقشِ نظر کے سامنے گزرتے جاتے ہیں۔ اس علی و ادنی سرگرمی کا مقابلہ جب ازمنہ وسطیٰ کو سکون و وجود سے کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

اس ان تھک سرگرمی کے چاروں طرف جو عقلی لور پھیلا ہوا ہے اُس نے بنی نوع انسان پر بے شمار برکتیں اور رحمتیں نازل کی ہیں روس میں اس کی وجہ سے کاشتکار طبقہ کے وہ اٹھو نو فوس آزاد ہو گئے جو مالکانِ اراضی کے پشتینی غلام تھے۔ امریکہ میں اس کی بدولت چالیس لاکھ حبشی غلام آزاد ہو گئے۔ بجائے اُس نہیں ملی خیرات کے جو خالقِ خدا یا دہر سے کچھ ٹکس پر چند ہر نصیبِ فداکت زدہ لوگوں کو مل جایا کرتی تھی اس نے خیراتِ خاصے کے محتاج خاصے اور پستیٰ ^{المنذون} ایک وسیع پیمانہ پر قائم کر دیئے اور محتاجین و غرباء کے لئے قانون بنادیا۔ اس نے طب کو سید سے رستہ پر لگا دیا یعنی مرض کے ازالہ سے دہر بہا بہتر اُس کا وغیرہ ہے۔ فنِ تدبیر مملکت میں اُس نے صحیح علمی اصول قائم کر دیئے اور بجائے اُس قانون کے جس میں عطائیانہ بے تربیتی کی شان نظر آتی تھی ایسے قوانین وضع کئے جن میں یہ اصول منظرِ تھا کہ قانونی چارہ جوئی سے پہلے تمدنی و قحاطہ پر تنوع کے ساتھ تحقیق کی نظر ڈالی جائے۔ انسان کے ارتقاء عقلی میں جو حصہ اس نے لیا ہے وہ اس درجہ نمایان اور کثرت آموز ہے کہ ایشیا کی دیرینہ سال اقوام بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے مستفیض ہونے کی آرزو مند ہیں۔ چین یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مغرب کا جو عمل مشرق پر ہو گا جو اُس کا وہ عمل مغرب پر ہو گا لازمی ہے۔ روم میں جب مختلف دیار و اقصاء کے دیوتا ایک جگہ لا کر جمع کئے گئے تھے تو ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے بت پرستی مٹ گئی تھی۔ اسی طرح آج وسائلِ نقل و حرکت کی آسانیوں نے متضاد و معارض مذاہب کو ایک دھڑلے میں لا آتا رہا ہے اور مسلمان بدو برہمن ایک دوسرے کے مواجہ میں صفت آرا

نظر آتے ہیں پس ضرور ہے کہ ان مختلف مذاہب میں ترقیات اور تبدیلیاں ہو جائیں۔ اس پہلی
نقشہ و مکتبہ کے اثر سے مامون و معنوں صرف سائنس ہی رہے گا اس کے ذریعہ سے کائنات اور
آفرینندہ کون و مکان کا جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ زیادہ تر عظمت و جبروت اور
زیادہ تر ہیبت اور عب کی شان لئے ہوئے ہے۔

جس اصول نے اس تحریک کو زندہ کیا ہے اور جو ان علمی اکتشافات و ایجادات کی روح
و روان ہے وہ تشخص کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اصول بعض دنوں میں آرزوئے دولت
بن کر ظاہر ہوتا ہے اور بعض دنوں میں جن کی طینت شرافت سے نمر کی گئی ہے گناہ عزت
کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس مقام تعجب نہیں ہے کہ یہ اصول سیاسی قوت بن کر اٹھارہویں
صدی میں دو موقعون پر اُن عظیم الشان تمدنی زلزلوں کا محرک ہوا جو تاج مین انقلاب امریکہ و
انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہیں۔ انقلاب اول الذکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پورا ابراہیم
وقت تشخص ہو گیا اور کوئی دن جاتا ہے کہ وہاں یہ اتباع اصول جمہوریت و س کرڈرائس
ہر اُس قید سے آزاد ہو کر جو محض فلاح امن عامہ ہو کامل حریت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔
انقلاب ثانی الذکر نے اگرچہ یورپ بھر کی سیاسی بساط اٹھادی ہے اور اگرچہ حیرت انگیز جنگی فتوحات
اُس کے ہر کابدہی میں پھر بھی اپنے مقاصد کو کامل و مکمل نہیں کیا۔ بلکہ فرانس پر اس کی وجہ
سے رہ رہ کر تباہی اور بربادی آئی ہے۔ فرانس کی دو عمل حکومت نے جو دینی و دینی و فرما
کی اطاعت و ابرادان کا جو اُس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہے اُسے اگر موجودہ ترقیات کا
ایک پہلو سے حلیف بنایا ہے تو دوسرے پہلو سے حریف کر دکھایا ہے۔ ایک ہاتھ سے
اُس نے عقل کے سر پر تاج رکھا دوسرے ہاتھ سے اُس نے سنبھا لیتے ہوئے پاپا کو سنے
سرے سے سنبھالا۔ اس تناقض کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی
تمام اولاد و وطن پر یہاں تک کہ ادنیٰ گنہگار کو بھی سچی تعلیم نہ دے۔

انقلاب فرانس نے موجودہ آراء پر جو عقلی حملہ کیا اُس میں سائنس کی طاقت صرف نہیں

کی گئی تھی بلکہ ادب کی۔ اس میں انتقاد و مبادیات کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن سائنس پر البادہی
 انظم کی تعریف کبھی صادق نہیں آئی۔ اُس نے ہمیشہ مدافعت پہلو اختیار کیا ہے اور حریف کو بروک
 ٹوک حملہ کرنے کا کمال فراخ حوصلگی موقع دیا ہے۔ پھر بھی ادب کا حملہ اس قدر خطرناک نہیں
 ہے جس قدر سائنس کا۔ اس لئے کہ انشا پر د از می ایک مقامی شے ہے اور سائنس عالمگیر
 و جمہ گیر ہے۔

اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ سائنس کی ذات سے تمدن جدید کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور
 اُس نے بنی نوع انسان کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں کس قدر حصہ لیا ہے تو اس کا
 جواب ہمیں اُسی طرح ملے گا جس طرح اس سوال کا جواب ملتا تھا کہ لاطینی نصرانیت نے انسان
 اور اُس کے موجودہ تمدن کو کیا نفع پہنچایا ہے۔ جن ناظرین نے اوراق گذشتہ پر نظر سمان بڑا لی
 ہے وہ اس نتیجہ پر لا محالہ پہنچے ہوں گے کہ ضرور ہے کہ ہمارے ابا نے جس کی حالت میں
 اصلاح واقع ہوئی ہو لیکن جب ہم اس نتیجہ کو شمار و اعداد کے معیار سے جانچتے ہیں تو اس میں
 شان تبیین و تحکیم پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کے مسائل اور مذہب کی اشکال کا اثر اگر بنی نوع
 انسان پر دیکھنا مطلوب ہو تو درم شامی کی پرتون کی ورق گردانی کرنی چاہئے۔ لاطینی نصرانیت
 ہزار سال میں یورپ کی آبادی دگنی نہ کر سکی۔ اور انفرادی زندگی میں بھی کوئی نمایاں اضافہ اس کو
 عہد میں نہ ہو سکا۔ لیکن ڈاکٹر جاردوس کی رپورٹ سے جو اُس نے مسیحی سٹس کی مجلس حفظ صحت
 کے ملاحظہ میں پیش کی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اصلاح کینہ کے وقت جنوا میں انسداد کی عمر کا
 اوسط ۲۱ سال تھا۔ ۱۸۱۷ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیان ۴۰۲۶۸ ہو گیا۔ تین سو سال پہلے جنوا

آہلی ہالیں برس زندہ رہتے تھے اتنے آج کل ستر برس کی عمر کو پہنچنے میں ۱۷۹۳ء میں
 گورنمنٹ انگریزی کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑی۔ یہ ضرورت اس طرح پوری گئی کہ اوسط
 مدت عمر کے حساب سے ہر شخص کے لئے وظیفہ سالانہ مادام الحیات مقرر کیا گیا اور یہ وظائف
 سین ٹیر خواگی سے لے کر اوسط سن عمر تک کے اشتخاص کے ہاتھ بوض ایک خاص رقم کے

سیچ ڈالے گئے۔ اس انتظام میں فائدہ گورنمنٹ ہی کر رہا تھا تو سے سال بعد وظایف کا ایک جدید سلسلہ گزشتہ صدی کے اوسط معیار حیات کی توقع پر جاری کیا گیا۔ لیکن وظیفہ خواران دور ثانی نے اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں اتنی زیادہ عمر پائی کہ گورنمنٹ کو لینے کے دینے پڑ گئے اور یہ قرضہ بہت ہی گرانباز ثابت ہوا۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ وظیفہ خواران قرضہ اول میں سے ذکر و امانت دو ٹون جنوں کے دس ہزار اشخاص اٹھائیس سال کو پہنچنے سے پہلے مر گئے لیکن ایک صدی بعد جب دوسرے قرضہ کے وظائف جاری کئے گئے تو اسی عمر کے صرف پانچ ہزار سات سو بہتر مردوں اور چھ ہزار چار سو سولہ عورتوں نے وفات پائی۔

ہم روحانیات کا جسمانیات کے ساتھ اور نفسیات کا واقعات کے ساتھ مقابلہ کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ اقوال جن کا اتباع قرون اولیٰ و آخریٰ میں کیا گیا رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ زمانہ سابق میں جو مقولہ واجب الاتباع سمجھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ ”جہالت زہد و التقویٰ مان ہے۔“ دور آخر میں جس مقولہ پر عمل ہوا اُس کے الفاظ یہ ہیں ”علم اور طاقت مترادف ہیں۔“

بارہواں باب

خطرہ کی آمد آمد

زمین کے جتنے خطرہ ہوئے ان کی قریب الوقوع علامات، لکھیا گئے ردواجو نصرانیت کا رکن، لیکن ہیں ان علامات کو پہچان کر آئے والے خطرہ سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے۔ پاپائی پائس تاسع مجلس عرصیہ مسیحیہ منعقد کرتا ہے۔ مختلف دول یورپ کے تعلقات پاپائیت کے ساتھ لکھیا کے تعلقات سائنس کے ساتھ حسب تصریح مندرجہ مکتوب عمومی و تلمیض پاپائیہ۔

دینیکین کونسل کے فتوے عصمت پاپا کے متعلق اور نیز دربارہ سائنس۔ کونسل کے فیصلہ کا خلاصہ۔ حکومت پر دتھیا اور پاپائیت کی سٹ بھیڑ۔ یہ مقابلہ تفوق اور غلبہ کے حصول کے لئے در اہل سلطنت اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ یورپ میں دو عملی حکومت کا اثر۔ دینیکین کونسل کا اعلان اس امر کے متعلق کہ پاپائیت سائنس کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ روس کی تھو لک زمین کی تعمیر ساخت۔ خدا اہام ایمان اور عقل کے متعلق اس کی تعریفات۔ اس کا سبب دشمن۔ تمدن جدید پر اس کی کئے۔ جماعت اتحاد انجیلیہ فرقہ پر اٹھنٹ اور اس کے فیصلہ جات۔

سابق الذکر فیصلہ جات وقتا و عملی پر ایک عام نظر۔ مسئلہ زیر بحث کی موجودہ د آئندہ صورت۔

جو شخص مسیحی دنیا کے موجودہ رجحان خیال سے آگاہ ہے وہ اس واقعہ کے اخفا پر قناد نہیں ہو سکتا کہ نصرانیت ایک عقلی و مذہبی بحران میں مبتلا ہوا چاہتی ہے۔

ہر طرف سطح تیرہ و تار نظر آ رہا ہے۔ طوفان کی آمد آمد کا شور کاؤن میں پڑ رہا ہے۔ جرمنی میں قومی جماعت عقاید ماوراء الجبال (یعنی پاپائی مذہب) کی مخالفت پر کربا نہ ہے کھڑی ہے۔ فرانس

میں ترقی یافتہ طبقہ انسانے جمہور کے ساتھ دست و گریبان دکھائی دیتا ہے اور اس کشمکش میں اس دولت عظیم الشان کی سیاسی فوقیت بے اثر بلکہ زایل ہو چلی ہے۔ اٹلی میں روما پر ایک ایسا فرمان روا قابض ہے جو کلیسا سے خارج کیا جا چکا ہے۔ پاپا کو مقدس اس حیلہ کی آڑ میں نہ کر کہ آپ قید میں ہیں اپنے قصر دیشیکن سے حریت پر ملاعن و ملاءعن کی چوچھاڑ کر رہے ہیں اور باوجود اس کے آپ کی غلطیاں اور خطائیں بر لایل قاطع و براہین ساطع ثابت ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی برابر یہ بڑے لگائے جاتے ہیں کہ آپ معصوم عن الخطا ہیں۔ ایک رومن کیتھولک اسقف سچ کہتا ہے کہ اہل یورپ علانیہ طور پر نصرانیت سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں اہل مذہب نہایت بدحواسی کے ساتھ یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ میں آج کل کچھ ایسی ہوا چل رہی ہے کہ مذہب کی عقل بنیاد منہدم ہوئی جاتی ہے۔ آنے والی تباہی کا وہ جس طرح بن پڑے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایک قوم پر وہ وقت بڑی آزمائش اور امتحان کا ہوتا ہے جب وہ مذہبی پابندیوں کی کنپھل جسم سے اتارتی ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ زمین بتاتی ہے کہ یہ وقت کیسا سوکھا ہوتا ہے اور آتش کیسے کیسے خطرات عظیم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب سدا ایک حالت پر نہیں رہتے۔ ان بن انسان کے عقلی نشوونما کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ایسے کتنے ملک ہیں جن کا مذہب وہی ہے جو مسیح کی ولادت کے وقت تھا؛

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یورپ کی کل آبادی تیس کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں سے اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ رومن کیتھولک ہیں اور تین کروڑ تیس لاکھ یونانی کیتھولک۔ پرائسٹنٹ سات کروڑ دس لاکھ ہیں جو بہت سے فرقوں میں منقسم ہیں۔ یہودیوں کی آبادی پچاس لاکھ ہے اور مسلمان کی ستر لاکھ۔

امریکہ کی مذہبی تقسیم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ عام جنوبی امریکہ کی ایسی آبادی کا مذہب رومن کیتھولک ہے۔ وسطی امریکہ۔ میکسیکو۔ اسپین اور فرانس کے غریب الہندی مقبوضات کی نسبت بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ اور کینیڈا میں پرائسٹنٹ آبادی کی اکثریت ہے۔

کی حیثیت محض باغیانہ ہے لہذا اُس کو کوئی حق حاصل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ پراٹھنٹ جماعتوں کا جائز اور حقیقی روحانی پیشوا کیتھولک اسقف ہی ہو سکتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ نصرانیت کے پیروں کا جزو غالب کیتھولک ہے۔ اور پاپائیت کا یہ مطالبہ کہ اُسے مسیحی دنیا کی اعلیٰ ترین طاقت تسلیم کیا جائے تحکمانہ اصرار کی ایسی شان لئے ہوئے ہے کہ مسیحی دنیا کی موجودہ مذہبی حالت پر نظر امتقاد ڈالتے وقت اس کے فیصلجات و فتاویٰ کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ پاپائیت کو طرز عمل میں اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تدبیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ کیتھولک فرقہ ایک شخص کے احکام کی تعمیل کرتا ہے لہذا اس کو وہ اتنا کتناز اور اقتدار حاصل ہے جتنا پراٹھنٹ جماعتوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس کے علاوہ روما کا بڑا نام اپنی شان و ادب کا رکن کے ساتھ اس کا پشتیبان ہے۔

پاپائیت نے تامل و تذبذب سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اُس عقلی خطرہ کے ہر پہلو پر غور کیا ہے جو کوئی دم میں ظاہر ہوا چاہتا ہے۔ اور جو فیصلہ اُس نے اس بار دین صادر کیا ہے۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو بزعم خود اپنے حریف پر پورا غلبہ حاصل ہے۔ یہ فیصلہ گزشتہ وینیکن کونسل کے اجلاس کی رویداد کے معائنہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ پاپائی پالسن تاسع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۲۹ جون ۱۸۶۵ء روم میں ایک مجلس عمومی انعقاد کی تحریک کی۔ اس مجلس کا اجلاس ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو شروع ہو کر جولائی ۱۸۷۰ء میں ختم ہوا۔ منجملہ دوسرے مسائل کے جو اس مجلس میں بغرض غور پیش ہوئے۔ دو امور نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ پاپاے روم معصوم ہے دوسرا یہ کہ مذہب کا تعلق سائنس کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔

لیکن اس مجلس کا انعقاد عام دھنامندی کے ساتھ نہ ہوئے پایا۔ مشرقی کلیساؤں کی رائے زیادہ تر اس کے خلاف تھی۔ اُن کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پاپا نے روم نصرانیت کی پیشوائی کا منصب اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے حالانکہ اُن کی رائے میں حضرت یسوع مسیح ہی کلیسا کے سردار ہیں۔ اُنھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مجلس کے

انفعاذ کا نتیجہ جو اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ نئے فساد اور نئی خرابیاں اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ ان محترم کلیساؤں کے خیالات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۶۶۷ء میں کلدانی بطریق نے منطوری بطریق سائین کو رومن کیتھولک اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اُس نے یہ جواب دیا: "آپ چاہتے ہیں کہ میں اسقف روما کی پاپوش کو بعد عجز بوسہ دوں لیکن یہ تو فرمایئے کہ کیا وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک انسان نہیں ہے؟ کیا وہ عزت و آبرو میں آپ سے بڑھ کر ہے؟ ہم اس بات کو کبھی جائز نہ رکھیں گے کہ ہمارے مقدس معابد میں مورتوں اور مجسموں کی پرستش ہو اس لئے کہ ان کی پرستش ناپاک اور ذلیل بت پرستی کی ہم معنی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی طرح ہم بھی اس عقیدہ کے پیرو ہو جائیں کہ خدائے قدیر انسان کی طرح مان کے بطن سے پیدا ہوا؟ حضرت یہ کفر آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمیں تو اس سے سات رکھا جائے۔" اس جواب نے ثابت کر دیا مشرق اور مغرب کا اتحاد محال ہے۔

بالآخر اطراف و اکناف عالم سے جو بطریق صدر اسقف اور اسقف آکر اس مجلس عمومیہ میں شریک ہوئے ان کی مجموعی تعداد سات سو چار تھی۔

روما کو اپنی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ سائنس نہ صرف پاپائی عقاید کی جلد جلد جڑہ کاٹ رہا ہے بلکہ یاسی قوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ یہ واقعہ اُس سے چھپا ہوا نہ تھا کہ یورپ بھر میں تعلیم یافتہ اشخاص مذہب سے قطع تعلق کر رہے ہیں اور اس اعتزال کا مرکز اصل جرمنی کا شمالی علاقہ ہی ہے پس جب جرمنی اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی تو اُس نے اس جنگ سے نہایت دلچسپی ظاہر کی اور بقدر امکان آسٹریا کا حوصلہ بڑھایا۔ لیکن معرکہ ساؤدووا کے نتیجے میں اُس کی امید کو تبدیل ہو یا یو سی کر دیا۔

اس کے بعد جب فرانس اور جرمنی میں لڑائی ہوئی تو پاپائیت کو پھر تھوڑا سا اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اُس کو ذرا شک نہ تھا کہ فتح فرانس کو حاصل ہوگی جس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا خود اُس کی فتح ہوئی۔ لیکن جنگ سیدان نے دوبارہ اُس کی امیدوں کا خون کر دیا۔

اب چونکہ کسی سال کے لئے اُس کی امید دن کے احیا کی کوئی صورت نہ تھی لہذا اُس نے ہتھ کر لیا کہ جرمی مین بغاوت کر دی جائے۔ چنانچہ آج کل اس سلطنت میں جو گل کھل رہے ہیں وہ حضرت پاپا کی رومانی کی چمن آرائی کے کرشمے ہیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر آسٹریا یا فرانس کو کامیابی نصیب ہوتی تو پروشیا کے تخت پر اسٹنٹ مذہب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

اس جنگ کشاکش کے ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی بروئے کار لایا گیا جس کا تعلق ذہنیات کے ساتھ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ازمندہ دسلی کے سالخورہ و فرسودہ عقاید و مراسم کے احیا کی تدبیر کی جائے اور انہیں افراط کی حد تک پہنچایا جائے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو چنانچہ نہ صرف اس ادعا کا علم بلند کیا گیا کہ پاپائیت کو تمام ممالک کی دنیوی حکومتوں میں نلی السویہ شریک ہونے کا ربانی حق حاصل ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ رومانی برتری اور نوعیت واجب الاعتراف ہے اور مسائل ماہ النزاع میں دنیوی حکومت کو اُس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ پاپائیت کے خطرہ میں پڑنے کا باعث سائنس کی ترقی ہوئی تھی لہذا اُس نے کمال شوخ چٹھی دبلے ہاکی کی راہ سے سائنس کی حد بندی کر دی اور اُس کے اقتدارات کی حدود مقرر کر دیں۔ اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمدن جدید کو بھی مردود و مطرود قرار دینے کی خدمت سنبھالنے لگی۔

جب پاپا کو مقدس سالہ ۱۸۷۰ء میں گیشا سے مراجعت منسرا ہوئے تو ان منصوبوں پر

۱۷ جنوری ۱۸۷۱ء کا ایک شہر ہے جو لب ساحل رومانیہ میں ۶۰ میل جانب جنوب و مشرق اور نیپلز سے پینتالیس میل جانب شمال و مغرب واقع ہے۔ یہ شہر نہایت قدیم ہے اور رومن سلطنت کے زمانہ سے لے کر آج تک اس نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں۔ مسلمانوں نے نویں صدی میں اس کا محاصرہ کیا تھا ۱۰۷۱ء میں اس پر اسپین کا قبضہ ہوا۔ اُن سے ۱۴۹۹ء میں فرانسیسیوں نے چھینا۔ پاپائی پائس تاسع جن کا ذکر متن میں رومانیہ سے نکال دئے گئے تھے اور گیشا میں اُنہوں نے پناہ لی تھی ۱۸۷۰ء میں فرانسیسیوں کی مدد سے

غور شروع ہوا اور جیڈوٹ فرقة کے مشورہ پر انہیں عمل میں لانے کا ڈھنگ ڈالا گیا۔ یہ فرقة اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ دزدانہ ممکن کو ممکن کر دے گا اور پاپائیت کی بڑھی ہڈیوں میں جوانی کا کس بل پیدا کیا جاسکے گا۔ غرض پاپائی گزٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ گلیڈیا بمقابلہ حکومت آزاد و خود مختار مطلق ہے۔ اساقف پاپا کے مطیع ہیں۔ اساقف کی فرمان برداری ان کے ماتحتین پر واجب ہے۔ پرائسٹنٹ جیڈون کا فرض ہے کہ عبادہ ارتداد و دہریت سے محفوظ ہو کر اُس گلد میں شریک ہو جائیں جس سے جدا ہو کر وہ بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مسالمت و رواداری کئی شکل میں کسی طرح جائز نہیں۔ ماہ دسمبر ۱۸۵۳ء اساقف کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں پاپا نے عقیدہ جبل پاپائیت کا اعلان کیا۔ اسکو دس سال بعد وہ فراہم پاپا کی طرف سے جاری ہوئے مکتوب عمومی اور تلخیص کے نام سے مشہور ہیں۔

مکتوب عمومی کی تاریخ اجرا ۸۔ دسمبر ۱۸۵۳ء ہے۔ اس کا مسودہ بڑے بڑے عالم پادریوں نے مرتب کیا تھا اور ہولی آفس (دفتر مقدس) کی مجلس انتظامی نے اس پر کچھ بحث کی تھی۔ اس کے بعد یہ اساقف کے پاس بھیجا گیا تھا اور سب سے آخر میں پاپا نے کر دینا لون کے ساتھ مل کر اس پر نظر ثانی کی تھی۔

تمدن جدید پر اس مکتوب میں جو لے دے کی گئی تھی اُس سے بعض پادریوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض کر دینال بھی اس کے ساتھ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جمع ہوئے۔ کیتھولک اخباروں نے اس کی اشاعت کی تو سہی لیکن بہت ساف داریاب۔ پرائسٹنٹ حکومتوں نے اگرچہ اس کی مزاحمت نہ کی لیکن کیتھولک حکومتوں کو اس نے مضطرب و سرسیمہ کر کے مضطرب میں ڈال دیا۔ فرانس نے اس کے صرف اُس حصہ کی اشاعت کو روک دیا

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۵۔ انہوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا اور مراجعت فرما سے رد ہوئے

جو جوبلی کے اعلان سے متعلق تھا۔ آسٹریا اور اٹلی نے اسے شایع ہو جانے دیا لیکن سرکاری طور پر منظور نہ کیا۔ کیتھولک ممالک کے اخبارات و رسالجات اور مجالس وضع آئین و قوانین کی طرف سے اس پر نکتہ چینی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے یہ تاہم یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کی وجہ سے کلیسا اور موجودہ تمدن کا اختلاف بہت بڑھ جائے گا۔ اور تو اور اسپین تک میں بعض اخبارات ایسے تھے جنہوں نے ان الفاظ میں اپنا افسوس ظاہر کیا کہ ”در بار پاپا سے رومانے تمدن جدید کو بدنام کرنے اور اُس پر نفرین پہنچنے میں نہایت ہٹ دہرمی اور کورسوادمی کا ثبوت دیا ہے۔“

اس مکتوب نے آزادی ضمیر و آزادی ایمان پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے:-
 ”یہ عقیدہ نہایت ہی خطرناک بلکہ مجبوزمانہ ہے کہ آزادی ضمیر و آزادی پرستش کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور ہر شایعہ سلطنت میں اس حق کے اعلان اور نگہداشت کا ذمہ دار قانون کو ہونا چاہیے اور نیز یہ کہ عامہ خلافت کا ارادہ جو اُس طریقہ سے جسے عام رائے کہا جاتا ہے یا دوسرے ذرائع سے ظاہر ہو ایک اعلیٰ قانون ہے جو تمام ربانی یا انسانی حقوق کی قید سے آزاد ہے۔“ والدین کے اس حق کی بھی اس مکتوب میں نفی کی گئی ہے کہ وہ کلیسا کے رومن کیتھولک کی حدود سے خارج ہو کر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ اُن گستاخ و بے ادب لوگوں پر اس مکتوب میں نفرین کی گئی ہے جو ازراہ جسارت کلیسا اور پاپائی منصب کے اُن پیشوایانہ اقتدارات کو ”دنیوی حکومت کے تابع کرنا چاہتے ہیں جو خداوند یسوع مسیح کا عطیہ ہیں۔“ تقدس اب جناب پاپا نے مکتوب عمومی کے مکتوب الیہم یعنی اپنے محترم برادران دینی کو ہر وقت عبادت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور حسب ذیل تالیسی الفاظ سے اس تاکید پر مزید اضافہ فرمایا ہے۔ ”اس غرض سے کہ خداے تعالیٰ زیادہ آسانی سے ہماری اور آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے ہمیں چاہیے کہ کامل سچائی اور خلوص کے ساتھ خدا کی مان مریم عذرا سے مدد مانگیں جو ہمارے اور اُس کو درمیان بمشکل ایک وسیلہ

کے ہیں۔ اور جو اپنے اکلوتے بیٹے خذادند یسوع مسیح کے دہننے ہاتھ پر زین روا
اڑھے اور مختلف زیورات پہنے ہوئے بطور ملکہ کے جلوہ فرما رہیں۔ اس لیے
کہ کوئی مراد ایسی نہیں جو آسمان کی ملکہ کے توکل سے پوری نہ ہو سکے۔“

صاف ظاہر ہے کہ پاپائی طرف سے جس اصول کا اب اعلان ہوا اُس کا لازمی نتیجہ
یہ تھا کہ جن حکومتوں کے تعلقات باپائیت کے ساتھ اب تک مرا نقانہ و مصالحانہ تھے
وہ بھی اس کے مخالف ہو جائیں۔ روس میں بہت بڑی ناراضی پھیل گئی اور جو واقعات
اس کے بعد پیش آئے اُن کے لحاظ سے جناب تقدس تاب نے ایک تہدید آمیز فرمان
نومبر ۱۸۶۶ء میں صادر فرمایا جس کا جواب گورنمنٹ روس نے یہ دیا کہ اُس معاہدہ کو جو ۱۸۶۶ء
میں دربار روما اور دولت روس کے درمیان قرار پایا تھا فسخ و کالعدم کر دیا۔

جنگ ساڈووا (جولائی ۱۸۷۶ء) کے نتیجہ کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر
باوجودیکہ یہ ظاہر تھا کہ تمام یورپ کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے۔ خصوصاً وہ تعلقات جو باپائیت
کو دول یورپ کے ساتھ تھے اپنے حال پر قائم نہیں ہیں۔ پاپا نے بتاریخ ۲۷ جون
۱۸۷۶ء ایک فرمان جاری کیا جو مکتوب عمومی اور تلخیص کا مصدق و موثق تھا۔ اس کے
ساتھ ہی اُس نے ایک مجلس عمومیہ کے انعقاد کا بھی قصد ظاہر کیا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے
ہیں۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی بتاریخ ۲۹ جون ۱۸۷۶ء انقصاد مجلس کا اطلاع نامہ جاری
کیا گیا۔ لیکن اب آسٹریا کے ساتھ چپقلش ہو پڑی۔ آسٹریا کی پارلیمنٹ نے جو قوانین جاری
کیے تھے اُن کی رو سے سلطنت کے تمام باشندوں کا درجہ ملکی حقوق کے لحاظ سے
مساوی قرار دیا گیا تھا اور مکیلیا کے اقتدارات محدود کر دئے گئے تھے اس پر پاپائی
گورنمنٹ کی طرف سے اعتراض ہوا اور آسٹریا کو بھی روس کی طرح مجبوراً وہ معاہدہ جو ۱۸۶۶ء
میں حکومت آسٹریا و دربار روما کے مابین قرار پایا تھا منسوخ کرنا پڑا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے فرانس میں سالم تلخیص کی اشاعت کی اجازت نہیں

دی گئی۔ لیکن پردیشیا چونکہ پاپائیت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لہذا اس کا مزاحم نہ ہوا۔ پاپائیت تو اہل من مزید کے مرض میں مبتلا تھی ہی۔ اس عدم مزاحمت نے مرض کو اور بڑا دیا۔ یعنی علانیہ یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اہل ایمان اپنے مال و جان بلکہ اپنے عقلی عقاید تک کلیسا کی نذر کر دیں۔ پراٹسٹنٹوں اور یونانیوں کو بھی کلیسا سے رد میں کتھولک کی حلقہ گبوشی کی دعوت دی گئی۔

تاریخ مقررہ پر مجلس عمومیہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے مقاصد یہ تھے کہ تلخیص کو قوت سے نسل میں لایا جائے۔ عصمت پاپا کے عقیدہ کی ترصیص کیجائے اور مذہب اور سائنس کے تعلقات صاف صاف بتا دیے جائیں۔ اس بات کی ہر طرح سے تیاری کر لی گئی تھی کہ جو مقام ذہن میں پیشتر سے قائم ہیں ان کی تعمیل و تکمیل ہو کر رہے۔ اسقفوں کو پیش از پیش مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ روم میں بحث کرنے کے لیے نہیں آرہے ہیں بلکہ ان فیصلوں پر صناد کرنے کی غرض سے بلائے جا رہے ہیں۔ جو ایک معصوم و غیر خاطمی پاپا عا در کر چکا ہے۔ آزادانہ بحث کا خیال تک بھی پیش نظر نہ تھا۔ مجلس کے کسی اجلاس کی روداد کے معائنہ کی کسی کج اجازت نہ تھی۔ ان اساقف کو جن کا تعلق محض ایک رسمی ضابطہ کی تکمیل کے لیے فریق اختلاف سے تھا بات کرنے کا موقع تک نہ دیا گیا۔ تاریخ ۲۲۔ جنوری سنہ ۱۸۷۸ء اس معنوں کی درخواست مجلس میں بغرض تصفیہ پیش ہوئی کہ عصمت پاپا کی تعریف کیجائے۔ اس کے مقابلہ میں جماعت اقلین کی اختلافی درخواست پیش ہوئی۔ اس پر اقلین کو مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی اور ان کی آرا کی اشاعت کے متعلق بھی حکم امتناعی جاری کیا گیا۔ اگرچہ یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جماعت اکثرین فریقین مباحثہ کا اس حد تک جزو غالب ہو کہ جماعت اقلین پر پوری طرح سے چھا جائے لیکن پھر بھی مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ ایک حکم اس معنوں کا جاری کیا جائے کہ کسی تحریک کی منظوری کے لیے یہ ضروری نہیں کہ غلبہ آما اتفاق کامل کے قریب قریب پہنچا ہو ابو بلکہ محض کثرت رائے کافی ہوگی۔ جماعت اقلین کی آراء کے مخالفت کی مطلق پروا نہ کی گئی۔

مجلس نے اپنے مقاصد کی تکمیل پر جب اس قدر زور دیا تو دول خارجیہ کے حکام کو اس کی اس غیر مل اندیشہ کار روانی نے مایم و سر اسیمہ کر دیا۔ دانا پایہ تخت آسٹریا کے صدر اسقف نے پاپا کی خدمت میں ایک محضر روانہ کیا جس پر بہت سے کردینا کو اور صدر اسقفون کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں جناب تقدس تاب سے التجا کی گئی تھی کہ مسئلہ عصمت کو معرض بحث میں نہ لائیں۔ اس لیے کہ کلیسا آج کل ایسی کشمکش میں مبتلا ہے جس کا گذشتہ زمانے میں وجود نہ تھا اور اسکو ایسے حریفوں سے ہلا پڑا ہے جو سرے سے مذہب ہی کے دشمن ہیں اور اسے فطرت انسانی کے لیے سم تمل سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جب کہ کیتھولک اقوام کی نیت اعدا اور معاندین کی منصوبہ باز یون سے ڈانڈا ڈول ہو رہی ہو ان کو ایسے عقاید کے تسلیم کرنے پر مجبور کرنا جو ٹرسٹ کی کونسل کے سلسلہ عقاید پر مستند اور ان قرین مصلحت نہ ہو گا۔ اس محضر میں یہ عبارت بھی درج تھی کہ مسئلہ عصمت پاپا عن الخطا کی تعریف جن الفاظ میں کرائی جاتی ہے وہ دشمنان مذہب کے ہاتھ میں ایک اور زبردست حربہ دے دیے گئے۔ جس کا اثر یہ ہو گا کہ وہ لوگ بھی جو بلحاظ عقاید افضل الناس ہیں کلیسا کی رو سے کیتھولک کو ان بنویون کے اعوا سے برا سمجھنے لگیں گے۔ وزیر اعظم آسٹریا نے ایک انتہائی تحریر کے ذریعہ سے دربار پاپا کو اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ ہر ایسی کارروائی کا خمیازہ دربار موصوف کو پہنچنا پڑے گا جو آسٹریا کے حقوق میں تصرف و اندازی کا موجب ہوگی۔ فرانسیسی گورنمنٹ نے بھی ایک یادداشت پاپا کی خدمت میں بھیجی جس میں یہ قریک کی گئی تھی کہ ایک فرانسیسی اسقف کو مجلس کے اجلاس میں فرانس کے حالات پر بحث اور اس کے حقوق کی حمایت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس کا جواب پاپا کی گورنمنٹ نے یہ دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا اسقف سفارت کی خدمات بھی انجام دے اور مجلس کی رکنیت کے مقدس فرائض سے بھی سبکدوش ہو سکے۔ اس پر فرانسیسی گورنمنٹ نے ایک مودبانہ عرضیہ کے بیج

سے گزارش کی کہ امید ہے کہ حضرات اس وقت کسروانکسار کے اصول کو پیش نظر رکھ کر اور جنابِ بابا سے مقدس احتیاط و عاقبت شناسی کو کام فرما کر غلو آمیز شخصی آراء کو مذہبی عقاید کی فہرست میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ توقع بھی ظاہر کر دی کہ دینی حکومت کی بیجا مداخلت اور دست اندازی سے اُس کے مدنی و سیاسی قوانین کو کیتھولک فرانسیسیوں کی عقل سلیم اور حب وطن محفوظ رکھے گی۔ اس مخالفت میں شمالی جرمنی کی "کانفیڈریشن" (انجمنِ اتحاد) بھی شریک ہو گئی اور ہر طرف سے بابا کی گورنمنٹ پر دباؤ ڈالا گیا۔

۲۳۔ اپریل کو دان آرنم سفیرِ پروشیا نے دارو سفیرِ فرانس کے ساتھ ملکر بابا کی خدمت میں یہ تحریک پیش کی کہ قرونِ متوسطہ کے خیالات کا احیاء بعد از مصلحت ہے۔ اس وقت اقلین نے یہ نہ پا کر مطالبہ کیا کہ مسئلہ عصمتِ بابا کے تصفیہ سے پہلے دینی اور دنیوی حکومتوں کے تعلقات کا تعین کر دیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا بھی تصفیہ کر دیا جائے کہ آیا مسیح نے سینٹ پیٹر اور اُس کے جانشینوں کو بادشاہوں اور شہنشاہوں پر اقتدار عطا فرمایا ہے یا نہیں۔

لیکن اس تحریک پر مطلق التفات نہ کی گئی یہاں تک کہ بحث کے لیے مہلت تک نہ دی گئی۔ فرقہ جیوسٹ کے اراکین جو اس تمام تحریک کے بانی مسابانی تھے اپنی ہر ایک تجویز پر مجبور نہ ہو سکتے تھے۔ حامِ نکتہ چینی سے بچنے کا کوئی ایسا حیلہ نہ تھا جو مجلس نے اختیار نہ کیا ہو۔ تمام کارروائی بازمین کھی گئی۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے اُن سے حلف لے لیا گیا تھا کہ خاموش رہیں گے۔

۳۱ جولائی کو وہ رائے لی گئیں۔ ۶۰۱ آرا میں چار سو اٹھاون موافق تھیں کثرتِ آراء کے قاعدے کے مطابق تحریک منظور شدہ قرار پائی اور پانچویں دن بابا نے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ وہ معصوم عن الخطا ہے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ یہ وہ دن تھا جبکہ فرانس

نے پردشیا کے خدات اعلان جنگ کر دیا اس کے آٹھ دن بعد فرانسسیسی فوج روم سے ہلائی گئی۔ شاید مدبر اور فلسفی دونوں کو اس کا اعتراف ہو گا کہ اگر عقل سلیم پاپا کو غمخاطر تسلیم کرتی تو مسکمی عصمت ائمہ و ائفاق کا بہت بڑا غمخوار ہو سکتی ہے مگر عقل کو یہ بات باور آئے تو کیونکر آئے۔

اس کے بعد شاہ اٹلی نے اپنی قلم سے ایک خط پاپا کو لکھا جس میں نہایت مودبانہ طور پر ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ امر ضروری ہے کہ شاہی فوجیں بڑھ کر ان مقامات پر قبضہ کر لیں جن کا جناب تقدس باب کی سلامتی اور ملک کو حریفوں کی دست برد سے بچانے کے لئے شاہی قوت کی حمایت میں آجنا مصالح سیاسہ کے مقتضیات سے ہے۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کیتھولک مذہب کا تقدس اہمیت پیشوا اس ضرورت کو تسلیم کرنے سے نہ صرف قومی متناؤں کو پورا کر گیا بلکہ باسٹندگان اٹلی کی ارادت و عقیدت کا مرکز بن کر دریائے ڈانوب کے کنارے اگر چاہے تو ایک ایسی شاندار حکومت قائم رکھ سکے گا۔ جو انسانی حکومت کی اطاعت سے مطلقاً آزاد ہوگی۔

اس کا جواب جناب تقدس باب نے ایک مختصر سے جملے کئے خط میں یوں دیا۔
 ہمیں خدا کا شکر کرتا ہوں جسے حضور کو میری زندگی کے پیالہ کی تلچھٹ میں تلخی کے ملانے کی توفیق عطا کی ہے باقی رہے آپ کے بعض مطالبات سو میں ان کے منظور کرنے سے قاصر ہوں اور ان اصول کی پابندی بھی میرے حیطہ امکان سے خارج ہے جو آپ کے خط میں درج ہیں میں پھر خدا سے استعانت چاہتا ہوں اور اپنا کام اُس کے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اسی کا کام ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ حضور پر اپنی بہت سی برکتیں نازل کرے اور آپ کو خطرات سے بچائے اور آپ پر وہ رحم فرمائے جس کی آپ کو بہت ہی ضرورت ہے۔

شاہی فوج کو بہت کم مزاحمت پیش آئی۔ ۲۰ ستمبر شہر کو اس نے روم پر قبضہ

کر لیا۔ اب ایک عام اعلان جاری کیا گیا کہ مسئلہ اتحاد دولت اٹلی کے متعلق کل باشندگان اٹلی کی رائے بذریعہ قرعہ اندازی لی جائے اس عام قرعہ اندازی کے نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ اٹلی میں لوگوں کا دماغ دینیات کی قیود سے کامل طور پر آزاد ہو چکا ہے اُن صوبہ جات میں جو روپے سے متعلق تھے آراء قابل اندراج کی تعداد ۱۶۷۵۴۸ تھی ان میں سے بہ قدر ۱۳۵۲۹۱ آراء کے قرعہ اندازی ہوئی۔ الحاق صوبہ جات کی تائید میں ۱۳۳۶۸۱ آراء برآمد ہوئے آراء مخالف کی تعداد ۱۵۰۶۰۴ تھی اور ۱۰۳ رائیں ایسی تھیں جو بیخود کر دی گئیں اٹلی کی پارلیمنٹ نے باشندگان رومانی اس متحدہ راسے کو کہ رومانی صوبہ جات کا دولت اٹلی کے ساتھ الحاق کر لیا جائے بغلیہ آراء تسلیم کر لیا۔ ۲۳۹ رائیں اس اعتراض کی موید تھیں اور بیس مخالف غرض ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ پاپائی ریاستیں دولت اٹلی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں اور ایک اشتہار اس الحاق کی جزیات کے متعلق جاری کیا گیا۔ اس اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ ”ان رعایات سے گورنمنٹ اٹلی یورپ پر یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ باتباع اس اصول کے کہ ایک خود مختار حکومت میں کلیسا کو خود مختار ہونا چاہیے۔ اٹلی پاپائی فرمان رومانی کو تسلیم کرتی ہے جب پروشیا اور آسٹریا کی جنگ ہوئی تو پاپائیت کو یہ امید تھی کہ سلطنت جرمنی پر آسٹریا کی نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اور اہل جرمنی کا مذہب کیتھولک ہو جائے گا۔ جب جرمنی اور فرانس میں لڑائی ہوئی تو فرانسیسیوں کو امید تھی کہ جرمنی میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ جنہیں رومن کیتھولک مذہب کے ساتھ ہمدردی ہوگی۔ اسی لیے کیتھولکوں کو ہٹا ٹنٹوں کے خلاف بھڑکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ کوئی ایسی گالی نہ تھی جو اُن کو نہ دی گئی ہو کبھی اُنہیں دہریہ کہا گیا کبھی اُن کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اُن میں ایمان داری اور دیانت کی صفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کبھی ان کے فرقوں کی نسبت یہ ظاہر کیا گیا کہ اُن کا اعتزال روپہ زوال ہے کبھی اُن پر یہ آوازہ کسا گیا کہ بیروان کو تھرمر

زیادہ فاسق و فاجر قوم پوپ بھر میں کوئی نہیں۔ خود جناب پاپا نے شاید یہ سمجھ کر کہ دنیا کو تاریخ انسیا منسیا ہو گئی ہے بلا تامل یہ ارشاد فرمایا کہ ”اہل جرمنی کو سمجھ جانا چاہیے کہ بجز کلیسا سے روم کے اور کوئی کلیسا آزادی اور ترقی کا حشر نہیں ہو سکتا۔“

اس اثنا میں جرمنی کے پادریوں نے ایک جماعت اس غرض سے قائم کی کہ پاپا کی غاصبانہ دست برد کے خلاف اپنی آواز بلند کرے بلکہ علی طور پر اس کی مزاحمت کرے۔ اس جماعت نے صاف کہہ دیا کہ ہم ہرگز اس امر کے روادار نہیں ہو سکتے کہ انسان خدا کے تحت پر بٹھا دیا جائے بلکہ ہم کسی شکل میں بھی کسی کو نائب خدا بنا ہوا دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے علمی عقاید کو قیسییت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑا سکتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک بے دہرک نکلے کہ انہوں نے خود پاپا ہی پر زندقہ و الجاد کا الزام لگا دیا۔ ان متمدن اور سرکش اشخاص کو خارج ار کلیسا کیے جانے کی دہمکیاں دی گئیں اور بالآخر یہ مطالبہ کیا گیا کہ بعض پروفیسروں اور معلموں کو خدمت سے سبکدش کر کے بجائے ان کے ایسے اساتذہ مقرر کیے جائیں جو عصمت پاپا کے قابل ہوں۔ اس مطالبہ کی تعمیل سے گورنمنٹ جرمنی نے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ جرمنی کی دلی تمنا تھی کہ پاپائیت کے ساتھ صانع صفائی کے تعلقات قائم رکھے وہ مذہبی جھگڑوں میں ہرگز نہ پڑنا چاہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو کر رہا کہ امرابہ البمف مذہبی نہ تھا بلکہ پولیٹیکل یعنی حکومت کی طاقت آیا حکومت ہی کے خلاف صرف کیجاے یا نہیں۔ ایک دفعہ ایک استاد جو کسی مدرسہ میں ورنش کی تعلیم دینے پر مورتھا کلیسا سے خارج کیا گیا۔ اور جب کلیسا کی طرف سے اس کی بظرفی کی تحریک ہوئی تو گورنمنٹ نے اس تحریک کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ حکام کلیسا نے اس انکار کو کلیسا کے حقوق کی پائیامی پر محمول کر کے ظاہر کیا کہ گورنمنٹ نے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ شہنشاہ جرمنی نے اپنے وزیر کی اس کارروائی کو جو کلیسا کے مقابلہ میں کی گئی

تھی بنظر استحسان دیکھ کر اس کی حمایت کی۔ اس پر پاپائی اخباروں نے شہنشاہ کو ہر ایماندار کیتھولک کی مخالفت کی دہمکی دی کہ جیسا کہ پاپا کے ساتھ مقابلہ کرنا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں حکومتیں تہ وبالا ہو سکتی ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ ہر شخص جو ذرا بھی سمجھ رکھتا تھا اچھی طرح جان گیا کہ امرابہ النزاع نے اب اس سوال کی شکل اختیار کر لی ہے کہ سلطنت کا اصلی مالک کون ہے گورنمنٹ یا کلیسا سے روم؟ دو بادشاہ درستی سے گنبد۔ والی مثل ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ دو حکومتوں کے ماتحت رہ سکیں جن میں سے دونوں ایک دوسرے کا تخطیہ کرتی ہوں۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر گورنمنٹ کلیسا سے روم کے احکام کی متابعت کرنے سے پہلو تہی کرے گی تو دونوں گویا ایک دوسرے کے دشمن ہونگے۔ اس طور پر روم نے جرمنی کو لڑائی پر مجبور کیا اور یہ وہ لڑائی تھی جس میں روم کی بوجہ تمدن جدید کے حریف بننے کے صاف زیادتی پائی جاتی ہے۔

گورنمنٹ جرمنی اب اپنے حریف کو پہچان کر یہ مدافعانہ چال چلی کہ محکمہ وزارت عبادات عامہ کے کیتھولک سیغہ کو ایک قلم تخفیف کر دیا۔ یہ واقعہ اسی کے موسم گرما میں پیش آیا نومبر آئینہ میں شاہنشاہ پارلیمنٹ میں ایک قانون اس مضمون کا نافذ کیا کہ جو کسی ایسے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موجب نقصان من ہونگے وہ مستوجب سزا البغیضہ نوعداری ہونگے۔ اس کے ساتھ ہی اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ کامیاب وہی جماعت ہوگی جس کے ہاتھ میں مدارس ہونگے ایک منصوبہ وسیع پیمانہ پر اس غرض سے قائم کیا گیا کہ مدارس کو کلیسا سے علیحدہ کر لیا جائے۔

”جیسوٹ“ فرقہ تمام جرمنی میں اس سازش کا جال پھیلا رہا تھا کہ ایسے مذہبی قانون کی تعمیل رعایا پر فرض نہیں ہے جو حکومت کا بنایا ہوا ہو۔ یہ گویا کلمہ کھلا بغاوت تھی گورنمنٹ اگر ان بغیوں کی دہمکی میں آجاتی تو اس کی خیر نہ تھی۔ ارملان کے اسقف نے صاف کہہ دیا کہ حکومت کے ان قوانین کی وہ ہرگز متابعت نہ کرے گا۔ جو سو فر کلیسا ہوں گے۔ اس پر گورنمنٹ نے اُس کی تنخواہ روک دی اور یہ دیکھ کر جب تک جیسوٹ فرقہ کا مالک میں قدم نہیں گاہ۔ امن قائم

ہنہو سکے گا ان کے اخراج کا قصد کر لیا اور جتنے جیسوئٹ تھے سب ملک بدر کر دئے گئے۔
 ۱۸۷۲ء کے خاتمہ پر جناب تقدس آب نے ایک خطبہ شائع کیا جس میں اس واقعہ کی طرف
 اشارہ کرنے کے بعد کہ سلطنت جرمنی میں کلیسا جو روحنا کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ آپسے یہ دعویٰ
 کیا کہ کلیسا اور حکومت کی حدود اور مافیہ کے معین کرنے کا حق صرف کلیسا ہی کو حاصل ہے۔ یہ
 اصول جس درجہ خطرناک اور ناقابل تسلیم ہے ظاہر ہے اس لیے کہ لفظ اخلاق کلیسا کی اصلاح میں
 انسان کے جملہ تعلقات باہمی پر حاوی ہے۔ اور کلیسا نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ قوت
 جو اس کی معین نہیں ہے اس پر جبر کرتی ہے۔ اس خطبہ کی اشاعت کے چند روز بعد یعنی
 ۴ جنوری ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ نے چار قوانین نافذ کیے:-

(۱) ادون وسائل کے انضباط و تعین کے متعلق جن کو اختیار کر کے انسان اپنا تعلق کلیسا سے
 منقطع کر سکے۔ (۲) کلیسا کے اقتدارات تعزیری کی تفسیر و تحدید کے متعلق۔ (۳) قانون تنبیہات
 و تادیبات مذہبی دربارہ ممانعت سزا سے جسمانی و انضباط سزا سے جہانہ و جلا سے وطن و
 عطا سے حق اہل بہ نامہ راضی فیصلہ عدالتہا سے ممانعت بعدالت العالمیہ امور مذہبی جسکا فیصلہ قطعی
 اور ناطق منظور ہوگا۔ (۴) قانون تعلیم ابتدائی و تقرر پادریان۔ اس چوتھے قانون کو
 رو سے لازمی قرار دیا گیا کہ پادریوں نے خاطر خواہ تعلیم پائی ہو اور سرکاری امتحان پاس کیا ہو
 اور فلسفہ و تاریخ و جرمن علم ادب میں مہارت رکھتے ہوں یہ بھی قرار پایا کہ جو مذہبی مدارس
 سلطنت کی نگرانی میں قائم رہنے سے انکار کریں وہ بند کر دئے جائیں۔

یہ قوانین حکومت جرمنی کے اس مصمم قصد کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اس بات کی
 روادار نہ ہو گی کہ اٹلی کے چند اونچے گھرانے جرمنی میں من مانی کارروائیاں کریں اور اسے
 کٹ پتلی کی طرح تار پر سچائیں۔ بلکہ وہ اپنے گھر کا انتظام اب خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتی
 ہے۔ اس مقابلہ کو وہ مذہب اور ایمان کا معاملہ نہیں سمجھتی بلکہ قانون سلطنت اور قانون
 کلیسا کی فرمانروایانہ مولتوں کا تصادم تصور کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ پاپائیت کو مذہبی نہیں

بلکہ پولیٹیکل طاقت سمجھتی ہے۔ اور اُس نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جرمنی کی دستوری حکومت کا یہ اعلان لفظاً و معنیاً علماً و عملاً برقرار رہے گا کہ ”مذہبی آزادی کو ہرگز اُن فرائض میں مغل نہ ہو چاہیے جو ہر فرد رعایا کے ذمہ دوسرے افراد رعایا اور حکومت کی طرف سے واجب الادائی ہیں۔“

یہ قول بالکل درست ہے کہ بابائی حکومت میں شان عمومیت نظر نہیں آتی یعنی وہ ایک ہمہ گیر کلیسا نہیں ہے جسکی برکات سے کل مسیحی دنیا مستفیض ہوتی ہو بلکہ اسکا مقصد محض چند اطالوی خاندانوں کو نفع پہنچانا ہے۔ اس کی ہیئت ترکیبی پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاپا کر دینال اسقف اور کر دینال شماس سب کے سب اطالوی ہیں۔ کر دینال قصیص تقریباً سب کے سب اطالوی ہیں۔ روما کی مجلس مقدمہ کے اعضا و اعمال سب کے سب اطالوی ہیں قرون متبسطہ سے لے کر آج تک فرانس کا ایک بھی پادری پاپا نہیں ہوا۔ یہ بھی حال آسٹریا پرتگال اور اسپین کا ہے۔ باوجود اُن کوششوں کے جو اس اختصاص کے خلاف وقتاً فوقتاً عمل میں لائی گئی ہیں اور باوجودیکہ بھی طرح کے جتن کیے گئے ہیں کہ کلیسا کے مناسب جلیلہ کا دروازہ تمام کیتھولک دنیا کے لیے بلا امتیاز کھول دیا جائے لیکن ممکن نہیں کہ کوئی غیر ملکی کرسی مقدس تک پہنچ سکے۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کلیسا ایک سلطنت ہے جو خدا نے مخصوص طور سے اٹلی ہی کے امرا کو عطا فرمائی ہے۔ موجودہ مجلس کر دینالان کے پچپن ارکان میں سے چالیس اطالوی ہیں حالانکہ انصافاً ان کی تعداد آٹھ سے زیادہ ہونی چاہیے تھی۔

ترقی یورپ کی چلتی گاڑی کی راہ میں حکومت کی دو عملی نے روڑا اٹھا سے رکھا ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ ہر قوم کے دو بادشاہوں ایک دینومی یعنی داخلیہ اور ایک دینی یعنی خارجیہ جبکہ مختلف ممالک جدا جدا فرمان رواؤں کے ماتحت ہوں اور ان سب کا ایک فرمان روا پاپا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تاریخ میں ہکو بجز ان متخالف و متعارض

طاقون کی رقبیانہ جدوجہد کی داستان کے اور کوئی سبق آموز حقیقت نظر آئے؟ جو شخص ان واقعات کا بغور غور و نظر کرے گا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو مین جھون نے مٹو یسٹ کے عنصر کو اپنی حکومت سے خارج کر دیا ہے سب سے زیادہ متنی یافتہ مین اُس پر فوج کی حقیقت منکشف ہو جائے گی جس نے فرانس کو عضو معطل بنا رکھا ہے۔

ایک طرف تو فرانس یو۔ یہ کامتھا دیشوا بننا چاہتا ہے۔ اور دوسری طرف عہد ماضی کی اُس لاش سے ہم آغوش ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی گل کر چو نہ ہو گئی ہیں یعنی طبقہ جہلا و عوام کے خوش رکھنے کی غرض سے وہ طرز عمل اختیار کرتا ہے جس کی وقعت اُس کی عقل سلیم کی نظروں میں خاک نہیں ہو سکتی۔ جن دو حکومتوں کا فرانس میں دور دورہ ہے وہ یہاں تک مادی انقوت ہیں کہ کبھی ایک کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی دوسرے کو اور بار بار ایسا بھی اتفاق پیش آتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوت کو اپنے اعراض کی تکمیل کا آلہ بنا لیتی ہے لیکن اس دو عمل کے خاتمہ کا وقت اب قریب آتا جاتا ہے۔ شمالی اقوام کو جو تحولات

بارہ و توہمات باطلہ میں اس درجہ مبتلا نہ تھیں یہ قنویت مدت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی اور اوہون نے علی رغم انف روم اس کا جواب اپنے کندھے سے اتار پھینکا تھا جس کی قسمت دوسری قوموں سے اچھی تھی۔ کبھی بھی کسی غیر قوت کا روحانی حلقہ گوش نہ بنا۔ وہ قدیم کلیسا سے یونان کی رسوم ہی کو اپنا سرمایہ نجات تصور کرتا تھا۔ اور پاپائیت کو نعرانیت

قرون اولیٰ میں مسندانہ رختہ اندازی سے تعبیر کرتا تھا۔ امریکہ میں امور دنیا و دین بالکل الگ الگ کر دیے گئے ہیں۔ مذہب کو حکومت میں دست اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں اگرچہ باقی ہر اعتبار سے اُسے پوری آزادی حاصل ہے نئی دنیا کی حالت دیکھ کر ہمیں یطمینا

لے دو سال ہو سے کو فرانس بھی اس دو عملی حکومت کی قید سے آزاد ہو گیا۔ مذہب حکومت سے بالکل بے دخل کر دیا گیا اور اب فرانسیسی گورنمنٹ کا شاہی مذہب نام کو نعرانیت لیکن فی الحقیقت ادیت ہے۔ مترجم

بھی ہوتا ہے کہ نصرا نیت کے دونوں فرقوں یعنی کیتھولک اور پرنسٹنٹ کی قوت بالیدگی و انفراس سلب ہو چکی ہے۔ ان کی جو حدود ایک عرصہ سے معین ہو چکی ہیں ان سے یہ دونوں متجاوز ہونے کے قابل نہیں رہے کیتھولک اقوام کیتھولک ہیں اور پرنسٹنٹ پرنسٹنٹ۔ پرنسٹنٹوں کے دل سے فرقہ بندی کا خیال دور ہو رہا ہے۔ ان کے اختلافات مٹتے جاتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے افراد کا میل جول بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی آراد عقائد مروجہ کا ماخذ کلیسا نہیں ہے بلکہ اخبارات و رسائل ہیں +

جس جہ و جہد کا ذکر ہم نے کیا ہے اس کے لحاظ سے پاپائے پائس تاسع کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اول یہ کہ پاپائیت کی قوتیں ایک مرکز پر لا کر جمع کر دی جائیں اور یہ مرکز ایک مطلق العنان روحانی مقتدا ہو جسے دہانی اقتدارات حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو اقوام سبھی الذہب ہیں ان کے عقلی نشوونما کی ہاگ پاپا کے ہاتھ میں آجائے مقصد اول الذکر کا کوئی اور نتیجہ بجز سیاسی مداخلت کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پاپائے موصوف کو اصرار تھا کہ دنیوی طاقت ہر حال میں دینی طاقت کے تابع ہو اور ہر دفع قانون جو کلیسا کی اغراض کا حامی نہ ہو منسوخ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ایسا قانون اہل ایمان کے لئے واجب الاتباع نہیں ہے۔ گزشتہ اوراق میں ہم محل طور پر بعض ان پیچیدگیوں کا ذکر کر آئے ہیں جو اس اصول کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث واقع ہو چکی ہیں +

اب ہم اس طریقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو پاپائیت نے اپنی عقلی حکومت کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے یعنی ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنے اور اپنے حریف سامتوں کے باہمی تعلقات کی تعریف و تعین کن الفاظ میں کی ہے۔ لازمہ وسطی کی حالت کے اچاکی کوشش میں اس نے تمدن جدید کی کیوں کر مخالفت کی ہے اور اپنا نیا حال کو کس کس طرح سے کو سا ہے

مکتوب عمومی و تلخیص میں جو اصول مندرج ہیں انہیں وٹیکن کونسل قوت سے فعل

میں لانے کی آرزو مند تھی "تخصیص" میں اُن لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے جو عقیدہ ہمہ دوست کے قائل ہوں یا پختہ ہوں یا مطلقاً استدلالی و معقولی ہوں۔ اور اس قسم کے عقائد کو مورد نفرت قرار دیا گیا ہے کہ خدا کائنات ہے۔ خدا اور قوت مترادفات ہیں۔ امور دین پر بھی اُسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہئے جس حیثیت سے مسائل فلسفہ پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ نئے طریقے اور اصول جنہیں متکلمین زمانہ قدیم نے دینیات کی حمایت کے لئے اختیار کیا تھا مقصدیات زمانہ حال و ترقی سائنس کے لحاظ سے موزوں و مناسب نہیں رہے۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جس مذہب کو از روئے عقل سچا سمجھے قبول کر لے۔ کلیسا کے اقتدارات کی تعیین و تحدید کا حق حکومت کو حاصل ہے۔ کلیسا کو جبر یا بالواسطہ و بلاواسطہ قوت سے کام لینے کا حق حاصل نہیں کلیسا کو حکومت اور حکومت کو کلیسا سے الگ کر دینا چاہئے۔ اب یہ امر قرین مصلحت نہیں رہا کہ حکومت کا مذہب عبادت کے باقی تمام طریقوں کی نفی کر کے کیتھولک مذہب ہی قائم رہنے دیا جائے۔ جو لوگ کیتھولک ممالک میں آکر سکونت پذیر ہوں انہیں اپنا طریقہ عبادت علانیہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ پاپائے روما کو تمدن جدید کی ترقی کے ساتھ اتفاق و موافق ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے بھی تخصیص میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ کلیسا کو مدارس عامہ کی نگرانی کا کامل اختیار حاصل ہے۔ اور حکومت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نخل اور طلاق کے معاملات بھی کلیسا کے حیز اقتدار میں داخل ہیں +

ان میں سے وہ اصول جنہیں کونسل نے بالفعل شکل ضابطہ مرتب کرنا قرین مصلحت سمجھا ایک رسالہ میں جس کا نام "کیتھولک مذہب کا دستور عقائد" ہے درج کر دیئے گئے ہیں اب ان عقائد کے مہات الامور خصوصاً مذہب اور سائنس کے تعلقات باہمی پر غور کرنا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ سطور ذیل اس رسالہ کا مکمل اقتباس پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کے ذریعہ سے صرف اُن اجزاء کا خلاصہ درج کیا گیا ہے جو ضروری الاظہار ہیں +

رسالہ کی تہید ایک مناظرانہ تقریب پر مشتمل ہے جس میں واقعہ اصلاح کینڈیہ کے اصول و ستائش پر بت شد و نکتہ چینی کی گئی ہے :-

”اُس ربانی اقتدار کی نفی کرنے کے باعث جو کلیسا کو دین برحق کے حقائق کی تعلیم کے متعلق حامل ہے اور جہل امور متعلقہ مذہب کو ہر شخص کے اجتہاد ذاتی کے حوالے کرتا کی بدولت متعدد فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان فرقوں کے باہمی اختلاف و نزاع سے نہ صرف بہت سے لوگوں کے دل سے مسیح کا ایمان زائل ہو گیا بلکہ کتب مقدسہ کا شمار افسانوں اور فرضی روایتوں میں ہونے لگا۔ لوگ مسیحیت کے منکر ہو گئے اور اس کے بجائے محض عقل بقول خود نیچر کی تعلیم کی پیروی کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو ہمہ اوست مادیت اور دہریت کے قریں جا گرے ہیں۔ اور فطرت انسانی کے استدلالی پہلو کو نظر انداز کر کے اور نیکی و بدی کے ہر قاعدہ کو پس پشت ڈال کر جماعت انسانی کا اخلاقی شیرازہ بکھیرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ان معتقدات فاسدہ و بدعات سیئہ کی چونکہ ہر جگہ اشاعت ہو رہی ہے لہذا بہت سے کیتھولک بھی ان کے دام تزویر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے سائنس کو جس کا ماخذ انسان ہے مذہب کے ساتھ جو ربانی الاصل ہے ملا کر خلط مبحث کر دیا ہے۔ لیکن کلیسا جو ابوالا اہم اور سید الا توام ہے کمزوروں کی قوت اور ناتوانوں کا سہارا ہے جو راہ گم کردہ اُس کے آغوش عاطفت میں اگر عافیت گزین ہونا چاہیں انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہے اور جس رستہ سے وہ بھٹک گئے تھے اُس پر انہیں نئے سرے سے ڈالنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی لئے کل دنیا کے اساتذہ اس مجلس عمومیہ میں آکر جمع ہوئے ہیں اور چونکہ روح القدس بھی اس جلسہ میں نزول اجلال فرما کر ہمارے اجتماعات میں شریک ہے لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پطرس کی کرسی سے مسیحی نجات کے عقیدہ کا اعلان کریں اور ان بدعات کو جو اس عقیدہ کی مخالف ہیں سر زمین اعتقاد

سے قاطبۂ خارج کر دیں +

”خدا کی حقیقت جو آفرینندہ کون و مکاں ہے :- مقدس رومن کیتھولک کلیسا جو مسیحین کی یادگار ہے یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدائے ہی و برحق ایک ہے جو آسمان و زمین کا خالق و مالک۔ قادر مطلق۔ ازلی وابدی ملائقہ و لا تختہ۔ برتر از فہم و قیاس۔ غیر متناہی العقل الارادہ اور من کل الوجہ کامل ہے۔ و کائنات سے جدا اور متمازن ہے وہ اپنی مشیت مطلقہ کی تحریک پر دو مخلوق ہستیوں کو عدم سے وجود میں لایا جن میں سے ایک روحانی ہے دوسری جسمانی ایک لہہ ہوتی ہے دوسری ناسوتی۔ اس کے بعد اُس نے فطرت انسانی کو بنایا جو ان دونوں سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ خدا اپنی تائید سے تمام چیزوں کی حفاظت اور انتظام کرتا ہے اور اُس کا جلال و جبروت اقصائے کائنات پر محیط ہے اُس کے نظم و نسق میں موزونی و ترتیب پائی جاتی ہے۔ و ہمہ دان و ہمہ میں ہے۔ اور و باتیں بھی اُس سے پوشیدہ نہیں ہیں جو اُس کی مخلوقات کے آزادانہ افعال سے وقوع میں آتی ہیں +

”الہام کی حقیقت :- کلیسائے مقدس کا عقیدہ ہے کہ اگرچہ خدا کی ذات عقل انسانی کے قدرتی نور کی روشنی میں صاف صاف نظر آسکتی ہے لیکن اُس کی یہ بھی مرضی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مقدرات کو فوق العادت طور پر ظاہر کرے۔ یہ فوق العادت الہام ٹرنٹ کی مقدس کونسل کے اجتہاد کے مطابق عہد عتیق و جدید کے اُن نسخوں میں مندرج ہے جن کی ترویج کونسل نے کی ہے اور نیز کتب مقدسہ کے لاطینی نسخہ میں موجود ہے۔ یہ کتابیں اس وجہ سے مقدس ہیں کہ اُن کے املا میں روح القدس کا تصرف شامل تھا۔ ان کا مصنف خدا ہے اور ربانی تصانیف ہونے کی حیثیت سے وہ کلیسا کے حوالے کی گئی ہیں +

”اس غرض سے کہ یحییٰ او چرلی طبیعت کے لوگ آیات آسمانی کی غلط تفسیر و

تاویل نہ کرنے پائیں بہ تجدید اجتہاد مجلس رٹنٹ یہ فرمان صادر کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کتب مقدسہ کے معانی اُن معانی سے مختلف نہ بیان کرے جو کلیسائے مقدس نے بیان کئے ہیں کہ اُسی کو اس قسم کی مفسری سزاوار ہے ۔

”ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بندہ ہے اور خدا اُس کا آقا ہے اور چونکہ عقل حادث حقیقت ازلی کی کمال طور پر طبع و منقاد ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ جب کوئی الہام منجانب اللہ صادر ہو تو اُس پر ایمان لائے۔ ایمان ایک سعادت ہے جو بزرگواروں نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ ایک جوہر باوراء العادۃ ہے جسے خدا کی دین سمجھنا چاہئے جو شخص آیات آسمانی کو برحق سمجھتا ہے نہ اس لئے کہ اُن میں وہ فطری حقائق پوشیدہ ہیں جن کے سمجھنے پر عقل انسانی قادر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان آیات کی تنزيل کا ماضی جناب باری ہے اُس کے لئے ایمان وسیع نجات ہے پھر بھی اس خیال سے کہ عقل اور ایمان میں توافق قائم ہو سکے خدا نے الہام پر معجزوں اور پیشین گوئیوں کا اضافہ فرما دیا جو اُس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کے مظاہر ہونے کے لحاظ سے ایسی جہتیں ہیں جن کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکتے ہیں۔ ان جہتوں کا اظہار حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کے ذریعے عموماً اور جناب مسیح کے ذریعہ سے خصوصاً ہوا۔

”کوئی شخص ایمان لائے بغیر اپنی فطرت کے حق سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی شخص تا وقتیکہ مرتے دم تک اُس کا ایمان سلامت نہ رہا ہو ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ذریعے سے کلیسا کو اپنی الہامی آیات کا محافظ و معلم قرار دیا۔ کیونکہ صرف کلیسائے کیتھولک ہی اُن نشانات آسمانی کا مورد و مبطل ہے جن سے دین مسیحی کا مفید یقین ہونا ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور یہی نہیں خود کلیسا اپنی حیرت انگیز تبلیغ اپنے مفید الشان تقدس۔ اپنی بے پایاں خیر و برکت اپنے ہمہ گیر اتحاد اور اپنی غیر متزلزل استقامت سے اس دعویٰ کی تائید کر رہا ہے کہ

و ایمان و ایقان کا حقیقی و اصلی مرکز ہے اور بلا خوف و تردید اس بات کا ثبوت دے گا ہے کہ اس کی ماموریت منجانب اللہ ہے۔ اس طور پر کلیسا اپنے بچوں کو بتاتا ہے کہ اُن کا ایمان ایک نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں کی حالت میں جنہوں نے ایمان کی تائید آسمانی کی بدولت کیتھولک مذہب قبول کر لیا ہے اور اُن لوگوں کی حالت میں جنہوں نے عقل انسانی کو اپنا پیشوا قرار دے کر ایک جھوٹا مذہب اختیار کر لیا زمین آسمان کا فرق ہے۔

”عقل اور ایمان کی حقیقت :- اس کے علاوہ کلیسا کیتھولک کا ہمیشہ سے عقیدہ ہے اور اب بھی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں اور ہر قسم باعتبار اپنی اصل اور غایت کے ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اختلاف اصلی تو اس لحاظ سے ہے کہ ایک بذریعہ عقل فطری معلوم ہوتا ہے دوسرا بذریعہ ایمان۔ اور اختلاف غایت اس اعتبار سے ہے کہ علاوہ اُن حقیقتوں کے جن کا انکشاف عقل فطری کی وسعت سے ہو سکتا ہے ہمارے ایمان کے سامنے اُن اسرار و غوامض کو پیش نظر کیا جاتا ہے جن کا راز سر بہتہ خدا ہی کو معلوم ہے اور تا وقتیکہ وہی اُن کو بذریعہ اہل ظاہر نہ کرے اُن کی حقیقت کا علم ہم کو نہیں ہو سکتا۔“

”اس میں شک نہیں کہ اگر عقل ایمان کی روشنی سے منور ہو اور اپنی تلاش و جستجو میں استقامت و رزانت سے کام لے تو وہ خدا کی عنایت سے توسط اُن اشیاء کے تمثیل کے جو قدرتی طور پر معلوم ہیں اور توسل اُس تعلق کے جو اسرار و غوامض متذکرہ کو ایک دوسرے کے ساتھ اور انسان کی عاقبت کے ساتھ ہے ان اسرار و غوامض کی کنہ تک ایک محدود و مگر بدرجہ غایت مفید پیرایہ میں پہنچ سکتی ہے۔ لیکن محال ہے کہ عقل کبھی بھی ان اسرار و غوامض کو کامل طور پر اُن حقائق کی طرح سمجھ سکے جو اس کا موضوع اصلی ہیں اس لئے کہ خدا کے بھید اپنی نوعیت کے اعتبار سے عقل حادث و مخلوق کی

رسائی سے اس قدر دور ہیں کہ الہام کی تلقین اور ایمان کی تصدیق کے بعد بھی ان پر ایمان ہی کی نقاب پڑی رہتی ہے جو اُس وقت تک نہیں اُٹھتی جب تک کہ مغربِ قفسِ عنصری سے آزاد نہیں ہو لیتا۔

”لیکن اگرچہ ایمان برتر از عقل ہے تاہم ان دونوں میں حقیقی تناقض کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جو خدا کشفِ اسرار اور سرچشمہ ایمان ہے وہی روحِ انسانی کو غفل کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ خدا اپنی تردید آپ نہیں کر سکتا اور ایک حقیقت دوسری حقیقت کی ضد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر عقل و ایمان میں ظاہر بینوں کو تناقض نظر آئے تو اس کی مثال بالکل سراسر اب کی سی ہے جو فریبِ نظر کا کرشمہ ہے۔ ایسے تناقض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایمان کی حقیقت اُس طور پر نہیں سمجھی اور سمجھائی گئی جس طرح کلیسا دراصل اُسے سمجھتا ہے اور یا بعض لوگوں کے یہودِ رایوں اور جیلوں کو غلطی سے مقتضیاتِ عقل کا مترادف خیال کر لیا جاتا ہے۔ پس ہم ہر اُس ادعا کی نسبت باطل ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں جو ایمان کی روشن حقیقت کی ضد ہے۔ مزید برآں کلیسا کو جو تبلیغ کے رسولی منصب کے علاوہ ایمان کی حفاظت و حیانت کی خدمت پر بھی مامور ہے یہ اقتدار بھی منجانبِ اللہ حاصل ہے بلکہ یہ بات منجملہ اُس کے ربانی فرائض کے ہے کہ علمِ باطل کو حرام قرار دیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ فلسفہ اور تزویر کے دام میں گرفتار ہو جائیں۔ اسی لئے تمام ایمان والے مسیحیوں کو یہ تقید فمائش کی جاتی ہے کہ نہ صرف اُن آرا کی حمایت سے مطلقاً باز رہیں جو سائنس کے جائز مسلمات سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں مغائر لایمان ہیں اور کلیسا نے خصوصیت کے ساتھ انہیں عقائدِ فاسدہ کی فہرت میں داخل کر دیا ہے بلکہ اُن کا یہ فرض ہے کہ ایسی آرا کو منجملہ اُن غلطیوں کے تصور کریں جنہوں نے مسیحائی کی فریب و شکل اختیار کر رکھی ہے۔

”نہ صرف یہ بات ناممکن ہے کہ عقل اور ایمان میں تخالف واقع ہو بلکہ وہ اور

اٹا ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں یعنی ادھر تو عقل سلیم ایمان کی بنیاد قائم کرتی ہے اور ایمان کی مشعل ہاتھ میں لے کر حقائق آسمانی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور اُدھر ایمان عقل کو غلطیوں میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے اور انواع و اقسام کے معارف و حقائق سے اس کے سرمایہ اور اک میں اضافہ کرتا ہے پس کلیسا انسانی علوم و فنون کا مخالف نہیں ہے بلکہ اُن کا حامی و مؤید ہے۔ وہ اُن فوائد سے بے خبر نہیں ہے جو علوم و فنون کی بدولت انسان کو حاصل ہیں اور نہ ان فوائد کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بخلاف اس کے اُس کو اس امر کا اعتراف ہے کہ چونکہ ان علوم و فنون کا ماخذ خدا ہے جو الٰہک علم ہے لہذا اگر ان سے صحیح صحیح حور پر فائدہ اُٹھایا جائے تو ان کا اکتساب تائیدِ ایزدی سے موجبِ یزداں شناسی ہو گا۔ کلیسا اس بات کی بھی ممانعت نہیں کرتا کہ یہ علوم اپنے اصول اور طریقوں سے اپنی اپنی جائزہ دوو کے اندر کام نہ لیں لیکن اس واجبِ آزادی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی کلیسا اس احتیاط کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ کہیں یہ علوم تعلیم ربانی کی نفی کرنے سے غلطیوں میں نہ پڑ جائیں اور اپنی جائزہ دوو سے متجاوز ہو کر ایمان کا شیرازہ نہ بکھیر دیں +

ایمان کی مہم من الہی کسی فسفیانہ اکتشاف کی طرح انسانی عقل کے ذریعہ سے حد کمال کو پہنچنے کی محتاج نہیں ہے بلکہ ایمان کو کامل و مکمل شکل میں دویتِ مسیح یعنی کلیسا کے حوالے کر دیا گیا ہے تاکہ جان سپاری کے ساتھ اُس کی حفاظت کی جائے اور پاک اور بے لوث صورت میں اُس کی اشاعت کی جائے۔ اسی لئے دین مقدس کے کل مسائل کے معانی کلیسا کے عقوم کے لحاظ سے بیان کئے جانے چاہئیں اور یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ مفسرین وضاحت کے بہانہ سے ان معانی میں کوئی ترمیم یا تفسیر روا رکھا جائے پس حدیثوں کی بجا طے کے اُٹھنے اور انسان کی متواتر تسلسل کے گزارنے کے ساتھ ساتھ عقل و فہم اور علم و دانش کی وسیع السیر ترقی اشخاص کے لئے

منقرض اور کلیسا کے لئے مجتہداً جائز قرار دی جاتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ ترقی بہ اعتبار قسم اپنی حد سے متجاوز نہ ہو یعنی مسائل ایمان کے مفہوم و معانی و عقیدہ میں کسی قسم کی خارجی آمیزش نہ ہونے پائے۔

منجملہ دیگر ادا مرد و نواہی کے حسب ذیل امور بھی منہیات میں داخل کئے گئے۔
”لعنت ہو اُس پر۔“

”جس کا ایمان نہیں ہے کہ خدا نے برحق ایک ہے جو تمام دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔“

”جو شیخ چشمی کی راہ سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یحیرمان کے اور کسی شے کا وجود نہیں ہے۔“
”جو یہ کہتا ہے کہ ذات باری اور باقی تمام اشیاء بجا ذہن ترکیبی واحد و منصرف و مشترک الاصل ہیں۔“
”جو یہ کہتا ہے کہ موجودات جسمانی و روحانی جن کی ہستی محدود ہے یا کم از کم موجودات روحانی کا منہج جو ہر ذات باری ہے یا یہ کہ جو ہر ربانی اپنے ہی مظاہر یا اپنی ہی ترقی یافتہ شکل کے ذریعہ سے کائنات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔“
”جس کو اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ خدا نے کون و مکان کو نیست سے بہت کیا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے بذریعہ ارتقاء جاری بالآخر حق و خیر کو دریافت کر سکتا ہے اور اُسے ایسا کرنا چاہئے۔“
”جو کتب مقدسہ کو مٹرنٹ کی مقدس کونسل کی توضیح کے مطابق کلاً یا جزئاً مقدس اور مدار حجت شرعیہ ماننے سے انکار کرتا ہے یا اُن کے الہامی ہونے سے منکر ہے۔“
”جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل انسانی اس درجہ آزاد و مطلق العنان ہے کہ خدا اُس سے پابندی ایمان کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔“

”جس کا یہ قول ہے کہ الہام ربانی خارجی شہادتوں کی بنا پر قرین اعتبار و مفید

یٹھین نہیں ہو سکتا +

”جو یہ کہتا ہے کہ معجزے نہیں ظاہر کئے جاسکتے یا یقین کے ساتھ اُن کا کبھی علم نہیں ہو سکتا اور مسیحیت کا سماوی الاصل ہونا اُن کے ذریعہ سے کبھی ثابت نہیں کیا جاسکتا“ جو یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ الہام ربانی غنصر اسرار سے عاری ہے اور جملہ معتقدات تربیت یافتہ عقل کی مدد سے سمجھ میں آسکتے اور ثابت کئے جاسکتے ہیں +

”جس کا یہ اعتقاد ہے کہ علوم انسانی کی تحصیل میں اس درجہ آزادی سے کام لینا چاہئے کہ ہر شخص اُن کے ادعا کو صحیح یا اور کرنے کا مجاز ہو خواہ ایسے ادعا الہامی تعلیم کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو +

”جو اس بات کا قائل ہے کہ ممکن ہے کہ ترقی سائنس کے دور میں ایک زمانہ ایسا آئے جبکہ کلیسا کے معتقدات کا مفہوم اُس مفہوم سے بالکل ہی بدل جائے جس کے لحاظ سے کلیسا نے آج تک ان معتقدات کی تاویل کی ہے +

یہ فیصلہات و فتاویٰ جن عجیب و غریب بلکہ جن بے باکانہ و شوخ چٹانہ و عداوی پر متضمن ہیں انہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیتھولک جماعت استحسان و اطمینان کی نظر سے نہ دیکھ سکی۔ جرمن یونیورسٹیوں کی طرف سے تو ان دعاوی کی دل کھول کر مخالفت کی گئی اور جب ختم سال پڑ وٹیکن کونسل کے احکام عام طور پر تسلیم کر لئے گئے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ احکام مبنی بر صحت و صداقت ہیں بلکہ محض موذبانہ متابعت کے اقتضا +

بہت سے متقی و پرہیزگار کیتھولک علما کو اس تمام کارروائی اور اس کے نتائج پر کمال رنج و افسوس ہوا چنانچہ ایک فرانسیسی پادری ہیماںتھ اپنے طبقہ کے مقتدا کو ایک خط ان الفاظ میں لکھتا ہے: ”کلیسا کا جو ہمارا مبداء ایمان ہے اُنیسویں صدی کے تمدن سے جس کی ہم دینیوی اولاد ہیں اور جس کے بہت سے فرائض و حقوق ہمارے ذمہ واجب الادا ہیں اس طور پر جہاں کر دیا جانا ایک ایسا فاعل ہے جس میں معصیت اور

حماقت کی مسادی آمیزش پائی جاتی ہے اور میں اس افراق کو بہت ہی قابل ملامت سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر لاطینی قوم میں عموماً اور فرانس کی آبادی میں خصوصاً تمدنی اخلاقی اور مذہبی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کی وجہ کیتھولک مذہب نہ ہوگا بلکہ کیتھولک مذہب کا طریقہ تاویل و طرز عمل ہوگا جس نے ایک مدت سے اس دین کی صورت مسخ کر رکھی ہے۔

باوجودیکہ جناب پاپائے مقدس کو معصوم ہونے کا ادعا تھا جس کے بالفاظ دیگر یہ معنی تھے کہ آپ ہمہ داں و علام الغیوب ہیں پھر بھی آپ کی روح القدسی بصیرت جنگ فرانس و جرمنی کے نتیجہ کے متعلق پیش بینی نہ کر سکی۔ اگر آپ کو ملکہ نبوت عطا ہوا ہوتا اور نبی شناسی کی قابلیت آپ کے حصہ میں آتی ہوتی تو آپ پر اپنی کونسل کے اجتہادات کی غیر موزونی و موقع ناشناسی کی حقیقت کھل گئی ہوتی لیکن کہاں کی عصمت اور کہاں کی نبوت۔ یہاں تو مطلب سعدی کچھ اور ہی تھا۔ پاپا کی اس درخواست کو کہ اُس کے دنیوی اقتدار کے برقرار رکھنے کے لئے کچھ فوج بطور کمک بھیجی جائے شاہ جرمنی نے رد کر دیا۔ خاج الکلیسا شاہ اٹلی نے روما پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ پاپا نے بھنجلا کر یکم نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک مکتوب عمومی صادر کیا جس کی تلخی اور ششی تاج کل کی بین الاقوامی مراسلت کے مذہب اور شائستہ لہجہ کے ساتھ نسبت تضاد رکھتی ہے۔ اس مکتوب میں جناب تقدس تاب نے دربار پیڈمانٹ کی کارروائی کو ہدف سهام مطاعن و ملاحظن بناتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کارروائی کے بانی مہائی اُس فریق کے مشعور پر کاربند ہوئے ہیں جس کے لئے خسران اخروی مقدور ہو چکا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد

۱۱۰۹۸ اٹلی کا شمالی صوبہ جس کے شمال کی طرف سوئٹزرلینڈ اور مغرب کی طرف فرانس واقع ہے رقبہ ۱۱۰۹۸

مربع میل اور آبادی ۱۹۰۰۰۰ میں ۳۲۶۳۳۳۳ نفوس تھی +

ہوا ہے کہ مابدولت حالت قید میں ہیں اور گروہ اشرا و شیاطین کے ساتھ کسی باب میں اتفاق نہیں کر سکتے۔ پھر اپنی مخالفین پر اخراج اکبر یعنی عدم شرکت کینسہ کی حد اخیر جاری کرتے ہوئے سب و شتم اور تاوان و سزا کا انتہائی فتویٰ بھی صادر کیا ہے اور دوشیزہ مریم مادر خدا اور مرسلین مقدس پطرس و پولوس کی شفاعت کے خواستگار ہوئے ہیں +

مختلف پرنسٹن فرقوں میں سے بعض نے مجلس اتحاد انجیلی کے نام سے ایک انجمن بغرض صلاح و مشورہ قائم کر لی تھی۔ اس مجلس کا آخری اجلاس ۱۸۷۳ء کے موسم خزاں میں بمقام نیویارک ہوا۔ اگرچہ اس موقع پر یورپ اور امریکہ کے پرنسٹن کلیساؤں کے بہت سے زاہد و متقی و کلا جمع ہوئے تھے لیکن وقت و سطوت کے اعتبار سے اس مجلس کو اس عظیم الشان مجلس سے کوئی نسبت نہ تھی جس کا اجلاس کلیسا سے سینڈس پیٹر واقع روم میں اس سے کچھ ہی دن پہلے منعقد ہو چکا تھا۔ مجلس اتحاد انجیلی اپنے ہزار سالہ شجرہ نسب کے مقدس تسلسل کا حوالہ نہ دے سکتی تھی اور اس حیثیت سے اپنے دعاوی نہ پیش کر سکتی تھی کہ گویا وہ تاجداروں اور تخت نشینوں کی سیم و عدیل بلکہ ان سے بھی بالا و برتر ہے۔ وہ میکن کونسل کی کارروائی کے ہر پہلو میں دانشمندانہ تدبیر اور دنیوی حکمت عملی کی شان نظر آتی تھی لیکن مجلس اتحاد انجیلی کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ وضاحت اور تعین سے معرا تھے اور کوئی خاص غایت اس کے انعقاد کا نصب العین نہ تھی۔ اگرچہ اس مجلس کی خواہش یہ تھی کہ مختلف پرنسٹن کلیساؤں کا اتحاد زیان کامل و مکمل ہو جائے لیکن اسے قوی امید نہ تھی کہ یہ دل پذیر خواہش پوری ہو سکے گی پرنسٹن کلیساؤں کے وجود میں آنے کا باعث نا اتفاقی اور ان کے قیام کا مدار افتراق پر تھا۔ اس مجلس نے اسی اصول کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیا +

پھر بھی مجلس اتحاد انجیلی کی کارروائی میں بعض نکتہ آموز و معنی خیز واقعات شامل ہیں یعنی اس نے اپنے اس دیرینہ حریف کو جس نے ابھی حال ہی میں واقعہ اصلاح کو مورد

سطاعن نارواو ملاعن ناسرا بنایا تھا نظر انداز کر کے وٹیکن کونسل کی طرح اپنی نگاہ سائنس پر جا دی۔ سائنس کے ہیبت ناک نام کی آڑ میں اس کے سامنے گویا ایک ایسا جھوٹا دیو کھڑا تھا جو ہر ساعت بڑھ رہا تھا اور جس کی شکل نہایت ہی ڈراونی تھی۔ اس عظیم الجثہ و قوی ہیکل دیو سے خطاب کرتے وقت مجلس اتحاد انجیلی نے بعض دفعہ تو ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے تلق و روا داری کی ہوائی تھی اور بعض دفعہ ایسا لہجہ اختیار کیا جو سراپا تعریض و تشنیع تھا۔

مجلس اتحاد کو یہ نظر نہ آیا کہ موجودہ سائنس اور اصلاح کینسہ حقیقی ہی نہیں بلکہ تو احم بہنیں ہیں۔ یطین ارتقا میں ان کا ظہور ایک ہی وقت میں ہوا اور ان کی پیدائش کی علت بھی ایک ہی ہے۔ مجلس اتحاد دسٹے یہ نہ دیکھا کہ اگرچہ متعارض و متخالف فرقوں کا متحد ہونا محال ہے لیکن سائنس ایک ایسا نقطہ اتصال ہے جہاں یہ سب جمع ہو سکتے ہیں اور ان کا اصلی و حقیقی فائدہ اسی میں ہے کہ سائنس کو بے اعتباری کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے ساتھ مخلصانہ اتحاد قائم کریں۔

اب ہم کتیہولک مسیحیت کے دستور العقاید پر جس حیثیت سے کہ وٹیکن کونسل نے ان عقاید کی تعریف و توثیح کی۔ ہے کچھ خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک شے مختلف اشخاص کو ایک ہی حیثیت سے دکھائی دے تو ضرور ہے کہ اُس پر ایک ہی پہلو سے نظر ڈالی جائے۔ جو مثال اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اُس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اہل مذہب اور اہل سائنس کے مقامات مشابہ بالکل الگ الگ ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ فریق ثانی سے یہ خواہش ظاہر کرے کہ واقعات کی جو قطاریں صف بستہ اُسے نظر آرہی ہیں دو سر فریق بھی اُن کو ویسا ہی تسلیم کرے۔

دستور العقاید کو اس اصول موضوعہ کے اعتراف پر اصرار ہے کہ کلیسا نے رومان

من اللہ ہے اور مامور من اللہ کی یہ خلعت بلا مساہمت و مشارکت احدے خاص طور پر اسی کو عطا ہوا ہے۔ اس ربانی اقتدار کی بنا پر اس کی یہ خواہش ہے کہ تمام لوگ معقولہ میں اس کی متابعت اختیار کریں اور تمام اقوام اپنی ملکی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیں +

لیکن ایسے زبردست اور پر شکوہ دعوے کے لئے دلیل بھی ایسی ہی زبردست اور پر شکن ہونی چاہئے اور ثبوت ایسا ہونا چاہئے جس کے ماننے کی صحت پر کسی کو اعتراض کی مجال نہ ہو سکے اور یہ ثبوت حتمی و بالواسطہ وغیرہ متعلق نہ ہو بلکہ صریح و موجہ و قاطع ہو غرض یہ ثبوت ایسا ہو جس کی تردید ناممکن ہو اور جس کا توڑ نہ ہو سکے +

لیکن کلیسا کا قول ہے کہ اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ اس کا دعویٰ عقل انسانی کی کسوٹی پر پرکھا جائے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ دعوے بلا چون و چرا و بے حیلہ و حجت فوراً بطور اصول ایمان تسلیم کر لیا جائے +

اگر یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو اس کے باقی کے مطالبات بھی خواہ وہ کیسے ہی بے اندازہ کیوں نہ ہوں لاحقہ ماننے پڑیں گے +

دستور العقاید نے عقل کا تخطیہ اور منقصت کرنے میں عجب خود فراموشی سے کام لیا ہے یعنی اول تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ عقل امور مابہ البحت کا تصفیہ کرنے سے قاصر ہے اور اس کے بعد خود ہی ان امور کی تائید میں براہین و دلائل پیش کر کے عقل سے فیصلہ طلب کیا ہے۔ غرض دستور العقاید کیا ہے۔ ایک التجانامہ ہے جس میں عقل سے بجا بجا یہ تمنا کی گئی ہے کہ اپنی تغلیط و تحیق کر کے کسی طرح رومانی نصرانیت کو سچا ثابت کر دے +

جب مذہب اور سائنس کے اختلافی پہلو اس درجہ متباہن و متغایر ہیں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں حقیقت اشیا کے اظہار کے متعلق تطابق و توافق پیدا ہو سکے۔ اور نہ اس وقت

تک کوئی مشترک نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں کا حکم عقل کو نہ قرار دیا جائے اور اس کا قول فیصل نہ سمجھا جائے +

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جن میں سے بعض رومانی نصرانیت سے زیادہ قدیم ہیں اور بعض کے پیروں کی تعداد اس کے پیروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں بجز اس کے کہ عقل سے استصواب کیا جائے ان میں سے ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جاسکتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں اپنا اپنا دعوئے عقل کے دربار میں پیش کریں اور جو کچھ عقل فیصلہ کرے اسے صحیح تسلیم کریں + لیکن پاپائی کونسل کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ وہ ایمان بالغیب کو عقل پر ترجیح دیتی ہے اور کہتی ہے کہ عقل و ایمان علم کی دو علیحدہ علیحدہ شاخیں ہیں۔ ایمان کا مجموعہ اسرار و غوامض ہیں اور عقل کا واقعات و حقائق۔ اس کا دعوئے ہے کہ ایمان کو عقل پر فضیلت حاصل ہے اور جو طبیعتیں متذبذب و مشکلی ہیں ان کی تسکین و معجزوں کا درپیشین گوئیوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتی ہے +

بخلاف اس کے سائنس ناقابل فہم امور سے روگردانی کر کے و کلفت کے اس قول پر تکیہ کرتا ہے کہ ”خدا انسان کو ان باتوں پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کرتا“۔ جس سے سمجھ نہ سکے۔ اور چونکہ اس کا حریف کوئی قابل الطینان صداقت نامہ جس سے اس کا اعتبار قائم ہو سکے نہیں پیش کر سکا لہذا سائنس یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا پاپائیت کی تاریخ یا پاپاؤں کے حالات زندگی سے کوئی ایسی کیفیت استخراج ہوتی ہے جس سے معقول طور پر اس امر کی تصدیق ہو سکے کہ پاپا مہربان اللہ ہیں یا معصوم ہیں یا انکھیں بند کر کے ان کے کنبے پر اس حیثیت سے عمل کرنا واجب ہے کہ وہ ناپ خدا ہیں + دستورالعیائد میں ایک نہایت ہی نمایاں لیکن ساتھ ہی مناقض خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس نے عقل انسانی کے آگے طوعاً و کرہاً تسلیم خم کیا ہے۔ اس میں

کیتھولک مذہب پر جہاں من حیث الفلسف نظر ڈال کر اس کا بنی عقول ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہاں عام متبذل مذہب کی مکروہ شکل پر پردہ بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں آفرینندہ کون و مکان جناب باری کی صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جن سے خدا کی شان جلالی و جمالی موزوں طور پر آشکارا ہوتی ہے لیکن اس قول کے اعادے سے احتراز کیا گیا ہے کہ یہ خدائے قہار و قیوم جس کا رعب کائنات پر چھایا ہوا ہے ایک مادر خاکی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو ایک یہودی بنجار کی بیابتابانی بی تھی اور اس کے بعد آسمان کی ملکہ ہو گئی جس خدا کی تصویر اس میں کھینچی گئی ہے وہ قرون متوسطہ کا خدا نہیں ہے جو بلا تک کے ایک گروہ سے گھرا ہوا اپنے سونے کے تخت پر جلوہ گستر ہے بلکہ فلسفہ کا خدا ہے۔ دستور العقاید میں نہ اقا نیم ٹلٹھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نہ مریم عذرا کے اس استحقاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسے معبود ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بلکہ ضنائف کناثہ اس استحقاق کی سختی سے نفی کی گئی ہے۔ نہ عثمانے ربانی یعنی پادری کے کیسیمی اعل سے شراب اور زہنی کو خدا کے خون اور گوشت کی شکل میں بدلنے کا حوالہ دیا گیا ہے اور نہ اولیاء سے مرادیں مانگنے کے وجوب و حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔ غرض اس کے ماتھے پر زمانہ موجودہ کے تخیل کی تقلید اور عقل انسانی کی ترقی کے آثار کا شیک لگا ہوا ہے +

ذات و صفات باری کی اس تشریح کے بعد دستور العقاید نے اس مسئلہ کی تلقین کی ہے کہ انتظام کائنات کیونکر چل رہا ہے۔ کلیسا کا دعویٰ ہے کہ اسے تمام مادی اخلاقی حادثات پر ماوراء الطبیعی دسترس حاصل ہے۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے پادری یا قواسم قیسی قوت کے زور سے جو ان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے اور یا آسمانی طاقتوں کو دعاؤں کے ذریعہ سے اپنا مددگار بنا کر واقعات آئندہ کو اپنی خواہش اور ارادہ کے

سناچ میں ڈھال سکتے ہیں۔ پاپائے عظیم کا ارادہ مصدر رست و کشادہ ہے۔ اور اُسے حل و عقد کی پوری قدرت حاصل ہے۔ اُس کا فیصلہ ناطق اور اُس کا فرمان قضا تو اماں سے ہے۔ اس فیصلہ کی ناراضی سے کسی مجلس عمومیہ میں اپیل دائر کرنا اور اس طور پر گویا یہ ظاہر کرنا کہ کوئی دنیوی طاقت پاپا سے بھی اعلیٰ وارفع ہو سکتی ہے بالکل ناجائز ہے۔ اس قسم کے اقتدار پر ایک مطلق العنان اور غیر آئینی حکومت میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن جس حکومت کا نظم و نسق قانون غیر تفسیر پر مبنی ہو اُس میں ان کو مطلق دخل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ دستور الصفا نہایت زور سے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نظم عالم میں مسلسل دست اندازیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اُس کو ہرگز اس حقیقت کا اعتراف نہیں ہے کہ واقعات قدرت میں ایک غیر ممکن الاندفع تواتر اور معاملات انسانی میں ایک ناقابل تغیر تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کے ہر حصہ میں نظام تمدن کی ترتیب یکساں نہیں پائی جاتی رہی؟ کیا انسانی جماعتوں کا نشو و نما افراد کے نشو و نما کے مشابہ نہیں ہے؟ کیا دونوں کو شباب بلوغ اور انحطاط کے مدارج نہیں طے کرنے پڑتے؟ کیا ان شخص جس نے دنیا کے مختلف ممالک کی آبادیوں کی رفتار تمدن پر غور کیا ہے اور ان ایک سی حالتوں کو مشاہدہ کیا ہے جو اس تمدن کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں صاف نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ ارتقاء پابند قانون ہے؟ پیرد کی قوم اٹکا اور فرماں روا یان کمیکو کے مذہبی خیالات اور ان فرماں رواؤں کے آداب و مراسم دربار وہی تھے جو ایک زمانہ میں یورپ میں پائے گئے۔ وہی تھے جو ایشیا میں پائے گئے یعنی ان سب کا رجحان خیال ایک ہی طرف تھا۔ اور ان سب کی ترقی کے دھارے کا رخ ایک ہی جانب تھا۔ شہد کی مکھیوں کے ایک ابنوہ کو اگر ان کے وطن سے کسی دور دراز سرزمین میں منتقل کیا جائے تو ان کے چھتے کی ساخت اور ان کا طرز معاشرت اُسی ایک طریقے کا پابند ہو گا جس کو مکھیوں کے دوسرے نامعلوم ابنوہ اختیار کریں گے۔ یہی حال بے تعلق اور دور افتادہ انسانی جماعتوں کا ہے۔

خیال اور فعل کا یہ تعلق و تواتر اس درجہ غیر متغیر ہے کہ بعض فلاسفہ تالیخ ایشیا کی مثالوں کو یورپ پر منطبق کر کے بلاتامل یہ دعویٰ پیش کرنے کو تیار ہوں گے کہ اگر اسقف روم اور چند صدیاں ہوں تو ایک غیر خاطی باپا خود بخود پیدا ہو جائے گا اور اگر ایک غیر خاطی باپا کچھ اور مدت مسترد کی جائے تو لامائیت نمودار ہوگی و لامائیت جسے ایشیا کبھی کا حاصل کر چکا ہے +

موجودات روحانی و جسمانی کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے دستور العقائد نے اپنے اقوال کو ان لوگوں پر تبر کر کے سے شان تاکید و تائیس عطا کی ہے جو مسئلہ انفصال کے خائل ہوں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ مظاہر قدمت محض ذات باری کے مظاہر ہیں۔ دستور العقائد کا مسودہ مرتب کرنے والوں نے ان عقائد کی تکفیر کرنے کو تو کروی لیکن جو مشکل اس مرحلہ میں انہیں درپیش تھی و ایسی نہ تھی جس کا آسانی مقابلہ کیا جاسکے۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ ان پرانے پائے زبردست خیالات کی صفیں ان کے مقابل معرکہ آرا نہ ہوتیں جو موجود زمانہ میں ارباب فکر و دانش پر اپنا قوی اثر ڈال رہے ہیں۔ اصول بقا و تناسب قوت کا منطقی نتیجہ مشرق کے فرسودہ و پیش پا افتادہ مسئلہ انفصال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور مسئلہ ارتقا و مسئلہ نشو و نما علی سبیل التدریج اس عقیدے کی بیخ کنی کر رہے ہیں کہ مولید کی پیدائش وقتاً فوقتاً عمل میں آئی۔ مسئلہ اول الذکر اس اصولی نکتہ پر مبنی ہے۔ کہ کائنات میں قوت کی مقدار غیر متغیر ہے۔ اگرچہ یہ مقدار گھٹ بڑھ نہیں سکتی لیکن ان اشکال کا جن کے ذریعے سے یہ قوت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ایک دوسری میں استحالة ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اس نظریہ کو سامن نے کمال اور بدیہی طور پر ثابیت نہیں کیا لیکن جو دلائل اس کی تائید میں پیش کی گئی ہیں و کثیر التعداد ہونے کے علاوہ اس درجہ قوی ہیں کہ اس کے مستحکم و مستند ہونے کا خواہی خواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر ایشیائی مسئلہ انفصال و انجذاب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو اس مہتمم بالشان

نظریہ کے ساتھ توافق ہے۔ اس مسئلہ کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ جب انسانی ہستی صلبے بطن میں متقل ہوتی ہے تو خدا ایک نئی روح کو عدم سے وجود میں لا کر اس میں پھونک دیتا ہے بلکہ اس بات کے معتقد ہیں کہ عقل ربانی یا عقل کل پہلے سے موجود ہے اُس کا ایک حصہ انسان کے جسم میں ڈال دیا جاتا ہے اور جب اُس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو یہ حصہ اُسی سرچشمہ حیات میں واپس جا کر مل جاتا ہے جس سے نکلا تھا۔ دستور العقاید کے مصنفین کے نزدیک یہ عقاید فاسد ہیں اور ان کی پیروی کی یہ کہہ کر مانعت کرتے ہیں کہ ایسے عقائد رکھنے والا شخص مبتلائے عذاب ابدی ہو گا۔ علیٰ ہذا القیاس انہوں نے ارتقا اور نشوونما کے مسائل کی بہ یک کشش قلم یہ کہہ کر تردید کر دی ہے کہ کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ موالید کی پیدائش وقتاً فوقتاً ہوتی یہ مسئلہ کہ ہر جاندار شکل کسی شکل سابقہ کا حاصل ہے سائنس کی رو سے قوت والے مسئلہ کی نسبت زیادہ مدلل و مہربان ہے اور جو اضافے حال میں اس پر ہوئے ہیں اُن کا خواہ کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو لیکن غالباً اصولی طور پر اس کی صحت اور درستی میں کوئی کلام نہیں۔

واقعہ اصلاح پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرنے سے کلیسا نے اپنے ان خیالات کو گویا علی لباس پہنا دیا ہے کہ عقل تابع ایمان ہے۔ اُس کی نظروں میں اصلاح ایک ملحدانہ بدعت ہے جس نے لوگوں کے لئے ہمہ اوست دہریت اور مادیت کا دام خسراں بچھا رکھا ہے اور جو اُس بنیاد ہی کو ڈھا رہی ہے جس پر تمدن کا وار و مدار ہے۔ اسی لئے اُس نے ”اُن شیخ اور بے چین طبیعت کے لوگوں کی بے راہ روی کا سد باب کرنا چاہا جنہوں نے بہ تقلید و تمہید رائے قائم کی ہے کہ ہر شخص کو کتب مقدسہ کی تفسیر و تاویل کا ذاتی حق حاصل ہے“ اُس کا یہ دعویٰ ہے کہ پرائسٹنوں کو کیتھولکوں کے برابر پولیٹیکل حقوق نہ ملنے چاہئیں اور جو شخص اس مساوات کا ادا کرتا ہے وہ نجیشتا اور گمراہ ہے۔ اُس کا یہ قول ہے کہ پرائسٹنوں سے بہ جبر و تشدد پیش آنا اور ان کا استیصال کرنا ایک مقدس فرض

ہے اور انہیں مدارس قائم کرنے کی اجازت دینا ایک قابل فخرین فعل ہے۔ پاپائے
گرگوریسی شانزدہم نے آزادی ایمان کو ایک مجنونانہ حماقت سے تعبیر کیا اور اخبارات کی
آزادی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اس سے بڑھ کر ناجار اور ناشدنی حرکت اور کوئی
نہیں ہو سکتی +

لیکن دریائے ٹائبر کے کنارے جو تقدس تاب بزرگوں اور غیب دانی کی کرسی پر جلوہ
افروز ہیں ان کی مہم من الہی و عصمت عن الخطا کا قابل و شخص ہو تو کیوں کر جو جس کو معلوم
ہے کہ پاپاؤں نے ہمیشہ ایک دوسرے کی تقلید و تکذیب کی ہے اور پاپا اگر مجالس
عمومیہ کے منہ آئے ہیں تو مجالس عمومیہ نے پاپاؤں کی خبر لی ہے اور جس سے یہ بات
چھپی ہوئی نہیں ہے کہ پاپائے سکسٹس خامس کی بائبل میں اتنی سلسلہ غلطیاں تھیں کہ کوئی
دوسرا ان کے قریب ہوں گی، کہ اس نسخہ کے مرتب کرنے والوں کو اس کی اشاعت خود
روک دینی پڑی؟ کس طرح ممکن ہے کہ اگر باب کلیسا ان حقائق کو قریب و غلطیاں قرار
دیں کہ زمین کر دی شکل ہے نظام شمسی کا ایک رکن ہے۔ اپنے محور پر گھومتی ہے اور
آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے؟ و اس واقعہ سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں کہ زمین کے
حصہ متقابل پر بھی انسان آباد ہیں اور ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی دنیا میں موجود ہیں؟
ان دعاوی کو کن دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا عدم سے وجود میں لائی گئی اور
ایک ہفتہ کی مدت میں اس مکمل شکل میں جو ہمارے پیش نظر ہے بنائی گئی اور اس میں
کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے اجزاء ایسے ناقص العمل ہیں کہ خدا کو ان نقائص کی تلافی
و اصلاح کے لئے مسلسل دست اندازی و مداخلت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے +
جب ہادی سائنس کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے عقلی معتقدات کی سپر پھینک دے
تو کیا سائنس کو ان سے ان الفاظ میں مخاطب ہونے کا حق نہیں ہے کہ ذرا اپنے
تاریخی گریبان میں حافظہ کا منہ ڈال کر تو دیکھیں؟ جب زمین کی شکل اور بہشت و دوزخ

کے موقع کی بحث پھڑی تو پادریوں ہی کو بچا دیکھنا پڑا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ زمین ایک سطح میدان ہے اور آسمان بہشت کا صحن ہے جس کی مراد سے انسان بہشت میں داخل ہوئے ہوئے بکرات و مرآت دیکھے گئے ہیں لیکن یہ دعویٰ غلط اور باطل ثابت ہوا۔ زمین کا کردی شکل ہونا علم ہیئت کے واقعات اور سیکیلن کے جہاز کے سفر سے بہ دلائل قاطع ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد پادریوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین کائنات کا مرکز جسم ہے تمام اجرام سماوی اس کے تابع ہیں اور یہ خدا کی عنایات و انفضال کی مود خاص ہے جب اس خیال کی بھی قطعی کھل گئی تو انہوں نے اس ادعا کی آڑ میں جاننا لی کہ زمین غیر متحرک ہے اور آفتاب و ثوابت جو بظاہر اس کے گرد حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی گردش کرتے ہیں۔ لیکن جب دور بین کی ایجاد نے اس بوسیدہ طلسم کو بھی توڑ دیا تو پادریوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نظام شمسی کی حرکات کا دار و مدار مداخلت ربانی پر ہے۔ اس قول کو نیوٹن کی کتاب پر نہپیانے نے یہ ثبوت دے کر جھٹلایا کہ نظام شمسی کے ارکان کی حرکتیں قانون غیر ممکن التغییر کی تابع ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ زمین اور تمام اجرام سماوی آج سے کوئی چھ ہزار سال پہلے پیدا کئے گئے اور چھ دن میں نظام قدرت مرتب کر دیا گیا اور نباتات و حیوانات اور ان کی مختلف نوعیں روئے زمین پر آباد کر دی گئیں۔ جب شہادت مخالف کی گٹھڑی کا وزن اس قدر بڑھ گیا کہ پادریوں کی منطق کی کمر ہری ہو گئی تو انہوں نے بدرجہ مجبوری تاویل کا پہلو اختیار کیا اور دنوں کو قرون میں تحویل کر دیا لیکن یہ جیل بھی کارگر نہ ہوا۔ چھ قرون اور چھ خاص پیدائشوں کا خیال اس انکشاف کے سامنے نہ ٹھہر سکا کہ حیوانات کی نوعین بتدریج ایک دور میں نمودار ہو کر دوسرے دور میں منہٹاے بلخ کو پہنچیں اور تیسرے دور میں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں۔ اس الطباق قرون و ادوار کا تاثر نہ صرف پیدائش بلکہ پیدائش و مرگ کا متقاضی ہے۔

پادریوں کو اس قول پر اصرار تھا کہ دنیا میں ایک ہمہ گیر طوفان آیا تھا جس کی موجیں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھا گئی تھیں اور یہ پانی ایک تندہوا کے چلنے سے خشک ہوا تھا۔ جب کرہ ہوا اور سمندر کے عمق کے صحیح حالات معلوم ہوئے اور غل تبخیر کا بھی ٹھیک اندازہ ہو گیا تو طوفان والا بیان بھی دھکوسلا ثابت ہوا۔ نسل انسانی کے اولین مورخوں کے متعلق پادریوں کا یہ بیان تھا کہ خدا نے انہیں جسمانی و دماغی ہر اعتبار سے کامل بنایا لیکن بعد میں وہ اس ذریعہ کمال سے بچے گر پڑے۔ اس بیان کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے بیانات کا ہوا تھا چنانچہ پادریوں کو یہ فکر پڑی ہوئی ہے کہ زمانہ قبل تاریخ کے انسان کی وحشیانہ حالت کے ثبوت میں شہادت کا جو روز افزوں انبار جمع ہو رہا ہے اُس سے عمدہ برا ہونے کی کیا سبیل اختیار کی جائے ؟

جب حالت یہ ہو تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جو کلیسا کے معتقدات کو ہزلیات و شیطیات سمجھنے لگے ہیں روز بروز بڑھتی جائے ؟ کیوں کر ممکن ہے کہ اُس مذہب کو جو دیکھی اور بوجھی ہوئی چیزوں کے متعلق ایسی فاش غلطیوں میں مبتلا ہے ان دیکھی اور ان بوجھی حقیقتوں کا نکتہ آموز تسلیم کر لیا جائے ؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب جو جسمانیات میں ناکام میاب ہوا ہے اخلاقیات و روحانیات میں کامیابی کے ساتھ مقنا و پیشوا ہو سکے ؟ کلیسا نے سائنس اور مذہب کے ان اختلافات کا تخیلیہ ازراہ استحقار یہ کہہ کر کرنا چاہا ہے کہ ”انہیں غیب نظر سمجھنا چاہئے“ ”یہ بیہودہ جملے ہیں“ ”یہ جمل علم نامہ کے مصنوعی کرشمے ہیں“ ”یہ غلطیاں ہیں جنہوں نے اپنے چہرے پر حقیقت کا نظر فریب خانہ دل رکھا ہے“ لیکن کہیں اس قسم کے جملے کئے فقروں سے بھی کام چلا ہے۔ سائنس کے حقائق و نذر اور عادل گواہ ہیں جو قسیمیّت کے دعوئے عصمت کا بلا خوف تردید ابطال کر رہے ہیں اور پادریوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی جہالت اور کورسودگی

کا مجسمہ پیش کر رہے ہیں +

اتنی بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کے ارتکاب کی تصور وار ٹھہر کر اب پاپا پائنت میں اتنا دم نہیں کہ بیان صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جہاں سائنس کا نام آیا اور وہ ایسی انجان بنی کہ گویا اس سے کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اور طرہ یہ ہے کہ اس پر بھی دین و دلیری کی شان اُسی آن بان کے ساتھ قائم ہے۔ باوجودیکہ واقعات کی قطاریں اس کی تغلیط تسفیہ تکذیب و تحقیق کرنے کے لئے مقابل میں صف بستہ کھڑی ہیں پھر بھی وہ برابر اپنی ہند پر قائم ہے اور معصوم ہونے کی وہی ایک بڑا نکتہ جاتی ہے +

لیکن پاپا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُسے بجز ان حقوق کے جنہیں وہ از روئے عقل ثابت کر سکے اور کوئی حقیق نہیں عطا کئے جاسکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نہ ہی معائنہ میں تو معصوم ہونے کا دعویٰ کرے اور علمی امور میں جب عصمت کا ذکر آئے تو اچھے کانوں پر دھڑے عصمت عن خطا جملہ امور پر حاوی ہے۔ اس سے مراد وہمہ دانی وہمہ شناسی ہے۔ اگر دینیات و آئینات پر اس کا اطلاق صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے تو سائنس پر بھی ہونا چاہئے۔ مگر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ پاپائنت کی سلسلہ اجتہادی خطا و لغو کو اس کے دعوئے عصمت کے ساتھ تطبیق دی جاسکے +

جب پاپا کا معصوم اور خطا سے مبرا ہونا ایک دعوئے بلا دلیل و قیاس ہے بنیاد پر تو کیا وجہ ہے کہ اس کے اس مطالبہ کو رو نہ کر دیا جائے کہ پاپائی عقاید کی اشاعت و زلفا میں جبر کا استعمال روا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس قول کی سختی کے ساتھ تردید نہ کی جائے کہ بوجہ بد اعتقادی کے جس کی زمانہ میں عام ہوا چل رہی ہے محکمہ اعتبار عقاید کا قیام لازمی و ضروری ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ فطرت انسانی کی زمانی دے کر اس محکمہ کی حیثیت سفاکی اور جابرانہ تحویف سے علی رؤس الاشہاد بیزاری کا اظہار نہ کیا جائے؟ کیا ایمان

یا ضمیمہ یا مہیزہ کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناقابل انتقال حقوق حاصل نہیں ہیں؟
 کیسٹھولک مذہب اور زمانہ کے رجحان خیال کے درمیان ایک ایسا ناقابل عبور صیلا
 حامل ہو گیا ہے جس کا پاٹ ٹوٹنے پر غلط فہمی زیادہ چوڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مذہب کو اس امر پر حیرت
 ہے کہ کورنا ایمان عقل پر ترجیح رکھتا ہے اور واقعات کے مقابلہ میں اسرار و اودام نہایت
 وقعت کے قابل ہیں اُس کو یہ دعویٰ ہے کہ حقایق فطرت کے کشاف اور حقایق الہامی
 کے معبر ہونے کا حق بجز اُس کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ وہ کتب مقدسہ کے متعلق بہرے
 رائے کے تسلیم کرنے سے اعراض کرتا ہے جو موجود فن تنقید کے اصول کی رو سے
 ظاہر کی گئی ہو اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کی آیات کے وہی معانی صحیح سمجھے جائیں جو مفسرین
 شریعت نے بیان کئے ہیں۔ وہ آزادی و حریت اور دستور و آئین کی نسبت اپنی نفرت کا
 اظہار علانیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان شخصوں کی خطا ناقابل درگزر ہے جو پاپا اور تمدن
 جدید کی باہمی مصالحت کو قرین امکان یا قرین صواب تصور کرتے ہیں +

لیکن عقل جو کل کے تمدن کی علم بردار ہے پوچھتی ہے کہ اُسے دنیا نوسیح دریا
 کی بتدیانہ خامہ فرسائی کا پابند کیوں بنایا جاتا ہے اور اُن جاہل اور نکتہ ناشناس لوگوں
 کی بادعوانی کے صحیح تسلیم کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے جن کے انجیلی کارنامے کلیسا کے
 قرون اولیٰ سے نقل رکھتے ہیں؟ عقل کہتی ہے کہ اُسے تقلید جامد اور اندھا دھند ایمان
 میں کوئی غہنی نظر نہیں آتی بلکہ وہ ایسے ایمان کو نظر اشتباہ دیکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ
 سچ اور جھوٹ کے امتیاز کے لئے قرین وثوق ہونے کا جو عام قاعدا اس وقت مرجح
 ہے اُس میں اور دینا اصلاح ہو جائے۔ وہ اُن مصنوعی روایتوں اور فرضی حکایتوں
 کو چشمہ نان لینا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتی جو محض پادریوں کی مقصد برآری کے لئے
 تصنیف کر لی گئی ہیں۔ وہ اس دلیل کو کہ چونکہ یہ قصص و روایات زمانہ قدیم سے چلے آ
 ہیں لہذا ضرور صحیح ہیں باور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں پاتی اس لئے کہ اگر قدامت ہی معیار

صحت ہو تو کلیسا کی روایات کے مقابلہ میں بت پرستی کی روایات بہت زیادہ قدیم ہیں خود کلیسا کی ورازی عمر کی وجہ ربانی حفاظت یا سماوی تائید نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے موم کی ناک بن کر اپنے آپ کو زمانہ کے ماتھے کے حوالے کر دیا۔ اور جدھر کی ہوا جلتی دیکھی اُدھر کا رخ اختیار کر لیا۔ مجھ مذہب نصرانیت سے بھی بقدر کئی صدیوں کے زیادہ قدیم ہے۔ تو کیا اس قدامت سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اس کی روایات بمقابلہ نصرانیت کی روایات کے زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا ان الزام سے اپنے آپ کو کسی طرح بری نہیں کر سکتا کہ اس نے اکثر موقعوں پر تاریخ میں دین و دنیا میں تدبیر و تصرف سے کام لیا اور تاریخی واقعات کا اختراع و رد رکھا۔ اگرچہ کلیسا کا اخلاق اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد اگر مقدس ہو تو اس کی تکمیل کے ذرائع بھی خواہ وہ فی الحقیقت کیسے ہی ناروا ہوں پاک ہو جاتے ہیں لیکن جو صورت یہاں بیان کی گئی ہے اس پر یہ اخلاقی مقولہ صادق نہیں آتا +

عرضِ مذہب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ رومانی نصرانیت اور سائنس کے پیر و ان دونوں کے اجتماع کو اجتماعِ ضعیف سمجھنے لگے ہیں۔ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں۔ ضرور ہے کہ ایک کی جگہ دوسرے لے۔ یہی فیج انسان کو چاہئے کہ دونوں میں سے جس کو چاہیں پسند کر لیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں اس میں مستولی ہوں +

کیونکہ ایک نصرانیت اور سائنس کو اس جانتے ہوئے اور آگاہی میں ہمہ وقت پھوڑا رہا کہ ہم پریشنت نصرانیت اور سائنس کے باہمی تعلقات پر غور وائنسے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مصاصت نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ پریشنت کلیساؤں کو اس اصول پر عمل کرنے کی توجہ دینی ہو جو ان کو لوہے سے ترکیبیں ملا ہے اور جسے کئی سال کی جنگ و جدل سے بے بس و مریض کر دیا ہے۔ وہ اصول

یہ ہے کہ ہر شخص کتب مقدسہ کے مفسر ہونے کے اعتبار سے اپنا مجتہد آپ ہے۔ یہ اصول حریت عقلی کا سنگ بنیاد تھا۔ لیکن اگر آیات الہامی میں اجتہاد شخصی کو دخل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صحیفہ فطرت کے معانی سمجھنے میں اس حق سے کام نہ لیا جاسکے۔ جو غلط فہمیاں اب تک واقع ہوئی ہیں ان میں فطرت انسانی کی کمزوری کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ واقعہ اصلاح کینڈہ کے بعد سالہا سال تک اگر لوگوں نے اس علت غائی کو جو محرک اصلاح ہونی تھی پوری طرح نہیں سمجھا اور ہمیشہ اس پر عمل نہیں کیا تو وہ قابلِ درگزر ہیں۔ کیلون نے جب سرویش کو زندقہ آگ میں جلوہ دیا تو وہ اصول جنہوں نے اس وحشیانہ کارروائی پر اسے آمادہ کیا اصلاح کے سکھائے ہوئے نہ تھے بلکہ کیتھولک نصرانیت سے اُسے ترک میں پہنچے تھے اور ان کی قید سے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہ کر تھا۔ علیٰ ہذا القیاس ان ذی اثر پرسٹنٹ پادریوں پر بھی یہی قول صادق آتا ہے جنہوں نے علمائے طبیعیین کو کافر و زندقہ ٹھہرایا۔ کیتھولک نصرانیت اگر سائنس کے ساتھ صلح کرنی چاہے تو اُس کے رستہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں موجود ہیں جو شاید رفع نہیں ہو سکتیں لیکن پرسٹنٹ نصرانیت کا ملاپ سائنس کے ساتھ ہو سکتا ہے ایک کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کینڈہ و عناد اور دشمنی و عداوت کی منازل مفتوحاں طے کرنی پڑیں گی۔ دوسرے کو صرف دوستی تازہ کرنی پڑے گی جس میں غلط فہمی کی وجہ سے فرق آگیا۔

۱۔ دوستی ہر ہی کب تھی جو تازہ ہو۔ کیا مصنف کو وہ جامع دماغ گالیاں یاد نہیں ہیں جو تحریک اصلاح کینڈہ کے بانی بہائی مارن کو مقرر نے فلاسفہ و اہل علم کی شان میں عموماً اور ارسطو کی شان میں خصوصاً تعریف کی تھیں؟ کیا ڈیرہ کو خود اپنا ہی فقرہ بھول گیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ اصلاح کا سائنس کے سربراہ ذرا سا بھی احسان نہیں ہے؟ کیا ڈیرہ کو اپنی یہ عبارت فراموش ہو گئی ہے کہ ”کلیسا نے مسیحی کی دوزخ جاعیتیں یعنی پرسٹنٹ و کیتھولک باوجود باہمی رقابت کے اس امر میں متفق و متحد تھیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۳)“

لیکن وہ عقلی خطرہ جو سچی دنیا میں بہت جلد نمودار ہوا چاہتا ہے خواہ ابتدائیں کیسے
 ہی تلخ کیوں نہ پیدا کرے لیکن اس میں تو شک نہیں کہ موجدہ نسل کا اس خطرناک
 طور پر چپکے چپکے مذہب سے قطع تعلق کرے جانا ایک دن پوشل رنگ لا کر رہے گا۔
 فرانس اپنی رعایا کے طبقہ سافل کے رومانی عقاید میں زیارات کی سرپرستی معجزات
 و کرامات کے صدور اور آسمانی نشانات کی نمائش کے ذریعہ سے از سر نو جان ڈال رہا
 ہے لیکن اُس کا یہ طرز عمل بے معنی نہیں ہے۔ اُس کے مقدر کا نکھانہ علامات میں حصہ
 لینے پر اُسے مجبور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اُس کی جبین عقل عرق انفعال سے تریب ہو
 جاتی ہے۔ جرمنی نے قصہ کر لیا ہے کہ اطالوی عنصر کو خارج کر کے دو عقلی حکومت
 کی قید سے آزاد ہو جائے اور اُس اصلاح کو جسے تین سو سال قبل اُس نے ناتمام
 چھوڑا تھا تکمیل کے درجہ کو پہنچائے۔ یہ قصہ بھی ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ وہ وقت
 قریب آگیا ہے کہ انسان جا رہا ہے جو غیر متحرک مذہب اور متحرک و متیز اندساٹنس میں سے جس کو
 دبقیہ حاشیہ صغیر گزشتہ کچیز ان علوم کے جہان کی رستے میں کتب مقدسہ کے نفیض نہ ہوں اور کسی علم کو
 سلامت اور روادار ہی کی نظر سے نہ دیکھا جائے؟

ہمارے جن ناظرین نے اس کتاب کو بامعان نظر پڑھا ہے وہ باسانی اُس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ گزشتہ
 اور سائنس کا اجتماع خدین کا اجتماع ہے۔ یورپ نے علوم و فنون اور تمدن میں جو ترقی کی ہے وہ مذہب سے آزاد ہو کر کی ہے
 اور جوں جوں یہ ترقی بڑھتی جائے گی مغرب میں بے دینی و احتیاد ہی اور دہریت کا زوبھی بڑھتا جائے گا۔ یورپین اہل
 سائنس میں سے کچھ دو فیصد ہی بھی ایسے نہ ہیں گے جو سچیت کی تعلیم کی صحت کے تو دلدار خدا کی ہستی کے عجیب و غریب
 صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ایمان کے قوسین میں عقل کو جگہ دی ہے جس نے رشتہ
 میں شان و درایت پیدا کر دی ہے جس نے سائنس کی شریعت ہی سے سرپرستی کی ہے۔ اسلام کو آسمان
 غزالی اور ابن رشد پر فخر و ناز ہو سکتا ہے لیکن سچیت کے لئے خیر کہہ ثنائی و التئیر اور کہتے باعدش
 رنگ و عار ہیں۔

چاہے اختیار کر لے یا تو مذہب کا دامن پکڑ لے جو سرمایہ تسکین ہونے کے اعتبار سے
محض قرون متوسطہ کے اوہام کا مجموعہ رہ گیا ہے اور یا سائنس کے پیچھے ہو لے جو شاہ
زندگی کے قدم قدم پر برکتوں اور رحمتوں کے موتی برساتا جاتا ہے انسان کو معاش
کی معراج پر پہنچا رہا ہے اور بنی نوع انسان میں اتحاد کی رُوح پھونک رہا ہے اس کی
فتوحات محکم و دیر پا ہیں لیکن اُس کا میا بی کا نور جو کیتھولک نصرا نیت کے ماتھے پر
فلسفہ کے ٹکڑے کے بعد چمک سکتا ہے زیادہ سے زیادہ اُس شہاب ثاقب کے
آنی و عارضی اور بے سود و سبب مصرف نور کے مشابہ ہے جو آسمان سے زمین پر گرتا
ہے۔

اگرچہ گائیڈو کا یہ قول کہ کلیسا نے ہمیشہ جبر اور مطلق العنانی کا ساتھ دیا ہے بال
بیج ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اُس کی حکمت عملی کی باگ سیاسی ضرورتوں کے
ساتھ میں ہے۔ کلیسا جو کچھ کرتا ہے اُنہی صدیوں کے متفقہ دباؤ سے مجبور ہو کر کرتا
ہے۔ اُس کے افعال میں تو شان مجبوری نظر آتی ہے ہی لیکن اُس کی زندگی میں بھی
اُس قانون کی جھلک دکھائی دے رہی ہے جس کا عمل آج تک نہ ٹلا ہے نہ ٹاگا
یعنی پاپائیت کا بھی وہی حشر ہو رہا ہے جو ہر تنفس کا ہوتا ہے۔ اس نے اول شیر
خوارگی و طنو لیستہ کا مرحلہ طے کیا۔ اس کے بعد سن رشد و بلوغ کی منزل میں قدم رکھا
اور جب جو شش شہاب کے ساتھ اس کی زندگی کا مقصد بھی ختم ہو چکا تو حضور ہوا کہ
یہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو اور سال خوردہ و ناتواں بندھوں کی طرح اس کا مزاج
چڑچڑا ہو جائے۔ اس کی جوانی تو پلٹ کر آنے سے رہی۔ باقی رہا اس کی یادگاروں
کا اثر سوچا البتہ قائم رہے گا جس طرح بستہ پرست رومانے اپنا خستی سایہ سلطنت
روما پر ڈال کر اُس کی تخیل کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا اسی طرح مسیحی رومان اپنا آخری

سل ایک بہت بڑا فرانسیسی میرا درمونی (۱۸۷۰-۱۸۷۱ء) مترجم

سایہ یورپ پر ڈال کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے ۔
 کیا تمدن جدید اُس ترقی کے عہد سے دست بردار اور کنارہ کش ہونے کے
 لئے رضا مند ہو گا جس نے اس کی قوتوں اور خوشیوں میں اتنا بڑا اضافہ کیا ہے ؟
 کیا تمدن جدید رجعت قہقری کر کے قرون متوسطہ کی نیم وحشیانہ جمالت و ادا لام پرستی
 دور کی طرف عود کرنے پر آمادہ ہو گا ؟ کیا تمدن جدید اُس طاقت کا حلقہ بگوش بننا پسند
 کرے گا جو اگرچہ ملہم من اللہ ہونے کی مدعی ہے لیکن کوئی صداقت نامہ ایسا نہیں
 پیش کر سکتی جس سے اُس کا دعویٰ لائق اعتبار سمجھا جاسکے ۔ وہ طاقت جس نے صد
 سال تک یورپ کو جمود کی زنجیروں میں جکڑے رکھا ہے اور ہر اُس کوشش کو جو
 ترقی کے لئے کی گئی ہے یا قوآب آہن میں ڈبو دیا ہے یا شعلہ آتش میں جلا دیا ہے ۔
 وہ طاقت جو عقل و تمیز اور فہم و شعور سے اپنا مرتبہ اونچا سمجھتی ہے ۔ وہ طاقت جو
 حریت خیال اور آزادی تمدن سے متنفر ہونے کا اعلان علی رؤس الاشهاد کرتی ہے ۔
 وہ طاقت جو اپنے اس ارادہ کو نہیں چھپاتی کہ مرنے والے ہی ان میں سے ایک کا
 کھلا گھونٹ ڈالے گی اور دوسرے کو سولی پر لٹکا دے گی ۔ وہ طاقت جس کے
 نزدیک یہ عقیدہ مہلک اور مجنونانہ ہے کہ آزادی ایمان و آزادی عبادت کا حق ہر
 شخص کو حاصل ہے ۔ وہ طاقت جو مذہب و متمدن سلطنتوں میں قانون کے ذریعہ سے
 اس حق کے نافذ کئے جانے کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے ۔ وہ طاقت جو
 ازراہ غایت استحقار اس اصول کی نفی کرتی ہے کہ زبان خلق کو جو نفاذ خدا ہے
 ضرور ہے کہ قانون کی فہم اختیار کرے ۔ وہ طاقت جو مذہبی معاملات میں ذاتی رائے
 کا حق ہر شخص سے پھیننے پر تلی ہوتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ لوگوں کا فرض صرف
 اسی قدر ہے کہ جو کچھ کلیسا کہے دے اُس پر ایمان لے آئیں اور جو حکم دے اُس کی
 تعمیل بلا چون و چرا کریں ۔ وہ طاقت جو کسی دینی حکومت کو کلیسا کے اقتدارات

کی تجدید اور اُس کے حقوق کی تعیین کا مجاز نہیں سمجھتی۔ وہ طاقت جو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ نافرمانی و ناروں کو تعمیل حکم پر طوعاً و کرہاً مجبور کرنا اُس کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔ وہ طاقت جو گھر کی پاک چار دیواری کا بھی ادب نہیں کرتی اور جو شخص اُس کی نظروں میں مشتبہ ہو اُس کی بی بی بیٹوں اور نوکروں چاکروں کو بندیدہ اعتراف سری اُس کا جاسوس و مخبر بناتی ہے۔ وہ طاقت جو بلا الزام لگانے والے کے مواجہ کے اُس پر مقدمہ چلاتی ہے اور اُسے شکنجہ میں کھینچ کر خود اپنے ہی خلاف شہادت دینے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ طاقت جو والدین کے اس حق کو خنثی کرتی ہے کہ وہ اس کے کلیسا سے باہر اپنی اولاد کو تعلیم دلا سکتے ہیں اور برپیل صراحتاً کہتی ہے کہ لوگوں کی خانگی زندگی کی نگرانی اور معاملات نکلح و طلاق کا انضباط اس سے متعلق ہے۔ وہ طاقت جو ان لوگوں کو ڈھیٹھ اور دین و لیر کہہ کر پکارتی ہے جو کلیسا کے اقتدار کو حکومت کے اقتدار کے تابع کرنا چاہیں یا جو کلیسا کو حکومت سے علیحدہ کرنے کے خواہشمند ہوں۔ وہ طاقت جس کو رواداری و مسالمت کے نام سے چرٹے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر ملک میں عبادت کے دوسرے طریقوں کو موقوف کر کے صرف کیتھولک مذہب ہی کو ملکی مذہب ہونے کا حق حاصل ہے۔ وہ طاقت جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تمام وہ قوانین جو اس کے اغراض و مقاصد کی راہ میں حائل ہوں منسوخ کر دیئے جائیں اور جب یہ مطالبہ منظور نہیں ہوتا تو تمام اپنے پیروں کو ان قوانین کی خلاف ورزی کا حکم دیتی ہے نہ؟

چونکہ اس طاقت کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کوئی گراست یا معجزہ جس سے اس کی مطلب برآری ہو سکے اس سے صاف نہیں ہو سکتا لہذا وہ بلا تامل حکومتوں کے خلاف سازشیں کر کے محرک نفوذ امن ہوتی ہے اور اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے جبر و تشدد کی قوتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرتی ہے۔

اس قسم کے دعاوی اور اس طرح کے مطالبات کے معنی یہ ہیں کہ تمدن جدید کے خرمین میں سرکشی و بغاوت کی چنگاری ڈال دی جائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ تہذیب و شائستگی کا قصر منہدم کر دیا جائے خواہ اس کے نیچے کتنی ہی قویں کیوں نہ ہوں جائیں اور کیسا ہی بڑا نقصان دنیا کو کیوں نہ پہنچ جائے۔ اگر لوگ ان مطالبات کو بلا چون چرات تسلیم کر لیں تو ہم سمجھیں گے کہ وہ حقیقت میں غلام ہیں +

جو معمر کا پیش آنے والا ہے اُس کا نتیجہ ارباب عقل سلیم سے مخفی نہیں۔ ہر قوت جب کہ دار و مدار جھوٹ اور دھوکے پر ہے مغلوب ہو جائے گی۔ ہر اُس نظام کو جو تلبیس کا مرکز اور فریب دہی کا مصدر ہے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ اُسے قائم رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ایمان کو عقل کے دربار میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اوہام و پامل کو اپنی مسند و اقامت و حقایق کے لئے خالی کرنی ہوگی مذہب کو اُس خود مختار و حکمرانہ حیثیت سے دست کش ہونا پڑے گا جو اُس نے ایک مدت مدید سے بمقابلہ سائنس اختیار کئے رکھی ہے۔ آزادی خیال کا علم مند ہو کر رہے گا۔ پادریوں کو اُن حدود کے اندر رہنے کا سبق سیکھنا ہو گا جو انہوں نے اپنے لئے اختیار کی ہیں اور فلاسفہ پر ظلم و فساد کرنے کے باز آنا ہو گا اس لئے کہ فلاسفہ اپنی روز افزوں قوت کے بھروسے اور اپنی نیک نیتی کے بل پر آئیں اپنے حریفوں کی مزاحمت اور دست اندازی کے روادار نہ ہوں گے۔ آج سے دو ہزار تین سو سال پہلے عزرائیل کی بید مجنون سے چھائی ہوئی نریوں کے کنارے میٹھ کر جھٹکھا تھا اُس کی صداقت میں آج بھی کلام نہیں بے حق ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور اُس کی قوت قائم رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور فتح اُس کا ساتھ دیتی ہے +

کتاب

سخاوت علی اکبر آبادی (حیدر آباد دکن)
و
عبد القادر جنتی (کریم آباد پنجاب)

GLOSSARY.

فرہنگ مصطلحات علمیہ

ذیل میں اون علمی اصطلاحات کا ترجمہ ردیف وار درج کیا جاتا ہے جو اس کتاب میں آئی ہیں۔ اگرچہ یہ ترجمہ لفظاً و معناً کامل و مکمل نہیں ہے اور غالباً ارباب فضل و کمال کی ناقدانہ نگاہوں کو اس میں بہت سے نقائص محسوس ہونگے لیکن ایسی حالت میں جبکہ کوئی علمی لغات اردو زبان میں ایسی موجود نہ تھی جس سے مجھے اس کتاب کے ترجمہ میں مدد ملتی میں مجبور تھا کہ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اپنی سمجھ اور قابلیت کے موافق اولتاً سیدھا جیسا سمجھ سے بن پڑے کروں اور اسے اس کتاب کے اخیر میں بطور ضمیمہ اس امید پر شامل کر دوں کہ اگر کسی نکتہ سنج ادیب کی عنایت ان اصطلاحات میں سے کسی کا نعم البدل پیش کرسکی تو کتاب کی طبع ثانی کے وقت بشرطیکہ ملک سے اسے سند قبول عطا ہو اسی لحاظ سے ترمیم کردی جائیگی۔

اس فرہنگ کی ترتیب و تدوین سے میرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس سے اون مترجمین کو جو آئندہ کسی علمی کتاب کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کریں ترجمہ میں مدد ملے اور جب کبھی کسی علمی تالیف یا ترجمہ میں اون خیالات کے اظہار کی ضرورت پیش آئے جو اس فرہنگ کے الفاظ میں مرکوز ہیں تو یہی الفاظ استعمال کر کے ادب اردو کے علمی شعبہ میں اصطلاحی یکسانی پیدا کی جائے تاکہ جو دقتیں ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی بدولت آج کل ہمیں پیش آرہی ہیں وہ رفتہ رفتہ رفع ہوتی جائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک علمی اصطلاحات کی ایک جامع لغات اردو زبان میں تیار نہ ہو جائیگی اوسوقت تک تالیفات و تراجم کی تیاری میں موہن و مترجمین کو برابر دقتیں پیش آتی رہیں گی اور ہر شخص ہر نئے مفہوم کے لئے نئے لفظ کوہ کو زبان کی مشکلات میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اس جامع لغات کی تیاری کا مسئلہ شاید

انجمن ترقی اردو علیٰ کوفہ کے زیر غور ہے لیکن خدا جانے یہ لغات کب تیار ہو۔ چونکہ ترجمہ و تالیف کا کام اوسکے انتظار میں رکا نہیں رہ سکتا۔ لہذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نئی علمی کتاب شائع ہو اوسکے آخر میں اور مصطلحات کی فہرست شامل کر دی جائے جو اوسمیں آئی ہوں اور دوسرے مؤلفین و مترجمین بلحاظ ضرورت انہیں مصطلحات کا استعمال کرتے ہوئے انکے علاوہ اور جو نئی اصطلاحات قائم کریں اور انہیں بطور ضمیمہ اپنی کتاب کے ساتھ شریک کر دیا کریں۔ اسطور پر ایک بہت بڑا ذخیرہ علمی الفاظ کا جو اردو زبان کیلئے بطور قدر مشترک ہوگا جمع ہو جائیگا اور یہ ذخیرہ اوس مکمل و جامع لغات کی تیاری کو جسکی ضرورت انجمن ترقی اردو محسوس کر رہی ہے بہت زیادہ آسان کر دیگا۔

ظفر علی خان۔

Tavertine.	۱ جزائے کلسیہ متحجرہ	(الف)	
Star Occulta- tion.	احتجاب کواکب	Clepsydra.	آبی گھڑی
Scurvy.	احتراق خون	Fossils.	آثار متحجرہ
Aqueous rocks.	احجار آبی	Saw Mill.	آرہ کشی کی کل
Igneous rocks.	احجار آتشی	Spokes.	آرے (پہلے کے)
Metamorphic rocks.	احجار مستحیلہ	Firmament.	آسمان
Confusion of languages.	اختلاف اللہ	Glazing.	آئندہ بندی
Perturbation.	اختلال	Diocese.	ایوشیہ
Aberration of the fixed stars.	اختلال ثوابت	Sphinx.	ابو الہول
Free will.	اختیار	Elevation.	اہار
		Reunion.	اتحاد ثانی
		Chance.	اتفاق
		Detritus.	اجراف

Obliquity of the Ecliptic.	اصول اعوجاج طریق الشمس-	Excommuni- cation.	اخراج از کلیسا
Virtual Velocities.	اصول حقیقت سرعت رفتار-	Literature.	ادب
Communism.	اصول مساوات جائداد-	Sentiment of personality.	ادراک ذات
Principle of in- terference.	اصول عقارشت	Astronomical observation.	ارتصاد
Auricular con- fession.	اعتراف سرعی	Oscillation.	ارتعاش
Secession.	اعتزال	Earths.	ارضیات
Peripheral ner- ves.	اعصاب بیرونی	Geocentric.	ارضی المورکز
Vesicular ner- ves.	اعصاب منفوط	Consciousness.	استبصار
Obliquity.	اعوجاج	Efficacy of prayer.	استجاب دعا
Submergence.	اغراق	Metamorphosis	استحاله
Foreclosing of Mortgage.	اغلاق الرهن	Precession of the equinoxes	استقبال اعتدالین
Horizon.	افق	Induction.	استقرا
Satellites.	اقمار	Demonstration.	استقراء تمام
Centralization.	اقتداز	Immaculate conception.	استقرار حمل بحالت دوشیزگی
Oxidation.	اکسار	Deduction.	استنباط
Elixir.	اکسیر حیات	Cave lion.	اسد کهفی
Theology.	الهیات	Cylinder.	استوانه
Hallucination.	التباس حواس	Bishop.	استقف
Deposit.	التمام	Organic forms.	اشکال ذوی الاعضا
		Porisms.	اشکال کثیر النتائج

Samaritin.	بائیبیل کا نسخہ سامیری-	Elohistic.	الوہیمی
Vulgate.	بائیبیل کا نسخہ لاطینی-	Revelation.	الہام
Reaction Engine.	باخوہ استر جاعیہ	Bulging.	انتا
Dividing Engine	باخوہ انقسام	Absorption.	انجذاب
Calculating Engine.	باخوہ تخمین	Condensation.	انجماد
Visual Sense.	باصوہ	Deflection.	انحراف
Chance.	بخت	Stereotyping.	انطباع حروف مسبوکہ
Full moon.	بدر کامل	Refraction of light.	انعطاف ضیا
Heresy.	بدعت	Refraction of light.	انعکاس ضیا
Constellation.	نورج	Emanation.	انفصال
Serpentarius.	نورج ثعبان	Decomposition.	انفکاک
Orion.	نورج جوزا	Winter Solstice.	انقلاب شتوی
Cassiopeia.	نورج ذات الکوسپی	Summer Solstice.	انقلاب صیفی
Reindeer.	یورفانی بارہ سینگا	Incarnation.	اوتار
Glacier.	یورف کا پہاڑ	Nutation of the Earth's axis.	اھتزاز محور زمین
Inverse Vision.	بصارت مقلوب	Pyramids.	اھرام مصر
Voltaic pile.	بطاریہ کھربائیہ	Faith.	ایمان
Paroxysm.	بطش شدید	(ب)	
Immortality of the soul.	بقائے روح	Septuagint translation of the Bible.	بائیبیل کا ترجمہ سبعینیہ-
Conservation of Force.	بقائے قوت		

Incarnation.	تجسد	Pawnbroking Establishment	بندھک نا ساھوکارہ
Anthropomorphism.	تجسیمیت	Legerdemain.	بھان مٹمی
Censorship.	تحریر	Ellipticity.	بیضویت
Sowing machine.	تخم ریزی کی کل	(پ)	
Imagination.	تخیل	Pontiff : Pope.	پا پائے روما
Papal dispensations and indulgences.	تذکرات غفران پا پائے -	Papacy.	پا پائیت
Quadrature of the circle.	تربیع دائرہ	Rhinoceros leptorhinus.	پتلی تہوتہنی والا
Filtration.	ترویق	Layer.	یوت
Fusion.	تسیح	Escapement.	یو زہ
Individualism.	تشیخص	Creation.	پیداشر
Transfusion of blood.	تشریب خون	Stoics.	پیروان حکیم زیلو
Disintegration.	تشیخت	Sublapsarians.	پیروان مسئلہ تاخر
Scepticism.	تشک		تقدیر مہبوط -
Sublimation.	تسعید	Supralapsarians.	پیروان مسئلہ
Crucifixion.	تصلیب		تقدیر مہبوط
Intercommunication.	تعامل	(ت)	
Plurality of worlds.	تعدد عوالم	Apotheosis.	تالیہ
Denudation.	تعریہ	Phases of the moon.	تبدلات قمر
Emplacement.	تغیر مناظر کواکب	Anathema.	تبرا
		Relics.	تبرکات
		Glaciation.	تبرید
		Experiment.	تجربہ

(ج)

Plastic.	جابل
Necessity.	جبر
Particulars.	جزئیات
Molecule.	جزو لایتنجزے
Organism.	جسم ذوی الاعضا
Minority.	جماعت اقلین
Majority.	جماعت اکثرین
Articulation.	جوڑ
Divine essence.	جوہر ربانی
Gnomon (Geo- metry.)	جیب
Sine (Trigono- metry.)	جیب مستوی

(ج)

Spiral.	چکر
Spiral spring.	چکر دار کمائی
Lime stone.	چونے کا پتھر

(ح)

Omnipresent.	حاضر و ناظر
Immaculate conception.	حبل بلا دنس
Periodical sun.	حرارت آفتاب کا موقت الاشتداد ہونا

Schism.	تفرقہ مذہبی
Canonization.	تقدیس الاموات
Calcination.	تکلیس
Inoculation.	تلقیح
Vaccination.	تلقیح البقوی
Allusion.	تلمیح
Painting of the body.	تلوین بدن
Common sense.	تمیز مشترک
Correlation of force.	تناسب قوت
Transmigration	تداسخ
Incorruptibili- ty of the ce- lestial objects.	تذرہ فلکیات
Equilibrium.	توازن
Energy.	توانائی
Pentateuch.	تورات
Tattooing.	توشیم

(ث)

Second.	ثانیدہ
Dualism.	ثنویت
Fixed stars.	ثوابت
Efficacy of alms.	ثواب خیرات

Diagonal.	خط انزاویه	Circular motions.	حرکات مستدیر
Tangent.	خط المماسه	Progressive motion of light.	حرکت نور بر سیل تدریج -
Tropic of capricorn.	خط جدی	Alkalies.	حوضیات
Tropic of cancer.	خط سرطان	Calculus.	حساب
Cuineform.	خط شریخی	Calculus of partial differences.	حساب اختلافات جزئیہ -
Line of no variation.	خط عدم انحراف	Integral calculus.	حساب تامی
Equinoctical lines.	خط معدل النهار	Differential calculus.	حساب جزئیات
Curved line.	خط مقوس	Double entry.	حساب مزدوج
Meridian line.	خط نصف النهار	Infinitesimal calculus.	حساب مقادیر لامتناهی -
Vacuum.	خلا	Book-keeping by double entry.	حساب و کتاب ذریعہ اندراجین -
Flexure.	خمیدگی	Resurrection.	حشر ارجاساد
Supernaturalism.	خوارق عادات	Peat.	حشیش متعجر
Slide rest.	خیراد	Truth.	حق
Ventral chord.	خیط البطن	Fauna.	حیوانات
(د)		Mollusks.	حیوانات مفصلیه
Antarctic circle.	دائرہ قطب جنوبی	Achromatic microscope.	(خ) خورد بین بے رنگ
Arctic circle.	دائرہ قطب شمالی	Cave bear	خرس کھفی
Thrashing machine.	دائین چلائیگی کل	Exodus.	خروج
Minute.	دقیقہ		
Cerebral light.	دماغی بینائی		

(۱)		Circumference.	دور
Heresiarch.	راس الملاحده	Circulation of blood.	دوران خون
Reaction.	رد عمل	Tertiary period.	دور ثالثہ
Observatory.	رصد گاہ	Post Tertiary period.	دور ثالثتہ الاخری
Pendulum.	رقاص ساعت	Miocene period.	دور ثالثتہ اوسطی
Friction.	زگر	Quaternary period.	دور رابعہ
Remontoir.	رمنتار	Glacial period.	دور زمہریہ
Planing machine.	رنده کی کل	Eccentrics.	دوائر مختلف المركز
Toleration.	رواداری	Balance wheel.	دولاب تعدیل
Tradition.	روایت	Double star.	دھوا ستارہ
Cotton gin.	اوئی سے بنوئے جداً کرینکی کل۔	Depression.	دھسن
Myrtle.	ریحان	Sun dial.	دھوپ کھڑی
(۲)		Gnomon.	دھوپ کھڑی کا کانتا
Parallax.	زاویہ اختلاف منظر	Ecstatic meditation.	دھیان اور گیان
Horizontal parallax.	زاویہ اختلاف منظر افقی۔	Abbey.	دیر
Lens.	زجاجہ	Theology.	دینیات
Greater inequality of Saturn.	زحل کی عدم مساوات اکبر۔	Colossus.	دیو ہیکل مجسمہ
Pleistocene Age.	زمانہ ثانیہ الثالثہ جدید۔	(۳)	
Stone Age.	زمانہ حجرہ	Calamite.	ذنب انفرس
Neolithic Age.	زمانہ حجرہ جدید	Mammals.	ذوات الثدي

Zenith.	سمت الراس	Palaeolithic Age.	زمانه حجریه قدیم
Canopus.	سپیل	Bronze Age.	زمانه نحاسیه
Semony.	سیمونیت	Heresy.	زندقه
(ش)		(س)	
Olfactory Sense.	شامه	Intransgressible term.	ساعت موقوت
Laurel.	شجره الغار	Tropical year.	سال انقلابی
Depravity.	شقاوت	Sidereal year.	سال کوكبی
Ellipse.	شكل اهليلجي	Auditory sense.	سامعه
Hyperbola.	شكل بعيد البيضوي	Semitic.	سامی
Binomial Theorem.	شكل ذومعد دین	Silhouette.	سایه سیاه
Parabola.	شكل قریب انبیضوي	Velocity of light	سرعت نور
Spheroid.	شكل مثیل کره	Predestination.	سر نوشت ازایی
Conoid.	شكل مثیل مخروط	Quadrangular plane.	سطح ذواربعة الزوايا
Statistics.	شمار و اعداد	Inclined plane.	سطح مایل
Comet.	شهاب ثاقب	Sophistry.	سفسطه
Meteoric stream.	شهابه متوانیه	Papal Nunico.	سفیر پاپا
Burning Mirror	شیشه آنشی	Congeries of stars.	سلسله الكواكب
(ص)		Cephalic Ganglia.	سلعة الراس
Thunder bolt.	صواعقه	Nervous Ganglia.	سلعة الاعصاب
Conservation of Force.	صیانت قوت	Forecastle.	سلوقیه

Ivy.	عشقی پیچان	(ط)	
Infalibility.	عصمت	Coal bearing strata.	طبقات زغال
Grace.	عفو		
Orthodoxy.	معتقد راشدہ	Palaeozoic formations.	طبقات قدیمہ تختانیہ
Pleiades.	نزد ثریا	Stratum.	طبقہ
Intellect.	عقل	Physicists.	طبیعیین
Passive Intellect	عقل انفعالی	Ecliptic.	طریق الشمس
Active Intellect	عقل فعال	Ordeal.	طریقہ ابتلا
Universal Intel- ligence.	عقل کل	Method of in- crements.	طریقہ اضافات
Individual In- tellect.	عقل منفرد	Derivative functions.	طریقہ اعمال استخراجی
Objective In- tellect.	عقل موجود فہمہ انتہار ج	Variations.	طریقہ تغیرات
Subjective In- tellect.	عقل موجود فہمہ الذہن	Fluxions.	طریقہ فضائی
Dogma.	معتقدہ مذہبی	Metric sys- tem.	طریقہ مطاریہ
Pantheism.	معتقدہ عامہ اوست	The Deluge.	عالمیان نوح
Notation.	علامات نویسی	Longitude.	طول البلد
Cause.	علت	(ع)	
Final cause.	علتہ العلل	Eestacy.	عالم حال
Secondary cause.	علت ثانوی	Digit.	عدد مفرد
Gnomon.	علم	Nonentity.	عدم
Metallurgy.	علم استخراج معادنات	Latitude.	عرض البلد
		Transubstanti- ation.	عشائے ربانی

Spherical trigonometry.	علم مثلث کروی	Jurisprudence.	علم اصول فقہ
Optics.	علم مناظر و عرایا	Harmonics.	علم الاصوات
Botany.	علم نباتات	Economics.	علم الاقتصاد
Astronomy.	علم هیئت	Anthropology.	علم الانسان
Profane learning.	علوم دنیویہ	Mythology.	علم الاوتان
Sacred learning.	علوم دینیہ	Psychology.	علم النفس
Mechanical.	علمی سبیل الاضطوار	Dynamics.	علم تحریک اجسام
Theoretically.	علمی سبیل النظر	Anatomy.	علم تشريح ابدان
(ع)		Physiology.	علم تشريح اعضا
Incandescent gas.	غاز مستوقد	Topography.	علم تعییر بلدان
Calend.	نمره عامه	Mechanics.	علم جز تقییل علم حركات وحیل
Opaque.	غیر شفاف	Meteorology.	علم حوادث الجو
Endless screw.	غیر مختلای پیچ	Zoology.	علم حیوانات
Amorphous.	غیر معین الشكل	Medicine.	علم طب
(ف)		Geology.	علم طبقات الارض
Safety lamp.	فانوس سلاعتی	Physics.	علم طبیعیات
Theological odium.	فتور بدعت	Conic sections.	علم فصول مخروطی
Hippopotamus amphibious.	فوس البحر ذو عنصرین	Scholasticism.	علم کلام
Gnostics.	فرقه ادویه	Chemistry.	علم کیمیا
Sectarianism.	فرقه بندی	Hydrostatics.	علم معانیات
		Trigonometry.	علم مثلث

Pharmacopoea.	قرا با دین	Stoics.	فوقہ جبریدہ
Conjunction of planets.	قران سیارگان	Agnostics.	فوقہ لا ادریہ
Fate.	قسمت	Reaping machine.	فصل کے لاونی کوئیکی کل
Ecclesiasticism.	قسیدیت	Space.	فضا
Destiny.	قضا و قدر	Genius.	فطانت
Pole.	قطب	Metallic Oxide.	فلزاتی اکسید
Greater or Equatorial diameter.	قطر استوائی یا قطر اکبر	Platonism.	فلسفہ اشراقیہ
Less or Polar diameter.	قطر قطبی یا قطر اصغر	Neo Platonism.	فلسفہ اشراقیہ جدید
First inequality of the moon.	قمر کی عدم مساوات اولین	Peripateticism.	فلسفہ مشائیدہ
Evection.	قمر کی عدم مساوات ثانیہ	Annihilation.	فنا
Force.	قوت	Theosis.	فنا فی اللہی
Perpendicular force.	قوت عمودی	Hermeneutics.	فن تفسیر نگاری
Oblique force.	قوت غیر مستقیم	Horticulture.	فن چمن بندی
Electro magnetism.	قوت مقناطیسیہ کبر بائیدہ	Mammoth.	فیل مشعرانی
Hypothesis.	قیاس		(ق)
	(ک)	Inflammability.	قابلیت اضطرام
Universe.	نائنات	Refrangibility.	قابلیت انعطاف
Genesis.	کتاب پیدائش	Omnipotent.	قادر مطلق
Tile Library.	کتب خانہ خشتی	Canon law.	قانون دینیہ
		Immutable law.	قانون غیر متغیر
		Ellicay of li-tanics.	قبولیت استغفار

Tube rose.	گل شب بو	Holy Scriptures	کتاب مقدسه
Ranunculus.	گل شقایق نعمانی	Density.	کثافت
Marigold.	گل صدبرگ	Polygamy.	کثرت ازدواج
Mowing machine.	گهاس کاٹنے کی کل	Pollysyllabic.	کثیر الہجا
Chronometer.	گھڑی	Cardinal.	کودینال
		Rhinoceros with chambered nostrils.	گرمردن مشبک المناخر

(ل)

Agnosticism.	لا ادرایت	Sphere.	کرہ
Atheism.	لا مذہبی	Armillary sphere.	کرہ فلکی
Llamaism.	لامانیت	Ark.	کشتی نوح
Antennae.	لامسہ رونگٹے	Gravity.	کشش ثقل
Anchor.	لنگر (گھڑی کا)	Atonement.	کفارہ
Rifled gun.	لولی انتقویب (بندوق)	Dead beat.	کلالہ
		Carbonite of lime.	کلس سفیم

(م)

Matter.	مادہ	Universals.	ذایات
Antidulivian.	ماقبل طوفان	Church.	کلیسا
Ultramontane.	ماوراء انجبال	Amber.	کھر با
Half moon.	ماہ نیم ماہ	Offing.	کھلا سمندر
Automaton.	متحرک بالذات کل	Chemical laboratory.	کیمیا خانہ
Retina.	متشبکہ		

(گ)

Rotaion.	گردش
----------	------

Madonna.	مریم عذرا	Mystics.	متصوفین
Reflecting sextant.	میزوله انعکاسی	Duplex.	مثلی (کهری کا پرزہ)
Land surveying.	مساحت	Rhapsody.	مجدربانہ ہنر
Undulatory theory of light.	مسئلہ ارتعاش نور	Solids.	محسوسات
Evolution.	مسئلہ ارتقا	Pandects of Justinian.	مجلتہ القوانين جستجینین
Antepodes.	مسئلہ تقابل جگہیں	Synod.	مجلس عامہ
Fatalism.	مسئلہ تقدیر	Oecumenical Council.	مجلس عمومی
Nebular theory	مسئلہ ضبابہ الاجرام	Metropolitan.	مجلس مطرانہ
Theory of the Fall.	مسئلہ دیوٹ آدم	Cathedral chapter.	مجمع الا کلیروس
Equation of the centre.	مساوات مرکز	Magianism.	مجو سیت
Quadratic Equations.	مساوات درجہ چہارم	Convex.	محدب
Cubic Equations.	مساوات درجہ سوم	Gibbous.	محدب التلویر
Equidistant.	مساوی البعد	Apocryphal.	محرّف
Rectangle.	مستطیل	Inquisition.	محکمہ احتساب عقاید
Prolate.	مستطیلہ القطبین	Axis.	محور
Oblate.	مسطح القطبین	Resistance.	مدافعت
Mastodon.	مسطو دان	Orbit.	مدار
Observation.	مشاہدہ	Averroism.	مذہب ابن رشد
		Anthropocentric.	مروء المرمز
		Transit of Venus.	مرور زھرہ

Zodiac.	منطقه البروج	Greater inequality of Jupiter.	مشتري کی عدم مساوات اکبر
Torrid Zone.	منطقه حاره	Lithography.	مطبع سنگ
Temperate Zone.	منطقه معتدله	Purgatory.	مطهر
Panorama.	منظر وسیع	Phenomenon.	منظور
Self luminous.	منیر	Rationalism.	معقولیات
Table of chords.	میزان الاوتار	Laboratory.	معمل
Eolipile.	میزان البخار	Reagent.	معیار (کیمیا)
		Minima.	مقادیر اقل
(ن)		Maxima.	مقادیر اکثر
Herbivorous.	نباتات خوار	Indeterminate quantities.	مقادیر غیر معینہ
Salvation.	نجات	Destiny.	متندر
Asteroid.	نجم	Holy Virgin.	مقدس دوشیزہ
Geocentric system.	نظام ارضی مرکز	Contemporaneous magnetic disturbances.	مقاطعی اختلالات کے حوادث متعاصره
Heliocentric system.	نظام شمسی مرکز	Parallactic rules.	مقیاس اختلاف مناظر کواکب
Pythagorean system.	نظام فیثا غورث	Indicator (distance.)	مقیاس المسافت
Theory.	نظریہ	Spectroscope.	مقیاس الوان نور منشور
Intellegent Principle.	نفس ناطقہ	Encyclical Letter.	مکتوب عمومی
Locomotion.	نقل و حرکت		
Naturalism.	نیچریت		

(۱)	(۲)
Bill of ex- change.	ہندی Monosyllabic. واحد الہجا
Reptiles.	ہوام الارض The Reformation. واقعہ اصلاح کنیسہ
Templar Knights.	ہیکلین Chord - (Trig- nometry.) وتر
Chaotic mass.	ہیوایی Primordial Existence. وجود اولین
(۳)	
Sabbath day.	یوم السبت Monotheism. وحدانیت
Jehovistic.	یہو وائی Specific gravity. وزن مخصوص



آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
 لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
 صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

[illegible]

